خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

نومبر 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

صفحات 290

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com
Digitized by Google

جاسوسی ڈائجسٹ
CNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عنبر رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

اِنشائیہ
07 جون ایلیا

طرزِ زندگی اور اندازِ فکر پر ایک صاحب نظر کا نوحہ

آپ کے خط
08 مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

سسپنس کلاسک

آستین کے سانپ
14 الیاس سیتاپوری

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

تبدیلی
57 تنویر ریاض

باپ اور بیٹے کے درمیان محبت کی رسا کشی کا دلچسپ احوال

ہلچل
67 سلیم انور

تضاد کائنات کے مانند متضاد شخصیت کے مالک ایک مجرم کا انداز

رنگِ آسماں
70 اے آر راجپوت

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی حقیقی خیروں کے عبرت انگیز اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

عالی دماغ
101 محمد طاہر عمیر

اپنی تنہائیوں میں سایوں کے ہجوم میں زندگی گزارنے والے ایک عجیب انسان کا قصہ

دیر آید
118 مرزا امجد بیگ

وکیلوں کی دلیلوں اور مجرموں کے سوئے ہوئے ضمیروں کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی

زیر و زبر
151 محمد ظہیر شیخ

قتل کی ایک لرزہ خیز روداد کا خوفناک انجام

جلد 47 • شمارہ 11 نومبر 2018 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

سبقت

161 شاہ زین رضوان

سچ پر جھوٹ کی سبقت اور..... خونی رشتوں کے درمیان خونی واردات کا احوال

محفلِ شعر و سخن

170 قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

کمبل

173 ڈاکٹر شیر شاہ سید

مردہ ضمیروں کو جھنجوڑتی ایک پر فکر اور عبرت اثر کہانی

وقت

178 حسام بٹ

ایک پُرعزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک طرباطویل داستان

ہلاکت

215 انجم فاروق ساحلی

ایک خونی واردات کا حساب لینے والے بے لوث دوست کی جی داری

حضرت موسیٰ ؑ

227 رضوانہ ساجد

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

کہانی کار

239 ایمل رضا

ایک سچی کہانی کار کی جھوٹی انا اور دہری شخصیت کا زہریلا کھیل

بجنگ آمد

248 طاہر جاوید مغل

معاشرے کے سب سے خطرناک اور پُرفکر پہلو کو اجاگر کرنے والی تحریر..... بجنگ آمد کی عملی تفسیر

کترنیں

** ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ۔ مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

نسخۂ نجات

جانے کس ستم ظریف نے کب اور کہاں نوکر شاہی کا لفظ ایجاد و اختراع کیا تھا۔ اس ستم ظریف موجد اور مخترع کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ لفظ یا دو لفظی مرکب شہنشاہوں، شاہوں اور حکمرانوں کے شانوں پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو جائے گا اور سکہ چاہے کسی بھی بادشاہ کا چلے اور شاہی چاہے کسی بھی خاندان کی ہو مگر ''حکومت'' نوکر شاہی کے قبضے ہی میں رہے گی۔

جسے اس بات پر شک ہو اور جو اس بیان پر یقین کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہو، وہ تاریخ اٹھائے اور وزیروں اور ''امیروں'' کا جاہ و جلال اور اوج کمال دیکھے۔ یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی ہیں کہ ان کے تزک و احتشام کے سامنے ہارون الرشید کا اہتمام اور انصرام ماند پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آخر کار جعفر برمکی کا سر قلم کرا کے اور اس کے باپ یحییٰ برمکی کو تباہی کا نشانہ بنا کر ہی ہارون ان دونوں باپ بیٹوں سے نجات پاتا ہے اور حقیقی معنوں میں ''خلیفہ ہارون رشید'' کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔ ابوالفضل اور فیضی ہیں کہ ان کے اثر و رسوخ کے آگے مہابلی اکبر کے نورِ عین شہزادہ سلیم کی ایک نہیں چلتی، یہاں تک کہ اسے ابوالفضل سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے قاتل کے خنجر آبدار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم یحییٰ برمکی ... جعفر برمکی اور ابوالفضل اور فیضی کے علمی مرتبے کے منکر نہیں ہیں اور ان کی عظمت مسلّم ہے۔ ہم تو صرف نوکر شاہی کے تعلق سے ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

سید ان بادشاہ گر ہیں جسے چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ انہی کے اشارے سے زندگی کے چراغ گل ہوتے ہیں اور انہی کے اشارے سے شہزادے آزاد زندگی کا سانس لیتے ہیں۔

ہم چند صدیوں ہی کی تاریخ کو کیوں دیکھیں۔ دو ہزار، تین ہزار اور چار پانچ ہزار برس پہلے کے دور پر نظر ڈالیں۔ فراعنہ ہوں یا قیصر و کسریٰ کے پُرجلال دربار، ہر جگہ اور ہر بارگاہ عالی میں وزیرانِ باتدبیر اور امیرانِ باتوقیر اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والی نوکر شاہی کی حکومت نظر آئے گی۔ نکسالوں میں سکہ شاہوں کے نام کا ڈھلتا ہے اور سلطنت میں حکم ان کی نوکر شاہی کا چلتا ہے۔

شہنشاہی اور نوکر شاہی کی ناک میں اگر نکیل ڈالی تو وہ جمہوریت نے ڈالی لیکن یہ وہیں ممکن ہو سکا جہاں واقعی عوام کی مرضی اور منشا سے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں اور جن کی ناخوشی اور برہمی سے ایوان ہائے حکومت اور تنگ ہائے سلطنت لرزہ براندام ہوتے ہیں۔

ہم نے یہ ملک جمہوریت کے نام پر بنایا تھا لیکن نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والے ایک ''غلام'' نے اس جمہوریت کا گلا ایسا گھونٹا کہ پھر وہ ڈھنگ سے پنپ نہ پائی۔ اب ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس نے نوکر شاہی کو بے لگام کر دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اہلکار جسے چاہے نہال کر دے اور جسے چاہے اسے عبرت ناک زوال کا نمونہ بنا دے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کی حرمت کو چاہے تار تار کر ڈالے۔ کوئی بھی نہیں ہے جو ان کی دست برد سے محفوظ ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بھی شخصیت اور آبرومندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ایسی صورتِ حال، ایسی وحشت ناک اور دہشت ناک صورتِ حال کسی بھی جمہوری حکومت کو راس نہیں آتی۔ راس آ ہی نہیں سکتی اور کوئی بھی منتخب حکمران دوبارہ عوام کے دربار میں بار نہیں پاتا۔ اس لیے اپنے حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ نوکر شاہی کو اپنے قابو میں لائیں، اس کے تابعِ مہمل بن کے نہ رہیں۔ اسی میں حکمرانوں کی بقا ہے اور اسی میں عوام کی بہبود ہے۔

یہاں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نوکر شاہی کوئی قومی پس منظر نہیں رکھتی۔ یہ تو انگریز سامراج کا ''کرم پرورانہ'' تحفہ ہے جس سے ہمیں نوازا گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو عوام کا طبقِ السّلطنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ اس گروہ کو اس کی حد میں رکھا جائے اور اسے آزاد اور جمہوری معاشرے کے آداب سکھائے جائیں۔ یہی ملک اور قوم کے لیے نسخۂ نجات ہے۔

عزیزانِ من
السلام علیکم!

لیجیے جناب گردشِ ایام میں نومبر 2018ء بھی سر پر آ گیا۔ دن، مہینے سال گزرتے جا رہے ہیں..... نسلیں اور معاشرے اچھی ماحول میں بدل رہے ہیں۔ مسندِ اقتدار پر بھی بدلاؤ آتا رہتا ہے مگر..... قسمتِ قوم کی تقدیر ہے کہ اول دن سے جن مسائل کا شکار ہے ان میں آج بھی الجھی ہوئی ہے لیکن مزید اضافوں کے ساتھ..... یہ کوئی اتنی حیرت کی بات نہیں کہ گزشتہ دنوں آئی ایم ایف جیسے ادارے نے پاکستان کی معاشی صورتِ حال پر نہ صرف تشویش اور افسوس کا اظہار کیا بلکہ حسبِ سابق بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ گراں قدر یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ خسارے میں چلنے والے تمام سرکاری اداروں کو نیلام کر کے نجی تحویل میں دے دیا جائے۔ شاید اس ادارے کو اس بات کا ادراک نہیں کہ حکومتیں اور سرکاری ادارے پیسا کمانے کے لیے نہیں بلکہ عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ اگر موجودہ حکومت نے بھی اپنے ابتدائی دنوں میں معیشت کی زبوں حالی پر قابو نہ پایا تو اس مرتبہ مظلوم عوام شاید پھر کبھی کسی قائد سے اچھی توقعات وابستہ نہ کر سکیں۔ لہٰذا اس کے لیے حکومت کو اپنی ذمے داریوں کو نبھانے کا عملی نمونہ پیش کرنا ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اداروں کے استحکام اور قرض کی ادائیگی سے نہ صرف ریاست اور جمہوریت مضبوط ہوتی ہے بلکہ قوم بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔ ایکشن کے دوران عوام کے لیے بھلائی کی ڈگڈگی تو بجائی جاتی ہے مگر اصل تماشے بعد میں ہوتے ہیں۔ جیسے کہ بغیر کسی نوٹس یا تحقیقی اطلاع کے اچانک بجلی کے محکمے نے ڈیجیٹل میٹر بدل کر عوام کو مزید عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس پر اوور بلنگ نے کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ مزید برآں متعلقہ حکام سے شکایت درج کرائی جائے تو الٹا صارف کو ہی بجلی چور بنا کر بلیک میل کیا جاتا ہے اور اسے ذلت اور خواری اٹھانی پڑتی ہے جبکہ دوسری جانب کئی کئی لاکھ کا فنڈ تھاوزات کے خاتمے کے نام پر ضائع کر کے بے روزگاری میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ پہلے روزگار کے مواقع پیدا کر کے ان کی کمپت کا انتظام کیا جاتا تو شاید غربت کے اندھیروں میں مزید اضافہ نہ ہوتا۔ بہرحال جس طرف نگاہ ڈالیے بہت کچھ نظر آتا ہے مگر ہم ہیں کہ نظر کا انداز بدلنے کو تیار ہیں نہ غلط اندازوں پر نشانہ لگانے سے باز رہتے ہیں۔ اللہ سے اچھے کی امید اور دعا کے ساتھ اب رخ کرتے ہیں اپنی محفل کا جہاں دوست ہمارے منتظر ہیں۔

✻ چلیلی ہیر کا خط، جھنگ سٹی سے ''17 ستمبر کو ماہِ اکتوبر کا ڈائجسٹ ملا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ تگڑی حالت میں تگڑی قیمت کے ساتھ سسپنس ڈائجسٹ کا یہ راہی اچھا لگا۔ اچانک پورے تیس روپے کا اضافہ کر کے نواز حکومت کی یاد تازہ کر دی۔ کچھ تو خیال کرتے، ہم رسالے پڑھنے والے لوگ اپر کلاس برگر فیملی سے نہیں ہوتے۔ (جی بالکل درست کہا آپ نے مگر..... مہنگائی نے ہر طبقے کی کمر کو توڑ کر رکھ دیا ہے) انشائیہ میں ایلیا جی بڑا خسارہ لیے حاضر ہوئے ہیں۔ جی صاحب خسارہ ہی خسارہ..... اداریہ بھی ٹھیک ہی تھا۔ محفل میں خالد شیخ طاہری صاحب صدارت پر نظر آئے۔ اپنے آپ کو عارف علوی مت سمجھ لیجیے گا۔ ویسے اچھا تبصرہ دینے پر مبارک باد۔ رفاقت انکل جی، میں لفظوں کو تڑکے کے ساتھ ساتھ کھانوں کو بھی اچھا تڑکا لگاتی ہوں اور ہاں، سٹریل انکل کا خطاب کسی اور انکل کے لیے تھا۔ تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ رومی انصاری صاحب نے مان لیا کہ ہم شہزادیاں ہیں، نوازش ہے جناب۔ پرانے تبصرہ نگاروں کو پہلے بھی کئی بار پکار اجا چکا ہے۔ رمضان پاشا جی نے اس بار کچھ فلاسفیانہ ٹائپ کا تبصرہ لکھا ہے، شاید صدارت کی امید میں۔ لاہور کے انجم ساحلی جی، ہیر کا تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی کافی عمدہ ہے۔ اسلام آباد والے مشورے اچھے دیتے ہیں جیسے کہ ظفر احمد نے زویا انجاز کی کو دیا۔ ہمایوں خوبی، آپ خود تو روزی سے پرانا رسالہ لیتے ہیں اور ہمیں کہتے ہیں پڑھے بغیر تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ ٹیلنٹ ہے ٹیلنٹ جو روزی بیچنے اور خریدنے والے کے پاس کہاں..... فیصل مشتاق تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں کی ابتدا آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل جی کی جنگ آمد سے کی۔ اس بار معاشرے کے سب سے خطرناک اور پُرخطر پہلو پر تحریر کیا۔ ایسی بہترین تحریریں پڑھ کر ہم خود عملی طور پر خود کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو کبھی اکیلا گھر میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ عادی جیسے دھرتی کے بوجھ کب شیطانی شکل میں آ جائیں۔ داستان کے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی مکافات بہت لاجواب تھی۔ مکافات کا لفظ ہی ایسا ہے کہ جس کو پڑھ کر دل کو تسلی ہوتی ہے۔ غلطی کرنے والوں کو سبق دینا ہوگا۔ وقت لاجواب انفو داستان ہے۔ حسام بٹ جی ہمیں کافی جنرل نالج بھی فراہم کرتے ہیں۔ اب کایا نے اسد علی کی کایا پلٹ دی ہے جیسے اس کو آسکر برادنگ ڈائکر بنا دیا۔ کافی دلچسپ قسط تھی۔ رنگِ آسماں اے آر راجپوت میں شاہ زمان اریبہ اور علی اپنے مشن پر پوری طرح کمر بستہ ہیں۔ پجھورام اور بجوجائی کے تانے بانے بھی عروج پر ہیں۔ شوکی پیارہ کسی برف پوش پہاڑی وادی کے غار میں پھنس گیا۔ محمد الیاس کی غار زدہ خاص پسند نہیں آئی۔ پاگل متانتی رائٹر ہیں، تبھی فردوس نے اچھا لکھا ہے۔ وہی مکافاتِ عمل والی بات آ جاتی ہے، کشمالہ اور کلثوم پر..... گڈ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دسواں حصہ پڑھا۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ جذاک اللہ رضوانہ ساجد۔ گڑیا محمد سجاول خان کی اچھی کوشش تھی۔ مین اور بیگ دونوں بہنوں کی کہانی۔ تحریر ریاض صاحب کی ناقابلِ یقین البتہ کافی دلچسپ کہانی تھی۔ کیٹی کی ایک صلاحیت نے اس کی جان بچائی اور دوسرے مجرموں کو بھی پکڑوا دیا۔ چار و ناچار، مرزا اامجد بیگ یا ملک صفدر حیات بہرحال ملک صاحب کا یہ کیس بھی کافی پیچیدہ تھا مگر صفدر حیات جی کے کیا کہنے۔ سنجیدگی اور ایمان داری سے کام کرنے والوں کو ہمیشہ کامیابی ملتی ہے۔ رانا

Digitized by Google

مظفر نے گڑھا لیف چیمہ کے لیے کھودا، گرا وہ خود..... زبردست۔ اس بار مراسلے اور لطیفے بہت اچھے اور نئے تھے۔ محفل شعر و سخن بھی لاجواب رہی۔ سبھی کے اشعار پسند آئے۔"

❁ ڈاکٹر نائلہ نصر ملک کی خواہش پشاور سے۔" کچھ عرصے سے بہت خواہش تھی کہ دوبارہ سسپنس کی محفل میں شرکت کی جائے مگر سستی اور مصروفیت آڑے آجاتی۔ عبدالبصار روی صاحب ہم خواب ہوئے تبصرہ نگاروں کو آواز دی تو حقیقت میں قلم اٹھالیا۔ (بہت خوب..... خوش آمدید) باقی صاحبان بھی براہِ کرم خواب سے حقیقت میں آجائیں۔ تمام خطوط بہترین تھے اور خالد شیخ صاحب کو مبارک باد۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے عامر شہزاد اور ریاض بٹ صاحب کو بھی مبارک۔ ویسے کیا ہی اچھا ہوا گر ادارہ ہمیں منتخب کیے جانے پر پرائز بھیجے۔ خواتین کے لیے سوٹ اور مردوں کے لیے کتابیں۔ (واہ واہ..... کیا کہنے بھئی..... سرکولیشن میں اضافہ کیجیے، یہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے) سسپنس اور سرگزشت بہترین رسالے ہیں اس لیے بہت داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ باغی کے محمد طاہر عمیر صاحب سے بھی درخواست کریں کہ پھر سے کوئی تہلکہ مچاتی تحریر لے کر آئیں۔ بہت عرصے سے خواہش تھی کہ رنگ آسمان کے اے آر راجپوت کی تعریف کی جائے تو آج ان کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں۔ بہت ہی زبردست اور اعلیٰ تحریر ہے۔ اس کے بعد جس تحریر نے بہت متاثر کیا، وہ ٹھنڈی چائے ہے۔ مختار آزاد صاحب نے محبت کی اتنی خوبصورت عکاسی کی کہ یقین کریں مجھے تو یہ بہت اچھی لگی۔ بغیر لمس کے محبت کی ہر قسم کو اتنی خوبصورتی سے ٹھنڈی چائے سے تشبیہ دینا بہت بہت قابلِ تحسین ہے۔ باقی تو اس دفعہ سسپنس نے بڑے مزیدار لطیفے سے رلا دیا۔ ٹھنڈی چائے سے لے کر پاگل ممتا اور پھر بھنگ آمد، پھر کیکر اور خارزار یقین کریں آپ نے ہمیں بہت ہی غمگین کر دیا اور کتنے ہی آنسو نکل آئے۔ برائے مہربانی ایک ساتھ اتنی دکھی کہانیاں شائع نہ کیا کریں۔ بہرحال ہر ایک کہانی ٹاپ کلاس تھی۔ کاش یہ کہانیاں پڑھ کر ہم اپنے اعمال بھی ٹھیک کر لیا کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بہترین ہے اور پیغمبروں کی زندگی کے واقعات کو تحقیق سے لکھنا بہت مشقت کا کام ہے لیکن رضوانہ ساجد صاحبہ کو اس کا بہت اجر ملے گا۔ وقت بھی بہترین کہانی ہے اور حقیقتاً بہت ہی معلومات سے بھرپور کہانی ہے۔ بس ہیر وصاحب بہت ہی عاشق مزاج اور "کریکٹر ڈھیلا ہے" والا واقع ہوئے ہیں۔ اب تک تین خواتین کو قابو کر چکے ہیں، کہانی کی آخری قسط تک امید ہے فوج ظفر موج لگ چکی ہوگی۔ ادارے کے لیے بہت دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم سب کراچی سے خیبر تک صرف پاکستانی ہونے کا حق ادا کریں۔"

❁ زرین آفریدی، حیدرآباد سے تشریف لائی ہیں" ماہ اکتوبر کا سسپنس ڈائجسٹ دھماکا خیز انداز میں بروقت مل گیا۔ آپ ادارے والے بھی سیاست دانوں سے کم نہیں، پہلے رسالہ بند کرنے کی دھمکی دے کر یکدم تیس روپے اضافے کے ساتھ ڈائجسٹ پیش کر دیا، بہرحال نشہ جتنا مہنگا ہو جائے مجبوری ہوتی ہے۔ 6 ستمبر شہداء کی یاد اور شادیوں کے سیزن کے لحاظ سے خوبصورت رہا۔ ذاکر حسین صاحب کی رحلت کا سن کر دکھ ہوا۔ ساتھ سینئر صحافی الیاس شاکر صاحب کا بھی..... اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جون ایلیا جی کا خسارہ اور اداریہ اچھا لگا۔ محفل پر نظر پڑی تو خالد شیخ طاہری صاحب صدارت کے حق دار ٹھہرے۔ مبارک باد۔ عامر شہزاد نیا اضافہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض بٹ صاحب مختصر تبصرے کی وجہ بھی بتائی ہوتی۔ عبدالبصار روی صاحب ہم بھی آپ کے ہم نوا ہیں، پرانے تبصرہ نگاروں کو محفل میں واپس لانے کے لیے۔ تبصرہ اور شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد رفاقت صاحب، یہ پھولوں کا گلدستہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہو گیا۔ رمضان پاشا اچھے مشورے کے ساتھ محفل میں حاضر تھے، شعر پسند کرنے کا شکریہ جناب۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس بار مکافات لے کر آئے۔ اچھی تاریخی داستان تھی پسند آئی، پھر آخری صفحات پر چلے گئے۔ جناب طاہر جاوید محفل صاحب کی بھنگ آمد..... اس بار محفل

معزز قارئین کے لیے

ادارے کی روحِ رواں محترمہ عذرا رسول سے علم ہوا کہ بہت سے قارئین پرانے مصنفین اور ان کی کہانیوں کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ کوئی سدا نہیں رہتا۔ الیاس سیتاپوری، محی الدین نواب، اقبال کاظمی، افسر آذر، علیم الحق حقی، علی سفیان آفاقی، کاشف زبیر، مختار آزاد، احمد صغیر صدیقی، سلیم فاروقی، ایم اے راحت کے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو غریقِ رحمت فرمائے۔ یہ ایک بحرانی صورتِ حال تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئے مصنفین کی تلاش، تربیت اور حوصلہ افزائی ناگزیر تھی۔ ادارے نے ہر قسم کے تحفظات سے بالاتر ہو کر ہر اچھی کہانی کو پذیرائی دی۔ جن لکھنے والوں کی کہانیاں انتخاب کے معیار پر پوری نہیں اتر سکیں ان کی ناراضی قابلِ فہم ہے مگر ادارے کا طریقہ کار قطعی غیر جانب داری پر مبنی رہا اور مبنی ہے۔

احمد اقبال صاحب ڈائجسٹوں کے ایک مقبول مصنف ہیں لیکن ایک مدت سے وہ اپنی ادبی مصروفیات کے سبب کہانیاں نہیں لکھ رہے۔ ادارہ ان سے مسلسل رابطے میں ہے۔ محمود احمد مودی صاحب ایک اور ادارے سے مستقل بنیاد پر وابستہ ہیں اس لیے ہمارے پرچوں میں لکھنے سے قاصر ہیں۔ دیگر معروف قلم کاروں سے بھی نیاز مندانہ رابطہ رہتا ہے لیکن ان کی اپنی مصروفیات وعدوں اور وفا کی راہ میں حائل رہتی ہیں۔ رہا راقم الحروف..... تو جون 2006ء تک محترم قارئین سے قلم کے ذریعے رابطہ رہا۔ اب عذرا رسول صاحبہ کی ہدایت پر پہلی بار قارئین سے براہِ راست مخاطب ہوں۔ بعض ناگزیر اور ناگفتنی ذاتی وجوہ کی بنا پر ایک عشرے سے لکھنے کا سلسلہ موقوف ہے۔ ادارے سے گہری وابستگی اور ملازمت جاری ہے۔ اس دورانیے میں قلم نے جب بھی ذہن میں بنتی بگڑتی کہانیوں کا ساتھ دیا، تحریر قارئین کی نذر ہوئی۔

(اقلیم علیم)

صاحب کا انداز اور کہانی کا ماحول مختلف ہے۔ شاید انہوں نے معاشرتی بے اعتدالی اور خطرناک پہلو کو اجاگر کیا۔ جرم پر جو قیامت گزری، اس کی والدہ مروہ نے اس پر ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ عادی جیسے جانور نما لوگوں کو سزا ملنی ہی چاہیے۔ دوسری طرف گھر میں جوان اکیلی لڑکیوں کو بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگلے جسے کا انتظار ہے تو عادی کے انجام کا بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دسواں حصہ پڑھا۔ بہت ہی ایمان افروز سلسلہ ہے۔ کبھی فردوس کی پاکیزگی متاثر کیا۔ سلسلہ وار اسٹوریز دونوں بہترین مراحل میں داخل ہو چکی ہیں۔ رنگِ آسماں اے آر راجپوت، کئی پہلو لیے ہوئے کافی دلچسپ اسٹوری ہے۔ اریبہ بشاہ زمان اور علی اپنے مشن پر لگے ہوئے ہیں۔ شوکی، ریتا اور مجو بائی دلچسپ رام زبردست۔ وقت میں حسام بٹ صاحب بھی بہترین انداز میں اسد علی کو اپنے سفر کے حصول کی طرف گامزن کیے ہوئے ہیں۔ ویلڈن۔ ظفر اقبال ظفر کی کیمز، کلاس ڈیفرنس کا ٹاپک یا امیری غریبی کا فرق۔ سکینہ اور فیضو کا بیٹا حسنی زندہ واپس نہ آیا مگر چھوٹے خان کا گھوڑا واپس آگیا۔ محمد سجاول خان کی گڑیا بس گزارے لائق اسٹوری تھی۔ شہر عباس کی چور بھی بیسٹ رہی۔ نادیہ نور کی احسان مند بھی خوب رہی۔ پیشہ ور قاتل کلارک نے اپنے احسان کا بدلہ ویسٹرن جائنٹ کو قتل کر کے لیا جو اس کے محسن ڈاکٹر اسٹیون جائنٹ کو مارنا چاہتا تھا۔ چار و ناچار میں ملک صفدر حیات نے بتایا کہ زر، زمین اور سیاست بہت بری ہیں۔ رشتوں پر ہونے والی لڑائی سیاست پر ختم ہوئی اور رانا مظفر کو زندگی بھر کے لیے جیل جانا پڑا۔ محفل شعر و سخن میں تینوں اعزازی شعر واقعی اچھے تھے۔ باقی کی محفل بھی بہت لاجواب رہی۔ لطائف بھی بہت اچھے تھے۔"

❁ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں" تازہ شمارے کے سرورق پر ایک دلہن بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ آج شادی کی رات ہے، یہی سوچ کر مسکرا رہی ہے۔ فہرست بالکل سادہ تھی، مزہ نہیں آیا۔ انتساب حسبِ معمول فکر انگیز تھا۔ کترنیں سب کی سب دلنگ تھیں۔ اشعار کی محفل میں محمد شفیق حسین، ریاض بٹ، ناہید یوسف، محمد آریز ملک کے اشعار قابلِ داد تھے۔ عبدالبار رومی انصاری کا قطعہ بھی لاجواب تھا۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عنبر آزاد کی ٹھنڈی چائے سسپنس کلاسک کے سلسلے کی کڑی ہے؟ (جی، ہرگز نہیں.....) اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ ناقابلِ یقین، بہت ہی پُرلطف اور پُرمزاح تھی۔ پیشہ ور بھی اچھی تھی۔ ٹھنڈی چائے بھی اثر انگیز اور متاثر کن تھی۔ رنگِ آسماں میں ایک پراسرار حسینہ کے روپ میں ایک نیا کردار شامل ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی حسینہ کیا گل کھلانے والی ہے۔ سزائے انتظار، بہت خوب۔ یہ کہانی مدتوں یاد رہے گی۔ موت سے پہلے کچھ خاص اثر نہ چھوڑ سکی۔ چار و ناچار اس کہانی کے مصنف کا نام فہرست میں مرزا امجد بیگ لکھا تھا حالانکہ یہ کہانی ملک صفدر حیات نے لکھی تھی۔ کہانی کچھ منفرد اور الجھن والی تھی، پھر بھی ملک صاحب نے مجرم کو پھانس ہی لیا۔ پاگل ممتا، یہ تو پاکیزہ کی چیز ہے، سسپنس میں کیوں لگا دی..... بریف کیس، بہت ہی مختصر اور پُرتجسس تھی۔ غیر ملکی کہانیوں میں چشم دید اول نمبر پر ہے۔ احسان مند یہ کہانی بھی بہت اچھی اور پُرلطف تھی۔ وقت کی یہ قسط بہت ہی دلنگ تھی۔ خارزار، بے انتہا اثر انگیز تھی۔ چور کہانی خواہ مخواہ طویل کی گئی ہے۔ اس میں کچھ نہیں جو پسند آئے۔ گڑیا بھی اچھی نہیں لگی۔ ہاں البتہ سکیمر نے تو ہمیں بھی رلا دیا۔ بہرحال آمد، ابھی تو کہانی چل رہی ہے جب ختم ہو گی تو تبصرہ کروں گا۔"

❁ محمد رفاقت، واہ کینٹ سے تبصرہ کر رہے ہیں" جناب! اکتوبر کا بھی شمارہ آگیا۔ بہت انتظار رہتا ہے جب پڑھ لیتے ہیں تو پھر سے اگلے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ یہ انتظار بھی بڑی عجیب چیز ہے جو انتظار کرتا ہے، اسے ہی پتا ہوتا ہے۔ تو جناب سب سے پہلے تو ساجد امجد صاحب کی کہانی مکافات پڑھی۔ بہت محنت سے لکھی گئی کہانی بہت پسند آئی۔ ادارہ اور محترم رائٹر صاحب کو بہت بہت مبارک ہو۔ ظفر اقبال ظفر صاحب نے کیمز کی کہانی خوبصورت انداز میں پیش کی۔ گھوڑے کا گھر تلاش کرتے کرتے اپنا بچہ کھو دیا۔ محمد سجاول خان صاحب کی گڑیا بھی اچھی کہانی ہے۔ عنبر آزاد کی ٹھنڈی چائے ماسٹر امجد علی کی طرح نہ جانے کتنے گھرانے اس طرح ختم ہو جاتے ہیں۔ بہت خوبصورت الفاظ میں ایک فکر انگیز کہانی تھی جو کہ بہت پسند آئی۔ رنگِ آسماں کا بارھواں حصہ بھی پڑھ لیا۔ دیگر کہانیاں جن میں ناقابلِ یقین، پیشہ ور، سزائے انتظار، موت سے پہلے، چار و ناچار، پاگل ممتا، بریف کیس، چشم دید، احسان مند، وقت، خارزار، چور سب ہی اچھی ہیں۔ کس کی تعریف کریں۔ اتنی اچھی اور زیادہ تعداد میں اس دفعہ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اس کے لیے میں ادارے کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ محفل شعر و سخن بھی اپنی آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ اچھے شعروں کی بارش ہو گئی ہے۔ کئی کئی بار شعر پڑھے اور ان میں ڈوب گئے۔ سب کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ اسی طرح رسالے کی جان کترنیں بھی بہت اچھی ہیں۔ آتے ہیں سب سے اچھے سلسلے آپ کے خط کی طرف۔ تو جناب میں محترم ہمایوں تھوانی صاحب کی اس بات سے متفق ہوں کہ بڑے لمبے خط نہیں ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی موقع مل سکے۔ رسالہ مکمل پڑھتے نہیں اور خط بڑے بڑے لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سرورق کے مصور محترم ذاکر حسین کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔"

❁ محمد صفدر معاویہ کی خوشی خانیوال سے" سرورق کو خوب سجایا گیا۔ میں بہت خوش ہوں کہ پورے 290 صفحات ہو گئے۔ قیمت کی کوئی بات نہیں روپیا جیسا تو آنی جانی چیز ہے۔ اچھی چیز پڑھنے کو مل جائے تو پیسا وصول ہو جاتا ہے۔ محترم جون ایلیا کا بڑا خسارہ لفظ لفظ موتی ہے۔ آنکھوں سے پڑھا اور پردیا ہے دل پر۔ بدی ہر چیز پر حاوی ہو گئی۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ بے حسی اور بے ضمیری کے عالم کا تو نہ پوچھیے جس معاشرے سے انصاف اور عدل اٹھ جائیں وہاں پر پھر یہی حال ہوتا ہے۔ الکل ذاکر حسین کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ مرحوم کی ادارے کے لیے بہت خدمات تھیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ محفل میں خالد شیخ طاہری محفل کو لیڈ کر رہے ہیں۔ مبارکاں جی۔ ٹھیک فرمایا کہ ہم مشکل وقت میں ادارے کے ساتھ کھڑے ہیں۔ عامر کا بھی رہا خوب اندازِ بیان۔ ریاض بٹ بھی اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ رومی انصاری بھائی کی بہت ہی عمدہ ٹیسٹ انگز، بہت خوب۔ محمد رفاقت اور رمضان پاشا بھی محفل کی رونق بنے۔ فیصل مشتاق کو ویلکم۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں کی شروعات کی مکافات سے جو ڈاکٹر ساجد امجد نے لکھی۔ مثال ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے بعد دنگے

فساد جو ہوئے تخت کو خون سے لت پت کر گئے اور حکومت کسی اور کے ہاتھ گئی۔ تحویر ریاض کی ناقابلِ یقین بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ کیٹی کو خاص صلاحیت حاصل تھی جس کی مدد سے وہ سب کچھ جان لیتی۔ ماہ رخ ارباب کی پیشہ ور بھی اچھی رہی۔ مختار آزاد کی ٹھنڈی چائے نے دل کو دکھی کر دیا۔ پتا نہیں کیوں بچے بڑے ہوتے ہی ماں باپ کو چھوڑ جاتے ہیں خصوصاً بیٹے کیونکہ بیٹی کو تو پیسے ہی گھر چھوڑ کر جانا ہوتا ہے۔

اے آر راجپوت کی رنگ آسماں اپنے رنگ بکھیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے اور کافی سنسنی خیز واقعات پیش آ رہے ہیں خصوصاً شوکی کے ساتھ۔ محمد طاہر عمیر کی چشم دید میں کتنا بھیانک کردار تھا مائیکل عرف کارلوس کا۔ اسے کیا خبر تھی کہ کبھی کبھی وہ ہوتا ہے جو کسی کے گمان میں نہیں ہوتا جیسے میکس کی آنکھ۔ جون نے اپنے بیوی بچے کے قاتل کو کیٹر کردار تک پہنچایا جو کہ باقی لوگوں کا قاتل بھی تھا۔ وقت بھی وقت کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ کہانی میں تھوڑا ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ محمد الیاس کی غار زار نے بھی دکھی کر دیا۔ خون کے رشتے ہی ہمیشہ ارمانوں کا خون کرتے ہیں۔ ہوس اور لالچ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ آمنہ نے طارق کی خاطر اسلام قبول کیا۔ ثمر عباس کی چور بھی بہتر رہی۔ دونوں ہی کنگلے نکلے۔ قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا..... میں بہت کچھ جاننے کو مل رہا ہے جو کہ پہلے معلوم نہ تھا۔ مسلمانوں کے حوصلے ہی ہمیشہ دشمن کی شکست ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو تو پھر کیا کہنے۔ محمد سجاول خان کی گڑیا بھی اچھی تھی۔ ماں کی محبت اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی اور وہ اسی کی طرح شیزوفرینیا کا شکار ہو گئی۔ ظفر اقبال ظفر کا کیکر..... اس دفعہ سسپنس نے رلانے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ آہ بے چارہ حسن ایک گھوڑے سے بھی کم تر تھا۔ امیری غریبی کا فرق بتاتی تحریر نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی جنگ آمد میں ایک مجرم عدیل عادی نے ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ اپنے باپ کے طاقتور ہونے کو بدمعاشی دھاندلی کا سرٹیفکیٹ سمجھ رکھا ہے پر خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ہمارا معاشرہ ایسے کرداروں سے بھرا پڑا ہے مُردار وں سے حریم اور عروبہ کا لڑنے کا فیصلہ اچھا لگا۔ عمر کا کردار بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔''

❁ سا گر تلوکر، چشمہ بیراج سے لکھ رہے ہیں ''آج پھر من چاہا کہ سسپنس میں حاضری دوں۔ سرورق پر سبز ہلالی پرچم دل میں کھب گیا۔ جون ایلیا کے لفظ ہیں کہ حکمت دوا ش کے موتی۔ ذاکر حسین کی موت کا دکھ ہوا۔ اللہ غریق رحمت فرمائے، آمین۔ تاریخی کہانی اچھی رہی۔ پیشہ ور مختصر مگر پُراثر، ویل ماہ رخ۔ موت سے پہلے، منظر امام ہمیشہ گہری کہانیاں لکھتے ہیں۔ واقعی جب انسان کے پاس آس نہ رہے اور وہ ناامید ہو جائے تو انسان مر جاتا ہے۔ ویسے بھی آس زندگی ہے۔ مایوسی موت اور کفر ہے۔ ٹھنڈی چائے اتنی پیاری گہری اور جھنجوڑتی کہانی۔ اس کہانی کی تعریف کے لیے میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے اس کہانی کا حق ادا ہو سکے۔ وقت دھیمی دھیمی چل رہی ہے۔ اسکل اینڈ بونز حقیقت ہے یا فینٹسی ہے۔ جنگ آمد بہت تلخ کہانی ہے۔ عادی..... عادی مجرم ہے یا نفسیاتی مریض۔ باریال کا کردار غیر ضروری لگا۔ بھائی ہو کر چپ ہے جبکہ یہ مرتو جوش اور انتقام والی ہے۔''

❁ ریاض بٹ، حسن ابدال سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ماہ اکتوبر 2018ء کا شمارہ جب 18 ستمبر کو ہاتھوں میں آیا تو دل کو سکون ملا۔ ورنہ جو تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی، اس نے سکون غارت کر رکھا تھا۔ بہرحال بہترین فیصلہ کرنے پر ادارے کا ممنون ہوں۔ سرورق بھی بہترین ہے۔ ایک وقت تھا جب سرورق پر شعر منتخب کر کے بھیجنے کا سلسلہ ہوا کرتا تھا۔ جون ایلیا کا انتہائیہ قابلِ تعریف ہے۔ ایسی تحریریں کبھی نہیں مرتیں۔ کہنہ مشق فنکار مصور ذاکر حسین ہم سے جدا ہو گئے۔ ہم غم سے نڈھال ہیں۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ سسپنس کے سرورق پر سکرانی کی۔ خدا مرحوم کے درجات بلند کرے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بڑھتے ہیں اپنی منزل کی طرف، وہاں خالد شیخ طاہری کرسی صدارت پر براجمان ہیں۔ بہت خوب جناب۔ تبصرہ جاندار، شاندار اور خوبصورت ہے۔ عامر شہزاد آپ نے بھی خوب تبصرہ لکھا ہے۔ ہر شخص کو اپنے خیالات لکھنے کی پوری آزادی ہے۔ یہی تو اس محفل کی انفرادیت ہے۔ رضوانہ قریشی کے تبصرے بھی خوبصورت ہیں۔ اس بار تاریخ کے اوراق ڈاکٹر ساجد امجد صاحب لے کر آئے ہیں..... اور ہمیں ماضی میں لے گئے۔ جہاں تخت وتاج اور انا کی خاطر قتل وغارت کے بازار گرم رہتے تھے۔ ملنگل..... نے بغاوت کی اور انجام کار اپنے پورے خاندان کے قتل کا باعث بنا۔ ماہ رخ ارباب کی پیشہ ور ایک اچھی تحریر ہے۔ اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے۔ منظر امام ایک کہنہ مشق اور رنگ گو رائٹر ہیں۔ ان کی اس ماہ کی کہانی موت سے پہلے ایک رلا دینے والی کہانی ہے۔ حمید ساری عمر ٹھوکریں کھاتا رہا اور آخر میں موت کو گلے لگا لیا۔ دکھوں سے بھری کہانی ''کیکر'' ظفر اقبال ظفر کی ہے..... اولاد کا دکھ کیا ہوتا ہے، یہ وہی محسوس کر سکتا ہے جس کے گھر کا چراغ بجھ گیا ہو لیکن کہانی میں ایک کنفوژن رہ گئی۔ یہ راز نہیں کھلا کہ نفاحسن کیسے انجام کو پہنچا۔ گڑیا کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ اب بات ہو جائے ملک صفدر حیات کی تفتیشی کہانی چارو ناچار کی۔ یہ سیاست کے گرد گھومتی ایک پُراثر کہانی ثابت ہوئی۔ تجسس اور سسپنس آخر تک قائم رہا۔ پاگل ستا بھی فردوس کی ایک دلگداز کہانی ہے۔''

❁ رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور، ضلع رحیم یار خان سے شاملِ محفل ہیں ''سسپنس میں تبدیلی آ ہی گئی اور وہ بھی ایک دم پورے سو روپے کی قیمت کے ساتھ۔ چلو کوئی گل نہیں۔ جہاں پہلے 30 روپے بقایا بچ جاتے تھے۔ اگلے شمارے کے لیے ہاکر کے پاس، اب حساب بالکل سیدھا ہو گیا۔ ٹائٹل پر اس دفعہ کافی حیرانی ہوئی کیونکہ سبز رنگ کا بیک گراؤنڈ اور پیچھے سبز ہلالی پرچم اور وہ بھی اکتوبر کے مہینے میں؟ ٹائٹل گرل منہ کھولے پتا نہیں کیوں دانت نکال رہی تھی، سمجھ نہیں آئی۔ بہرحال ہرے رنگ کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ ادارے کے پرانے ساتھی اور مصور ذاکر انکل کے انتقال پر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ محفل دوستاں میں اس دفعہ خالد شیخ طاہری کرسی پر جلوہ افروز نظر آئے۔ کافی عمدہ تبصرہ رہا موصوف کا۔ مبارکاں جناب۔ محترم بھائی عبدالجبار رومی انصاری نے دل سے یاد کیا تو ہم آپ کی آواز پر کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی مکافات پڑھی۔ ملنگل بیگ کو ایک جاگیر گیا تھی، وہ اپنی اوقات بھول گیا اور بغاوت کر کے مارا گیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا شاندار اور اچھا رہا لیکن بعد میں آپس کی خانہ جنگی اور امراء کی طوائف الملوکی نے ساری مملکت کا بیڑا غرق کر دیا۔ کافی معلوماتی تحریر تھی۔ ویلڈن۔ تحویر ریاض کی ناقابل

Digitized by Google

یقین واقعی ناقابلِ یقین تحریر تھی۔ کہیں نے صرف تیس سیکنڈ جہنم میں گزارے اور دس ہزار سے بھی زیادہ سیریل کلرز کا سراغ لگایا اور جان نوکس کو بھی قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ پیشہ ور میں سراغ رساں نے سابقہ محبوبہ سے اس کی بے وفائی کا بدلہ بھی لے لیا اور پیسے بھی کما لیے۔ واہ جی کیا کہنے چالاک محبوب کے۔ اچھی تحریر رہی۔ مختار آزاد کی ٹھنڈی چائے مناسب تحریر تھی۔ وہی بچوں کے چھوڑ جانے پر والدین..... نامسٹیلجیا کا شکار۔ وہی دوری کا احساس اور تنہائی کے دن اور آخر میں ٹرین سے گر کر ہلاک۔ کہانی میں ایک چیز بہت اچھی لگی اور وہ چیز ہے آج کل کی نام نہاد سوشلائزیشن اور ٹیکنالوجی کا اندھا دھند اور بے دریغ استعمال۔ قریب بیٹھا شخص ہماری توجہ کا منتظر ہے اور ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں سے ہم رابطے میں ہوتے ہیں۔ رنگِ آسماں میں اب کہانی حقیقت سے دور ہو کر عجیب ماورائی دور میں داخل ہو گئی ہے۔ پہلے کالی کے مندر میں کوئی سفید رسی نما شے ہر مرتبہ شوکی کو یقینی موت سے بچاتی رہی اور پھر اس دفعہ برف زار پر عین موت کے منہ میں جاتے ہوئے شوکی کو بچالیا اور ایک عورت کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ اتحادی افواج نے نمل کر فرنگیوں کو شکستِ فاش دے دی۔ سزائے انتظار میں مسٹر ہارڈنے اپنی کم ظرف اور لالچی اولاد کو بہت عمدہ سزا دی۔ بہت زبردست کہانی۔ موت سے پہلے منظر امام نے اس دفعہ کافی اداس اور بور کر دیا۔ اس دفعہ پتا نہیں منظر امام کس موڈ میں تھے۔ ورنہ ہر دفعہ ان کی کہانی بوریت دور کر دیتی تھی۔ منظر صاحب کو ایسی تحریریں جچتی نہیں۔ ملک صاحب جارونا جارِ جرم پکڑے نظر آئے۔ کافی تفتیش و تحقیق کے بعد بدری کفن چور کو پکڑنے اور اعترافِ جرم کروانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اچھی کاوش رہی۔ پاگل ممتا بس نارمل کہانی رہی۔ وہی بس روایتی ساس بہو کی چپقلش اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانا۔ رائٹر کی سوچ بس ایک زاویے پر گھومتی نظر آئی۔ بہرحال کوشش اچھی رہی۔ سلیم انور کی بریف کیس مختصر مگر بہترین تحریر۔ مجرم ایک لفظ کی وجہ سے اپنے کیے کی سزا پا گیا مگر آفیسر کی کارکردگی بھی بہترین رہی۔ چشم دید مغربی دنیا سے درآمد بہترین، تیز رفتار کہانی رہی۔ ڈان ولیم کارلوس 40 سال بعد آخر سراغ رساں جون کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا۔ میکس کی مصنوعی آنکھ نے حیرت انگیز کام کر دکھایا۔ اینڈریو بھی کافی فارم میں دکھائی دیا۔ نادیہ نور کی احسان مند ایک اور مختصر مگر شاندار مغربی تحریر۔ قاتل نے اپنے محسن ڈاکٹر جانز کو بھی بچالیا اور اس کے لاپتی بھتیجے کو ٹھکانے لگا کر اچھا کام کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات پہلی دفعہ اتنی تفصیل سے شائع ہوئی ہے۔ ادارے سے گزارش ہے کہ اگلے مہینے سسپنس کلاسک میں محی الدین نواب کی تحریر شامل کی جائے۔" (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی پوری ہوگی)

❁ خالد شیخ طاہری، جامشورو سندھ سے محفل کی زینت بنے ہیں" پندرہ ستمبر کو جب دو سو نوے صفحات کا سسپنس ہاتھ میں پکڑا تو ایک خوشگوار سا احساس جسم و جاں میں اتر گیا۔ قلبِ خوشی سے باہر کو سو روپے دیے اور سسپنس کو سینے سے لگائے آفس میں پہنچ گیا۔ بس منظر میں قومی پرچم کی بہاریں دکھلاتا سرورق دیدہ زیب ٹھہرا..... آہ..... ہمارے پیارے ذاکر انکل..... تقریباً پچاس سال ادارے کے لیے خدمات انجام دینے اور ہمارے لیے دل فریب شاہکار سرورق بنانے والے ذاکر حسین جن کے بارے میں ایک جگہ پڑھا تھا کہ مرحوم ایک ماہر آرٹسٹ تو تھے ہی مگر ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے..... ادارے کو اور ہمیں ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔ اللہ پاک ذاکر حسین مرحوم کو جنت میں سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں کی فہرست میں پہنچے تو اتنی ساری کہانیاں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ تبھی فردوس، سجاول خان اور ماہ رخ ارباب سے نام دیکھے بہت خوشی ہوئی کہ ادارہ نئے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ آپ تینوں کو بہت بہت مبارک اور آخری صفحات پر ہر دل عزیز منظر صاحب کو دیکھا تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ منظر صاحب کو پڑھنے کے لیے جلدی جلدی انشائیہ میں بڑا خسارہ پڑھ کر جب اپنی محفل میں پہنچے تو خود کو کرسیِ صدارت پر براجمان دیکھ کر چیخ ہی نکل گئی۔ پھر خود کو سنبھال کر سانسیں درست کیں اور سب ساتھیوں کے تبصرے پڑھے۔ سبھی تبصرے لاجواب رہے۔ میری سسپنس میں پہلی انٹری کو پسند کرنے کا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بالترتیب گڑیا، پاگل ممتا اور پیشہ ور بڑھیں، گڑیا میں سجاول خان نے تحیّر اور حقیقت کے درمیان پھنس جانے والی عین کی ذہنی حالت کو خوب بیان کیا۔ پاگل ممتا اور پیشہ ور اگرچہ پرانے پلاٹ پر لکھی تحریریں تھیں مگر کیا کریں، اب تو تقریباً ہر پلاٹ ہی پرانا ہو چکا ہے۔ اب جو اچھے سے اچھا لکھے گا وہی داد کا مستحق قرار پائے گا۔ تو میری طرف سے بہت ساری داد دونوں لکھاریوں کے لیے، بہت اعلیٰ..... اسی طرح محنت کرتی رہیں۔ بات کریں آخری صفحات کی تو محفل صاحب کا قلم برائیوں کے خلاف چلتا ہوا نظر آیا۔ جب محفل صاحب کا قلم چلتا ہے تو بجنگ آمد جیسی ہی تحریر جنم لیتی ہے۔ اپنے حق و انصاف کے لیے باطل قوتوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے والوں کی جدوجہد کی داستان ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ پہلا حصہ لاجواب رہا۔ اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ اس دفعہ تو دونوں سلسلے زبردست رہے۔ وقت نے اس قسط میں رفتار پکڑ لی ہے۔ کایا اور علی آگے کیا کیا ہنگامہ خیز کارنامے انجام دیتے ہیں یہ تو اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔ رنگِ آسماں کی قسط بھی زبردست رہی۔ زمان اور اریبہ اپنے مشن کی کامیابی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ علی جنگ جتوا کر اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے پر تول رہا ہے۔ شوکی کہاں جا پھنسا ہے؟ راج محل میں گوروں کی مکاری اور اپنوں کی غداری کیا رنگ لاتی ہے؟ یہ سب تو اگلی قسط میں ہی واضح ہو سکے گا۔ مختار آزاد صاحب کی ٹھنڈی چائے میں اپنوں کی بے اعتنائی سے دلبرداشتہ بزرگ کا انجام پڑھ کر دکھ ہوا۔ منظر امام صاحب ہمیشہ کی طرح چھوٹی کہانیوں میں سبقت لے گئے۔ موت سے پہلے میں ایک ناکام عاشق کی موت سے پہلے کامیابی نے افسردہ کیا۔ ترجمہ کہانیوں میں شاکر لطیف سزائے انتظار کے ساتھ سرفہرست رہے۔ تنویر ریاض ناقابلِ یقین میں زبردست رہے۔ سلیم انور متاثر نہ کر سکے البتہ گمشدہ میں شاہ زین رضوان دل جیتنے میں کامیاب رہے۔ نادیہ نور کی احسان مند اچھی کہانی رہی۔ ثمر عباس کی چور میں چوروں نے مزہ دیا۔ طاہر عمیر جو بافی سے ہی ہمارے دلوں میں جگہ بنا چکے ہیں، آسان شکار کے بعد چشم دید بھی ان کی لاجواب تحریر رہی۔ خارزار میں محمد الیاس نے ہمارے معاشرے کے ان تلخ پہلوؤں اور رویّوں سے پردہ اٹھایا جو حقیقت ہیں۔ چار و ناچار ملک صاحب کی ڈائری میں ایک اچھا اضافہ۔ غریب کی مہارت کبھی کبھی ہمیشہ کا روگ بن جاتی ہے، ظفر اقبال ظفر کی کنکر پڑھ کر اندازہ ہوا۔ سسپنس کے پہلے صفحات تاریخ کے حوالے سے ہمیشہ خاص رہے ہیں۔ مکافات میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر عمدہ رہی۔ اس دفعہ محفل شعر و سخن کے انتخاب بہترین رہے۔" (دو سو نوے صفحات دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو گیا..... بس آپ کی ایسی ہی خوشگوار باتیں، تبصرے اور مختلف تجاویز

Digitized by Google

اس پرچے کی رونق کا سبب ہیں۔)

✻ محمد اسلم، لاہور سے خط لکھ رہے ہیں ''آج جب میں بک اسٹال پر میگزین لینے گیا تو سسپنس پر نظر پڑی تو دل خوش ہو گیا کیونکہ سسپنس کا ٹائٹل جگمگا رہا تھا اور وہ ٹائٹل تھا معروف آرٹسٹ ذاکر صاحب کا۔ محترم میں نے تقریباً 23 سال رائل پارک کشمی چوک میں گزارے ہیں۔ چونکہ میں بھی آرٹسٹ اور ڈیزائنر ہوں بلکہ تھا تو ذاکر صاحب سے اکثر ملاقات رہتی تھی اور میں ان کو استاد جی کہتا تھا۔ میری ان سے آخری ملاقات تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے ہوئی۔ وہ رائل پارک چوک میں کھڑے تھے۔ میں نے حسبِ معمول ان کے گھٹنوں کو احتراماً چھوا اور سلام کیا تو بولے۔ ''سنا بھئی کی حال اے.....'' میں نے کہا استاد جی آپ کی دعائیں ہیں۔ ان کی باتیں تو بہت ہیں۔ کیا کیا باتاں لیکن آج جب عامر صاحب نے سسپنس میں ان کے انتقال کے متعلق لکھا تو میں سکتے میں آ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو گیا ہے پھر یقین کرنا پڑا کہ ایک اور شخصیت ہم سے دور چلی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے جب مصور انٹرنیشنل میگزین کے ایوارڈ کا ڈیزائن کیا جس کا سلوگن تھا ''اللہ سب سے بڑا مصور.....'' انہوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اب جبکہ ذاکر صاحب ہم میں نہیں ہیں تو اللہ پاک سے دعا ہے کہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔'' (آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں مگر..... سسپنس کے دیگر سلسلوں پر بھی اپنی رائے دیتے تو خط بھرپور ہوتا)

✻ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے تشریف لائے ہیں ''گول مٹول دمکتے چہرے کی دوشیزہ بہت ہی پیاری لگی اور اس کی من موہنی سی مسکراہٹ نے تو سر ورق کی شان بڑھا دی۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر ختم سے قائم رہو یہی قیمتی متاع ہے ورنہ جہالت اور نفرتوں میں پڑ کر تو بڑا خسارہ ہی ملے گا اس لیے سسپنس پڑھنے والوں سے گزارش ہے۔ جون ایلیا کی گہری باتوں سے لازمی مستفید ہوا کرو۔ وہ اپنی بے باک باتوں میں انسان کو بہت کچھ سمجھا جاتے ہیں۔ انکل ذاکر حسین کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ماضی کے عبرت اثر واقعات سے ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی زبردست رہی۔ جلال الدین نے جس طرح کیقباد کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح خود بھی مکافات کی زد میں آ گیا اور علاؤ الدین کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور سیدی مولا بابا فرید کی نصیحت پر عمل نہ کرنے کی پاداش میں قتل ہو گئے ہاں سیدی مولا کی بددعا نے جلال الدین کے گرد مکافات کا گھیرا تنگ کیا جس سے اس کا بیٹا اور وہ خود ابدی اجل سے ہوئے۔ حسام بٹ کی سلسلے وار وقت نے اس دفعہ پینگوئنز کی سفاکی اور وحشت خوب دکھائی جس میں کایا کو رلانے والے آسکر کا تیا پانچا ہو گیا اور کایا کو بھی سکون مل گیا علی نے بھیس تو ٹھیک سے بدل لیا ہے لیکن سناٹے میں کیوں آ گیا۔ طاہر جاوید مغل کی جنگ آمد بھی اچھی لگی۔ معاشرے کی ایسی بے راہ روی جس میں عادی جیسے عادی مجرم معصوم حریم اور زویا جیسی کلیوں کو مسل جاتے ہیں اور پھر اثر رسوخ کی بنا پر پولیس بھی جہاں پشت پناہ بن جائے تو ایسے ہی انصاف کی دھجیاں بکھرتی ہیں۔ یہاں جوشیلے نوجوان عمر کا کردار پسند آیا جو انصاف کے تقاضے پورے کروانے کی تگ و دو میں حریم اور عروبہ کے ساتھ ساتھ ہے۔ اے آر ارجیوت کی رنگِ آسماں نے بھی خوش کر دیا۔ اریبہ نے خوب چال چلی اور پھر زمان کے ساتھ مل کر دشمنوں کو ٹھکانے بھی لگایا اور ایمونیشن ڈپو بھی تباہ کیا اور سمندر میں موجود ہی ہاک پر بھی پہنچ گئے۔ مختار آزاد کی کہانی ٹھنڈی چائے نے تو افسردہ کر دیا۔ واقعی سچ کہا کہ کس کے بغیر اظہار ادھورا ہے، رابطے کی ٹیکنالوجی جتنی مرضی ترقی کر لے مگر لمس کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔ ملک صفدر حیات کی چاروں ناچار بھی عمدہ رہی۔ اپنی ماں کی بے حرمتی پر چیخنے چلانے والے رانا مظفر اپنے مخالف منور صاحب کے قتل کی منصوبہ بندی کرنے پر دھر لیے گئے۔ کفن چور بدری بھی بلا کا منصوبہ ساز نکلا لیکن جنہوں نے بچنا ہوتا ہے وہاں خدا کی مرضی سے ہر طرح کی منصوبہ بندی بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ منظر امام کی کہانی موت سے پہلے اچھی رہی۔ ماہ رخ ارباب کے مختصر کہانی پیشرو اچھی تھی۔ خود غرض سائرہ اپنے شوہر کو بے وفا ثابت کر کے بلیک میل کرنا چاہتی تھی لیکن سابقہ بوائے فرینڈ کے ہاتھوں خود ہی بلیک میل ہو گئی۔ رئیسوں کا گھوڑا ڈھونڈتے فیملو اپنا منتوں مرادوں سے ملا بیٹا گنوا بیٹھا۔ یوں حسنی کی ماں ٹیکر زوہ ہی رہ گئی۔ بڑے لوگوں میں چھوٹے لوگوں کی زندگی ایسے ہی اجیرن ہوتی ہے۔ ظفر اقبال ظفر کی کہانی کیکر نے اداس کر دیا۔ معاشرے کے منفی پہلو کو انہوں نے بہت اچھے سے بیان کیا۔ جو بیاہی کا ناکشالہ نے جس طرح اپنی ساسوں سے سلوک کیا تھا، وہی اس کے خود ساس بننے پر سامنے آ گیا۔ پتا نہیں لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آج جو کچھ ہم کسی کے ساتھ کر رہے ہیں، وہی کل ہمارے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ تبھی فردوس کی پاگل ممتا بہت اچھی لگی، عمدہ کہانی۔ معصومیت اور ذہانت سے بھرپور کہانی گم شدہ میں شاہ زین رضوان نے اچھا تاثر دیا۔ بلیس نے اپنی دوست صوفی کے لیے بہت کوشش کی کہ اسے چھڑوا لے مگر منشیات کا دھندا کرنے والوں نے صوفی کو مار ہی دیا۔ بلیس کا کردار ذہانت سے بھرپور اچھا لگا۔ مالِ غنیمت کے لالچ میں اسرائیلیوں نے حسیون کے جنگجو لوگوں کو بھی شکست دے دی۔ اب مشکل سے دوسری جنگ کے لیے تیار ہوئے تو بس کے لوگوں کو ان کی حد سے بڑی ہوئی خود اعتمادی نے مروا دیا۔ ویسے بھی اسرائیلی 40 سال کی صحرا نوردی کر چکے تھے سو اب انہیں اللہ کے حکم سے ہر جنگ میں فتح نصیب ہونا تھی لیکن پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم سے بار بار کہنا پڑتا اور لاڈلی قوم حیلے بہانوں سے بمشکل راضی ہوتی۔ خلوط کی محفل سے اپنائیت سے بھرپور خالد شیخ ظاہری کی صدارت عمدہ رہی، مبارکباد۔ عامر شہزاد، ریاض بٹ کی انٹری بھی خوب رہی اور جہاں میرے سخن نے دل خوش کر دیا، تو یہ نوید سن کر میرا دل بھی خوش ہو گیا بہت شکریہ۔ ظفر احمد، محمد ہمایوں خولی، فیصل مشتاق پہلی انٹری دیگر۔ رضوانہ قریشی تو ایک عرصے بعد نظر آئی ہیں۔ کرن عمران، اسلم علی، اسما خان کے شعرا اچھے لگے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

راجا شمشیر، کراچی۔ غلام حسنین، لیہ۔ نورالدین، گوجرانوالہ۔ ریاست علی خان، کوئٹہ۔ ندیم کمال، بھی۔ اسامہ خان، نواب شاہ۔ اشعر علی، ملتان۔ عمران احمد، پنجوٹ۔ نادیہ خان، پشاور۔ نمرا نعیم، کراچی۔ سنبل، حیدر آباد۔ مسکان علی، سکھر۔

Digitized by Google

سسپنس کلاسک

ایک دن سب کو اس عالمِ فانی سے چلے جانا ہے لیکن جانے والوں کے کام ان کی یاد زندہ رکھتے ہیں..... مرحوم مصنفین کی یادگار تحریروں کو خراجِ تحسین۔

مقبول اور ناقابلِ فراموش کہانیوں کا انتخاب

سسپنس کا ایک نیا سلسلہ

آستین کے سانپ

الیاس سیتاپوری

ایک ایسے عہد کا قصّہ جب سازشوں کی ڈوری سے ریشہ دوانیوں کے جال انتہائی اپنایت سے مفاد پرستی کے پھندے ڈال ڈال کر بُنے جاتے اور رخ پر نقاب ڈال کا بازاروں میں وفاداریوں کا مول کیا جاتا تھا... ایسے میں کوئی کسی کی حقیقت سے کیسے واقف ہوتا اور اگر اتفاقاً ہو جاتا تو اسے بھی اپنے مفاد میں حصے دار بنا کر اس کے ہونٹوں پر چُپ کے تالے لگا دیے جاتے مگر ...اموی عہد کے ان کرتا دھرتاؤں میں ایک شاطر ایسا بھی تھا جو انہی کے درمیان رہ کر انہی کی کمزوریوں سے کھیلتا رہا مگر اپنا آپ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حتیٰ کہ اجل نے بھی اس کی جانب قدم بڑھاتے بڑھاتے آخری لمحات میں اپنا رخ پھیر لیا... وہ عجیب انسان قسمت کا اتنا دھنی تھا کہ مشکل وقت میں سانپ کے مانند نکل جانے کے بعد لوگ اس کی لکیر کو پیٹتے رہ گئے مگر اس کا کوئی سراغ نہ پا سکا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اموی شاہی خاندان' مروان بن محمد کو جائز حکمران نہیں سمجھتے تھے۔ سالہاسال پہلے محمد اپنے باپ کے حکم پر مصعب بن زبیر کے سپہ سالار ابراہیم بن الاشتر کے مقابلے پر گیا اور اس کو شکست فاش دے کر اس کے مال واسباب پر قبضہ کرلیا۔ سامان میں ابراہیم کی ایک حسین مگر حاملہ لونڈی بھی شامل تھی۔ یہ لونڈی محمد کو پسند آگئی اور اس نے اس کو اپنے لیے الگ کرلیا۔ کچھ عرصے بعد مروان پیدا ہوا تو محمد نے اسے اپنا بیٹا بنالیا۔ محمد کے اس فعل نے اموی شاہی خاندان کو بہت ناراض کردیا اور ہشام بن عبدالملک کے بیٹوں نے مروان بن محمد کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ یہ مروان کے اندرونی دشمن تھے۔

دوسری طرف بنوعباس تھے' جو بنوامیہ کی بساطِ خلافت الٹ کر اپنی بساطِ سلطنت بچھانا چاہتے تھے۔ ان حالات میں مروان بن محمد کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ پریشان ہوجاتا لیکن مروان بن محمد شجاعت و استقامت' پامردی اور سخت کوشی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہ صاحب تدبیر بھی تھا۔ وہ سب کچھ تھا مگر خوش قسمت نہیں تھا۔ طالع اس کا مخالف اور زمانہ اس کا دشمن تھا۔ مروان نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اندرونی اور بیرونی' دونوں ہی دشمنوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہے گا جب تک کہ یہ دونوں نیست و نابود نہ ہوجائیں لیکن قسمت خود اس کی بیخ کنی کا فیصلہ کرچکی تھی۔

بنوامیہ کے بعض سمجھ دار اور ٹھنڈے دل ودماغ رکھنے والوں نے مروان اور ہشام کے بیٹوں میں صلح صفائی کرادینا چاہی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بنو ہاشم خلافت کے در پر کھڑے دستکیں دے رہے ہیں اور وہ ہمیں دست بہ گریباں پاکر کسی بھی وقت زبردستی اندر داخل ہوجائیں گے' اس لیے اس وقت آپس کے اختلافات ختم کرکے بنو ہاشم کو پچل دو' بعد میں جو جی میں آئے' کرتے رہنا لیکن بنوامیہ کے بڑے اس مشورے کو ماننے پر تیار نہیں تھے۔ اسی دوران مروان نے دمشق کی ہوا اپنے خلاف دیکھ کر موصل کے قریب حران کو اپنا دارالخلافہ بنالیا۔ دمشق والوں کو اس کا بڑا قلق ہوا اور وہ خود کو بے یارومددگار سمجھنے لگے۔ ترک دارالخلافہ نے دمشق والوں کو بھی دو طبقوں میں بانٹ دیا۔ ایک وہ تھے جنہیں مروان کا یہ فیصلہ پسند نہیں تھا اور وہ مروان سے نفرت کرنے لگے تھے' دوسرا طبقہ وہ تھا جو مروان کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتا تھا اور دلائل دے کر اپنے مخالفین کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر بنوامیہ کے امیدوارِ خلافت مروان کے خلاف سازشیں نہ کرتے اور مروان خود کو غیر محفوظ نہ سمجھتا تو دارالخلافہ دمشق کے بجائے حران نہ لے جاتا۔

مروان کے پرچہ نویس اس کو ذرا ذرا سی بات پہنچا رہے تھے۔ اس نے ان دونوں طبقوں میں' کسی ایک سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنے چند معتمدوں کے ساتھ' تاجروں کے بھیس میں دمشق آیا اور اپنے حمایتی طبقے کے سب سے زیادہ بااثر شخص فضل سے ملاقات کی۔ فضل' مروان کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا اور احترام میں کھڑا ہونے لگا لیکن مروان نے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ یہ فضل بھی مروان کی طرح ایک کنیز کے پیٹ سے تھا۔ مروان اس کی ذہانت اور تنظیمی قابلیت کا قائل تھا۔ فضل کو مروان سے اس لیے محبت یا عقیدت تھی کہ دونوں کی اصل ایک تھی۔ وہ مروان کے مخالفین اور دعوئے دارانِ خلاف سے سخت نفرت کرتا تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو بنوامیہ نژاد سمجھ کر اس کی انا کو ٹھیس پہنچاتے تھے۔

مروان نے فضل سے کہا۔ ''فضل! سرِدست میں ایک تاجر ہوں اور کل دمشق سے چلا جاؤں گا۔ کیا ہم دونوں آنے والے کل کے بارے میں چند باتیں کرسکتے ہیں؟''

فضل کے پیچھے زنان خانے کی دیوار تھی اور یہ دیوار لکڑی کی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ تھے شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح۔ فضل نے پیچھے مڑکر دیکھا' کوئی عورت ان سوراخوں میں سے دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ فضل نے معنی خیز انداز میں مروان کو دیکھا اور ذرا تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تاجر! تو کہاں سے آرہا ہے اور تیرے پاس ہمارے مطلب کی کون کون سی چیزیں موجود ہیں؟''

مروان بھی فضل کی کرخت آواز کا مطلب سمجھ گیا اور جواب دیا۔ ''آپ میرے ساتھ میری قیام گاہ پر چلیں اور سارا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ میں زبانی کہاں تک گنواؤں گا۔''

فضل، مروان کے ساتھ اٹھا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے پہلے ہم دونوں کھانا کھالیں، اس کے بعد تیرے ساتھ چلیں۔''

فضل مروان کو دارالضیافت میں لے گیا اور مؤدبانہ عرض کیا۔ ''امیرالمومنین! میں اپنے لہجے کی درشتی کی معافی چاہتا ہوں۔ آج حالات اتنے نازک ہیں کہ اگر دمشق والوں کو یہ پتا چل جائے کہ امیرالمومنین یہاں تشریف رکھتے ہیں تو بنوعباس کے سیاہ پوشوں سے زیادہ اپنے ہی لوگ آپ کی ہلاکت کے درپے ہوجائیں۔''

مروان نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں اس لیے

Digitized by Google

میں جلدی ہی واپس چلا جاؤں گا۔ میں دمشق اس لیے آیا ہوں کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ بیک وقت دو محاذوں پر کروں میدانِ جنگ میں اور دشمنوں کے اپنے گھروں میں۔''

فضل نے کہا۔ ''امیر المومنین وضاحت سے ارشاد فرمائیں۔''

مروان نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں یہاں خطرات کے پیش نظر زیادہ وقت بھی نہیں دے سکتا۔ میری نظر میں تو ایک لائق انسان ہے۔ تو دمشق میں چند ایسے ذہین عربوں کو یکجا کر جو میرے اور تیرے منصوبوں پر نہایت ہوشیاری سے کام کرسکیں۔ میرے ہم قوم عرب نادانی سے یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ بنو عباس اور بنو امیہ کا کوئی جھگڑا ہی نہیں، یہ سارا فتنہ عرب اور عجم کا ہے۔ عجمی خالص عرب اقتدار سے نالاں ہیں' وہ حکومت میں خود بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب بنو ہاشم نے بنو امیہ کے خلاف تحریک چلائی تو عجمیوں نے اس امید میں بنو ہاشم کا ساتھ دینا شروع کیا کہ بصورتِ کامیابی ان کے احسان مند بنو ہاشم عجمیوں کو اپنے اقتدار میں ضرور شریک کرلیں گے۔''

فضل، مروان کے سیاسی تجزیے کا قائل ہوگیا، پوچھا۔ ''امیر المومنین! آپ یہ بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

مروان نے جواب دیا۔ ''فضل! میں چاہتا ہوں کہ تو دمشق میں کنیز زادوں کی ایک فہرست تیار کر اور پھر ایک تنظیم قائم کردے۔ اس تنظیم کے چند ذہین نوجوانوں کو اس قسم کی تربیت دے کہ وہ دمشق، شام اور عراق کے شہروں میں نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے خود کو منظم کریں اور پھر اس مضبوط تنظیم کو میرے عرب مخالفین کے روبرو سپر بنا کر کھڑا کردیں۔ میں نے خراسان، آذربائیجان، ایران اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں نسبی اور نسلی تعصب کو ہوا دی ہے' یہاں تک کہ یہ لوگ آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگیں گے۔ اس طرح میں اندرونی دشمن سے بے نیاز ہوجاؤں گا اور ساری توجہ بنو ہاشم کی بیخ کنی پر دے سکوں گا۔''

فضل نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کروں گا لیکن میری ناقص رائے میں اس نسبی اور نسلی تعصب کا پھیلاؤ زیادہ نہیں ہوگا.....''

مروان نے بات کاٹ دی۔ ''بقیہ کام دوسرے لوگ کررہے ہیں' قبائلی عصبیت بیدار کی جاچکی ہے۔ اب میرے عرب دشمن اپنے اپنے مخالف قبائل سے برسرِ پیکار ہوجائیں گے۔ اس طرح میں ان دونوں کے مقابلے سے محفوظ رہوں گا اور بنو ہاشم پر پوری توجہ دے سکوں گا۔''

فضل نے رک رک کر کہا۔ ''آپ نے میرے ذمے جو کام کیا ہے، اس کو میں پوری ہوشمندی اور دانائی سے روبہ عمل لاؤں گا کیونکہ اصیل اور نژاد لوگوں نے میرے دل پر وہ زخم لگائے ہیں کہ وہ زندگی بھر ہرے رہیں گے۔''

مروان نے مزید ہمت بڑھائی۔ ''زر و مال کی فکر نہ کرنا' یہ تجھے ملتا رہے گا۔''

مروان ایک دن اور ایک رات فضل سے صلاح مشورے کرتا رہا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں فضل کی نسبی عصبیت اتنی زیادہ بیدار اور مشتعل ہوچکی تھی کہ وہ خود اس میں جھلسنے لگا۔ مروان نے غوطہ دمشق میں اسے باغات دے رکھے تھے اور شاہی خزانے سے سالانہ ایک معقول رقم بھی ملتی تھی۔ مروان حران چلا گیا تو فضل دمشق میں اس کے معاملات کی نگرانی کرنے لگا۔ جب مروان نے اسے ایک شاندار محل عطا کیا تو فضل کے حاسدوں کی خواب و خورش حرام ہوگئی اور وہ اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

فضل اپنے محل میں ایک بیوی، دو کنیزوں' ایک لڑکے اور دو جوان لڑکیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ نوکر چاکر ان کے علاوہ تھے۔ لڑکا جوان تھا، اس کا نام عقیل تھا لیکن وہ اپنے نام کے برعکس عقل مند سے زیادہ چالاک اور اوباش تھا۔ دونوں لڑکیاں عروسہ اور صفیہ بھی جوان تھیں لیکن یہ دونوں حسین بھی تھیں اور مہذب بھی۔ عروسہ حاضر جواب اور تیز طرار تھی لیکن صفیہ کم گو اور خاموش طبع۔

فضل دارالضیافت میں مروان کو چھوڑ کر اندر گیا تو ایک کنیز یکتی نے فضل کا خوش اخلاقی سے استقبال کیا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا وہ تاجر چلا گیا؟ وہ کیا کیا لایا ہے؟ میں چاہتی ہوں اس کا سامان میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور پسند کروں۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''وہ تاجر کل تک میرا مہمان ہے۔ میں اس کا سارا سامان یہیں منگوالوں گا پھر تو جو اس میں سے پسند کرے گی، میں تجھے دلوادوں گا۔''

یکتی نے کہا۔ ''ہاں، میں نے دیوار کی جالیوں سے اس تاجر کو دیکھا تھا۔ میں تو غلطی سے یہ سمجھ بیٹھی تھی، گویا امیر المومنین مروان تشریف لے آئے ہیں لیکن اب میں مطمئن ہوں کہ وہ امیر المومنین نہیں، کوئی تاجر ہے۔''

یکتی کی باتوں نے فضل کو بدحواس کردیا لیکن اس نے بظاہر حواس کو قابو میں رکھا۔ فضل نے ہر ایک سے کم سے

Digitized by Google

کم باتیں کیں۔ اس کو حیرت تھی کہ اس کی بیوی، دونوں کنیزیں اور لڑکیاں، امیر المومنین مروان اور تاجر کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں کررہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سارا شوشہ یحشی کا چھوڑا ہوا ہے۔ خیریت یہ گزری کہ اس کا بیٹا عقیل موجود نہیں تھا ورنہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔ فضل کا سکون برباد ہوگیا۔ وہ مروان کو یہ بتانے کے لیے بے چین تھا کہ یحشی نے اسے پہچان لیا ہے اور یحشی کی وجہ سے گھر کا ہر فرد امیر المومنین کی موجودگی سے آگاہ ہوچکا ہے۔

فضل نے بڑے غور و فکر کے بعد یحشی کو اپنے اعتماد میں لے لیا، اسے محل کے باغیچے میں لے گیا اور پوچھا۔ ''یحشی! میں دمشق کا ایک آسودہ حال اور معزز شخص ہوں۔ میرے پاس باغات ہیں، مال و زر ہے، محل ہے، دو کنیزیں ہیں۔ کیا تو بتاسکتی ہے کہ یہ اعزاز اور یہ آسودگی کس کے مرہونِ منت ہے؟''

یحشی نے جواب دیا۔ ''جہاں تک میں جانتی ہوں، یہ سب کچھ امیر المومنین مروان کا عطا کردہ ہے۔''

فضل نے کہا۔ ''درست۔ امیر المومنین کے ہم سب پر بڑے احسان ہیں۔ امیر المومنین کی ذات ایک بلند و بالا اور وسیع و عریض گھنیرے درخت جیسی ہے جس کے سائے میں میرے جیسے معلوم نہیں کتنے خاندان عزت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کررہے ہیں لیکن بنو ہاشم کے سیاہ پوش اب اس سایہ دار اور ثمر بخش درخت کو ڈھا دینا چاہتے ہیں۔ بنو ہاشم نے بخمیوں سے سازش کرلی ہے اور ان کے حملے جاری ہیں۔ امیر المومنین کو ہم سب کی مدد درکار ہے۔ میں تجھ سے مشورتاً پوچھتا ہوں کہ میں کس کا ساتھ دوں؟ بنو ہاشم کا یا بنو امیہ کا؟''

یحشی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین مروان کا۔''

فضل کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ''شکر ہے کہ تو میری ہم خیال ہے۔ اب میں تجھ سے رازداری کا حلف لوں گا۔ وہ تاجر جس کو تو نے امیر المومنین مروان سمجھا تھا، وہ واقعی امیر المومنین مروان ہی ہیں۔ وہ ایک خفیہ منصوبہ لے کر دمشق آئے ہیں اس کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں تو اس خبر کو راز رکھے کیونکہ امیر المومنین کی دمشق میں موجودگی ان کے حق میں خطرناک ہے۔''

یحشی اس انکشاف سے ذرا بھی حیرت زدہ نہ ہوئی بولی۔ ''کیا آپ کے تاجر کہہ دینے سے میں نے یقین کرلیا تھا؟ ہرگز نہیں..... کیونکہ میں امیر المومنین کو پہچانتی ہوں۔ بہرحال آپ چاہتے ہیں تو یہ بات راز ہی میں رہے گی۔''

فضل جانے لگا تو یحشی نے اسے روک لیا۔ ''سنیے آپ نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں لیا لیکن میں.....''

فضل نے پوچھا۔ ''کس قسم کا مشورہ؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟''

یحشی نے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ امیر المومنین مروان کن مسائل اور مشکلات کا شکار ہیں۔ آج بنو امیہ جس گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں، اس کا ایک ہی حل ہے۔ بنو ہاشم فارس اور خراسان کی مدد سے اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ آج ان کے سب سے بڑے معاون و مددگار اہلِ عجم ہیں۔ بنو امیہ کو چاہیے کہ وہ میری قوم کو معاون و مددگار بنالیں۔ آج ترک ہی عربوں کے تاریخ ساز ساتھی ثابت ہوسکتے ہیں۔''

فضل جواب دیے بغیر چلا گیا اور پوری روداد مروان کے گوش گزار دی۔ مروان نے کہا۔ ''اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھ کو یہاں سے فوراً ہی روانہ ہونا چاہیے اور رہا یحشی کا مشورہ تو فضل! عقلمندوں کا قول ہے کہ عورت جو مشورہ دے، اس کے خلاف عمل کرو، اللہ مدد کرے گا۔ افسوس کہ میں ایک عورت کے مشورے پر نہیں چل سکتا۔''

مروان اسی رات واپس چلا گیا۔

فضل نے مروان کے مشورے اور ہدایات کے مطابق کام کرنا شروع کردیا۔ اس نے کنیز زادوں کی فہرست تیار کرنے پر چند نوجوانوں کو لگا دیا اور انہیں ہدایت کردی کہ یہ کام خاموشی اور احتیاط سے کیا جائے۔ انہیں یہ ہدایت بھی کی گئی کہ بنو ہاشم اور بنو عباس کے کنیز زادوں کی فہرست بطور خاص تیار کی جائے۔ انہیں نہایت چالاکی اور دانائی سے نسبی عصبیت پر آمادہ اور مشتعل کیا جائے۔ کنیز زادوں کو ایک مرکز پر لایا جائے اور انہیں ایک پرچم تلے کھڑا کردیا جائے۔ اس اہم کام پر جن نوجوانوں کو لگایا گیا تھا وہ غیر معمولی ذہین اور پرجوش تھے چونکہ وہ خود کنیز زادے تھے اس لیے یہ کام ان کی انا اور عصبیت کے مطابق تھا۔ ان میں کے چند نوجوان بھیس بدل کر بنو ہاشم کے سربرآوردہ لوگوں میں گھل مل گئے۔

☆☆☆

دو ہفتوں کے اندر اندر ہزاروں پر مشتمل ایک فہرست تیار کرلی گئی اور ان ہزاروں کو یہ بات بھی بتادی گئی کہ وقت آگیا ہے جب یہ کنیز زادے بنو ہاشم اور بنو امیہ کے خلاف ایک ساتھ شورش برپا کرکے سیاسی قوت حاصل کرلیں اور بنو امیہ کو مجبور کردیا جائے کہ وہ حکومت کے

کاروبار میں کنیز زادوں کو نمایاں نمائندگی دیں۔ انہیں یہ سبق بھی دیا گیا کہ بنو ہاشم کی جدوجہد اور سعی و کوشش کو ہر ممکنہ طریقے سے نقصان پہنچایا جائے اور ان میں شامل ہو کر ان کے خلاف مخبری کی جائے۔

ان نوجوانوں میں عصامی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ عصامی کا باپ ہاشمی اور ماں ترک تھی۔ اس نے خراسان میں پرورش پائی تھی۔ باپ کی طرف سے اسے عرب ہونے کا غرور ملا تھا اور ماں کی طرف سے بنو ہاشم کے خلاف نفرت اور جھنجلاہٹ..... جس کے ایک فرد نے اس کی ماں کو کنیز بنا لیا تھا۔ وہ جب خراسانیوں سے بات کرتا تو فخریہ ... کہتا کہ وہ حکمران قوم سے تعلق رکھتا ہے اور جب عربوں میں ہوتا تو غمزدہ لہجے میں کہتا۔ ''اے کاش! میری ماں کنیز نہ بنائی گئی ہوتی اور میں آزاد ماں کا بیٹا ہوتا۔''

فضل کے کسی کنیز زادے نے جب اس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا اور کنیز زادوں کی تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی تو وہ اس میں بخوشی شامل ہو گیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ خراسان میں چند ماہ کام کرنے کے بعد وہ فضل کے پاس دمشق چلا آیا۔ فضل اس پُرجوش جذباتی نوجوان کو تھپکیے میں لے گیا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ عصامی کے خیالات بڑے باغیانہ تھے اور بار بار افسوس سے یہی کہتا تھا۔ ''اے کاش! میں کسی آزاد ماں کا بیٹا ہوتا اور میری ماں ایک ہاشمی کی کنیز نہ ہوتی۔''

عصامی نے فضل سے وعدہ کیا کہ وہ ہاشمیوں میں گھس جائے گا اور ان کی بیخ کنی کی ہر تدبیر پر عمل کرے گا۔

عصامی کی بابت یہ بات بخشی کو بھی معلوم ہو گئی کہ بخشی ہی کی طرح عصامی کی ماں بھی ترک تھی۔ اس نے چوری چھپے اس نوجوان کو دیکھا تو اس میں اپنی قوم کی کشش سی محسوس ہوئی۔ عصامی کا چوڑا چکلا سینہ، پُررعب چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں مقناطیسیت پائی جاتی تھی۔ لمبا قد، چوڑی کلائیاں، گداز بازو اور بھاری آواز۔ یہ ساری علامتیں ایسی تھیں جو عورت تو عورت، مرد کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔ اس کی انہی چیزوں نے فضل کو بھی مرعوب و متاثر کیا تھا۔ اس کی گفتگو میں طرزِ استدلال بڑا مستحکم تھا اور وہ عموماً اپنے مقابل کو لاجواب کر دیا کرتا تھا۔ فضل نے پہلی نظر میں ہی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ عصامی کا مستقبل نہایت درخشاں ہے اور شاید وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں، جب عصامی کوئی خاص منصب حاصل کر چکا ہوگا۔ وہ کہیں کا والی بھی بن سکتا تھا۔ ان خیالوں کے ساتھ ہی فضل کو اپنی دونوں لڑکیاں، عروسہ اور صفیہ کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا دونوں میں سے ایک تو عصامی کے لیے بہتر ہی رہے گی۔ شاید عروسہ جو بہت تیز طرار اور حاضر جواب ہے، یا پھر شاید صفیہ جو کم گو اور خاموش طبع ہے۔ وہ عصامی کو اپنے پاس ہی رکھ لینا چاہتا تھا لیکن عصامی کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا۔ اس نے جس مقصد کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا، اس سے اس کے کردار میں حرارت پیدا ہو گئی تھی اور یہی گرمی اور حرارت اس کو سرتاپا سرگرم کار رکھے ہوئے تھی۔ کنیز زادے دمشق، حمیصہ، کوفہ، بصرہ اور حلب میں بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہے تھے۔

دس دن فضل کے ساتھ رہ کر اس نے اتنا اعتماد مزید حاصل کر لیا کہ فضل کے محل میں وہ اجنبی نہیں رہا، اسے خاندان کا ایک فرد سمجھا جانے لگا۔ فضل نے ایک طرف تو عصامی کو محل میں داخل کر کے اس پر اپنایت کا اظہار کیا تھا اور دوسری طرف وہ اس کی حرکات و سکنات کا لومڑی کی طرح مشاہدہ کر رہا تھا۔

عصامی نے ٹھیک چودھویں دن سفر کی تیاری شروع کر دی اور اپنا سامان باندھنے لگا۔ اس وقت فضل محل میں نہیں تھا۔ وہ غوطۂ دمشق کے ایک باغ کی دیکھ بھال کرنے گیا ہوا تھا۔ شہر میلی اور کم گو صفیہ نہایت چوکنا اور محتاط انداز میں عصامی پر نظریں رکھے ہوئے تھی۔ بخشی اور عروسہ بھی یہ سب دیکھ اور سمجھ رہی تھیں لیکن خاموش تھیں اور ان میں سے کسی ایک کی بھی یہ مرضی نہیں تھی کہ عصامی فضل کی عدم موجودگی ہی میں نہیں چلا جائے۔ عصامی نے اپنا سامان باندھ کر ایک کونے میں رکھا اور بطور خاص بخشی کے پاس پہنچا۔ بخشی نے بن کر حمام کا رخ کیا اور کسی پر یہ ظاہر کیا۔ ''میں منہ ہاتھ دھو کر ابھی واپس آتی ہوں۔''

عصامی نے آہستہ سے کہا۔ ''اے میری ماں کی ہم قوم خاتون! میں بنو ہاشم میں جا رہا ہوں۔ فضل سے کہہ دینا کہ میں خود یا میرا کوئی آدمی اس سے بہت جلد ملاقات کرے گا۔''

بخشی حمام کی طرف جاتے جاتے رک گئی، بولی۔ ''عصامی! تو یہاں میری قوم کی بات نہ کر، کیونکہ اس وقت ہم سب عربوں کے زیر نگیں معتدد، معاون اور مددگار ہیں۔ ان حالات میں اپنی قوم کا ذکر کر کے ہم میں اپنے کمتر ہونے کا احساس نہ پیدا کر۔''

عصامی پھیکی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''خاتون! اس میں برتری یا کمتری کا کیا ذکر۔ جب میں نے تجھ کو اے میری

ماں کی ہم قوم خاتون کہا تھا تو اس کا بس ایک ہی مطلب تھا..... وہ یہ کہ میں اپنی قوم سے بڑی محبت کرتا ہوں اور تجھے مخاطب کر کے بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں۔''

یخشی ہاتھ کے اشارے سے عصامی کو ایک ایسے کمرے میں لے گئی جس کی چھت نسبتاً نیچی تھی اور وہ دوسرے کمروں کی نسبت زیادہ ٹھنڈا تھا۔ یخشی کمرے میں بچھی ہوئی ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھ گئی اور پشت کو دیوار سے ٹکا دیا۔ چوکی کے پاس ہی لکڑی کی ایک تپائی رکھی تھی اور اس تپائی پر بہترین کپڑا غلاف کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ یخشی خود چوکی پر بیٹھ کر عصامی کی طرف متوجہ ہوئی، بولی۔

''عصامی! تپائی پر بیٹھ جا' موقع غنیمت ہے۔ سوچتی ہوں، چند باتیں ہی کیوں نہ کر لی جائیں۔''

عصامی گھبرا کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یخشی نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''عصامی! مطمئن رہ' یہ دروازہ اسی طرح کھلا رہے گا۔ میں تو تجھ سے اس لیے مخاطب ہوگئی ہوں کہ فضل کی عدم موجودگی میں تجھ کو جانے سے روک لوں۔''

عصامی گھبرا گیا' بولا۔ ''خاتون! میں فضل کی عدم موجودگی میں جاؤں یا نہ جاؤں تو اس پر تیرا بات کرنا فضول ہے۔ میں جس کام سے جا رہا ہوں، اس کے لیے فضل سے ملاقات یا اجازت ضروری نہیں ہے۔''

یخشی بھی مسکرانے لگی اور اس کی یہ مسکراہٹ صرف ہونٹوں ہی تک محدود نہیں تھی، اس کی آنکھیں، دونوں رخسار اور جسم کا ایک ایک عضو مسکرا رہا تھا۔ وہ سرتاپا مسکراہٹ تھی۔ عصامی کی جگہ کوئی اور نوجوان ہوتا تو شاید کہیں کا بھی نہیں رہتا لیکن عصامی بے بس تھا۔ اس کے احساس اور جذبوں پر مقاصد اور منصوبوں کا قبضہ تھا۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں اور پوچھا۔ ''تو اب میں جا سکتا ہوں؟''

یخشی نے درخواست کی۔ ''عصامی! یوں تو، تو اپنے بقول اپنی مرضی کا مالک ہے لیکن اگر تو ہم سے جانے کی اجازت چاہے گا تو میں بار بار اور ہر بار یہی کہوں گی کہ فضل کو آجانے دے اور اس کی موجودگی میں یہاں سے جا تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''تیری خواہش ہے تو میں فضل کا انتظار کر لوں گا ورنہ اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔''

یخشی نے حیرت سے پوچھا۔ ''عصامی! تو نے تو خراسان میں پرورش پائی ہے، کیا کبھی دو دریاؤں کے اس پار اپنی ماں کے وطن جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ بس ماں سے ان کی قوم کی داستانیں سنتا رہا ہوں۔''

یخشی نے کمرے کے کھلے دروازے سے دور تک دیکھا اور تنہائی کا یقین کر کے آہستہ سے بولی۔ ''عصامی! عرب عورتوں کے مشورے قبول نہیں کرتے۔ ان کا ایمان ہے کہ عورت جو مشورہ دے، ہمیشہ اس کے خلاف کیا جائے یہی مردوں کی دانائی ہے لیکن اگر بنو امیہ عورتوں کے مشوروں پر غور کریں اور ان پر کاربند ہو جائیں تو یہ اپنا زوال پذیر اقتدار برقرار رکھ سکتے ہیں لیکن یہ میری یا کسی بھی عورت کی بات نہیں مانیں گے۔''

عصامی نے اکتا کر کہا۔ ''خاتون! تو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

یخشی نے جواب دیا۔ ''عصامی! میں عربوں کی عصبیت سے نفرت کرتی ہوں۔ ان کی یہی عصبیت ان کی بربادی کا سبب بنی جا رہی ہے۔ تیری ماں ترک تھی اس لیے تجھے میری بات ماننا چاہیے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے جھگڑوں میں نہ پڑ۔ ہمارے لیے دونوں ہی یکساں ہیں اور میری قوم کی عورتوں اور لڑکیوں کو ان دونوں کی کنیزیں ہی بن کر رہنا ہے۔''

عصامی نے یخشی کو بڑے غور سے دیکھا۔ ''خاتون! تیرا مفہوم اب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔''

یخشی اپنی جگہ سے اٹھی اور عصامی کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ تقریباً سرگوشی میں بولی۔ ''عصامی! فضل نے جس اہم کام کی ذمے داری قبول کی ہے، وہ محض مال و زر کی طمع میں، ورنہ میں اقتدار اور اقبال کو بنو امیہ سے ناخوش و ناراض دیکھ رہی ہوں۔ تو اپنی صلاحیتوں کو بنو امیہ کے لیے ضائع نہ کر' تو اپنے لیے کام کر' بنو ہاشم کا دوست یا دشمن بننے کی ضرورت نہیں۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میرا باپ بنو ہاشم میں سے تھا لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ محض اقتدار کی جنگ ہے جس میں قبائلی عصبیت اور عجمیت کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے لیکن کامیابی کے بعد یہ حربے بیکار ہو جائیں گے اور انہیں کند کر دینے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت دشمنوں کے بعد اگر کسی کی تطہیر ہوگی تو یہی اپنے لوگ ہوں گے۔ پھر کیوں نہ میں یہ کوشش کروں کہ اہلِ فارس اور خراسان کے بعد ترکوں کے لیے میدان ہموار کیا جائے۔ میں آئندہ برسرِ اقتدار آنے والے دربار میں ترکوں کو نمایاں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

یخشی، عصامی کے جواب سے بہت خوش ہوئی،

بولی۔ ''اب میں بہت خوش ہوں۔ اگر میں فضل کے محل میں اس کے فراہم کردہ عیش وعشرت کی عادی نہ ہوگئی ہوتی تو میں تیرے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ ہوجاتی۔ ویسے بھی تو میری قوم کی ایک ماں کا فرزند ہے اور تو مجھ کو اچھا لگتا ہے۔''

عصامی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ایک دیوار کی آڑ میں صفیہ کو کھڑے دیکھا جو کسی کی منتظر نظر آرہی تھی۔ اس نے عصامی کو دیکھتے ہی اٹک اٹک کر کہا۔

''پرستارزادے! باوا جان سے ملے بغیر نہ جانا۔''

عصامی نے تلخی سے جواب دیا۔ ''لڑکی! میری طرح تیرا باپ بھی پرستارزادہ ہے، اس لیے پرستارزادہ کہہ کر ہمیں گالی نہ دے اور پھر یہ کہ میرا باپ بنو ہاشم میں سے تھا جو آزاد تھا اس لیے میں پرستارزادہ نہیں ہوں۔''

صفیہ نے معذرت کی۔ ''افسوس کہ میں نے نادانستگی میں ایک ایسا لفظ استعمال کردیا جس سے تجھے تکلیف پہنچی لیکن تجھے تکلیف پہنچانا میری نیت میں نہیں تھا۔''

وہیں کسی طرف سے عروسہ بھی نازل ہوگئی۔ وہ ان دونوں کو مصروفِ گفتگو دیکھ کر مسکرائی۔ ''عصامی! تو ابھی موجود ہے، گیا نہیں؟ یہ شرمیلی تجھ سے کیا کہہ رہی ہے؟ اس سے ہوشیار رہنا کیونکہ یہ شرم اور گھبراہٹ میں ایسی باتیں کرجاتی ہے جو دل میں نہیں ہوتیں اور مخاطب کو دکھ پہنچادیتی ہیں۔''

اب ان کے پاس یخشی بھی پہنچ چکی تھی، وہ دونوں کو عصامی کے پاس دیکھ کر جل گئی لیکن اپنے احساسات کو چھپائے رکھا۔ مسکرا کر تینوں سے کہا۔ ''یہ دیوار کی آڑ میں کھڑے ہوکر باتیں کرنا دوسروں کو شک وشبے میں ڈال دے گا۔ اس لیے تم دونوں کو اگر عصامی سے باتیں ہی کرنا ہیں تو کہیں کسی کمرے میں لے جاؤ اور اطمینان سے باتیں کرو، ورنہ.....''

عصامی، یخشی کی پوری بات سنے بغیر ہی تیزی سے چلا گیا۔ عروسہ اور صفیہ کو یخشی کی مداخلت اچھی نہیں لگی، جبکہ ان دونوں نے یخشی کو تخلیے میں عصامی سے ہم کلام دیکھا تھا اور انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ تخلیے میں دونوں نے کیا باتیں کی تھیں لیکن دونوں کو ایک ہی شبہ تھا، وہ یہ کہ یخشی عصامی کو پسند کرتی ہے جبکہ یخشی ان کے باپ کی نوعمر کنیز ہے اور اس کو عصامی سے عشق لڑانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ عروسہ نے اپنے دل میں یہ قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے باپ کو کسی بھی طرح یخشی کے اس ارادے سے مطلع کردے گی۔ اس کی دوسری حریف اس کی اپنی بہن صفیہ تھی۔ لیکن صفیہ سے وہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

نومبر 2018ء کے
شمارے کی ایک جھلک

اولین صفحات

ایک دلکش، معصوم دلہن..... جو شادی کے دن بنا دولہا کے رہ گئی۔ محبت، عداوت اور دہشت ناک لمحوں سے گزرتی سنسنی خیز کہانی..... امجد رئیس کے قلم کی روانی

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرور کے رنگ

پتلی تماشا دکھانے والوں کا دردناک قصہ

حاصل لاحاصل کی جدوجہد میں گم کرداروں کا استقلال

جنی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

Digitized by Google

ذرا بھی خوف نہیں محسوس کرتی تھی۔ کیونکہ جولڑکی شرماتی ہو اور کھل کر باتیں نہ کرسکتی ہو اس سے ڈرنا کیسا؟

☆☆☆

فضل کے انتظار میں دو دن گزر گئے۔ عصامی کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے محل کے اندر آنا جانا موقوف کردیا۔ محل کے ایک گوشے میں فضل کا ایک اوباش بیٹا عقیل رہتا تھا۔ اس کو شراب اور عورت کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عقیل کو سیاست اور ریاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کو بھی اس سے الگ رکھنا چاہتا تھا لیکن باپ پر اس کا زور نہیں چلتا تھا۔ دو تین ہفتے پہلے اس نے اپنے محل میں عصامی کو دیکھا تو حسد محسوس کیا پھر جب اپنے باپ کو اس پر بے حد مہربان دیکھا تو... شبہے میں پڑ گیا پھر اس نے عصامی کو محل کے اندر آتے جاتے دیکھا تو اس شبے نے قوت پکڑلی اور یقین سا آنے لگا۔

اس نے اپنے باپ سے عصامی کے بارے میں کئی بار استفسار کیا لیکن ادھر سے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا تو عقیل کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ وہ عصامی کو اپنے محل میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی دن پہلے عصامی کو اپنا سامان سمیٹتے اور باندھتے دیکھا تھا جس سے وہ یہ سمجھا تھا کہ عصامی چلا جائے گا لیکن جب وہ اس کے بعد بھی محل میں نظر آتا رہا تو عقیل کو بڑا غصہ آیا اور جھنجلاہٹ عروج کو پہنچ گئی۔

اس کے علاوہ عقیل کی تیز نظروں نے محل میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، وہ اس کے اپنے خیال میں شرمناک تھا۔ اس نے بخشی، عروسہ اور صفیہ کی آنکھوں میں ایسی چمک محسوس کی جو محبت کرنے والی آنکھوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا جب وہ عصامی کو مشتبہ حالت میں پکڑے۔

اس نے بخشی کی آنکھوں میں شوق کی سرمستی محسوس کی اور یہ سوچ کر ذرا غیرت محسوس کی کہ بخشی اس کے باپ کی کنیز ہے اور اس لیے عصامی یا بخشی کو یہ مذموم کھیل نہیں کھیلنے دیا جائے گا۔ اس نے صفیہ کو چوبی روزنوں سے عصامی کو تاکتے جھانکتے دیکھا تھا، اس نے عروسہ کو شوخ و شریر لہجے میں مذاق کرتے دیکھا تو عقیل کا خون کہیں زیادہ کھول گیا۔ اس نے یہ حتمی فیصلہ کیا کہ وہ عصامی سے اس وقت تک کچھ نہ کہے گا جب تک اس کی اصل حیثیت واضح نہ ہوجائے اور اس کی اصل حیثیت کا علم اس کے باپ فضل سے ہی ہوسکے گا۔

عقیل نے دمشق کے باہر سرسبز کھیتوں کو سینچنے والی ایک نہر کے کنارے ایک عالیشان مکان لے رکھا تھا۔ یہ جگہ دمشق کے شمال میں تھی۔ دمشق کے مشرق میں اس کے باپ کے باغات تھے اور فضل اکثر و بیشتر ان باغات کی دیکھ بھال کے لیے چلا جاتا تھا۔ فضل کی خواہش تھی کہ اس کے کاموں میں عقیل بھی اس کا ہاتھ بٹائے لیکن عقیل کی افتادِ طبع ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

عقیل نے پہلی بار عصامی کو محل میں دیکھا تو اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا کہ کہیں عصامی اس کے باپ کی کسی ایسی کنیز کا بیٹا نہ ہو جو دمشق سے کہیں دور رہ رہی ہو لیکن عصامی نے عقیل کو یہ باور کرادیا کہ اس کا فضل سے اس کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں کہ امیر المومنین مروان بن محمد نے فضل کے ذمے چند اہم کام کردیے ہیں اور فضل نے اہم کام کا ایک جزو اس کے سپرد کردیا ہے۔ اس نے عقیل کو یقین دلادیا کہ وہ دمشق میں مستقل سکونت اختیار نہیں کرے گا، وہ آتا جاتا رہے گا اور وہ کسی بھی طرح اس کے خاندان کے لیے نقصان دہ نہیں ثابت ہوگا۔

فضل کے آجانے پر عصامی نے رخصت کی اجازت چاہی، فضل نے کہا۔ ''میں تو یہ سمجھا تھا کہ تو جاچکا ہوگا، لیکن خیر اب جبکہ تو مل ہی گیا ہے تو امیر المومنین کے لیے ایک ذمے داری اور قبول کر اور کوشش کر کہ اس میں کامیابی حاصل ہوجائے کیونکہ اس کامیابی سے بنو امیہ اور امیر المومنین کو وہی فائدہ حاصل ہوجائے گا جو ہم سب کا مطلوب اور مقصود ہے۔''

عصامی نے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا۔ ''وہ کیا؟''

فضل نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلینا چاہا لیکن اسی وقت بخشی آگئی اور اس نے شکایتاً کہا۔ ''فضل! تیرا بیٹا عقیل بدگمانیوں کا شکار ہوچکا ہے اور وہ ہم سب سے ایسی ایسی باتیں منسوب کررہا ہے کہ اگر وہ شہرت پاجائیں تو زندگی کی آب جاتی رہے اور میرے ساتھ ہی تیری دونوں بیٹیاں ذلیل وخوار ہوجائیں۔''

فضل نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''اچھا، اس وقت تو، تو میرا پیچھا چھوڑ دے اور واپس جا..... میں وہیں آتا ہوں، میرا انتظار کر۔''

بخشی نے ضد سے کام لیا، بولی۔ ''میں اکیلی واپس نہیں جاؤں گی کیونکہ عقیل نے مجھ پر ایک ایسا الزام لگایا ہے جو میری تباہی اور بربادی کا سبب بن سکتا ہے۔''

فضل نے غصے میں بخشی کو دھکیل کر دروازہ بند کرلیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''گھر گھر یہی نفاق اور فساد ہیں، اے بنو

Google

امیہ اور خلفائے بنوامیہ! مجھ کو تو اس نفاق اور فساد میں تمہاری بربادیاں اور زوال نظر آرہے ہیں۔" دروازہ بند کرنے کے بعد وہ عصامی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک گوشے میں لے گیا اور سرگوشی میں کہا۔ "عصامی! خوش قسمتی سے تیری رگوں میں ہاشمی خون موجود ہے اور تو اس خون کی وجہ سے اگر چاہے تو بنو ہاشم کا اعتماد حاصل کرسکتا ہے۔ مجھے کل ہی امیر المومنین کی جانب سے ایک اشاراتی پیغام موصول ہوا ہے۔ امیر المومنین نے لکھا ہے..... اگر ہمیں اساس تک رسائی حاصل ہوجائے اور ہم مضرت رساں پودے کی جڑ تک پہنچ جائیں تو نہ صرف یہ کہ ہم اس کی وسعت اور پھیلاؤ کی صحیح حد بندی کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے بلکہ ہم اس جڑ کو برباد کرکے پورے پودے کی مضرت سے نجات حاصل کرلیں گے۔"

فضل اتنا کہہ کر عصامی کی صورت دیکھنے لگا' کچھ تامل کے بعد پوچھا۔ "امیر المومنین کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا؟ اس پیغام میں کیا بات چھپی ہوئی ہے؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "غالباً امیر المومنین اس بنیادی آدمی کو پکڑنا چاہتے ہیں جو بنو ہاشم اور اہل بیت کے نام پر یہ تحریک چلا رہا ہے کیونکہ امیر المومنین یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس شخص کو پکڑ لیا جائے تو اس سے اس تحریک کے اہم ترین افراد تک پہنچا جاسکتا ہے اور ان سب کو برباد کرکے اس تحریک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچلا جاسکتا ہے....."

فرط خوشی سے فضل کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ "بے اختیار بولا۔" بے شک بے شک..... تو ذہین ترین نوجوان ہے۔ تو نے امیر المومنین کے مفہوم کو صحیح صحیح پالیا۔ آج کل یہی ابراہیم بنو ہاشم میں امیدوار خلافت ہیں اور انہی کے لیے بنو امیہ کے خلاف تحریک چل رہی ہے۔ انہیں ان کے پرستار امام ابراہیم کہتے ہیں۔"

عصامی نے کہا۔ "جب یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ امام ابراہیم اس تحریک کے روح رواں ہیں تو امام ابراہیم کی گرفتاری میں دشواری کیسی؟"

فضل نے جواب دیا۔ "امیر المومنین امام ابراہیم کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت چاہتے ہیں۔ جب تک یہ ثبوت نہیں ملے گا امیر المومنین ابراہیم کو گرفتار نہیں کریں گے۔"

اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹا' فضل نے جھنجلا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "بابا جان! میں ہوں عقیل، دروازہ کھولیے۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

ذہانت

سوال: "میں لٹریچر کی طالبہ ہوں۔ تقریباً انیس سال عمر ہے اور مجھے تھامس ہارڈی' ٹرجنیف اور کیٹنگ کی مسحور کن اور دلکش تحریروں سے اس قدر الفت ہے کہ بیان نہیں کرسکتی۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ کہیں یہ حضرات شادی شدہ تو نہیں؟"

جواب: "یہ حضرات شادی شدہ ہی نہیں بلکہ ان کا انتقال بھی ہوچکا ہے۔"

سوال: "اتفاق سے میں کافی بھاری بھرکم ہوں۔ ورزش اور ڈائٹنگ کے علاوہ جنہیں میں غیر فطری حرکتیں سمجھتا ہوں' بہتیرے جتن کیے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ ابھی ابھی کسی نے بتایا ہے کہ بار بار مالش کرانے سے وزن کم ہوجاتا ہے' کیا یہ صحیح ہے؟"

جواب: "بالکل صحیح ہے' اس سے واقعی وزن کم ہوجاتا ہے' مگر مالش کرنے والے کا۔"

سوال: "میرے خیال میں مغربی لباس کا سب سے تکلیف دہ جزو ٹائی ہے۔ یہ قطعاً فضول معلوم ہوتی ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ سب کے سب ٹائی کے شوقین ہیں ایسا کیوں ہے؟ کیا آپ ٹائی کا ایک بھی فائدہ بتاسکتے ہیں؟"

جواب: "ٹائی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے اتارتے وقت بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔"

سوال: "میری شادی کو چھ برس ہوچکے ہیں۔ ویسے سب خیریت ہے لیکن رشتے داروں پر اب تک بحث ہوتی ہے۔ بیوی بار بار یہی گلا کرتی ہے کہ آپ اپنے عزیزوں کو میرے رشتے داروں پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ یہی شکایت مجھے بیوی سے رہتی ہے۔ زیادہ تر فساد ایک دوسرے کی ساس پر ہوتا ہے بتائیے کہ کیا کیا جائے؟"

جواب: "اگر آپ بیگم کو یقین دلادیں کہ اپنی ساس کے مقابلے میں آپ کو ان کی ساس زیادہ عزیز ہے تو پھر انہیں کوئی گلہ نہیں رہے گا۔"

(استفسارات و جوابات..... از شفیق الرحمٰن)

عصامی کا خیال تھا، فضل بیٹے کو جھڑک دے گا لیکن فضل نے خلاف توقع برا سا منہ بنایا پھر مسکرا کر عصامی سے کہا۔ "اب تو دروازہ کھولنا ہی پڑے گا کیونکہ یہ شریر اس وقت تک دروازہ پیٹتا رہے گا جب تک کہ کھلوا نہ لے گا۔ بقیہ باتیں تھوڑی دیر بعد ہوجائیں گی۔"

اس کے بعد فضل نے دروازہ کھول دیا۔ عقیل نے

دروازے کو زوردار دھکا دے کر کھول دیا۔ دروازے کا ایک پٹ فضل کی پیشانی سے ٹکرایا، جس سے خون بہہ نکلا۔ فضل نے زخم پر ہاتھ رکھ دیا اور عصامی سے کہا۔ ''عصامی! کپڑا۔''

عصامی نے سر سے کوفیہ (سر کا کپڑا) اتارا اور فضل کے حوالے کر دیا۔ فضل نے کوفیہ کو کئی پرتوں میں تہ کر کے پیشانی کے زخم پر رکھ دیا۔ فضل کی ہتھیلی اور انگلیاں سرخ ہو رہی تھیں اور خون بہہ بہہ کر کلائی تک پہنچ چکا تھا، عقیل نے باپ کے زخمی ہونے کی کوئی پروا نہ کی۔ الٹا باپ ہی کو خطا کار ٹھہرا دیا۔ بولا۔ ''باوا جان! آپ کو دروازہ کھول کر فوراً ہی ہٹ جانا چاہیے تھا، اس میں غلطی آپ ہی کی ہے۔''

عصامی کا خیال تھا، فضل بیٹے کو معاف نہیں کرے گا لیکن فضل کو اب بھی غصہ نہیں آیا تھا، نہایت نرمی سے عقیل کو حکم دیا۔ ''عقیل! اندر سے خون بند کرنے کی دوا لے آ۔''

عقیل اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد عروسہ، صفیہ اور یخشی کے ساتھ دوا لیے ہوئے واپس آیا۔ یخشی نے زخم کو پانی سے دھویا اور اس پر دوا لگا دی اور کپڑا باندھ دیا، پھر فضل سے پوچھا۔ ''یہ زخم آیا کس طرح؟ ہوا کیا؟''

باپ بیٹے کو یخشی کے سامنے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا، بولا۔ ''عقیل کی دستک پر میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، تیز ہوا کے جھونکے نے ایک شدید جھٹکے سے پٹ کھول دیا اور میں چونکہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا اس لیے زخمی ہو گیا۔''

عصامی فضل کے شاندار جھوٹ پر اش اش کرنے لگا۔ اس نے فضل کے رویے سے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ فضل اپنے بیٹے سے بڑی محبت کرتا ہے۔

فضل نے اپنے چاروں طرف گھر والوں کا ہجوم جو دیکھا تو عصامی سے کہا۔ ''عصامی! افسوس کہ میں تجھ سے پوری بات نہیں کر سکا۔ ان ہنگامی حالات میں تجھ سے درخواست ہی کر سکتا ہوں.....''

عصامی نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آپ مجھ سے درخواست نہ کریں، حکم دیں۔ میں اس کی تعمیل میں دل و جان کی بازی لگا دوں گا۔''

عقیل بیچ میں بول پڑا۔ ''باوا جان! میں آج آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ عصامی کون ہے اور اس کا ہمارے گھر سے کس قسم کا رشتہ ہے؟''

فضل نے ترشی سے جواب دیا۔ ''یہ امیر المومنین کا آدمی ہے۔ اتفاق کی بات یہ جو خدمت انجام دینے نکلا ہے، وہ مہم میرے ذمے کر دی گئی ہے۔''

عقیل نے بڑی گہری نظروں سے باپ کو دیکھا اور سوال کیا۔ ''کہیں آپ غلط بیانی تو نہیں کر رہے ہیں؟''

یخشی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''عقیل! فضل تیرا باپ ہے، ایک ایسا باپ جو اپنی اولاد سے بڑی محبت کرتا ہے۔ تو اس وقت تو اس پر رحم کر، دل میں کلبلاتے ہوئے وسوسوں کے پیدا کردہ سوالات پھر کبھی کر لینا۔''

عروسہ نے بھی یخشی کا ساتھ دیا۔ ''بھائی عقیل کی باتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ باوا جان کو بھائی پر سختی کرنا چاہیے۔''

صفیہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا اور وہ منہ کھول کر رہ گئی۔

عقیل نے بچے کی طرح ضد کی۔ ''نہیں، میں اسی وقت مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔ باوا جان کو میرے ہر سوال کا اسی وقت یہیں جواب دینا ہوگا کیونکہ اگر مجھے میرے سوالوں کے جواب نہ ملے تو میرا سکھ چین غارت ہو جائے گا۔''

عصامی نے فضل سے اجازت طلب کی۔ ''میرا خیال ہے مجھ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے کیونکہ اگر میں کچھ دیر اور یہاں رک گیا تو میرے سر میں درد اٹھ کھڑا ہوگا نیں بہت سی باتیں برداشت نہیں کر سکوں گا۔''

فضل نے بھی عصامی کو نہیں روکا، چلا جانے دیا۔ عقیل اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عروسہ، صفیہ اور یخشی نے احتیاط سے کام لیا اور زخمی باپ ہی کی طرف دیکھتی رہیں۔

فضل نے بڑی شفقت سے کہا۔ ''ہاں تو میرے بیٹے عقیل! ادھر میرے قریب آ جا۔''

عروسہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''باوا جان نے بھائی عقیل کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔''

صفیہ نے کہا۔ ''اچھا، میں تو چلتی ہوں۔''

یخشی نے کہا۔ ''ہاں، تم دونوں جانا چاہو تو چلی جاؤ لیکن میں رکوں گی کیونکہ میں زخمی آقا کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

فضل کمرے کے بیچ میں بچھے ہوئے غالیچے پر بیٹھ گیا اور اپنے پاس ہی عقیل کو بٹھا لیا۔ دوسری طرف یخشی اپنے آپ ہی بیٹھ گئی۔

فضل نے بیٹے کو ایک بار پھر یقین دلایا۔ ''عقیل! عصامی امیر المومنین کا کارندہ ہے۔ اس سے بدگمان نہ ہو، وہ ایک شریف نوجوان ہے۔ اس کا باپ بنو ہاشم میں سے تھا۔''

عقیل نے خفگی سے کہا۔ ''اگر عصامی امیر المومنین کا کارندہ ہے تو وہ ہمارے خاندان میں گھل مل کیوں گیا؟''

فضل نے جواب دیا۔ ''ایک شریف نوجوان کا تیرے گھر میں داخل ہو جانا کوئی اتنی زیادہ بری بات بھی نہیں۔''

Digitized by Google

عقیل نے جھنجلا کر کہا۔ ”عصامی اگر چند دن اور رہ گیا تو وہ تین عورتوں کا شکاری کہلائے گا۔“

فضل نے حیرت سے پوچھا۔ ”تین عورتوں کا شکاری یعنی کیا مطلب؟“

عقیل نے جواب دیا۔ ”بابا جان! صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں لیکن جب آپ کی عدم موجودگی میں، میں گھر میں داخل ہوا تو اس نوجوان کو دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ میں نے اس نوجوان کے لیے عروسہ، صفیہ اور.....“ اس نے بخشی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور ایک خاص پیغام محسوس کیا ہے.....“

بخشی غصے میں کھڑی ہوگئی۔ ”عقیل! زبان سنبھال کر بات کر، اوباشوں کی صحبت نے تجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔“

فضل نے کہا۔ ”بخشی! تو اندر چلی جا۔ پہلے میں عقیل سے بات کرلوں، اس کے بعد تجھے بھی بولنے کا حق دیا جائے گا۔“

بخشی نے برہمی سے کہا۔ ”اتہام اور بدگمانی، گناہ میں شمار ہوتے ہیں۔ عقیل گنہگار ہے، اس کی ہر بات جھوٹ ہے۔“

بخشی بھی چلی گئی۔ فضل نے کہا۔ ”عقیل! دروازے کو اندر سے بند کرلے تاکہ میں اطمینان سے باتیں کرسکوں۔“

عقیل نے فوراً ہی دروازہ بند کردیا اور باپ کے پاس آبیٹھا۔ فضل نے اسے سمجھایا۔ ”بیٹے عقیل! یہ تو، تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تجھے بے حد چاہتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں عروسہ، صفیہ اور اپنی خوبصورت کنیز بخشی کو نہیں چاہتا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تو مجھ سے ایسی باتیں نہ کر جس سے میں آزمائش اور امتحان میں مبتلا ہوجاؤں۔“

عقیل نے کہا۔ ”بابا جان! میں یہ نہیں برداشت کرسکتا کہ عصامی جیسا غیر معروف نوجوان میری جائداد اور اثاثوں کا حصے دار بنے اور جب یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اس کی رگوں میں بنو ہاشم کا خون رواں ہے پھر میں یا آپ یا امیر المومنین اس پر کتنا اعتبار کریں گے۔“

فضل نے جواب دیا۔ ”تیری دولت تیری ہی رہے گی۔ تو کسی قسم کی تشویش نہ کر۔“

عقیل نے فوراً عرض کیا۔ ”بابا جان! اگر یہ بات ہے تو اسے فوراً یہاں سے روانہ کردیجیے۔ ورنہ یہ غلط فہمیاں پیدا کردے گا۔“

فضل نے یقین دلایا۔ ”اگر میں زخمی نہ ہوا ہوتا تو عصامی آج ہی چلا جاتا۔ بہرحال کل تو میں ہر حال میں اسے روانہ کردوں گا۔“

عقیل نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا۔ ”واللہ سچا وعدہ؟“

فضل نے جواب دیا۔ ”سچا وعدہ، واللہ۔“

عقیل نے جوشِ مسرت میں فضل کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اشعار پڑھنے لگا۔ ایسے اشعار جن میں خوش قسمتی پر فخر کیا گیا تھا اور دشمنوں کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

رات کو فضل نے بخشی کو بلایا تو وہ نہیں آئی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے ٹال گئی۔ عروسہ اور صفیہ بھی باپ سے خوش نہیں تھیں۔ عروسہ کی ماں کو جب ان تینوں کا علم ہوا تو اس نے عصامی کو ان کا ذمے دار ٹھہرایا۔ فضل کی دوسری کنیز رمان غیر جانبدار رہنا چاہتی تھی اس لیے اس نے کوئی دلچسپی ہی نہ لی اور شروع سے آخر تک خاموش اور لاتعلق رہی۔

دوسرے دن صبح فضل نے عصامی کو طلب کیا تاکہ بقیہ باتیں بھی گوش گزار کردے اور عصامی کو رخصت کردے لیکن عصامی اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ عصامی نے فضل کے نام ایک خط چھوڑا تھا۔

”میں نے آپ کا اور امیر المومنین کا مقصد سمجھ لیا ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور امیر المومنین کا اقبال ابھی باقی ہے تو میں معترضہ رساں پودے کی جڑ امیر المومنین کے حوالے کردوں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس مہم پر دوسرے لوگ بھی سرگرم سفر ہوں گے اور وہ سب امیر المومنین کی قربت اور سرخروئی کی خاطر درِ مقصود کی حصولیابی میں جان کی بازی لگا دیں گے لیکن کامیابی کسی ایک ہی کو حاصل ہوگی اور وہ ایک شخص میں خود ہوں گا۔

آلِ امیہ اور خلفائے بنو امیہ سے کہیے کہ وہ اگر اپنے دشمنوں پر غالب آنا چاہتے ہیں تو اپنی صفوں میں اتحاد اور

نئے سیاسی محاورے

دکھتی رگ چھیڑنا..... کسی ترمیم پر بات کرنا
رسی دراز ہونا..... ملازمت میں توسیع ہونا
منہ شکر سے بھر جانا..... شوگر فل کا پرمٹ ملنا
لانگ مارچ کرنا..... دل کی بھڑاس نکالنا
بغلیں بجانا..... وزارت کا حلف اٹھانا
منہ پر قفل لگ جانا..... ایوانِ صدر سے کھانا کھانا
خواب پورے ہونا..... پہلی دفعہ الیکشن جیتنا
اوٹ کے منہ میں زیرہ ڈالنا..... تنخواہیں بڑھانا (مزدوروں کی)

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اتفاق قائم رکھیں، اپنی شیرازہ بندی کریں، ورنہ ان کے لیے یہی کہنا پڑے گا کہ ایک ایسی قوم اپنے اقتدار اور انتداب کو طول دینا چاہتی ہے جس کا رعب اور دبدبہ یہاں تک اٹھ چکا ہے کہ اس کی اولاد باپ سے سر پھٹول کر رہی ہے، خاندان انتشار اور افتراق میں مبتلا ہے جس کے سامنے کوئی خاص نصب العین نہیں اور جب رعب، دبدبہ، اتفاق، اتحاد، تحمل، اعلیٰ ظرفی، جود وسخا اور فراخدلی جیسے اوصاف کسی قوم سے منہ موڑ چکے ہوں تو اقتدار اور انتداب کو منہ موڑتے کتنی دیر لگے گی؟''

اس خط نے فضل کو تڑپا دیا۔ خط کے آخری ٹکڑے میں جو اشارہ تھا، فضل کو اس میں اپنے گھر کا عکس نظر آیا۔ اس نے اپنے دل میں اس کا اعتراف کرلیا مگر عقیل سے اسے بے حد محبت تھی، بے اختیار غائبانہ عصامی کو جواب دیا۔ ''عصامی! تو نوجوانی کے جوش میں جو چاہے لکھتا رہ لیکن اگر میری طرح تجھے بھی ایک ہی لڑکا ملے تو ان حالات میں تجھ سے پوچھا جاسکتا ہے کہ بول، تو اپنے بیٹے کی خوشیوں کے لیے کیا کچھ کرسکتا ہے؟ میرا خیال ہے اس وقت تیرے ہر جذبے پر بیٹے کی محبت غالب آجائے گی اور تو بہت کچھ اپنی مرضی اور عقلی فیصلوں کے خلاف کرتا چلا جائے گا۔''

فضل نے عصامی کے اس خط کو بار بار پڑھا اور ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتا رہا۔ اس کیف اور از خود رفتگی میں عقیل بھی پہنچ گیا، باپ کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ کر پوچھا۔ ''باوا جان! یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟''

فضل نے یہ خط بیٹے کی طرف بڑھا دیا' بولا۔ ''اسے پڑھ لے، شاید کوئی فائدہ پہنچ جائے۔''

عقیل تیوریوں پر بل ڈالے، ناک بھوں چڑھائے خط پڑھتا رہا اس پر اس خط نے دوسرا ہی اثر چھوڑا تھا۔ اس نے خط کو پڑھ کر ہوا میں اچھال دیا، مسکرا کر بولا۔ ''باوا جان! یہ نوجوان مجھے تو سر پھرا لگتا ہے، باتیں ایسی لکھتا ہے گویا کوئی بوڑھا عالم بول رہا ہو۔''

فضل نے بے چینی سے لپک کر خط کو اپنے قبضے میں کیا، بولا۔ ''عقیل! عصامی کی باتیں تیری سمجھ میں یوں نہیں آئیں گی کیونکہ میری تشریح بھی تجھے مطمئن نہیں کرسکے گی۔ ہاں وقت اور تجربوں کا مفسر جو کچھ بھی بتائے گا، اسے تو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ خدا ہم پر رحم فرمائے۔''

عصامی کی چپ چاپ روانگی نے بخشی، عروسہ اور صفیہ کو یکساں اداس کردیا۔ انہیں عقیل پر غصہ آرہا تھا اس نے پورے ماحول میں تلخیاں، اداسیاں، کشیدگی، کھنچاؤ اور بیزاریت سی پیدا کردی تھی۔

عصامی نے محل سے نکلنے کے بعد دمشق کے مشرقی (چھتوں والے) بازار کی سیر کی۔ یہاں سے کچھ سامان خریدا، ہتھیاروں پر دھار رکھنے والے کی دکان پر گیا اور خنجر اور تلوار پر دھار کھوائی، یہیں ایک عطار سے چند دوائیں لیں جو موسمی بخار کو اتارنے میں استعمال ہوتی تھیں۔ پھر وہ جامع دمشق میں داخل ہوا، نماز کا وقت نہیں تھا۔ لہٰذا مسجد سنسان تھی۔ یہ محراب تک بڑھتا چلا گیا اور وہاں سجدے میں گر کر گڑگڑایا۔ ''اے میرے رب! مجھے شرمندگی سے بچا اور میری مدد فرما۔''

وہ بڑی دیر تک یوں ہی گڑگڑاتا رہا اور مناجاتیں کرتا رہا۔ وہ دوپہر تک جامع دمشق ہی میں رہا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ فضل اس کی تلاش میں دور دور تک آدمی روانہ کردے گا جو اسے دوبارہ پکڑ کے لے جائیں گے۔ چنانچہ دوپہر تک کا وقت جامع دمشق میں گزار کر جب وہ باہر نکلا تو اس کو اپنے سائے تک سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جامع دمشق سے نکلنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ اس نے سوچا بنو ہاشم اور اہلِ بیت کے داعی عموماً تاجروں کے بھیس میں رہتے ہیں اس لیے تاجر بن کر انہیں پہچاننا دشوار ہوگا۔ تاجر، تاجر سے گھل مل نہیں سکتا اور ان میں پیشہ ورانہ حسد اور چشمک بھی رہتی ہے۔ اس لیے اسے کوئی ایسا روپ اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ تاجروں میں بھی گھس بیٹھ سکے۔ اس نے دمشق کے بازاروں میں کئی جگہ صیقل گروں کی دکانوں پر گاہکوں کا ہجوم دیکھا تھا۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ دکھائی دیے تھے جو اپنے اپنے ہتھیاروں پر سان چڑھانے آتے تھے۔ اس نادر خیال کے آتے ہی اس نے سان خریدی اور سان کشی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایک سان کش کی حیثیت سے ہر کسی سے مل سکتا تھا اور ہر کہیں گھس سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اہلِ بیت کے داعی جب کہیں ملتے تھے تو اشاروں کنایوں میں باتیں کر کے اپنی شناخت کرادیا کرتے تھے اور ان اشاروں میں عموماً قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھی جاتی تھی جس کا مفہوم ان کی جدوجہد، خفیہ تحریک اور مقصد کے مطابق ہوتا تھا۔ اس نے قرآن پاک کی ایسی آیات کی تلاش شروع کردی جنہیں وہ بوقت ضرورت اپنی شناخت کے لیے پڑھ سکتا تھا۔

ان نازک لمحات میں وہ تائید غیبی اور اعانتِ الٰہی کا منتظر تھا۔ جامع دمشق میں دعائیں مانگنے کے بعد جب وہ باہر

Digitized by Google

نکلا تو اسے یاد آیا کہ دمشق کے باہر قریب ہی بیت لہیا نامی ایک گاؤں ہے جس کی عظمت اور بزرگی کا زمانہ قدیم سے بڑا چرچا چلا آرہا ہے۔ دمشق کے مشرقی دروازے سے نکل کر وہ بیت لہیا نامی گاؤں کی طرف چل دیا۔ اس نے کئی بار مڑ مڑ کر دمشق کی طرف دیکھا اور اسے ہر بار یہی محسوس ہوا، گویا دمشق کے مینارے بھی سر اٹھا اٹھا کر یہ حسرت و یاس اسے دیکھ رہے ہیں۔ راہ میں آتے جاتے راہگیروں کے گھوڑے اور گدھے گرد و غبار اڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے۔ شاہراہ کے آس پاس ذرا فاصلے پر سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے۔

کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد اس نے ایک کاشتکار سے پوچھا۔ ”اے فرزندِ زمین! خدا تیرے کھیتوں میں تا ابد یوں ہی فصلیں اگاتا رہے۔ یہ بیت لہیا کہاں اور یہاں سے کتنی دور ہے؟“

کاشتکار نے اس کے لب و لہجے سے پہچان لیا کہ یہ کوئی عجمی عرب نوجوان ہے جس کی عربی زبان میں عجم کا اثر پایا جاتا ہے، اس نے پوچھا۔ ”نوجوان! کیا تو دمشق سے آرہا ہے؟ شاید تو زائر ہے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے شوق میں مارا مارا پھر رہا ہے؟“

”مرحبا اے دوست! تو نے بالکل صحیح پہچانا میں واقعی ایک زائر ہوں۔ میرا باپ ہاشمی تھا اور میں خود خراسان میں پیدا ہوا جب سنِ شعور کو پہنچا تو دل میں شوق پیدا ہوا کہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کروں اور اپنے آبائی شہر مکے کی خاک کو بوسہ دوں۔“

کاشتکار نے قریب پہنچ کر بہ نظرِ ترحم عصامی کو دیکھا اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”تو نے دمشق میں کسی کو پتا تو نہیں دیا تھا کہ تو بنو ہاشم میں سے ہے؟“

عصامی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے جو لوگ اپنا حسب نسب چھپاتے ہیں، وہ خود کو اپنی ہی گالیوں سے آلودہ اور رسوا ہوتا محسوس کرتے ہوں گے۔ میں اپنا حسب نسب کہیں بھی نہیں چھپاتا۔“

کاشتکار نے تقریباً کان میں کہا۔ ”آلِ مروان اور بنو امیہ، بنو ہاشم سے حسد کرتے ہیں، اس لیے میں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر تو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں غائب کر دیا گیا تو تجھے کہاں اور کون تلاش کرتا پھرے گا۔ تیرے اعزا تیرے غم میں رو رو کر اپنا برا حال کرلیں گے اس لیے اپنے ساتھ بنو ہاشم کی رٹ نہ لگا۔“

عصامی نے کاشتکار کے زبردستی مشورے کا شکریہ ادا کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر تھوڑی دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

آخر کار وہ بیت لہیا میں داخل ہوگیا۔ گو کہ حضرت ابراہیمؑ بابل میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ان کا باپ بت بنایا کرتا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں بیت لہیا کے لیے یہ مشہور تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ یہیں بت بنایا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام بیت لہیا (بتوں کا گھر) پڑ گیا۔ یہاں کے جس مکان میں حضرت ابراہیمؑ کا باپ آذر بت بنایا کر رکھا کرتا تھا، اب اس جگہ ایک خوبصورت مسجد کھڑی تھی۔ اس مسجد کی مینا کاری اور نگین سنگِ مرمر کا کام دیکھنے کے لائق ہے۔ عصامی اپنے گھوڑے سے اتر کر اس مسجد میں داخل ہوگیا اور دیر تک سربسجود رہا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کے واسطے سے خدا سے یہ دعا مانگ رہا تھا کہ اس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرما۔

ابھی وہ سجدے سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ کسی شخص نے مسجد کے ایک ستون کے پیچھے سے نمودار ہو کر پوچھا۔ ”نوجوان! تو بہت فکر مند نظر آتا ہے۔ اپنا دکھ درد مجھے بتا..... شاید میں کوئی مدد کرسکوں۔“

عصامی نے چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اس کے سامنے کھڑا ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عصامی نے پوچھا۔ ”بھائی! تو کون ہے اور کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟“

اجنبی نے جواب دیا۔ ”میں تیرے لیے ایک اجنبی ہوں لیکن میں ایک تاجر ہوں اور سامانِ تجارت لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔ اس وقت بھی کوفے کے قصد سے نکلا ہوں، خدا کامیاب کرے۔“

اجنبی کے جواب نے عصامی کو اچانک یاد دلایا کہ بنو ہاشم کے داعی عموماً بے سروسامان ہوتے ہیں اور ان کی منزل مقصود کوفہ ہوتی ہے جہاں اس تحریک کی سب سے زیادہ مضبوط شخصیت قیام پذیر تھی۔ عصامی نے اس شخص کو ٹٹولنے کے لیے سورۃ انفال کا یہ ٹکڑا پڑھ دیا۔ ”اور جن لوگوں نے اسلام کو پناہ دی اور نصرت کی، وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے مغفرت اور اچھا رزق ہے۔“

اجنبی پہلے تو عصامی کی شکل دیکھتا رہا پھر تیزی سے عصامی سے لپٹ گیا، کان میں کہا۔ ”بخدا شبہ تو مجھے بھی تھا..... تو نے اچھا کیا جو اس طرح اشاروں میں اپنا تعارف کرا دیا، تیرا کہاں کا مقصد ہے؟“

Digitized by Google

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں بھی کوفہ جارہا ہوں۔ وہاں امام ابراہیم کے نام ایک پیغام لے کر جارہا ہوں۔''

اجنبی اور زیادہ خوش ہوگیا۔ ''واللہ! تو، تو انتہائی اہم نوجوان نکلا۔ امام ابراہیم کے نام ابومسلم خراسانی کا ایک پیغام لے کر میں بھی آیا ہوں۔ اگر خیریت.....''

عصامی نے بات کاٹ دی۔ ''لیکن میں کوفے سے پہلے موصل جانا چاہتا تھا، خراب کوفے ہی چلا چلوں گا۔''

اجنبی نے پوچھا۔ ''موصل کے قریب ہی حران میں مروان بن محمد مقیم ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں حران سے دور ہی رہنا چاہیے۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''موصل میں بھی بنو ہاشم کے داعی موجود ہیں، میں ایک خاص ضرورت سے ان سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں بڑی دیر تک حالاتِ حاضرہ پر باتیں کرتے رہے پھر یہ دونوں تاجروں کے ایک قافلے میں شامل ہوکر کوفہ روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

اتفاق سے عصامی کو جو شخص مل گیا تھا، اس سے خوش قسمتی کا شگون ملتا تھا۔ کوفے تک پہنچتے پہنچتے دونوں بہت زیادہ گھل مل چکے تھے۔ عصامی سفر بھی کرتا رہا اور قافلے والوں کے ہتھیاروں کو صیقل بھی کرتا رہا۔ اس طرح اس نے کمائی بھی کرلی۔ کوفے سے ذرا پہلے عصامی کئی گھنٹے غائب رہا اور واپس آکر بڑی تشویشناک خبر سنائی۔ اس نے اپنے ساتھی کو بتایا کہ ایک خیمے میں ہتھیاروں کو سان پر چڑھا رہا تھا کہ اس خیمے کے دو آدمیوں کی عجیب وغریب گفتگو سنی۔ میرا خیال ہے ان کا کسی شاہی منصب سے تعلق ہے کیونکہ ان دونوں کی ساری باتیں بنو ہاشم کے لوگوں سے متعلق تھیں۔ ''ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے آدمی بھی مصروف کار ہیں اور وہ بنو ہاشم کے لوگوں کی جستجو میں ادھر ادھر پھیل گئے ہیں۔ انہی کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں کسی طرح یہ معلوم ہوگیا ہے کہ اہلِ بیت کے داعی اس قافلے میں بھی موجود ہیں اور ان کی تلاش جاری ہے۔ ان خطرناک حالات میں ہم دونوں کو ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ ہم دونوں کب، کہاں اور کیوں گرفتار کرلیے جائیں۔ ہمیں ہوشیار رہنے کے ساتھ ساتھ اس کا عہد کرلینا چاہیے کہ خدانخواستہ اگر گرفتار بھی ہوجائیں تو ہماری تحریک کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

اجنبی نے پوچھا۔ ''کس قسم کا خطرہ؟ اور پھر میں کوئی بودا اور ابن الوقت تو نہیں جو حالات اور وقت سے بدل جایا کرتے ہیں۔ میں نے تو یہ عہد کررکھا ہے کہ اہلِ بیت کے لیے میری جان بھی کام آجائے تو میں منہ نہ موڑوں گا۔''

عصامی نے کہا۔ ''میں نے بھی یہی عہد کررکھا ہے۔ کوفہ پہنچ کر ہمیں امام ابراہیم سے فوراً نہیں ملنا چاہیے کیونکہ اس طرح ہم حکومت کی نظروں میں آجائیں گے اور یوں بھی ہماری نگرانی کی جارہی ہوگی۔''

اجنبی بھی فکرمند ہوگیا۔

کوفے پہنچ کر عصامی نے سرائے میں اجنبی کے ساتھ ہی قیام کیا اور اپنے ساتھی کو سرائے میں چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا۔ ''تو میرا انتظار کرے گا اور امام ابراہیم سے اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک میں یہ اطمینان نہ کرلوں کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور ہمیں یا خود امام ابراہیم کو ہماری ملاقات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

عصامی چلا گیا اور گھنٹوں غائب رہا۔ اس کے بعد چھپتا چھپاتا چوروں کی طرح واپس آیا۔ عصامی کی سانس پھول رہی تھی اور پورے جسم میں کپکپی طاری تھی۔ اجنبی تو پہلے ہی سے سہما ہوا تھا، پوچھا۔ ''برادر عزیز! خیریت تو ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''خیریت نہیں ہے، آلِ مروان کے بھیڑیے ہمارے تعاقب میں ہیں اور بڑی مشکل سے واپس آیا ہوں۔''

اجنبی نے کہا۔ ''کیا ہم اس سرائے کو چھوڑ دیں؟''

عصامی نے پوچھا۔ ''اگر سرائے چھوڑ دیں تو پھر ہم جائیں گے کہاں؟ کوئی اور ٹھکانا ہے؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''بنو ہاشم کے کسی پرستار کے گھر۔ میں یہاں کے کئی ایسے گھرانوں سے واقف ہوں جو ہمیں پناہ دے سکتے ہیں۔''

عصامی نے چڑ کر کہا۔ ''تو گویا ہم انہیں بھی خطروں میں ڈال دیں۔''

اجنبی نے کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کرلیا، پوچھا۔ ''اچھا اب تو یہ بتا کہ تجھے سرائے میں داخل ہوتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں نے کوشش تو یہی کی ہے کہ کوئی ہمارے اس ٹھکانے تک نہ پہنچ سکے۔ آگے خدا اور تقدیر جانیں۔''

پھر ایک سکوت طاری ہوگیا۔ دونوں آنکھیں بند کرکے کچھ سوچنے لگے۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ عصامی نے اپنے ساتھی کو ہاتھ کے اشارے

سے خاموشی رہنے کا مشورہ دیا۔

کسی نے پھر دستک دی اور ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھول دو، ورنہ توڑ دیا جائے گا۔''

عصامی نے اندھیرے میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں میں جانے کیا بات کی اور عصامی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک دم تیزی سے چار آدمی اندر داخل ہوئے۔ یہ مسلح تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں درّا اور رسی تھی۔ ایک شخص جو نسبتاً زیادہ کھرا اور بداخلاق نظر آتا تھا، تینوں سے آگے آگیا اور اجنبی سے پوچھا۔

''تو کون ہے؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''میں تاجر ہوں اور اپنے تجارتی سفر پر کوفے آیا ہوں۔''

اس نے ڈپٹ کر پھر سوال کیا۔ ''تو تاجر کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟''

''نہیں۔''

اس شخص نے اجنبی کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ایسا لگا گویا وہ اجنبی کے جواب سے مطمئن ہو گیا ہے۔ اجنبی نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ اب یہ شخص عصامی سے مخاطب ہوا۔ ''اور تو کیا ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں بھی ایک تاجر ہوں اور تاجر کے ساتھ ہی ایک سان کش بھی ہوں، ہتھیاروں کی صیقل کرتا ہوں۔''

اس شخص نے بڑا تیکھا سوال کیا۔ ''کس کے ہتھیاروں کو صیقل کرتا ہے، ان کے جنہوں نے خفیہ طور پر بنو امیہ اور آلِ مروان کے خلاف تیاریاں کر رکھی ہیں؟''

اس شخص نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے تینوں ساتھیوں کو کوئی حکم دیا۔ وہ تیزی سے اجنبی پر جھپٹے اور اس کو آناً فاناً بے بس کر دیا۔ عصامی نے شکایتاً کہا۔ ''صاحبان! یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ ہمارا گناہ؟ ہماری خطا؟ ہم پر کوئی الزام؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''تم پر جو الزام ہے، بہت جلد بتا دیا جائے گا۔''

اجنبی کے بعد عصامی کو بھی بے بس کر کے باندھ دیا گیا۔ اب اس شخص نے دونوں کے سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی اور ذرا دیر بعد اس کے سامان میں سے ابو مسلم خراسانی کا ایک خط برآمد کر لیا۔ ابو مسلم خراسانی اہلِ بیت اور بنو ہاشم کا داعی اعظم تھا اور اس کا امام ابراہیم سے براہِ راست واسطہ رہتا تھا۔

اس شخص نے خط کو زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔

''حمد اس رب کی جس نے عبداللہ کے بیٹے محمد کو نبی آخر اور خاتم النبیین بنا کر ہم گمراہوں میں بھیجا اور سلام ان لوگوں پر جنہیں اہلِ بیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ خراسان میں فصل تیار ہو چکی ہے۔ لاکھوں تلواریں نیام سے نکلنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں نے اہلِ بیت کے جاں نثاروں کو سیاہ وجھیاں باندھنے کا حکم دے دیا ہے اور انہوں نے میرے حکم کی تعمیل میں اپنے اپنے بازوؤں پر سیاہ وجھیاں باندھ لی ہیں۔

اللہ کے برگزیدہ بندے! مجھے عربوں سے شکایت ہے یہ اب بھی ہمارا ساتھ نہیں دے رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عرب اور غیر عرب کے تعصب میں مبتلا ہیں اور میں نے ان کے تیوروں سے ان کے ارادے بھانپ لیے ہیں۔ ان عربوں کی تلواریں جب بھی نیاموں سے نکلیں گی، اہلِ خراسان کے خلاف ہی نکلیں گی۔ میں کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تیری منشا جان لینا چاہتا ہوں۔ اپنے ہم قوموں کی بابت کوئی واضح حکم دیجیے کیونکہ تذبذب سے ہمیشہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔''

خط پڑھ چکنے کے بعد اس شخص نے تاجر سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ اور اس خط میں جس برگزیدہ بندے کا ذکر کیا گیا ہے وہ کون ہے؟''

تاجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب یہ شخص عصامی سے مخاطب ہوا۔ ''کیا تیرے پاس بھی اس قسم کی کوئی چیز ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے کہ اسی طرح میرے سامان کی بھی تلاشی لے لی جائے کیونکہ میرے نہ کہہ دینے سے تو مطمئن نہیں ہو گا۔''

اس شخص نے اپنے آدمیوں کو تلاشی کا حکم دیا اور ایک خط اس کے سامان سے بھی نکال لیا لیکن اس خط کو اس نے زور زور سے نہیں پڑھا، آہستہ آہستہ زیرِ لب پڑھتا رہا۔ اس کے بعد دانت پیستے ہوئے بولا۔

''تم دونوں جھوٹے ہو، دیکھنا میں تمہیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہوں۔''

اس کے بعد ان دونوں کو سرائے سے نکال کر کوفے کے عامل کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے ان دونوں کو مروان بن محمد کے پاس حران روانہ کر دیا۔ عصامی کا خیال تھا کہ اس کے اجنبی ساتھی کو مار ضرور لگے گی لیکن ابھی تک اس کے ساتھ بڑی نرمی کا سلوک کیا گیا تھا۔

اجنبی بہت خوفزدہ تھا۔ اس نے راستے میں عصامی سے پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے، کیا ہم دونوں قتل کر دیے جائیں گے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا لیکن ابھی تک ہمارے ساتھ کوئی نازیبا سلوک تو نہیں کیا گیا۔''

اجنبی رونے لگا۔ ''خراسان میں میرے بیوی بچے ہمیشہ میرے منتظر رہیں گے کیونکہ حران میں اگر مروان نے خاموشی سے مجھے قتل کرا دیا تو میرے بیوی بچوں کو میرے مارے جانے کی خبر تک نہ پہنچے گی۔''

عصامی نے نفرت سے کہا۔ ''اے شخص! مجھے تو تو منافق معلوم ہوتا ہے۔ کل تک تو تُو یہ کہتا تھا کہ اہلِ بیت پر اگر میری جان بھی قربان ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی اور اب تو بیوی بچوں کو یاد کر کے رو رہا ہے۔''

اجنبی نے پوچھا۔ ''میں تو خیر بیوی بچوں کو یاد کر کے رو رہا ہوں تو اپنا حال بتا کیا تجھے کوئی خوف نہیں؟ کیا تجھ کو تیرے بیوی بچے یاد نہیں کریں گے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''دوست! اللہ کے فضل سے نہ میری کوئی بیوی ہے اور نہ بچے۔ سردست تو میں خود بچہ ہوں۔ مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں۔ مارا جاؤں، یا زندہ رہوں۔''

حران کے بازار سے گزرتے ہوئے اجنبی پر غشی طاری ہونے لگی۔ عصامی اور اس کا ساتھی تاجر دونوں ایک ہی گھوڑے پر باندھ کر ڈال دیے گئے تھے۔ طویل سفر نے تاجر کو تھکا دیا تھا اور حران کی سخت گرمی نے تو اس کا حال بد سے بدتر کر دیا تھا۔ وہ بازار سے گزر کر مروان کے محل تک پہنچ گئے۔ عصامی حیران تھا کہ مروان نے دمشق جیسے پُرفضا اور حسین شہر کو چھوڑ کر حران جیسے گرم اور بے رونق شہر کو دارالخلافہ کیوں بنا لیا تھا۔

ان دونوں کو شاہی زندان میں بند کر دیا گیا۔ ان دنوں مروان حران میں موجود تھا۔

یہ دونوں تین دن تک یونہی بند رہے۔ تاجر کا حال بہت برا تھا۔ اس نے تیسرے دن رات کے پچھلے پہر جھپکی لی اور پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور عصامی کو بیدار کر دیا۔ ''عصامی! شاید یہی تیرا نام ہے۔ اس وقت میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا ہے۔ خدا جانے اس کی تعبیر کیا ہوگی۔''

عصامی سوتے سوتے ایک دم جو جاگا تو اس کے سر میں درد ہونے لگا، بیزاری سے بولا۔ ''کیا خواب دیکھ ڈالا میرے دوست؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''میں نے دیکھا مروان آ گیا ہے اور مجھ کو اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مروان نے میرے منہ میں غلاظت بھر دی اور حکم دیا کہ اس کو چھوڑ دیا جائے چنانچہ مجھے چھوڑ دیا گیا اور میری جگہ امام ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔''

عصامی نے طنزاً کہا۔ ''او خدا کے بندے! میں تو تیری بغل میں لیٹا ہوا ہوں۔ تو نے میری بابت تو خواب میں کچھ دیکھا نہیں اور امام ابراہیم کوفے میں بیٹھے ہیں اور تو انہیں خواب میں دیکھ رہا ہے۔''

تاجر نے عصامی کو بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ بولا۔ ''میں حیران ہوں کہ تو ذرا بھی خوفزدہ نہیں، بالکل مطمئن ہے اور تیرے اس اطمینان نے مجھے تیری طرف سے شک و شبہے میں ڈال دیا ہے۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''تو مجھ پر شک و شبہ کیے جا لیکن میں مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا جس طرح تو مر رہا ہے۔ تیری مثال میرے سامنے ہے۔''

چوتھے دن مروان آ گیا اور انہیں فوراً ہی طلب کیا۔ ساٹھ باسٹھ سالہ مروان کی لال لال آنکھوں نے تاجر کو اور زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ سرخی مائل گورا رنگ اور بھاری سر، چوڑے مونڈھے اور بڑی داڑھی، دونوں ہی نے مروان کے قیافے سے اس کی جفاکشی اور معاملہ فہمی کا اندازہ لگا لیا۔

مروان کے پاس ہی اس کا کاتب عبدالحمید بیٹھا تھا۔ اس شخص کی انشا پردازی اور زبان آوری بہت مشہور تھی۔

مروان نے خلاف توقع تاجر سے نرمی برتی اور مشفقانہ انداز میں کہا۔ ''اے شخص! اگر تو شادی شدہ ہے تو خدا تیری بیوی کو بیوگی کا روگ نہ دے اور اگر تیرے بچے بھی ہیں تو خدا انہیں یتیم نہ کرے۔ اب یہ بتا کہ تو کون ہے اور کس کے لیے کام کر رہا ہے؟''

تاجر پریشان ہو گیا کہ کیا جواب دے۔

مروان نے مزید کہا۔ ''جھوٹ اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ تیرے پاس سے خط برآمد کیا جا چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھ کو قتل کرا دوں کیونکہ تیرے قتل کیے جانے سے میرے خلاف سازشیں ختم نہیں ہو جائیں گی۔ میں تو اس شخص کی تلاش میں ہوں جس کے نام یہ خط لکھا گیا ہے اور ان نام نہاد برگزیدہ بندے کی تلاش میں ہوں جو حقیقتاً برگزیدہ کے بجائے طمع گزیدہ ہے جس کو اقتدار کی ہوس نے دیوانہ بنا رکھا ہے اور جو خلافت کو ورثے کے بطور حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

تاجر نے جی کڑا کر جواب دیا۔ ''میں اس برگزیدہ آدمی کا نام نہیں جانتا۔''

مروان نے اپنے کاتب عبدالحمید کی طرف دیکھا اور

کہا۔ ''عبدالحمید! تیری زبان آوری مشہور ہے۔ تو اس عاقبت نااندیش کو سمجھا کہ اس اقتدار کی جنگ میں خود اس کی حیثیت اناج کے اس دانے جیسی ہے جو چکی کے دو پاٹوں میں پس جایا کرتا ہے۔''

عبدالحمید اپنی جگہ سے اٹھا اور تاجر کے پاس جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''نادان شخص! خلاف معمول امیر المومنین تم دونوں کے ساتھ غیر معمولی نرمی برت رہے ہیں، ورنہ اس راز کو اگلوانے کے لیے تیرے اعضا بھی الگ کروا سکتے ہیں۔ تجھے اندھا کروا سکتے ہیں، عام شاہراہ پر کوڑے لگوا سکتے ہیں۔ تجھے بھوکا پیاسا مار سکتے ہیں لیکن وہ تجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس نادر موقع سے فائدہ اٹھا اور امیر المومنین جو کچھ پوچھ رہے ہیں اس کے صحیح صحیح جوابات دے دے۔''

تاجر سوچ میں پڑ گیا۔ مروان نے ایک چوٹ اور لگائی۔ ''میں تیرا خط تجھے واپس کر دوں گا تاکہ تو اسے نام نہاد برگزیدہ شخص کو پہنچا دے جو پس پردہ ڈوری ہلانے میں مشغول ہے۔ میں تجھے دس ہزار درہم بھی دوں گا تاکہ تو خوش وخرم اپنے بیوی اور بچوں میں پہنچ جائے اور امن وچین کی زندگی گزارے۔''

تاجر کے منہ میں پانی بھر آیا، پوچھا۔ ''امیر المومنین! یہ خط مجھے کیوں واپس کریں گے۔''

مروان نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ تو یہ خط اس شخص کو پہنچا دے جس کے نام یہ لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کا جو جواب ملے، وہ میرے پاس لے آ۔''

عبدالحمید نے کہا۔ ''تو تاجر ہے، خدا نے تجھے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ تو اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھائے۔ دس ہزار درہم کے عوض تو امیر المومنین کا ایک معمولی کام انجام دے رہا ہے اور اس سے تو دہرا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دس ہزار درہم نقد اور امیر المومنین سے مستقل رابطہ اور تعلق جو زندگی کے ہر موڑ پر تیرے ممد ومعاون ثابت ہوتے رہیں گے۔''

تاجر کی تاجرانہ رگ پھڑکی اور دل ودماغ میں حرص وطمع نے گھر کرنا شروع کر دیا۔

مروان نے کہا۔ ''اگر تو اس خط کا جواب لے آئے گا تو میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ پر ہمیشہ مہربان رہوں گا اور تیری مدد کرتا رہوں گا۔''

تاجر نے عصامی کی طرف دیکھا، مروان نے کہا۔ ''اپنے ساتھی کی طرف مت دیکھ۔ اگر تو راضی ہو گیا تو میں اسے بھی راضی کر لوں گا۔''

تاجر نے جواب دیا۔ ''میں راضی ہوں اور اس خط کا جواب لا کر امیر المومنین کے حوالے کر دوں گا۔''

مروان نے عصامی سے کہا۔ ''تو اپنے ساتھی سے عبرت پکڑ اور یہی کام تو بھی کر میں انعام واکرام دے کر تجھے بھی مالا مال کر دوں گا۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! میں یہ کام بعد میں کروں گا، پہلے میرا ساتھی اپنا وعدہ پورا کرے۔''

تاجر نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین! میں کچھ تخلیہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

مروان نے اپنے کاتب عبدالحمید سے کہا۔ ''تاجر جو میرے پاس رکے گا تو اس نوجوان کو لے کر ذرا دیر کے لیے ہٹ جا۔''

کاتب عبدالحمید عصامی کو لے کر باہر چلا گیا۔

مروان نے کہا۔ ''اب بتا تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

تاجر نے درخواست کی۔ ''امیر المومنین! جب تک میں واپس نہ آجاؤں، عصامی کو حراست میں رکھا جائے کیونکہ مجھ کو شبہ ہے کہ یہ سارا ابنا بایا کھیل بگاڑ سکتا ہے۔''

مروان نے جواب دیا۔ ''تو مطمئن رہ، میں تیرے ساتھی کو اس وقت تک قید میں رکھوں گا جب تک تو خط کے مذکورہ برگزیدہ کا جواب لے کر واپس نہیں آجائے گا۔''

مروان نے تاجر کو رہا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے آدمی بھی نگرانی کی خاطر لگا دیے۔

دوسرے دن عصامی کو طلب کیا اور اس کی کارکردگی کی بڑی تعریف کی، کہا۔ ''تیرے بارے میں دمشق سے اطلاع آچکی ہے۔ مجھ کو حیرت ہے کہ تو نے اتنا اہم کام اتنی جلدی انجام دے ڈالا۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین کی اقبال بلندی ہے ورنہ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔''

مروان نے پوچھا۔ ''اب تیرے کیا ارادے ہیں؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اب خراسان جاؤں گا اور وہاں بنو ہاشم کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کروں گا اور پرستان اہل بیت میں انتشار اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اور..... اور کیا کرے گا؟ تو پرستارزادوں کی ایک تنظیم بھی تو قائم کرنے والا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! یہ کام بھی ہو رہا ہے اور کئی دوسرے لوگ اس کام میں مشغول ہیں لیکن میں انتہائی غور وفکر کے بعد اس نتیجے میں پر پہنچا ہوں کہ اس کام

کے لیے بڑا وقت درکار ہے جبکہ داعیانِ اہلِ بیت اور جاں نثارانِ بنو ہاشم آپ کے خلاف بہت آگے جا چکے ہیں اور اب امیر المومنین کو جو قدم بھی اٹھانا ہے فوراً ہی اٹھانا ہے ورنہ وقت گزر جائے گا اور اس وقت ہر کوشش لاحاصل ہو جائے گی۔"

مروان فکر مند ہو گیا۔ سوچتا رہا پھر پوچھا۔ "جو تو کہہ رہا ہے یہی بعض دوسرے بھی کہتے ہیں لیکن اس کا علاج کوئی نہیں بتاتا۔ اس کے تدارک کا طریقہ کسی کے بھی ذہن میں نہیں۔"

عصامی نے عاجزی سے عرض کیا۔ "اس کا علاج ہے۔ تدارک کا طریقہ بھی بتا سکتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے اور اس کے نتائج نکلنے میں کافی وقت لگے گا اور موجودہ حالات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ معاملے کو طول دیا جائے اور کسی طویل المیعاد منصوبے پر غور کیا جائے۔"

مروان نے کہا۔ "تو رائے دے دے، کچھ اور مت سوچ۔"

عصامی نے کہا۔ "امیر المومنین! جس طرح اہلِ بیت کے نام پر آپ کے دشمنوں نے عجمیوں کو آگے بڑھایا ہے، آپ کو ان کے مقابلے پر ترکوں کو لے آنا چاہیے۔"

مروان خاموشی سے سوچنے لگا، پھر آہستہ سے کہا۔ "تیری تجویز بہت معقول ہے لیکن اس میں دو قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ بنو امیہ اور عرب یہ بالکل پسند نہیں کریں گے کہ میں ان کی حکومت میں غیر عرب عناصر کو شامل کروں اور دوسری قباحت یہ ہے کہ یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ ہے۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ اس لیے اس مشورے پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔"

عصامی نے عرض کیا۔ "پھر مجھے خراسان جانے دیجیے تاکہ میں وہاں آپ کے لیے کچھ کر سکوں۔"

مروان نے جواب دیا۔ "بہتر ہے تو خراسان چلا جا وہاں کا عامل نصر بن سیار تیرا معاون و مددگار ہوگا۔ میں اس کے نام ایک مختصر خط دے رہا ہوں۔"

اس کے بعد مروان نے اپنے کاتب عبدالحمید سے ایک خط نصر بن سیار کے نام لکھوایا۔

"اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر مروان بن محمد کی طرف سے نصر بن سیار والیِ خراسان کے نام۔ عصامی، بنو امیہ کا ایک ہتھیار ہے اس لیے تو اس کی قدر کر اور اس سے فائدہ اٹھا۔ خراسان کے لوگ خود رو پودوں کی طرح سر اٹھا رہے ہیں۔ ان کے لیے ایک زبردست مالی کی ضرورت ہے جو ان خود رو پودوں کی زیادتی کو تراش دے۔ عصامی خراسان کے بیشتر سرکشوں کی نشاندہی کر سکے گا جس سے تیرا کام آسان ہو جائے گا۔" خط کے آخر میں مروان کی مہر لگا دی گئی۔ نقش خاتم تھا۔

چند دن بعد تاجر جواب لے کر واپس آ گیا۔ یہ خط حمیمہ میں مقیم امام ابراہیم نے ابو مسلم خراسانی کو لکھا تھا۔ اس میں امام ابراہیم نے لکھا تھا۔

"اللہ کے بندے ابراہیم بن محمد کی طرف سے اہلِ بیت کے داعیِ اعظم ابو مسلم خراسانی کے نام۔ میں تجھ سے بہت ناراض ہوں کیونکہ نصر بن سیار اور اس کے حامی سرداروں کو زندہ رکھ چھوڑا ہے۔ خراسانی تلواروں کو عربی بولنے والوں کی گردنوں پر یوں چلا دے جیسے درانتی سے فصلیں کاٹی جاتی ہیں۔ عربوں اور عربی بولنے والوں کو زندہ نہ چھوڑ، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دے اور اس کا ذرا بھی لحاظ نہ کر کہ وہ میرے ہم قوم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بنو امیہ کے معاون و مددگار ہیں اور ہمیں اقتدار سے محروم اور مایوس رکھا ہے۔"

مروان خط پڑھ کر غصے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے حاکم بلقا کے نام فرمان جاری کیا کہ حمیمہ میں موجود امام ابراہیم کو فوراً گرفتار کر کے حران روانہ کر دے۔ چنانچہ حاکم بلقا نے فرمان حاصل کرتے ہی امام ابراہیم کو ایک مسجد سے گرفتار کر لیا۔ ان کی گردن میں چادر ڈال دی گئی اور انہیں کھینچ کر مسجد سے باہر لایا گیا۔ امام ابراہیم کے حامی اور عقیدت مند ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

کچھ عرصے بعد امام ابراہیم رسیوں سے جکڑے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اوندھے منہ ڈال کر حران پہنچا دیے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے رشتے داروں اور عقیدت مندوں کا ہجوم بھی حران میں داخل ہوا۔

مروان نے تاجر اور عصامی کو چھپا دیا اور امام ابراہیم کو اپنے روبرو طلب کر لیا۔ امام ابراہیم مروان کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

مروان نے امام ابراہیم کو غصے سے گھورا، کہا۔ "تو ہی وہ شخص ہے جو خلافت کا دعوے دار ہے؟"

امام ابراہیم نے جواب دیا۔ "تو مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔"

مروان نے کہا۔ "کیا تو اپنے داعیِ اعظم ابو مسلم خراسانی سے خط کتابت نہیں کرتا اور اس کو ہدایات نہیں دیتا رہتا؟"

امام ابراہیم نے جواب دیا۔ "تو جھوٹا ہے۔"

مروان نے بڑے تحمل سے کام لیا۔ "خراسان میں ایک انبوہِ عظیم سر اٹھائے تیرے لیے خلافت کا مطالبہ کرتا پھر

Digitized by Google

رہا ہے، کیا یہ بھی غلط ہے اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ تو نے عرب اور عربی بولنے والوں کے قتل عام کا حکم دے دیا ہے؟"

امام ابراہیم نے مشتعل ہو کر جواب دیا۔ "مجھے ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ خراسان خیمہ سے بہت دور ہے اس لیے خراسان میں کیا ہو رہا ہے، میں نہیں جانتا۔"

مروان نے کہا۔ "تو نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔ حالانکہ تو خود کو اہل بیت کا ایک معزز فرد سمجھتا ہے اور اپنے معتقدین میں امام کہلاتا ہے۔ تیری زبان سے جھوٹ کا نکلنا افسوس ناک بھی ہے اور تعجب انگیز بھی۔"

امام ابراہیم آپے سے باہر ہو گئے۔ مروان کو گالیاں دینے لگے۔ "او خلفۂ ناتحقیق! تو مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔ جبکہ میں بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ خراسان میں جو کچھ ہو رہا ہے مجھ کو اس کا علم نہیں ہے ویسے میں نے تیری نیت کا اندازہ لگا لیا ہے۔ تو مجھے بہر حال نشانہ ستم بنانا چاہتا ہے تو میں تجھے اجازت دیتا ہوں کہ جو تیرے جی میں آئے کر گزر..... کسی بات کا انتظار نہ کر۔"

کاتب عبدالحمید کا خیال تھا کہ گالیوں سے مروان مشتعل ہو جائے گا لیکن وہ بدستور صبر و تحمل سے گالیاں سنتا رہا۔ اس کے بعد امام ابراہیم کا خط ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "غالباً اس کے مکتوب الیہ سے تو واقف ہی ہو گا؟"

امام ابراہیم نے اپنا خط دیکھا تو چکرا گئے۔ ذرا نرمی سے انکار کیا۔ "یہ خط میرا نہیں ہے۔"

مروان نے تالی بجائی اور.... ایک غلام کو حکم دیا۔ "تاجر کو پیش کیا جائے۔"

غلام فوراً ہی چلا گیا اور ذرا دیر بعد تاجر کو لے کر حاضر ہو گیا۔ مروان نے تاجر کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید تو اس کو بھی نہیں جانتا، جو تیرا یہ خط لے کر خراسان جا رہا تھا؟"

تاجر نے امام ابراہیم سے کہا۔ "امام! جھوٹ نہ بولیے، یہ خط آپ ہی کا ہے اور اس کو میں خراسان لیے جا رہا تھا۔"

اب امام ابراہیم کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

مروان نے حکم دیا۔ "ابراہیم کو تاحکمِ ثانی قید خانے میں ڈال دیا جائے۔"

مروان کے آدمی امام ابراہیم کو دربار سے گھسیٹتے ہوئے زندان لے گئے۔ تاجر یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ گو کہ اس نے دس ہزار درہم میں یہ سودا کیا تھا لیکن بعد میں ضمیر نے بڑی ملامت کی۔

کھانسی، پھانسی، خارش، بارش

"ہیلو جی، کیا کہا؟ اے ذرا اونچا بولو..... کہیں معلوم ہے میں اونچا سنتی ہوں۔"

"کہہ تو رہی ہوں اماں جی کو کھانسی ہو گئی ہے۔"

"کیا کہا..... پھانسی ہو گئی ہے..... وہ کیسے؟ خدا خیر کرے۔"

"پھانسی نہیں کھانسی..... اور ساتھ خارش بھی ہو رہی ہے۔"

"کیا کہا..... بارش ہو رہی ہے۔ اے خیال رکھنا، کپڑے نہ بھیگ جائیں۔"

☆☆☆

کاش

"اے کاش میں چڑیا ہوتی۔ تم جہاں جاتے میں وہاں فوراً پہنچ جاتی۔" بیوی نے شوہر سے کہا۔

شوہر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا۔ پھر میں غلیل ہی سے کام چلا لیتا۔"

☆☆☆

عیادت

کسی شخص کو اتفاق سے ایک بڑا سرکاری عہدہ مل گیا۔ اس کے دوست احباب خوش ہو کر اس سے ملنے آئے مگر اس نے کسی کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔

ایک آدمی سے اس نے پوچھا۔ "کس لیے آئے ہو؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "عیادت کے لیے آیا ہوں، سنا ہے آپ اندھے ہو گئے ہو۔"

☆☆☆

نتیجہ

"ساری محفل دیوانہ وار اس کا گانا سن رہی ہے مگر تم ہو کہ مسلسل اسے گھورے جا رہی ہو۔"

"میرے گھورنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اتنا اچھا گا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"گانے والا میرا شوہر ہے۔"

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا

مروان نے عصامی کو انعام بھی دیا اور ایک کنیز بھی عطا کی روشنک۔ یہ ایرانی نژاد لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور رقص و موسیقی میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ علم مجلس میں بھی فرد تھی اور مروان نے اس کی بڑی قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔ عصامی بہت خوش ہوا کہ چلو ایک حسینہ میسر آ گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے کسی کوشش کے بغیر روشنک کی حصولیابی بڑا کمال تھا۔

☆☆☆

تاجر اور عصامی ایک ساتھ خراسان جا رہے تھے۔ تاجر اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ یہ اس نے کیا کر دیا لیکن عصامی اس کو تسلیاں دے رہا تھا کہ اگر یہ نہ کیا جاتا تو دونوں قتل کر دیے جاتے۔ تاجر نے کہا۔ ''عصامی! تو.... بہرحال خوش قسمت ہے کہ انعام میں ایک خربرو کنیز بھی حاصل کر لی۔ مروان نے مجھے کوئی کنیز نہیں دی۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین خوش دونوں ہی سے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کنیز مجھے بخشی۔''

تاجر کچھ سوچنے لگا، پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ ''بہرحال دوست میں دھوکا کھا گیا ہوں۔ اپنی زندگی کا بدترین دھوکا۔ امام ابراہیم قتل کر دیے جائیں گے اور افسوس کہ اس کی کوئی تلافی بھی نہ ہو سکے گی۔''

عصامی کو روشنک اچھی تو ضرور لگی تھی لیکن روشنک کے وجود کے ساتھ ہی اس کو شوخ و شریر عروسہ یاد آئی اور بخشی بھی لیکن صفیہ کا خیال مٹا مٹا، دھندلا دھندلا رہا۔ صفیہ اسے زیادہ متاثر نہیں کر سکی تھی۔

روشنک اس سے اس طرح پیش آئی گویا وہ ایک عرصے سے عصامی کو جانتی ہے۔ وہ عصامی کے ساتھ خوش تھی حالانکہ..... عصامی کا یہ خیال تھا کہ مروان کے محل میں رہنے والی کوئی لڑکی یا عورت خانہ بدوش عصامی کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے۔ اور روشنک کی خوشی کا یہ حال تھا کہ وہ اکثر و بیشتر کھلکھلاتی رہتی تھی۔ عصامی کو پہلی شدت سے یہ محسوس ہوا کہ اس دنیا میں عورت بھی کوئی چیز ہے۔ ابھی تک اس نے عورت کو دور سے دیکھا تھا دمشق میں فضل کے محل میں، جہاں اخلاقی قدریں ہر وقت دیوار کی طرح کھڑی رہتی تھیں۔ جہاں لڑکیاں اور بخشی اس کے قریب آنا چاہتی تھیں مگر وہ خود دور دور رہنے پر مجبور تھا لیکن اب جو مروان نے ایک کنیز عطا کر دی اور اس کو حق ملکیت اور تصرفانہ اختیار کا احساس جو ہوا تو دل و دماغ چکرا گئے۔ وہ اس آبگینے کی شدت اور قوت سے اتنا واقف نہ تھا۔ اب وہ یہ سوچنا چاہتا تھا کہ خراسان پہنچ کر اس کو کس طرح خدمات انجام دینا ہیں تو اس کے دل دماغ پھسل کر روشنک کی طرف چلے جاتے اور یہی جی چاہتا کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی کشمکش تو معلوم نہیں کب سے چلی آ رہی ہے اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے گی۔ یہ سارے کھیل پختہ عمر کے ہیں۔ اس نے اس نوجوانی میں بوڑھوں کی ذمے داری کیوں قبول کر لی۔ اس نے سوچا کیوں نہ روشنک کو لے کر کسی دور دراز علاقے کا رخ کیا جائے اور عہد رنگیں کو دل کے حوالے کر دیا جائے۔ اب وہ خود میں سیاسی اور نسبی امور کے بارے میں پہلے جیسا جوش و خروش نہیں پا رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر قافلہ مجو سفر تھا۔ عورتیں اونٹوں کی محمل میں محو خواب تھیں یا باتوں میں مشغول تھیں۔ روشنک کے لیے بھی اونٹ اور محمل کا انتظام کیا گیا تھا۔ عصامی اور تاجر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار روشنک کے اونٹ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ تیز ہوائیں محملوں کے پردے اٹھا دیتیں اور تشنگان قافلہ بڑے ذوق و شوق سے مہوشان محمل کی ایک جھلک دیکھنے کی تمنا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیوانہ وار آگے بڑھتے اور رات کی سیاہی کو برا بھلا کہتے ہوئے اپنی ناکامی پر صبر کر لیتے۔ ان تشنگان قافلہ میں تاجر بھی شامل تھا جو روشنک کی ایک جھلک دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ گھوڑوں کی بے ہنگم اور بے ترتیب ٹاپوں کی آوازیں قرب و جوار کی بستیوں کو یہ بتاتی جا رہی تھیں کہ کہیں، آس پاس کوئی قافلہ رواں دواں ہے۔ قافلے کا یہ دستور تھا کہ رات کے پچھلے پہر سفر شروع کر دیا جاتا اور طلوع آفتاب سے ذرا پہلے پڑاؤ ڈال دیا جاتا پھر ظہر کے بعد سفر دوبارہ شروع کر دیا جاتا اور عشا تک جاری رہتا۔ یہ قافلہ رے سے گزر کر نیشاپور پہنچا تو صبح ہو رہی تھی۔ اب خراسان بہت قریب تھا، اہل قافلہ نے فیصلہ کیا کہ نیشاپور میں چار دن قیام کیا جائے۔ قافلے میں جن کے ساتھ عورتیں تھیں، وہ خلوت کے مزے لوٹنے لگے اور جو تنہا تھے وہ نیشاپور کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے لگے۔ قافلے میں وہ لوگ بھی تھے جو مسلسل تاک جھانک میں مشغول تھے۔

عصامی اور تاجر کا خیمہ ایک ہی تھا لیکن وہ اس طرح کھڑا کیا گیا تھا کہ اس کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک حصے میں تنہا تاجر تھا اور دوسرے میں عصامی اور روشنک تھے۔ لیکن تاجر کو یہ حد بندی پسند نہیں تھی۔

روشنک کو یہ جو معلوم ہوا کہ قافلہ نیشاپور میں چار دن

Digitized by Google

قیام کرے گا تو اس نے خوب اچھی طرح غسل کیا۔ بہترین قیمتی لباس پہنا اور ضروری سنگار سے فارغ ہو کر عصامی کے روبرو بیٹھ گئی۔ عصامی نے محسوس کیا کہ روشنک حسین تو ہے ہی لیکن سنگار اور آرائش نے اس کے حسن میں.... چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس نے روشنک کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اور حیرت اور اشتیاق کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔ ''روشنک! کیا یہ تو ہے یا کوئی اور؟''

روشنک نے بادام نما بڑی بڑی آنکھوں سے عصامی کو دیکھا۔ اس کی لمبی لمبی پلکوں نے حسین آنکھوں کے گرد پہرا سا بٹھا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

عصامی کی نظریں ٹھوڑی سے پھسل کر شباب کے کوہسار تک چلی گئیں اور وہ سرتاپا نشہ و کیف میں غرق ہو گیا، سارے جسم میں چمک اور کسک ہونے لگی۔ عصامی نے اپنے پورے وجود میں کشش اتصال اور پیوستگی محسوس کی۔ روشنک اس کی بے چینی اور وارفتگی کو کن انکھیوں سے دیکھتی اور محسوس کرتی رہی۔

روشنک نے مسکرا کر پوچھا۔ ''عصامی! تو کہاں چلا گیا؟''

عصامی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ ''روشنک! میں امیر المومنین کی بدمذاقی پر حیران ہوں کہ انہوں نے تجھ جیسا مہ پارہ میرے حوالے کر دیا۔ بخدا یہ تو کفرانِ نعمت ہے جس کا خمیازہ مردان کو بھگتنا پڑے گا۔''

روشنک نے کہا۔ ''امیر المومنین کے حرم میں معلوم نہیں کتنے مہ پارے موجود ہیں جس کو تو غلطی سے کفرانِ نعمت سمجھ رہا ہے۔ وہ امیر المومنین کی عطا بخشش اور جود و سخا ہے۔''

عصامی نے روشنک کی سیاہ زلفیں مٹھی میں لے لیں۔ روشنک نے ناز و انداز سے زلفیں چھڑانے کی کوشش کی، بولی۔ ''میری لٹیں تو چھوڑ دے، کیا لٹوں کا پکڑنا اور سونگھنا بھی فطری تقاضوں میں شامل ہے؟''

عصامی نے بے اختیار جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بھی فطری تقاضوں میں شامل ہے۔ کسی بھوکے کی ناک میں جب مزے دار کھانوں کی خوشبو تھلکہ مچا دیتی ہے تو کیا اس خوشبو اور اس سے پیدا ہونے والے جھلکے کو غیر فطری کہا جائے گا؟ شاید نہیں، بلکہ قطعی نہیں۔''

روشنک نے عاجز آ کر کہا۔ ''میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ کیا ہمارے پاس کوئی اور موضوع نہیں ہے باتوں کے لیے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''ہے کیوں نہیں۔ میں ان شاعروں کی بات کر سکتا ہوں جو اپنے محبوب کے حسن میں گم ہو جاتے ہیں اور میں ان مصوروں کی بات کر سکتا ہوں جو اپنے موئے قلم اور رنگوں کے امتزاج سے اپنے محبوب کی شبیہہ میں اپنے احساس اور جذبوں کو مصور کر دیتے ہیں۔ میں ان عاشقوں کی بات کر سکتا ہوں جو اپنا سب کچھ محبوب کی ادا پر قربان کر دیتے ہیں۔''

روشنک کھلکھلا کر ہنس دی، بولی۔ ''عصامی! تیری بابت امیر المومنین نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تو ایک باتدبیر نوجوان ہے، ایک باشعور اور سیاسی نوجوان، متوازن اور متحمل نوجوان لیکن میں تجھ کو امیر المومنین کے ارشاد کے برعکس پا رہی ہوں..... آخر کیوں؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں نے شعراء کرام کو اچھی طرح پڑھا ہے، انہوں نے جگہ جگہ قامتِ یار فتنے سے تشبیہ دی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آخر قامتِ یار اور فتنے میں کونسی قدر مشترک ہے۔ آج جب میں تیرے پاس بیٹھا ہوں اور تیرے سراپا کو دیکھتا ہوں تو پھر دل سے فتنہ قامت یار کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔''

روشنک نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تاجر بھی اندر داخل ہو گیا۔ عصامی نے گھبرا کر بالوں کی لٹیں چھوڑ دیں، روشنک ایک گوشے کی طرف بھاگی۔ عصامی نے بڑی بے مروتی سے پوچھا۔ ''دوست! یہ کہاں کی شرافت ہے کہ تو میری مرضی اور اجازت کے بغیر میرے خیمے میں گھس آیا۔ حالانکہ میں نے اپنا حصہ الگ کر رکھا ہے اور میرے ساتھ روشنک بھی رہ رہی ہے۔''

تاجر ہنسنے لگا، بولا۔ ''عصامی! تو نے مجھے اپنا بھائی بنایا ہے، پھر بھائی سے پردہ کیسا؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھے بھائی بنایا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو بھائی کے ناتے میری خلوت میں گھسا چلا آئے۔ اسی وقت چلا جا میرے خیمے سے، ورنہ میں دوسری طرح نکال باہر کروں گا۔''

تاجر نے نرمی سے کہا۔ ''عصامی! میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ مردان نے مجھے صرف دس ہزار درہم دے کر ٹرخا دیا جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو نے بظاہر کوئی اہم خدمت نہیں انجام دی مگر تجھ کو نقد رقم بھی ملی اور ایک حسین کنیز بھی عطا ہوئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟''

عصامی ڈر گیا، بولا۔ ''تیری اطلاعات غلط ہیں۔ ہم دونوں کو جو کچھ ملا ہے، اس کا حساب کتاب تو ہی کر سکتا ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اگر تو نے امیر المومنین کو یہ نہ بتا دیا ہوتا کہ تو

بیوی بچوں والا ہے تو شاید تجھ کو بھی ایک کنیز مل جاتی۔"

روشنک نے دور ہی سے کہا۔ "یہ کیسا غیر مہذب شخص ہے، اسے باہر لے جا۔"

عصامی نے تاجر کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جانا چاہا مگر تاجر نے اصرار کیا۔ "میں تو یہیں بیٹھوں گا۔ روشنک میرے خیمے میں چلی جائے۔"

عصامی تاجر کی اکڑ سے خوفزدہ تھا، خراسان قریب تھا اور عصامی کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ تاجر اکڑ کیوں رہا ہے۔ چنانچہ اس نے روشنک سے کہا۔ "روشنک! تو اس کے خیمے میں چلی جا میں اس سے چند باتیں کر لوں۔ بھائی کہا ہے تو خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔"

روشنک نے پلٹ کر دونوں کو دیکھا۔ تاجر نے اس چودھویں کے چاند کو پہلی بار غور سے اور قریب سے دیکھا تھا۔ روشنک دوسری طرف چلی گئی لیکن تاجر دل مسوس کر رہ گیا، بولا "قیامت۔"

عصامی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

تاجر نے کہا۔ "عصامی! کیا اجازت ہے کہ میں کھل کر باتیں کر لوں؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "اجازت ہے لیکن میرے جذبات اور احساسات کا خیال کر کے بات کرنا۔"

تاجر نے رک رک کر کہا۔ "جیسا کہ تو جانتا ہے کہ میں ایک تاجر ہوں اور مال و زر کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ میں دس ہزار درہم میں کس طرح بک گیا۔ میں اتنا ارزاں تو نہیں تھا۔"

عصامی خاموش رہا۔ تاجر نے جھنجلا کر کہا۔ "کچھ ہوں ہاں تو کر، کیا دم سادھ کر بیٹھ گیا!"

عصامی نے جواب دیا۔ "میں تجھ سے واقف نہیں ہوں، تو جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ جب میں یہ جانتا ہی نہیں تو ہوں ہاں کس طرح کروں۔"

تاجر نے کہا۔ "پھر بھی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تو اس پر یقین کرتا چلا جا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کسی کو اپنی باتوں کا یقین کس طرح دلاؤں۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "جب تو یقین دلائے گا تو میں یقین کر لوں گا۔ آگے بڑھ، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

تاجر نے کہا۔ "عصامی! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ روشنک کو میرے حوالے کر دے اور اس کے عوض جتنی رقم لینا چاہے، بتا دے میں فراہم کر دوں گا۔"

عصامی ہنسا۔ "کہیں تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟ اگر میں کسی بھی طرح روشنک کو تیرے حوالے کر دوں تو تو جانتا ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟"

تاجر نے پوچھا۔ "کیا انجام ہوگا؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "روشنک امیر المومنین کا حلیہ ہے اور اگر میں اس حلیے کو بیچ دوں یا یوں ہی تیرے حوالے کر دوں تو ہم دونوں مورد عتاب امیر المومنین قرار پائیں گے۔"

تاجر نے کہا۔ "میں امیر المومنین کے عتاب سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں اس کے اقتدار کو چند روزہ سمجھتا ہوں اور یہ کہ خراسان میں اس کا زور نہیں چلتا۔"

عصامی نے کہا۔ "اچھا اگر امیر المومنین کا اقتدار چند روزہ ہے اور ان سے ڈرتا بھی نہیں تو پھر امام ابراہیم کو گرفتار کیوں کرا دیا؟"

تاجر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ ساری فضول باتیں ہیں۔ میں نے تجھ سے جو مطالبہ کیا ہے اس کے لیے تیرا قطعی کیا جواب ہے؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "اس فضول مطالبے کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ اب میں تیرے ساتھ بھی نہیں رہوں گا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی بھی نہیں کہیں گے۔"

تاجر نے کہا۔ "اچھا اب میں جاؤں گا۔ میرے مطالبے پر اچھی طرح غور کر لے، مجھے جلدی نہیں ہے۔"

تاجر چلا گیا، عصامی نے روشنک کو واپس اپنے خیمے میں بلا لیا۔ عصامی نے روشنک کو تاجر کے مطالبے سے آگاہ کر دیا۔

روشنک ہنس دی۔ "اس کا دماغ تو صحیح ہے؟ مجھے تو یہ دیوانہ لگتا ہے۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تاجر کی پشت بہت مضبوط ہے، اس پر اکڑ رہا ہے لیکن وہ ابھی مجھ سے واقف نہیں ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس کے وجود کو ہمیشہ کے لیے غائب کرا دوں لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔"

ظہر کے بعد قافلہ خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔ عصامی نے تاجر سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر بول چال بھی بند ہو گئی۔ خراسان میں داخلے کے بعد لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ عصامی نصر بن سیار کے پاس چلا گیا۔ نصر نے اس کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ تاجر کہاں چلا گیا؟ عصامی کو کچھ پتا نہ تھا۔

خراسان میں عصامی کا اپنا خاندان بھی موجود تھا لیکن

وہ جس مقصد کے لیے خراسان آیا تھا، وہ خطرناک تھا اور اگر وہ کبھی کسی خطرے میں گھر جاتا اور زندگی خطرے میں پڑ جاتی تو اس کا اثر اس کے خاندان پر نہ پڑے بس اسی خیال سے وہ اپنے خاندان سے دور رہتا تھا۔ اس نے خراسان میں ابومسلم داعی اعظم اہل بیت کا ہر طرف زور دیکھا۔ بظاہر یہاں مروان کی حکومت تھی لیکن عملاً بنو ہاشم چھائے ہوئے تھے۔ عصامی ابومسلم یا اس کے کسی قریبی آدمی تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح وہ مروان کے مخالفوں کی تحریک اور ارادوں سے پوری طرح باخبر بھی رہ سکتا تھا اور حران میں بنوامیہ کو خبردار کر سکتا تھا۔

چند دنوں بعد پورے خراسان میں یہ خبر پھیل گئی کہ مروان نے امام ابراہیم کو قتل کر دیا اور امام ابراہیم کے بعد ان کے بھائی عبداللہ کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا ہے۔ نصر بن سیار نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے جن آدمیوں کو چھوڑا تھا، ان میں عصامی بھی شامل تھا۔ عصامی خود کو بنو ہاشم کا ایک فرد کہتا تھا اور اہل بیت کی حمایت میں بنوامیہ کی مذمت کرتا تھا۔

وہ جس جگہ رہتا تھا وہاں کے لوگ دن رات بنوامیہ اور بنو ہاشم کی کشمکش پر بحث مباحثے کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض بنوامیہ کی مخالفت کرتے اور بعض بنو ہاشم کی مخالفت کرتے۔ ان میں عصامی بھی شامل ہو گیا اور بنوامیہ اور مروان بن محمد پر سخت تنقیدیں شروع کر دیں۔ عصامی کا لہجہ پُرجوش اور اتنا جارحانہ ہوتا تھا، دلائل اتنے زوردار ہوتے کہ مخاطب لاجواب ہو جاتے۔ ان بحث کرنے والوں میں ابومسلم کے آدمی بھی شامل تھے۔ انہوں عصامی کو ایک کام کا نوجوان محسوس کیا اور نہایت خاموشی سے ابومسلم سے ملاقات کرادی اور کہا۔ ''ابومسلم! یہ نوجوان ہمارے لیے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے اس لیے اس کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا جائے۔''

ابومسلم نے ترچھی نظروں سے بغور دیکھا اور عصامی کو پاس بلایا، پوچھا۔ ''نوجوان! تیری بڑی تعریفیں سنی ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ تو بنو ہاشم میں سے ہے، کیا یہ درست ہے؟ اگر درست ہے تو یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ تو ہمیں مل گیا۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں تو بنو ہاشم کے کام آنا چاہتا ہوں کیونکہ میں بھی بنو ہاشم میں سے ہوں لیکن افسوس کہ ہر طرف یہ افواہ گرم ہے کہ خراسان میں عربوں اور عربی بولنے والوں کا قتل عام ہونے والا ہے۔ ان حالات میں، میں یا میرے جیسے دوسرے لوگ کس طرح تیرے کام آسکتے ہیں۔''

ابومسلم زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''وہ محض افواہ ہے' اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔''

عصامی نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میں کام کرنے کو تیار ہوں۔''

ابومسلم نے پوچھا۔ ''تیری شادی ہو چکی ہے؟''

عصامی چکرا گیا۔ مگر فوراً جواب دیا۔ ''ہاں میں نے ابھی ابھی شادی کی ہے۔''

ابومسلم نے پوچھا۔ ''یہاں تیرا کوئی اور رشتے دار؟''

عصامی اور زیادہ پریشان ہو گیا، جواب دیا۔ ''نہیں، میرے سارے رشتے دار کوفہ چلے گئے۔''

ابومسلم نے مایوسی سے کہا۔ ''پھر تو ہمارا کام کس طرح کرے گا؟ تو اپنی بیوی کو کس پر چھوڑے گا؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اس کے لیے کوئی کنیز خرید لوں گا اور پھر سارا دن رہنے کے بعد شام کو تو بیوی کے پاس پہنچ ہی جایا کروں گا۔''

ابومسلم مسکرایا۔ ''یہ بھی درست ہے اور اگر کبھی ایک آدھ دن بیوی سے جدا بھی رہنا پڑے گا تو میرے آدمی تیرے گھر کی حفاظت کیا کریں گے۔''

عصامی دل میں بہت خوش تھا کہ اس نے بہت جلد ابومسلم کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

ابومسلم نے اس کے کان میں کہا۔ ''عصامی! غالباً تیرا ہی نام ہے۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''ہاں' میرا یہی نام ہے۔''

ابومسلم نے کہا۔ ''میں دو چار دن بعد تیرے سپرد ایک ایسا کام کروں گا جو تیرے جیسا لسان اور دل نشین باتیں کرنے والا ہی انجام دے سکتا ہے۔''

عصامی ابومسلم کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن اس پر ابومسلم کا جو مجموعی تاثر ہوا' وہ خوف بن کر ظاہر ہوا' ابومسلم ان تمام سے مختلف اور بڑا محسوس ہو رہا تھا جن سے اب تک عصامی مل چکا تھا۔ فضل، مروان بن محمد، نصر بن سیار، ابومسلم ان تینوں سے مختلف اور خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ابومسلم کے آدمیوں کو ابومسلم سے خوفزدہ محسوس کیا تھا۔ اس کا رعب اور دبدبہ مسلم تھا۔ وہ عصامی سے باتیں کرتے ہوئے مسکرایا بھی تھا جبکہ ابومسلم کے واقف کاروں کا یہ کہنا تھا کہ ابومسلم میدانِ جنگ کے علاوہ کہیں بھی نہیں مسکراتا یا پھر اس جگہ ہنستا ہے جہاں لوگ غمزدہ اور رو رہا نے ہو جاتے ہیں۔

اس نے نصر بن سیار سے انتہائی احتیاط اور رازداری سے ملاقات کی اور ابومسلم کی گفتگو کا سارا حال سنا دیا۔

نصر بن سیار نے مشورہ دیا۔ ''ابومسلم بہت چالاک

ہے۔ اس سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

عصامی نے کہا۔ "میں اس سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوں۔"

نصر نے تسلی دی۔ "خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو یہاں موجود ہوں اور خراسان پر آلِ مروان کی حکومت ہے۔"

عصامی گھر پہنچا تو روشنک کو دیکھ کر ڈھارس بندھی۔ جاتے ہی اس کی آغوش میں گر گیا۔ "روشنک! آج میں نے ایک ایسے شخص سے ملاقات کی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ یا تو میدانِ جنگ میں ہنستا ہے یا پھر اس جگہ جہاں دوسرے لوگ غمزدہ ہو جاتے ہیں یا رونے لگتے ہیں۔"

روشنک نے پوچھا۔ "ایسا کون شخص ہے؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "ابو مسلم۔ بنو ہاشم کا داعیِ اعظم۔"

روشنک نے کہا۔ "یہ ابو مسلم کے بارے میں دوسروں کی مبالغہ آرائی ہوگی۔"

عصامی نے روشنک کا چہرہ اپنے منہ کے قریب کر لیا، بولا۔ "روشنک! خدا کے لیے تو مجھ میں سما جانے کی کوشش کر۔ شاید اسی طرح میرے دل سے اس کا خوف نکل جائے۔ میں نے اتنا خوفناک آدمی آج تک نہیں دیکھا۔"

روشنک نے بھی اس کو بھینچ لیا، عصامی نے اپنے جسم میں کیف و سرور کو مچلتے ہوئے محسوس کیا اور اس کیف و سرور کی موجودگی میں ابو مسلم کا خوف کیسا؟

روشنک تسلیاں دینے لگی۔ "ابو مسلم کتنا ہی خطرناک اور دہشت ناک کیوں نہ ہو، تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اس دن عصامی نے اپنے دل کا خوب اچھی طرح تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سیاست اور ملوکیت یہ ساری خراب چیزیں ہیں اور آدمی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

روشنک نے محسوس کیا کہ عصامی اس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے۔ "مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھو روشنک۔ ورنہ میرا برا حال ہو جائے گا۔"

روشنک نے ایک بار پھر تسلی۔ "اگر تو نے اپنے دل میں ابو مسلم کی دہشت بٹھائی تو اس کا امیر المومنین کو کیا جواب دے گا؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "یہ ڈر دل میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اس وقت اگر تو نہ ہوتی تو دہشت اور خوف سے میرا کلیجا پھٹ جاتا۔"

عصامی کئی دن تک روشنک کی آغوش میں ہی دبکا رہا۔ اس آغوش میں سکون ہی سکون تھا، دہشت اور خوف میں زیادہ شدت نہیں رہی تھی۔

عصامی نے کئی بار ابو مسلم کے پاس جانے کی نیت کی لیکن ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

ایک دن شام کو مغرب کے فوراً بعد جھٹپٹے میں ایک شخص نے اس کے در پر دستک دی۔ عصامی باہر نکلا تو اندھیرے میں دروازے پر ایک شخص کو چہرے کو صافے میں چھپائے کھڑا دیکھا۔

عصامی نے سختی سے پوچھا۔ "کون ہے تو اور کس سے ملنے آیا ہے؟"

جواب ملا۔ "عصامی! مجھ کو اندر لے چل۔ میں تجھ سے تیرے ہی گھر میں باتیں کروں گا۔"

اس آواز نے عصامی کے جسم میں ایک خوف کی لہر سے ڈور ادوڑی کیونکہ یہ آواز ابو مسلم خراسانی کی تھی، سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "یعنی یہ آپ ہیں! آپ نے کیوں زحمت کی مجھ کو بلوا لیا ہوتا۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "دیکھ، اب تو اہلِ بیت کا ملازم ہے، میری خواہش ہے کہ تو آلِ مروان کے ارادوں اور منصوبوں کی خبریں مجھ تک پہنچائے۔ میں یہی بات اس دن بھی کر سکتا تھا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے اپنے لوگ تجھ کو پہچان لیں۔ یہاں کوئی قابلِ اعتبار نہیں۔ ہر شخص بک رہا ہے اور جس کو بھی اس کی حیثیت سے زیادہ قیمت مل جاتی ہے، وہ فوراً اس کے ہاتھ بک جاتا ہے۔"

عصامی نے کہا۔ "پھر جناب یہ تو بتائیں کہ وہ کون شخص ہے جو بک رہا ہے؟"

ابو مسلم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ "اے باتونی نوجوان! مجھے اندر لے چل، وہیں باتیں کروں گا۔ کیا تو اتنا بخیل ہے کہ مجھے اپنے گھر میں بٹھانا نہیں چاہتا؟"

عصامی نے کھسیا کر جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں جناب والا۔ آپ اندر تشریف لے چلیں۔ بے جا شرم اور حجاب کی کوئی ضرورت نہیں۔"

عصامی ابو مسلم کو اندر لے گیا اور اس کو ایک ایسے کمرے میں بٹھایا، جہاں روشنک کے سوا، اس کا سب کچھ تھا۔

ابو مسلم نے کہا۔ "عصامی! یہاں سے نصر بن سیار زیادہ دور تو نہیں ہے؟"

عصامی نے گھبرا کر جواب دیا۔ "ہاں، وہ قریب ہی ہے، یہاں سے بہت قریب ہے۔"

ابو مسلم کمرے میں ٹہلنے لگا، بولا۔ "عصامی! میں پیاسا ہوں، پانی پلا۔"

عصامی دوسرے کمرے میں پانی لینے چلا گیا۔ ابو مسلم نے عصامی کے سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی لیکن عصامی کے قدموں کی آہٹ سن کر اس کے سامان کے پاس سے ہٹ گیا۔

عصامی نے ابو مسلم کو پانی پیش کیا، جس کو وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پانی پی چکنے کے بعد اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"میں بھوکا ہوں۔"

عصامی نے پوچھا۔ "آپ ہمارا کھانا کھانا پسند کریں گے؟"

ابو مسلم نے جواب دیا۔ "میں بناوٹ اور تکلف سے دور بھاگتا ہوں۔ جب میں نے بھوک کا اظہار کیا ہے تو کھانا بھی زبردستی کھاؤں گا، بھوک میری کمزوری ہے۔"

عصامی کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ اس وقفے میں ابو مسلم نے عصامی کے سارے سامان کی اچھی طرح تلاشی لے لی، مگر کچھ حاصل نہ کر سکا۔

عصامی کھانے کا انتظام کر رہا تھا مگر دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ابو مسلم کے سامنے کھانا رکھ دیا گیا۔

اب وہ عصامی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا، اس کی نظریں کھانے پر تھیں۔ دانت کھانا چبانے اور لعاب دہن کی مدد سے حلق کے نیچے اتارنے میں مصروف تھے اور زبان سوالوں میں مشغول تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "عصامی تو بنو ہاشم میں سے ہے، گویا ہم سب تیرے قبیلے کے لیے ایک عظیم الشان کام کر رہے ہیں۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "بے شک بے شک، یہ کون نہیں جانتا۔"

ابو مسلم نے پوچھا۔ "مگر تو خود ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "میرے سپرد جو کام کیا جائے گا میں اسے پوری محنت اور عقلی صلاحیت سے انجام دینے کی کوشش کروں گا۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "تو بلا کا لسان ہے، باتیں کرنے کا فن جانتا ہے۔ کیا تو کبھی نصر بن سیار سے ملا ہے؟"

عصامی کے پاس اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ بولا۔ "نصر بن سیار سے کوئی کام ہو تو بتا دیا جائے میں کوشش کروں گا کہ وہ انجام دیا جائے۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "تو کسی بھی ترکیب سے اس سے مل..... اس کو ٹٹول کر یہ معلوم کر کہ ہمارے خلاف وہ کس قسم کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "میں کوشش کروں گا۔"

ابو مسلم بگڑ کر بولا۔ "کوشش کیا معنی۔ یہ کام بہر حال کرنا ہے۔"

اتنی دیر میں وہ دو آدمیوں کا کھانا اکیلا کھا چکا تھا، بولا۔ "کھانا اور لے آ، میرا پیٹ نہیں بھرا۔"

عصامی اندر گیا اور تین آدمیوں کا کھانا اور لے آیا۔

ابو مسلم پھر مشغول ہو گیا، بولا۔ "عصامی! مجھ کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو یہاں سے امام ابراہیم کے نام پر ایک خط لے گیا تھا اور بعد میں وہ پکڑا گیا اور مروان بن محمد کے داؤ میں آ گیا۔ دس ہزار درہم کے عوض اس نے خود کو اور امام ابراہیم کو فروخت کر دیا۔ امام قتل کر دیے گئے اور وہ شخص خراسان واپس آ کر روپوش ہو گیا۔"

عصامی کا مارے خوف کے اتابر احال تھا کہ غشی سی طاری ہونے لگی، بہ مشکل جواب دیا۔ "نہایت ذلیل تھا وہ شخص۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "ہاں، وہ بہت ہی ذلیل اور غدار تھا۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو نصر بن سیار سے ربط ضبط بڑھا کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس کو نصر بن سیار نے کہیں چھپا دیا ہے۔ ممکن ہے تیری کوشش سے اس کا پتا چل جائے۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "اگر اس کو نصر بن سیار نے پناہ دی ہے تو میں اس کا پتا چلا لوں گا۔"

ابو مسلم نے ترچھی نظروں سے عصامی کو دیکھا اور کہا۔ "اگر تو نے میرا یہ کام کر دیا تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے عوض میں تیری خدمت میں حسین ترین کنیز پیش کروں گا اور پھر تو دونو جوان اور خوبصورت عورتوں سے خوش ہو سکے گا۔"

اب تو عصامی کا اپنے آپ میں رہنا محال ہو چکا تھا۔ وہ فوراً دوسری طرف چلا گیا، بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔ میرا خیال ہے میری بیوی مجھ کو بلا رہی ہے۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "اور ہاں، واپسی میں کچھ کھانا اور لے آنا۔ میں ابھی بھوکا ہوں۔"

عصامی کو موقع مل گیا، بولا۔ "جناب! کھانا ختم ہو چکا، تیار کرانا پڑے گا۔"

ابو مسلم نے جواب دیا۔ "میں انتظار کر لوں گا لیکن دسترخوان سے بھوکا نہیں اٹھوں گا۔"

عصامی اندر چلا گیا اور آہستہ آہستہ روشنک سے کہا۔ "روشنک! میں نے نادانی میں ابو مسلم کو اتنا نہیں سمجھا تھا، مجھ کو شبہ ہی نہیں یقین ہے کہ ابو مسلم میرے بارے میں سب

کچھ جان چکا ہے۔''

روشنک نے پوچھا۔ ''وہ کہتا کیا ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''وہ جو کچھ بھی کہہ چکا ہے، اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ وہ مجھ کو اشارتاً بتا رہا ہے کہ میں کیا ہوں!''۔

روشنک نے کہا۔ ''پھر تو بڑی تشویشناک بات ہے۔''

عصامی نے کہا۔ ''اچھا نیک بخت ذرا اٹھ اور ابو مسلم کے لیے کھانا تیار کردے۔''

روشنک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ آدمی ہے یا اونٹ، پانچ کا کھانا کھا چکا ہے اور پھر بھی بھوکا ہے ابھی۔''

عصامی نے کہا۔ ''کھانا تیار کردے۔ میں اس مصیبت سے نجات پانے کی فکر میں ہوں۔''

چار آدمیوں کا کھانا اور تیار ہو گیا۔ ابو مسلم بڑے انہماک سے کھاتا رہا اور کہا۔ ''بہرحال عصامی! اس غدار کی تلاش ہم سب کا فرض ہے کیونکہ امام ابراہیم اس کی وجہ سے قتل کر دیے گئے۔ میں اس کو معاف نہیں کرسکتا۔''

ابو مسلم کھانے کے بعد کچھ اور رکا عصامی کو تنبیہ کی۔ ''عصامی! اہلِ بیت کا داعیِ اعظم اتنا بے وقوف تو نہیں ہوسکتا کہ اس کو ناتجربہ کار نوجوان بے وقوف سمجھیں اور مطلب نکالنے کی کوشش کریں اور نہ ہی میں اتنا پیچھے رہا ہوں کہ بے مقصد لوگوں کے گھروں میں کھانے کے لیے پہنچ جایا کروں۔ میں آلِ مروان کی حکومت میں اتنا ہی کرسکتا ہوں۔ لیکن وہ دن زیادہ دور نہیں جب میں مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دشمنوں اور منافقوں کو ذلیل و رسوا کرسکوں گا۔''

عصامی اس کی ایک ایک بات کو سمجھ رہا تھا لیکن نادان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابو مسلم چلا گیا اور عصامی نصر بن سیار کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ کیونکہ عصامی کے خیال میں اب وہ ابو مسلم کی مخبری کے لائق نہیں رہ گیا تھا کیونکہ ابو مسلم نے اس کو پہچان لیا تھا۔ اگر خراسان پر بنو امیہ کی حکومت نہ ہوتی تو شاید عصامی کا پتا بھی نہ چلتا۔

عصامی موجودہ حالات سے اتنا گھبرا گیا تھا کہ خراسان بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ جب اس روشنک جیسی حسین عورت مل گئی ہے تو اس کے ساتھ عیش کرنا چاہیے۔ خوامخواہ خطرات مول لینے سے فائدہ؟ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مروان بن محمد کتنا بدقسمت انسان ہے کہ اس نے روشنک کو اس لیے عطا کیا تھا کہ عصامی اس انعام سے خوش ہو کر اس کے لیے زیادہ خلوص اور زیادہ لگن سے کام کرے گا لیکن اس کا اثر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مروان کا یہ عطیہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو رہا تھا۔ روشنک کی جوانی اور حسن عصامی کو راہِ فرار پر آمادہ کر رہا تھا۔ اگر روشنک نہ ہوتی تو شاید عصامی زیادہ لگن، محنت اور دلیری سے اپنی خدمات انجام دیتا۔

اس نے نصر بن سیار کو ابو مسلم کی گفتگو کی تفصیل بتا دی اور کہا۔ ''اے ابن سیار! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ ابو مسلم کتنا شاطر اور چالاک انسان ہے۔ میں نے رعایا ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر جو طمانیت اور سکون دیکھا ہے، وہ بنو امیہ کے کسی راعی کے چہرے پر کبھی نظر نہیں آیا۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ خراسان اور اس کے مضافات کے لاکھوں جنگجو اس کے طفیل جنگ کے منتظر ہیں۔ میں تو اس جنگ کے نتائج ہی سے خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ بہتری اسی میں ہے کہ کسی طرح ابھی سے اس کا تدارک ہو جائے۔''

نصر بن سیار نے جواب دیا۔ ''میں کافی عرصے سے بنو امیہ اور آلِ مروان کو جگانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ بیدار ہی نہیں ہوتے۔ آج میں امیر المومنین کو ایک خط اور لکھتا ہوں۔''

عصامی نے کہا۔ ''میرا ذکر ضرور کر دیجیے گا، کیونکہ خطرات کی بو میں نے سونگھی ہے۔ ہاں اس کا علاج امیر المومنین ہی کو سوچنا اور نافذ کرنا ہوگا۔''

نصر نے اسی وقت کاتب کو طلب کرلیا اور مروان بن محمد کے نام ایک خط لکھوایا۔

''میں راکھ کے نیچے انگارے کی دہک دیکھ رہا ہوں اور یہ دہک عنقریب شعلہ بن کر بھڑک اٹھنے کو ہے۔ آگ دو لکڑیوں کی رگڑ سے بھڑکائی جاتی ہے اور فتنہ و فساد کا آغاز دو آدمیوں کی تلخ کلامی سے ہوتا ہے۔

میں حیرت زدہ ہوں اور ہر وقت یہ سوچتا رہتا ہوں کہ بنو امیہ جاگ رہے ہیں یا محوِ خواب ہیں؟

اگر وہ جاگ رہے ہیں تو حکومت کو بقا حاصل رہے گی اور اگر وہ سوئے ہوئے ہیں تو مجھ پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا کیونکہ میں انہیں جگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اگر وہ سوئے ہوئے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ اے بنو امیہ! اٹھ کھڑے ہو کیونکہ اٹھ کھڑے ہونے کی گھڑی سر پر آن کھڑی ہے۔'' خط میں جو مایوسی اور بے بسی پائی جاتی تھی، اس سے عصامی اور زیادہ ہراساں ہو گیا۔ اس نے گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ خراسان میں نہیں رہے گا۔ کسی گمنام علاقے میں چلا جائے گا اور روشنک کی محبت اور صحبت میں ساری عمر گزار دے گا۔

اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی روشنک کو بتادیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔

روشنک نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ پھر ہم کہاں رہیں گے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''روشنک! آج مجھ کو پوری صورتِ حال کا صحیح صحیح اندازہ ہوگیا ہے۔ بنو امیہ کا اقبال شام کے آفتاب کی طرح غروب ہورہا ہے۔ اب میں کس امید پر خطرات مول لوں۔''

روشنک نے کہا۔ ''لیکن میں اتنی جلدی خراسان نہیں چھوڑ سکتی اور میں تجھے بھی یہی مشورہ دوں گی کہ اتنی جلدی راہِ فرار نہ اختیار کر کیونکہ مردوں کے لیے یہ بات بڑی شرمناک ہے۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اگر میں رکوں گا تو بنو امیہ کی کمزور حکومت میری حفاظت نہیں کر سکے گی اور اس کا امکان ہے کہ میں نہایت سفاکی اور بے رحمی سے قتل کر دیا جاؤں۔''

روشنک نے کہا۔ ''کچھ بھی سہی..... لیکن میں فوراً ہی کہیں نہیں جاسکتی۔ جب تک خراسان کا عامل نصر بن سیار یہاں موجود ہے، میں یہیں رہوں گی۔''

عصامی نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ ''روشنک! یہ آج تو کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔ میں تجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور ایسی محبت نے مجھ کو زندگی سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ میں تیری ہی خاطر خراسان چھوڑوں گا اور گمنامی کی زندگی اختیار کروں گا۔''

لیکن روشنک کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ''ابھی میں خراسان ہی میں رہوں گی۔''

عصامی نے تھک کر کہا۔ ''ابھی کا مطلب کب تک؟ تو کب تک یہاں رہے گی؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''جب تک امیر المومنین کا جواب نہیں آجائے گا۔''

عصامی نے بے بسی سے کہا۔ ''بہتر ہے، میں جواب کا انتظار کروں گا لیکن اس کے بعد تو، تو چلی چلے گی میرے ساتھ؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس وقت میں انکار نہیں کروں گی۔''

عصامی نے کہا۔ ''اچھا، اس وقت تک میں کم سے کم باہر نکلوں گا کیونکہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ ابو مسلم مجھ کو گرفتار کرالے گا اور میں گرفتار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''یہ تیری مرضی پر منحصر ہے، جو سمجھ میں آئے کر۔''

لیکن روشنک کے منفی رویے نے عصامی کے پُرخلوص دل پر چوٹ ضرور لگائی۔ اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ روشنک یوں انکار کر دے گی۔

عصامی گھر میں ہی روپوش ہوگیا۔ جو بھی اس کو پوچھنے آتا روشنک یہی کہہ دیتی کہ عصامی گھر میں موجود نہیں، کہیں گیا ہوا ہے۔

سنسان رات، آسمان پر چاند بھی نہیں تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے ستاروں کی روشنی روکے ہوئے تھے۔ نصف سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سکوتِ شب کو بار بار توڑ رہی تھیں۔ عصامی روشنک کی آغوش میں میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ روشنک جاگ رہی تھی اور طاق میں رکھی ہوئی، شمع کی جھلملاتی لو کو دیکھ رہی تھی۔ شمع کی مدھم روشنی میں عصامی کا دھندلا دھندلا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ روشنک بڑی دیر تک عصامی کو دیکھتی رہی۔ اس نے عصامی کو پیار کیا اور آہستہ سے آواز دی۔ ''عصامی! کیا سو گئے؟''

عصامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ''عصامی! کیا نیند آگئی؟''

اسی لمحے عصامی کے خراٹے کی آواز سنائی دی، روشنک نے بڑے کرب سے کہا۔ ''عصامی! افسوس کہ میں نے تیری خواہش رد کر دی اور خراسان کو فوراً چھوڑ دینے پر آمادہ نہیں۔ میں مجبور ہوں عصامی لیکن تجھ کو میری مجبوریوں کا صحیح علم نہیں ہے۔''

اس وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ روشنک خاموش ہوگئی اور دوبارہ دستک کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد کسی نے پھر دستک دی لیکن یہ دستکیں نہایت احتیاط اور آہستگی سے دی جارہی تھیں۔ روشنک نے عصامی کو ہلایا۔ ''عصامی! باہر کوئی ہے۔ ذرا آنکھیں تو کھولو۔''

لیکن اس بار عصامی کروٹ بدل کر سو گیا۔ کسی نے پھر دستک دی۔ روشنک نے بڑی زور سے اسے جھنجوڑا۔ ''عصامی! کوئی ہے۔ آنکھیں کھول۔''

عصامی بیدار ہوگیا لیکن معاملہ سمجھے بغیر کچھ بولا نہیں۔ خاموش رہا اور دستک کا انتظار کرنے لگا۔

عصامی نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیوں روشنک! تیرا کیا خیال ہے، کون ہوسکتا ہے؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی لیکن نصف رات کے بعد آہستہ آہستہ دستکیں دینے کا مقصد میری سمجھ میں جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ باہر جو کوئی بھی ہے، اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ وہ کسی بڑے اور اہم مقصد کے

لیے یہاں آیا ہے۔"

عصامی آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا اور دستک کا انتظار کرنے لگا۔

کسی نے پھر دستک دی اور ذرا زور سے دی۔ عصامی نے دروازے سے گویا زبان لگا دی، پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے جواب آیا۔ "عصامی! میں ہوں تیرا دوست تاجر، وہی جس نے دمشق سے خراسان تک تیرا ساتھ دیا۔ خدا کے لیے دروازہ کھول دے۔"

عصامی کے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ تاجر نے پھر دستک دی اور کہا۔ "عصامی! اتنی بے مروتی اچھی نہیں۔ اگر تو نے دروازہ نہ کھولا تو پھر تیری بھی خیر نہیں۔"

عصامی نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ تاجر دروازے کے سہارے ہی کھڑا تھا جیسے ہی دروازہ کھلا، تاجر عصامی کے قدموں میں آن گرا۔

عصامی نے اس کو سہارا دیا اور اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔

روشنک بھی ان دونوں کے پاس ہی چلی آئی تھی، تاجر نے روشنک کو مسکرا کر دیکھا اور پوچھا۔ "روشنک! خیریت تو ہے؟"

عصامی نے بے مروتی سے کہا۔ "تاجر... روشنک سے مخاطب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھ سے باتیں کر، روشنک میری بیوی ہے۔"

تاجر نے حیرت سے کہا۔ "روشنک تیری بیوی ہے؟ افسوس کہ مجھ کو یہ بات نہیں معلوم تھی۔"

عصامی نے کہا۔ "تو نے بے وقت آ کر ہم دونوں کی نیند خراب کر دی۔ اب بقیہ وقت باتوں میں ضائع کر رہا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ اتنی رات گئے چوروں کی طرح آنے کا مطلب کیا ہے؟"

تاجر نے جواب دیا۔ "عصامی! ابو مسلم کے کتے میری تلاش میں ہیں اور ان کے خوف سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔ اس وقت بھی وہ میرے تعاقب میں ہیں اور میں تیرے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔"

عصامی کانپ گیا، بولا۔ "اگر یہ بات تھی تو تجھ کو میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ تو نے میرے پاس آ کر مجھ کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔"

تاجر بہت سہما ہوا تھا۔ بولا۔ "عصامی! دوست، دوست کے کام آتا ہے اور پھر یہ بھی تو سوچ کہ میں نے امام ابراہیم کے ساتھ جو کچھ کیا اس میں تو برابر کا شریک تھا۔"

عصامی نے برا سا منہ بنایا، پوچھا۔ "اب تو کیا چاہتا ہے؟"

تاجر نے بے تامل جواب دیا۔ "پناہ، صرف پناہ..... چند دنوں کے لیے پناہ۔ اس کے بعد خود ہی چوری سے فرار ہو جاؤں گا کیونکہ اب میرا آب و دانہ بنو خراسان سے اٹھ چکا ہے۔"

عصامی نے روشنک کی طرف دیکھا، روشنک اشارے سے اسے الگ لے گئی اور کہا۔ "عصامی! اس کا ہمارے پاس رکنا بہت خطرناک ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر وعدہ کرنا۔"

عصامی نے کہا۔ "میں تجھ سے مشورہ چاہتا ہوں، اب تو ہی بتا ان خطرناک حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ تاجر اگر پکڑا گیا تو اس کے ذریعے ہم بھی بے نقاب ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کو پناہ دینا اور پناہ نہ دینا دونوں خطرناک ہیں۔"

روشنک نے کہا۔ "پناہ دے دو، اور اس سے کہہ دیا جائے کہ کل شام تک اس کو یہاں سے چلا جانا پڑے گا کیونکہ ہم اس کی موجودگی کا خطرہ زیادہ دن تک نہیں برداشت کریں گے۔"

ان دونوں کے مشورے جاری ہی تھے کہ تاجر بھی ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہا۔ "دوستو! اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں۔ اگر جان کا خوف نہ ہوتا تو میں یہاں چوروں کی طرح رات کو نہ آتا، دن کو آتا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس گھر میں زیادہ دن نہیں رہوں گا، موقع پاتے ہی نکل بھاگوں گا۔"

عصامی نے کہا۔ "تو ہو تو اس طرح ہم دونوں کے پیچھے آ کھڑا ہوا گویا تو بھی اسی گھر کا ہی فرد ہے۔ پناہ لینے کے لیے آیا ہے تو اپنی اوقات کو تو نہ بھول۔ اگر میں تجھ کو نکال باہر کروں تو؟"

تاجر ہنسا۔ "تم دونوں مجھ کو نکال نہیں سکتے، ہاں دھمکی ضرور دے سکتے ہو۔ اچھا خیر، اب تم دونوں مجھ کو یہ بتا دو کہ میں اس مکان کے کس کمرے میں رہوں گا۔"

عصامی نے ناگواری سے کہا۔ "یہ اچھی زبردستی ہے۔"

پھر روشنک سے مشورہ کر کے ایک کمرا اس کے حوالے کر دیا اور واپسی میں کمرے کو اپنی طرف سے بند کر لینا چاہا۔ تاجر ان کی نیت بھانپ گیا، بولا۔ "دروازے کو بند نہ کرنا کیونکہ میں یہاں بند ہو جاؤں گا۔"

عصامی نے کہا۔ "دوست! تو یہاں میرا مہمان ہے تو مہمان ہی کی طرح رہ، تنگ نہ کر۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو

Digitized by Google

دروازے کو اپنی طرف سے بند کیوں کرنا چاہتا ہے، تجھ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے لیکن میں تجھ کو یہ کس طرح یقین دلاؤں کہ میں اس وقت بالکل بے ضرر ہوں۔ اس وقت مجھ کو اپنی جان کی فکر ہے، بس زندگی کی فکر..... کبھی میرے دل میں تیری روشنک کا خیال آیا تھا لیکن اب میں اپنی ہی جان کی حفاظت نہیں کر پا رہا ہوں۔ روشنک کی کیا فکر کروں گا، مجھ پر اعتبار کر میرے دوست۔ اب میں وہ تاجر نہیں ہوں، ایک دوسرا ہی انسان ہوں۔"

لیکن اس کی باتوں کا عصامی پر کوئی اثر نہ ہوا اس نے دروازے کو اپنی طرف سے بند کر کے تاجر کو قید کر دیا اور روشنک سے کہا۔ "برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب اس کی ہر بات نہیں مانی جا سکتی۔"

دونوں اس کے کمرے سے دور صحن میں چلے گئے۔ صحن میں ایک فوارہ چل رہا تھا اور فوارے کے باہر لیمو۔ کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کی ترش خوشبو سے پورا صحن مہک رہا تھا۔ دونوں فوارے کی دیوار پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور تاجر اور اس سے متعلقہ خطرات پر باتیں کرنے لگے۔ ان دونوں کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ صبح فجر سے ذرا پہلے یہ دونوں بھی سو گئے اور دن چڑھے تک سوتے رہے۔

بیداری کے بعد خود ناشتا کیا اور تاجر کو کھلایا پلایا۔ پہلے عصامی ادھر ادھر چلا بھی جاتا تھا لیکن تاجر کی موجودگی نے اس کو اس سے بھی محروم کر دیا۔

دوپہر کے بعد نصر بن سیار کا آدمی اس کو بلانے آیا۔ وہ روشنک کو سمجھانے لگا۔ "دیکھ روشنک! میرا ابن سیار سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ وہ معلوم نہیں کس ضرورت سے مجھ کو بلا رہا ہے۔ میری عدم موجودگی میں خبردار جو تو نے تاجر کو کھولا اور اس سے باتیں کیں کیوں کہ میں اس پر ان حالات میں بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

روشنک نے پوچھا۔ "تاجر پر اعتبار نہیں کرتا نہ کر، لیکن مجھ پر تو اعتبار کر۔ تیرا کیا خیال ہے، کیا میں اس تاجر کی باتوں میں آ جاؤں گی؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے، میں تجھ کو اس پر آئندہ طمع تاجر کے شر سے بچانا چاہتا ہوں۔"

روشنک چپ ہو گئی اور عصامی نصر بن سیار کے پاس چلا گیا۔

عصامی کے چلے جانے کے بعد روشنک نے نہایت احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اس کمرے میں جا بیٹھی جس کے برابر ہی تاجر بند تھا۔ دونوں کمروں کی مشترکہ دیوار میں اوپر

یاد رکھنے کی باتیں

☆ روپیہ بھی بڑا ہر جائی ہوتا ہے۔ یہ ابھی میرے پاس ہے۔ کچھ دیر بعد تمہارا ہوگا پھر کسی اور کا ہو جائے گا۔

☆ رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

☆ وقت شاہراہ پر اونگھتے ہوئے قافلوں کا ساتھ نہیں دیتا۔

☆ جب خدا دیتا ہے تو ہاتھ نظر نہیں آتے اور جب وہ مارتا ہے تو لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

☆ میں نے دنیا کو ایسا پایا گویا ایک مکان ہے اور اس کے دو دروازے ہیں۔ ایک سے میں اندر آ گیا، دوسرے سے باہر چلا گیا۔

☆ حاسد کبھی آسودہ حال نہیں ہوتا۔

☆ جیسے کیڑا کیڑے کو غارت کر دیتا ہے، ایسے ہی حسد آدمی کے قلب و دماغ کو چوپٹ کر دیتا ہے۔

☆ خوبصورت عورت دیکھنے سے آنکھ اور نیک دل عورت دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے۔ اس لیے خوبصورت اگر ایک ہیرا ہے تو نیک دل عورت ایک خزانہ ہے۔

☆☆☆

مہمان

فہیم اپنے دوست نزاکت سے۔ "کیا واقعی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں؟"

نزاکت۔ "جی ہاں، میزبانوں کے لیے..... اگر آنے والے مہمانوں کے ساتھ تو بچے بھی ہوں۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دورہ

ایک غیر حاضر دماغ پروفیسر اپنے ڈاکٹر دوست کے گھر گئے اور دو تین گھنٹے اس کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ جب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ "گھر میں خیریت تو ہے نا!"

پروفیسر صاحب گھبرا کر بولے۔ "ارے! خوب یاد دلایا۔ تمہاری بھابی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ جلدی چلو۔"

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا اور کمروں کی فضا ان کی چوں چوں سے گونجتی رہتی تھی۔

روشنک نے قلم کاغذ سنبھالا اور کچھ لکھنے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد تاجر کی آواز سنائی دی۔ ''عصامی! تو کیا کر رہا ہے؟ ذرا باہر کی بھی خبریں رکھ، کوئی میری تلاش میں یہاں تک نہ آجائے کہیں۔''

روشنک نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تاجر نے پھر آواز دی۔ ''عصامی! تو بولتا کیوں نہیں؟ کیا سو گیا؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''عصامی نہیں ہے، ذرا باہر گیا ہوا ہے زیادہ باتیں نہ کر۔''

تاجر میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی، پوچھا۔ ''تو گویا عصامی گھر میں نہیں ہے؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''ایک بار کہہ جو دیا۔''

تاجر نے کہا۔ ''روشنک! مجھ کو پیاس لگ رہی ہے، ذرا پانی تو پلا دے۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ مجھ کو خوامخواہ تنگ نہ کر۔''

تاجر نے عاجزی سے کہا۔ ''میں پیاسا ہوں روشنک!''

روشنک نے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تو پیاسا ہے مگر پانی کا نہیں کسی اور چیز کا پیاسا ہے۔''

تاجر نے کہا۔ ''تو بہت سمجھ دار ہے روشنک۔ اچھا ایک بات تو بتا۔''

روشنک نے تلخی سے جواب دیا۔ ''دیکھ تاجر تو مجھ کو خوامخواہ تنگ نہ کر۔ میں ایک کام کر رہی ہوں، کچھ دیر بعد باتیں کر سکتی ہوں۔''

تاجر نے اصرار کیا۔ ''بس ایک بات بتا دے۔ اس کے بعد جب تو کہے گی تبھی بات کروں گا۔''

روشنک نے کہا۔ ''اچھا پوچھ، کیا پوچھتا ہے؟''

تاجر نے کہا۔ ''یہ تو، تو جانتی ہی ہے کہ ابو مسلم کے لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میں جانتی ہوں، آگے کہہ۔''

تاجر نے کہا۔ ''اور تو اس پر بھی یقین رکھتی ہوگی اگر میں ابو مسلم کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھ کو بے دریغ قتل کرا دے گا؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''ہاں، شاید ایسا ہی ہو۔''

تاجر نے تلملا کر کہا۔ ''شاید نہیں یقیناً ایسا ہی ہوگا۔''

روشنک نے کہا۔ ''بات کو طول نہ دے، جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد کہہ دے کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

تاجر نے کہا۔ ''اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو تجھ کو کیسا لگے گا؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''بس ذرا افسوس ہوگا، زیادہ نہیں۔''

تاجر نے بے اختیار کہا۔ ''میرے لیے تیرا یہ ذرا سا افسوس ہی کافی ہے۔ حالانکہ اس وقت تیرے اس ذرا سے افسوس میں کچھ اضافہ ہو جائے گا جب تجھ کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ میں ابو مسلم کے ہاتھوں خوامخواہ قتل ہو گیا اور اپنے دل میں تیرے وصال کی ناکام حسرت لے گیا۔''

روشنک نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنے لکھنے کے کام میں مشغول ہو گئی، اس دوران تاجر کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں، وہ پاگلوں کی طرح بولے جا رہا تھا۔ اس طرح گویا آج کے بعد پھر کبھی بولنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ پھر تاجر خاموش ہو گیا۔ روشنک کو حیرت تھی کہ تاجر نے خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ وہ خط لکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد کئی چڑیاں اس کے کمرے میں بے چینی سے منڈلانے اور چوں چوں کرنے لگیں۔ انہوں نے اپنا گھونسلا چھوڑ دیا تھا۔ روشنک نے روشن دان کی طرف دیکھا چڑیاں گھونسلے تک جاتیں اور فوراً ہی واپس آجاتیں۔ اچانک روشن دان سے تاجر کی آواز سنائی دی۔ ''روشنک! اب تو میں تجھ کو دیکھ سکتا ہوں۔''

روشنک نے دیکھا، تاجر کی گردن روشن دان سے اس کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی اور وہ روشنک کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ روشنک نے کہا۔ ''تیری ان حرکتوں سے میں نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ یہ کہ تو لائق اعتبار نہیں ہے۔ تو نے امام ابراہیم کو گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔ تو نے عصامی سے وعدہ کیا تھا کہ اب تو میری طرف راغب نہیں ہوگا لیکن عصامی کی عدم موجودگی میں تو ہر طرح اس... کوشش میں ہے کہ کسی طرح مجھ تک رسائی حاصل کر کے اپنا مطلب نکال لے۔''

تاجر ہنسا، اس کی گردن دکھنے لگی تھی، بولا۔ ''اگر تو دروازہ کھول دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا اور تجھ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

روشنک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تو یوں باز نہیں آئے گا۔ اب میں اس کمرے میں ہی نہیں بیٹھوں گی۔ تو نے اپنے مطلب کے لیے چڑیوں کو بے گھر کر دیا، اب میں تجھ پر کس

Digitized by Google

طرح اعتبار کرلوں۔''

روشنک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تاجر خوشامدیں کرتا رہا لیکن اس کا روشنک پر کوئی اثر نہ ہوا۔

کافی دیر بعد عصامی واپس آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ بہت پریشان تھا۔ آتے ہی پوچھا۔ ''روشنک! کوئی خاص بات تو نہیں؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''خاص بات تو یہ ہے کہ تاجر نے بہت پریشان کیا۔ وہ روشن دان سے گردن نکال کر باتیں کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کمرے سے چلی آئی۔''

عصامی نے کہا۔ ''مجھے اس کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ خیر، دیکھا جائے گا۔''

روشنک نے پوچھا۔ ''نصر بن سیار نے کیوں بلوایا تھا؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اس نے ہم سب کو صاف صاف یہ بتا دیا ہے کہ خراسان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور ہمیں یہاں سے کسی وقت بھی فرار ہونا پڑے گا۔''

روشنک نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔ ''کیا نصر میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنے غداروں کو خاطر خواہ سزائیں دے سکے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ شاید اس میں اتنی قوت نہیں ہے، ورنہ اتنی مایوسی کی بات نہ کرتا۔ اس نے ہم سب سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی حفاظت خود کرے، حکومت کسی کی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہے۔''

روشنک کو اس کمرے میں چھوڑ کر عصامی تاجر کے برابر والے کمرے میں گیا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''دوست اب تو جلد ہی فرار ہونے کی تیاری کرلے۔ کیونکہ میں خود بھی یہاں سے جانے کی سوچ رہا ہوں۔''

تاجر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس طرح تیرے کہنے سے اپنی زندگی کو خطرے میں تو نہیں ڈال سکتا۔'' اس کے بعد وہ خود کو برا بھلا کہنے لگا۔ ''میں اس گھڑی اور اس دن پر لعنت بھیجتا ہوں جب میں مروان کے دس ہزار درہم پر بک گیا تھا۔ وہ بڑے گھاٹے کا سودا تھا کیونکہ اگر اس وقت میں یہ جانتا کہ آل مروان کا آفتاب اقبال گہن میں جانے والا ہے تو میں دس لاکھ میں بھی یہ معاملہ نہ کرتا۔''

عصامی نے کہا۔ ''جو گزر گیا اس کا ماتم کیوں، میں کل تک تجھ کو اپنے گھر میں نہ دیکھوں کیونکہ پرسوں تک میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

تاجر نے کہا۔ ''تب پھر تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا جا، اب میں اکیلا کہاں رہوں گا۔ مروان سے مل کر بتاؤں گا کہ مجھ پر جو بربادیاں آئی ہیں اس کا بنیادی سبب خود مروان ہے۔''

عصامی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بولا۔ ''اب میں آرام کروں گا کیونکہ سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ شاید آرام سے جاتا رہے، میں جا رہا ہوں۔''

عصامی روشنک کے پاس چلا گیا۔

☆☆☆

اس رات عصامی نے روشنک سے کہا۔ ''روشنک! اگر تو نے انکار نہ کیا ہوتا تو شاید میں نے خراسان کو پہلے ہی چھوڑ دیا ہوتا حالانکہ اب چھوڑنے میں پریشانی پیش آئے گی۔''

روشنک نے کہا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو ابو مسلم سے خوف آتا ہے اور کسی سے نہیں۔''

عصامی اسی وقت بازار چلا گیا اور ضروریاتِ زندگی کی چیزیں خریدنے لگا کیونکہ نصر بن سیار کی گفتگو کے مطابق سفر کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت تھی۔ اس نے بازاروں میں گھوم پھر کر یہ محسوس کیا کہ مروان بن محمد کا رعب اور دبدبہ لوگوں کے دلوں سے نکل چکا ہے اور لوگ دکانوں اور سڑکوں پر بنو امیہ کے خلاف برملا باتیں کرنے میں مشغول ہیں۔

بازار سے واپسی پر عصامی تاجر کے کمرے میں چلا گیا تاکہ وہ اس کو چلے جانے پر آمادہ کرے لیکن تاجر بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جیسے ہی میں باہر نکلوں گا، ابو مسلم کے آدمی پکڑ لیں گے۔

عصامی نے کہا۔ ''میں تجھ کو صحیح صحیح بتا رہا ہوں کہ میں خراسان کو چھوڑ رہا ہوں، پتا نہیں کس وقت چلا جاؤں۔ اس لیے تو آج رات کو یہاں سے چلا جا۔''

تاجر نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں تو مجھ کو کیوں نکالنا چاہتا ہے۔ روشنک نے میری شکایتیں کی ہوں گی۔''

عصامی نے کہا۔ ''روشنک نے تیری کوئی شکایت نہیں کی۔''

تاجر نے عصامی کے کان میں کہا۔ ''عزیز من! ویسے میں بھی تجھ کو ایک ایسی بات بتاؤں گا کہ تو تعجب بھی کرے گا اور افسوس بھی!''

عصامی نے پوچھا۔ ''کونسی بات؟''

تاجر نے کہا۔ ''روشنک پر بہت زیادہ اعتبار بھی نہ کر، یہ تیرے علاوہ بھی کسی اور کو چاہتی ہے۔''

عصامی نے غصے میں کہا۔ ''اچھا، تو اب تو ہم دونوں کو لڑوانا چاہتا ہے۔''

تاجر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''تم دونوں لڑو گے تو مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ آج تیری عدم موجودگی میں، میں نے

روشن دان سے روشنک کو خط لکھتے ہوئے دیکھا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ تجھ کو تو خط لکھنے سے رہی۔ اب تو ہی بتا کہ وہ کس کو خط لکھ سکتی ہے؟"

عصامی کے دل میں شبہ بیٹھ گیا۔ "اگر وہ کچھ لکھ رہی تھی، تو اس سے تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ وہ کسی کو خط ہی لکھ رہی تھی۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "کوئی پڑھی لکھی عورت کیا لکھ سکتی ہے، حساب کتاب تو لکھنے سے رہی۔"

عصامی نے پوچھا۔ "میری عدم موجودگی میں یہاں کوئی آیا تھا؟"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں تو اندر بند تھا، مجھے کیا پتا کہ یہاں کوئی آیا تھا یا نہیں۔"

عصامی نے کچھ دیر سوچتے ہوئے کہا۔ "تو تیرے بقول روشنک کسی کو خط لکھ رہی تھی؟ مگر کس کو لکھ رہی تھی؟ اور وہ خط بھیجا بھی گیا یا اس کے پاس موجود ہے؟"

اس کے دل میں شبہ بھی تھا کہ کہیں تاجر باہر نکلنے کے لیے ایسی باتیں تو نہیں کر رہا۔ اس نے تاجر کو تو دوبارہ بند کر دیا اور سیدھا روشنک کے پاس پہنچا، بولا۔ "روشنک! میں نے تاجر سے بات کر لی ہے۔ آج رات کو وہ چلا جائے گا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آج ہم دونوں شام ہی سے کہیں ٹل جائیں تاکہ تاجر ہماری عدم موجودگی میں گھر سے فرار ہو۔"

روشنک کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، عصامی نے کہا۔ "پہلے تو غسل کر لے۔"

روشنک غسل کرنے چلی گئی، اس کی عدم موجودگی میں عصامی نے روشنک کے سامان میں مذکورہ خط تلاش کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کپڑوں کی تہ میں سے وہ خط برآمد کر لیا۔ خط دیکھ کر اس کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ غم، غصے اور افسوس نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔ خط کو لے کر وہ فوارے کے پاس چلا گیا اور پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے خط پڑھ رہا تھا، اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ خط ختم کرتے ہی وہ لمبو کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور دل و دماغ نے کچھ سوچنے ہی سے انکار کر دیا۔

یہ خط امیر المومنین مروان بن محمد کے نام تھا۔

"کنیز روشنک، امیر المومنین مروان بن محمد سے دست بستہ عرض پرداز ہے کہ کنیز کے ذمے جو خدمت سونپی گئی تھی، اسے میں نے پوری ہوش مندی اور ہوشیاری سے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ عصامی نے ابو مسلم تک رسائی حاصل کر لی تھی لیکن میں اس کو ابو مسلم سے حد درجہ خوفزدہ محسوس کر رہی ہوں۔ چنانچہ عصامی میں موجود اس کا یہی خوف اس کو کام نہیں کرنے دے رہا ہے۔ ابو مسلم کو شبہ ہی نہیں بلکہ یہ یقین ہو گیا ہے کہ عصامی امیر المومنین کا کارندہ ہے اور امیر المومنین ہی کے لیے کام کر رہا ہے۔ چونکہ خراسان میں امیر المومنین کی حکومت ہے، اس لیے ابو مسلم عصامی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ ایک رات کو وہ اپنے چہرے کو کپڑے میں چھپائے ہوئے عصامی کے پاس آیا اور آٹھ آدمیوں کا کھانا اکیلا ہی کھا گیا۔ اس کی باتیں میں نے بھی سنیں اور ان سے اس نتیجے پر پہنچی کہ ابو مسلم عصامی کو یہ بتانے آیا تھا کہ اس نے عصامی کو پہچان لیا ہے۔ اس نے عصامی کو دھمکیاں بھی دیں اور لالچ بھی دیا اور اس کی پوری کوشش یہ رہی کہ کسی طرح عصامی کو توڑ لے اور اس سے نصر بن سیار کی مخبری کا کام لے۔ بظاہر تو عصامی نے انکار نہیں کیا اور ابو مسلم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہ کام کرے گا لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے جھوٹا وعدہ کیا ہے کیونکہ اگر وہ یہ وعدہ نہ کرتا تو ابو مسلم اس کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا اور عصامی ابو مسلم کے قرب سے محروم ہو جاتا۔ بہر حال، میں عصامی کی نگرانی کر رہی ہوں اور یہ جب تک امیر المومنین کے مفاد میں کام کرے گا، میں خاموش رہوں گی اور امیر المومنین کو مطلع کرتی رہوں گی لیکن جس دن بھی اس نے باغیانہ روش اختیار کی اور دشمنوں سے مل گیا، میں امیر المومنین کی ہدایت اور تاکید کے بموجب زہر دے کر عصامی کا کام تمام کر دوں گی۔"

اس خوفناک سازش نے عصامی کو دیوانہ کر دیا۔ روشنک کا لگاؤ محبت اور اس کی اندازِ دلبری، سب کچھ بناوٹی تھا، فرضی مروان بن محمد کے لیے اس کی ہدایت اور تاکید کے مطابق، اس کو روشنک کی شکل میں ایک ناگن نظر آئی جو اس کی آغوش میں پڑی ڈسنے کی تاک میں ہو۔

اس نے روشنک کے غسل سے فارغ ہونے کا بھی انتظار نہ کیا، خط کو اپنے قابو میں کیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دروازے سے دیکھا، چند گھڑسوار اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے، ان کے بازوؤں پر سیاہ وجھیاں بندھی ہوئی تھیں اور پہلوؤں میں تلواریں لٹک رہی تھیں۔ عصامی نے خطرے کی بو محسوس کر لی لیکن وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔

اچانک ان گھڑسواروں کے پیچھے سے ایک اور سوار نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سیاہ عمامے میں چھپا ہوا تھا، وہ عصامی

ہی کی طرف چلا آرہا تھا۔ گھوڑے کی سبک رفتاری سے گھڑ سوار گھوڑے کی پشت پر اچھل اچھل کر گر رہا تھا۔

گھڑ سوار نے عصامی کے پاس پہنچ کر لگام کھینچ لی، گھوڑا رک گیا۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا اور اپنے چہرے پر سے سیاہ عمامہ ہٹا دیا۔ یہ ابو مسلم خراسانی تھا۔ عصامی کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔

اب ابو مسلم کے ساتھی بھی اس کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اتر چکے تھے۔ ابو مسلم نے آگے بڑھ کر عصامی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کیا تو دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا؟ تجھ کو ہماری آمد کی اطلاع کس نے دی؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں نے دروازے کی درز سے سیاہ نشان سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ اہلِ بیت کے پرستاروں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا اور میں اختیاماً باہر آ گیا۔''

ابو مسلم نے مکان کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ ''تیری طاقت لسانی کا میں قائل ہوں۔ جب تجھ کو ہمیں دور ہی سے دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اہلِ بیت کے پرستار آ رہے ہیں تو یہ بات بھی تجھ کو معلوم ہو گی کہ اہلِ بیت کے پرستار تیرے پاس کیوں آ رہے ہیں؟''

عصامی ذرا سی دیر کے لیے بدحواس ہوا، مگر پھر ہوش و حواس مجتمع کر کے جواب دیا۔ ''کیا آپ لوگ مجھے شرفِ میزبانی عطا کریں گے؟''

ابو مسلم نے سختی سے کہا۔ ''ایک ایسے شخص کا مہمان بننا جو امام ابراہیم کی گرفتاری اور قتل کا باعث رہا ہو، ہم سب کی بے عزتی اور توہین ہے۔''

عصامی نے گھر کا دروازہ کھول دیا اور پہلے خود داخل ہوا، بعد میں ان سب کو بلایا۔ ''آپ لوگ اندر آ جائیں، دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا غیر مہذبانہ عمل ہے۔''

ابو مسلم نے اور زیادہ سختی سے کہا۔ ''تاجر کو ہمارے حوالے کر دے، بقیہ باتیں بعد میں ہوں گی۔''

اب عصامی انکار نہیں کر سکتا تھا، بولا۔ ''صاحبان اگر آپ لوگ نہ آتے میں تب بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیتا اور تاجر کی گرفتاری کی اطلاع پہنچاتا، میں نے اس کو اندر قید کر رکھا ہے۔''

ابو مسلم اور اس کے ساتھی اندر داخل ہو گئے۔ ابو مسلم نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اندر کمرے میں قید ہے لیکن اس کو حوالے کرنے سے پہلے میں آپ سے چند درخواستیں کرنا چاہتا ہوں۔''

ابو مسلم نے کہا۔ ''درخواستوں کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تو ان درخواستوں کے بغیر ہی محفوظ رہے گا۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ تو مروان بن محمد کا نمک خوار ہے، میں تجھ سے محاسبہ نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ تاجر تیرا آلۂ کار بن کر مروان تک پہنچا تھا۔ میں تاجر کو سزا دوں گا اور تو اس دن سے ڈر، جب اہلِ بیت اقتدار میں آ جائیں اور دشمنانِ اہلِ بیت کا محاسبہ شروع ہو۔''

عصامی لاجواب ہو گیا، ابو مسلم سے کہا۔ ''دو آدمیوں کے ساتھ اندر آ جائیے اور اپنے قیدی کو لے جائیے!''

اس کے بعد عصامی اندر گیا، روشنک غسل کے بعد لباس بدل کر بال سکھا رہی تھی۔ عصامی نے سرد مہری سے کہا۔ ''روشنک! پردے میں چلی جا تاکہ ابو مسلم اپنے مفرور کو لے جائے۔''

روشنک اس کی بات نہیں سمجھ سکی، پوچھا۔ ''ابو مسلم اپنے مفرور کو لے جائے، کیا مطلب؟''

عصامی نے بدستور بے رخی سے کہا۔ ''میری بات کا ایک ہی مطلب ہے۔ تاجر ابو مسلم کا مفرور ہے اور میں اس مفرور کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ مجبوراً ابو مسلم کے حوالے کر رہا ہوں۔''

روشنک نے احتجاج کیا۔ ''تاجر کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے، دھوکے بازی ہے، تجھ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔''

عصامی نے سختی سے کہا۔ ''اب زیادہ باتیں نہ بنا دوسرے کمرے میں چلی جا، ہی منافقت کی بات، تو یہاں کون ہے جو منافق نہیں، کیا تو منافق نہیں ہے؟ کیا میں منافق نہیں ہوں؟ کہہ تو دیا، دنیا کا ہر شخص منافق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا کے اکثر منافقوں کی منافقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔''

روشنک دوسرے کمرے میں چلی گئی تو عصامی نے... بہ آوازِ بلند کہا۔ ''صاحبان! آپ لوگ اندر آ جائیں۔''

ابو مسلم اور اس کے چند ساتھی بھرمار کر اندر داخل ہو گئے۔ عصامی ان کی رہنمائی کرنے لگا اور تاجر کے کمرے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''اس کمرے میں آپ کا قیدی ہے، آپ کا اختیار ہے کہ اسے یہاں رکھیں یا اپنے ساتھ لے جائیں۔''

ابو مسلم نے دروازہ کھول دیا۔ تاجر سامنے ہی کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو تاجر پر غشی طاری ہو گئی۔ وہ

مارے خوف کے بے ہوش ہوگیا۔

ابو مسلم نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اس کو کاندھے پر ڈال لو۔ پھر عصامی سے کہا۔ ''افسوس کہ میں تیرا شکریہ نہیں ادا کروں گا کیونکہ یہ تیرے پاس چھپا ہوا تھا اور فرار کی راہیں تلاش کررہا تھا۔''

عصامی کے پاس ان کھری اور سچی باتوں کا کوئی جواب ہی نہ تھا' چپ چاپ کھڑا رہا۔

ابو مسلم کا ایک ساتھی آگے بڑھا اور تاجر کو کاندھے پر ڈال لیا۔ ابو مسلم نے اپنے ساتھیوں کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے۔ ابو مسلم نے عصامی سے کہا۔ ''عصامی! آج بنو امیہ یا آلِ مروان میں ایک بھی ایسا نہیں جو ہمیں دھوکا دے سکے۔ میں ایک ایک کو پہچانتا ہوں۔ تو بھی اس فہرست میں موجود ہے، جو ہمارے محاسبے سے نہیں بچیں گے لیکن ابھی تجھ سے کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

عصامی خاموش رہا۔ وہ ابو مسلم کے ساتھ ساتھ صدر دروازے تک گیا۔ اس نے دیکھا، ابو مسلم کے ساتھی تاجر کو باندھنے میں مشغول تھے۔ باندھنے کے بعد انہوں نے تاجر کو پوری طرح گھوڑے کی پشت پر ڈال دیا۔ اس کے بعد ہر شخص اچھل اچھل کر اپنے اپنے گھوڑے پر بیٹھنے لگا۔ تاجر والے گھوڑے پر سب سے زیادہ قوی ہیکل بیٹھ گیا۔

ابو مسلم اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور عصامی سے کہا۔ ''عصامی! جیسا کہ میں نے تجھ کو یقین دلایا ہے کہ میں یا میرے ساتھی تجھ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، میں پھر یہی دہراؤں گا کہ تو سردست ہمارے ہاتھوں گزند نہیں اٹھائے گا۔ کل اس تاجر پر مقدمہ چلے گا۔ اگر تو آنا چاہے تو آسکتا ہے۔ میرا گھر تو تو نے دیکھ ہی رکھا ہے۔''

عصامی نے اوپری دل سے وعدہ کرلیا کہ آئے گا لیکن دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا اس مصیبت کو جلد دفع کر۔

ابو مسلم نے اپنے چہرے کو سیاہ عمامے میں چھپالیا اور جدھر سے آیا تھا، اسی طرف واپس چلا گیا۔

عصامی دوبارہ اندر گیا، روشنک فوارے کے پاس افسردہ کھڑی تھی۔ عصامی اس سے نظریں ملائے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے روشنک بھی پہنچ گئی اور بڑے کرب سے پوچھا۔ ''عصامی! یہ تو نے کیا کردیا؟''

عصامی نے طنزاً پوچھا۔ ''میں نے کیا کردیا؟ اور جو کچھ ہوا، اس پر تو حیرت زدہ کیوں ہے؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''یعنی اس میں حیرت کی کوئی بات ہی نہیں۔ تاجر کو ہم نے پناہ دی تھی اور پھر اس کو ابو مسلم کے حوالے بھی کردیا۔ یہ غداری نہیں تو اور کیا ہے، یہ دغابازی نہیں تو پھر دغابازی کہتے کس کو ہیں؟''

عصامی نے کہا۔ ''غداری اور دغابازی اس کو نہیں کہتے۔ اگر میں تاجر کو ابو مسلم کے حوالے نہ کرتا تو وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے زبردستی نکال کرلے جاتا، میں اس کی حوالگی پر مجبور ہوگیا تھا۔''

روشنک نے بڑی معنی خیز نظروں سے عصامی کو گھورا۔ ''کہیں تو ابو مسلم سے مل تو نہیں گیا؟''

عصامی کو اس سوال میں زہر کی تلخی محسوس ہورہی تھی، اس نے سوچا۔ شاید یہی وہ موقع ہے جب روشنک اس کو زہر دے کر ہلاک کرسکتی تھی۔

روشنک نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کہیں تو ابو مسلم سے مل تو نہیں گیا؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اگر میں ابو مسلم سے مل گیا ہوتا تو اس وقت میں تیرے سامنے کھڑا نہ ہوتا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تو میری غداری کا یقین کرتے ہی امیر المومنین کی ہدایت اور تاکید پر مجھ کو زہر دے کر مار دیتی اور مجھ کو یہ موت منظور نہیں۔''

روشنک تلملا کر کھڑی ہوگئی، فوراً بھاگی بھاگی اپنے لباس والے کمرے میں گئی اور کپڑوں کی تہیں کھول کھول کر اپنا خط تلاش کرنے لگی۔

عصامی نے روشنک کا خط انگلیوں میں دبا کر دور سے کہا۔ ''روشنک! تو جس خط کو تلاش کررہی ہے، وہ میرے پاس ہے۔ اس کو مت تلاش کر۔''

روشنک خط چھیننے کے لیے جھپٹی لیکن عصامی نے اس کو دھکا دے دیا۔ ''روشنک! اب فضول نہ الجھ، افسوس کہ میں نے تجھ سے محبت کی اور تیری خاطر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تجھ کو لے کر کسی دور دراز علاقے میں چلا جاؤں گا اور بقیہ زندگی تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں گزار دوں گا لیکن تیرا خط پڑھ کر میں اپنی حماقت اور سادگی پر آنسو بہا رہا ہوں۔ افسوس کہ میں نے ایک ناگن کو حور سمجھ لیا تھا۔''

روشنک نے سختی سے کہا۔ ''اچھا، اب یہ خط مجھے واپس دے دے۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ اب یہ خط میرے ہی پاس رہے گا۔''

روشنک نے کہا۔ ''تو پچھتائے گا۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''میں لاعلمی میں تو پچھتا سکتا

تھا لیکن اب میں نہیں پچھتاؤں گا۔"

روشنک نے بدستور سختی سے کہا۔ "تو اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہے۔"

عصامی نے جواب دیا۔ "غلط فہمی مجھ کو نہیں، تجھ کو ہے اپنے بارے میں۔ یہ جتنی جلدی دور ہو جائے بہتر ہے تیرے حق میں۔"

روشنک بھاگتی ہوئی دوبارہ اپنے کمرے میں گئی جیسے وہ عصامی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے والی ہے۔ عصامی مکان سے نکل گیا۔ اس کی جیب میں چند درہم و دینار پڑے تھے۔ انہیں ٹٹولا اور ان کی موجودگی کا یقین کر کے پڑاؤ کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے معلوم نہیں کیا خیال آیا کہ وہ سیدھا ابو مسلم کے پاس پہنچا اور کہا۔ "ابو مسلم! آج میں نے مروان اور بنو امیہ کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ میں نے روشنک کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھ کو مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اب مروان مجھ کو قتل بھی کرا سکتا ہے۔"

ابو مسلم کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ بولا۔ "اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟ اور یہ تیری قسمت میں موجود ہے کہ اگر بنو امیہ تجھ کو پا جائیں تو دار پر چڑھوا دیں..... اسی طرح صاحب اختیار ہونے کے باوجود میں بھی تجھ کو کوئی نہ کوئی سزا دینے کے حق میں ہوں۔"

عصامی نے عاجزی سے کہا۔ "ابو مسلم! میں تیری پناہ میں آ چکا ہوں، اس لیے مجھ کو مایوس نہ کر۔"

ابو مسلم نے سختی سے کہا۔ "عصامی! تیری محفل کہاں ہے ان دنوں۔ تو یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے مجھ سے؟ تو یہیں خراسان ہی میں رہ۔"

عصامی نے کہا۔ "ابو مسلم! اللہ میرے لیے کوئی صورت نکال، ورنہ میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے۔"

ابو مسلم نے کہا۔ "اچھا، آ میرے ساتھ چل۔"

عصامی، ابو مسلم کے ساتھ ایک عمارت میں گھس گیا۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی اس کے خلاف... سازش تو نہیں کر رہا ہے۔

عصامی کو ایک ایسے وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا گیا، جہاں پہلے ہی سے خاصا ہجوم تھا۔ وہاں عدالت کے جیسا منظر تھا۔ تاجر کو رسیوں سے باندھ کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔

جب وہ ابو مسلم کے ساتھ وہاں پہنچا تو عدالت اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ تاجر زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کی نظر اچانک عصامی پر پڑ گئی، وہ چیخا۔ "لوگو! یہ بھی تو تھا میرے ساتھ۔ میرا شریک جرم۔ اس کو تو مروان نے حسن کارکردگی کے صلے میں روشنک نامی ایک حسین کنیز بھی عطا کی تھی۔ اس کو بھی سزا دی جائے!"

ابو مسلم نے جواب دیا۔ "اے بدبخت! بکواس بند کر۔ عصامی اپنا آدمی نہیں ہے، اسی لیے اس نے جو کچھ کیا، ہم سرِدست اس کا محاسبہ نہیں کر سکتے لیکن ہم اپنی صفوں میں موجود غداروں کو ہرگز ہرگز معاف نہیں کریں گے۔"

تاجر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بار بار رحم کی درخواست کر رہا تھا۔

کئی آدمی تاجر کو شانوں سے پکڑ کر عمارت کے صحن میں لے گئے۔ ابو مسلم اور عصامی بھی وہیں پہنچ گئے، ابو مسلم نے کہا۔ "پہلے تو یہ طے پایا تھا کہ تاجر پر کل مقدمہ چلایا جائے لیکن پھر چند بڑوں کی رائے بدل گئی اور انہوں نے اس پر زور دیا کہ وقت ضائع نہ کیا جائے اور آج کا کام کل پر نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ اسی وقت مقدمہ چلا دیا گیا۔ مسئلہ صاف تھا اس لیے عدالت نے فوراً ہی سزا بھی سنا دی۔"

عصامی نے پوچھا۔ "اس کو کیا سزا دی گئی؟"

ابو مسلم نے جواب دیا۔ "سزا تیرے سامنے دی جائے گی۔ اس لیے پوچھنے کے بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

صحن میں آگ جل رہی تھی اور پتھروں کے چولہے پر ایک بہت بڑا کڑھاؤ چڑھا ہوا تھا۔ اس کڑھاؤ میں تیل کڑکڑایا جا رہا تھا۔ تاجر کو اس کڑھاؤ کے قریب کھڑا کر دیا گیا۔ پھر اچانک دو آدمی تاجر پر جھپٹے اور اس کو زمین پر گرا دیا۔ ایک نے اس کا داہنا ہاتھ زمین پر ٹکا دیا اور اس طرح دبائے رکھا کہ تاجر اپنی مرضی اور ارادے سے ہاتھ کو ذرا سی بھی جنبش تک نہ دے سکتا تھا۔

ابو مسلم آگے بڑھا اور شمشیر بردار شخص کو حکم دیا۔ "تعمیل!"

شمشیر والا ہاتھ اوپر اٹھا اور جب نیچے گرا تو تاجر کا ہاتھ کلائی سے کٹ چکا تھا۔ ایک دوسرے شخص نے انگیٹھی والا حصہ کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔

ابو مسلم کی آواز "تعمیل" پر شمشیر بردار کا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور نیچے گر کر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ گیا۔ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو ایک بار پھر کڑھاؤ میں ڈال دیا گیا۔ تاجر بڑی کربناک آواز میں چیخا اور بے ہوش ہو گیا۔ عصامی پر اتنی بری طرح دہشت طاری ہوئی کہ وہاں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ وہ ابو مسلم سے کچھ کہے بغیر ہی باہر چلا گیا۔

عصامی کے پیچھے پیچھے ایک آدمی بھاگا اور اس نے عصامی کو مکان کے باہر روک لیا، بولا۔ ''جناب! ابو مسلم کا حکم ہے کہ ابھی آپ نہ جائیں، وہ آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔''

عصامی نے پوچھا۔ ''اگر میں تیرا کہنا نہ مانوں تو؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''تب ہم زبردستی کریں گے اور کھینچ کر اندر لے جائیں گے۔''

عصامی ڈرا کہ ابو مسلم معلوم نہیں کیوں اس کو دوبارہ بلا رہا ہے۔ وہ اندر گیا، ابو مسلم اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تاجر کے دونوں ہاتھ کاٹ کر پہلے ہی کڑھاؤ میں ڈالے جا چکے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے خون جاری تھا اور تاجر بے ہوش پڑا تھا۔ ابو مسلم نے عصامی کو آواز دی۔ ''عصامی! ادھر میرے قریب آجا، یہ منظر تجھ کو بطورِ خاص دکھانا مقصود تھا۔''

عصامی سہما سہما ابو مسلم کے پاس کھڑا ہوا۔ ابو مسلم نے دوبارہ ... تعمیل، تعمیل کہنا شروع کر دیا اور ہر حکم تعمیل پر تاجر کا کوئی نہ کوئی عضو کاٹ کر کڑھاؤ میں ڈال دیا گیا۔ یہاں تک کہ دونوں ٹانگیں بھی کٹ گئیں اور صرف دھڑ باقی رہ گیا۔ آخر میں یہ دھڑ بھی کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا گیا۔

عصامی نے اتنا لرزہ خیز اور روح فرسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، چنانچہ اس پر اس کا اتنا برا اثر پڑا کہ وہ دیر تک اپنے حواس ہی میں نہ رہا۔ آخر ابو مسلم نے کہا۔ ''اب تو جا سکتا ہے لیکن میری یہ بات یاد رکھنا کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں۔ جب تم سب کا یوم الحساب آجائے اور جب محاسبہ شروع ہوگا تو تیرا محاسبہ بھی ہوگا اور تو محاسبے اور مواخذے سے کسی طرح بھی نہیں بچ سکے گا۔''

عصامی کوئی جواب دیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا اور وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ مروان بن محمد کی طرف داری میں بھی جان کا خطرہ تھا اور ابو مسلم کا قرب بھی خطرناک تھا۔ گویا وہ اس وقت جہاں کھڑا تھا اس کے سامنے موت کی خندق تھی اور پیچھے چاہِ ہلاکت تھا۔ فرار کی راہیں مسدود تھیں۔ وہ بھاگ کر جہاں بھی جاتا امیر المومنین مروان بن محمد کی حدودِ سلطنت سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

اب اس کے سامنے ایک ہی ٹھکانا تھا، دمشق میں فضل کا محل لیکن فضل بھی امیر المومنین مروان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خلافت کے معتوب کو وہ پناہ بھی نہ دے۔

عصامی اپنے گھر نہیں گیا۔ کوفہ جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گیا۔ اب وہ کوفہ جا رہا تھا اور وہاں سے دمشق کا ارادہ تھا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اطلاع ملی، خراسان کے لاکھوں جنگجو بنو امیہ کے خلاف گھروں سے باہر آگئے ہیں اور نصر بن سیار نے راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ خراسانیوں نے ابو مسلم کی سربراہی میں کھلم کھلا بغاوت کر دی ہے اور انہوں نے سیاہ لباس پہن کر ڈنڈے سنبھال لیے ہیں اور انہوں نے ان ڈنڈوں کا نام کافر کوب رکھ دیا ہے۔

کوفے پہنچ کر معلوم ہوا کہ ابو مسلم کی فوجیں حران کی طرف مروان سے جنگ کرنے کے لیے بڑھ رہی ہیں۔ مروان بھی گاؤں گاؤں، قریہ قریہ دورے کر رہا تھا اور اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش میں مشغول تھا۔

عصامی دمشق کے قریب پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، دمشق کے مینار دور ہی سے نظر آرہے تھے۔ وہ غوطۂ دمشق میں پھیلے ہوئے کھیتوں اور باغوں کی پرسکون فضا میں پہنچ کر یہ سوچنے لگا کہ یہاں کہیں اس بے چینی اور انتشار کا شائبہ تک نہیں ملتا جو خراسان سے کوفے اور کوفے سے موصل اور حران تک پایا جاتا تھا۔

دمشق میں داخل ہوتے ہوئے اس کو عروسہ، صفیہ اور منشی یاد آرہی تھیں جن میں سے ہر ایک نے اس میں بڑی دلچسپی لی تھی۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی رجوع نہ کر سکتا تھا، اس کو عقیل یاد آیا۔ وہ عصامی کا مخالف اور اوباش طبع نوجوان، جس سے اس کا باپ فضل بے حد محبت کرتا تھا۔

وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا، جو بظاہر تاریک تھا بنو امیہ اور ابو مسلم کے تصادم میں کوئی بھی جیتے، عصامی کو دونوں سے فلاح کی امید نہیں تھی۔ اس کو روشنک بھی یاد آئی جو اس کی کنیز سے زیادہ مروان بن محمد کی مخبر اور اس کے مفادات کی محافظ تھی۔ یہاں تک کہ وہ عصامی کو زہر دے کر ہلاک بھی کر سکتی تھی.... روشنک اس سے محبت نہیں کرتی اور اس کی مسکراہٹ، پیار محبت کی باتوں اور اس کے بظاہر مخلصانہ طرزِ عمل میں اس کا قاتل کردار موجود.... تھا۔ روشنک اس سانپ جیسی تھی جو صندل سے محبت کرنے کے باوجود ہم آغوشی کے دوران اپنا زہر دور نہیں کرتا۔ روشنک نے ساری عورتوں کو مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا تھا۔

اس نے ایک باغ سے کسی شخص کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس نوجوان عصامی کے پاس آکھڑا ہوا اور پوچھا۔ ''جناب! کیا آپ کا نام

Digitized by Google

عصامی ہے؟''

نوجوان نے چونک کر جواب دیا۔''ہاں، میرا نام عصامی ہے لیکن تو مجھ کو کس طرح جانتا ہے؟''

نوجوان نے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہاں میرا آقا فضل آپ کو بلا رہا ہے۔''

عصامی فضل کا نام سنتے ہی اضطراری حالت میں باغ کی طرف بڑھا۔ باغ میں داخل ہوتے ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور بے اختیار فضل سے چمٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

فضل نے محبت سے اس کی پشت تھپتھپائی، بولا۔''عصامی تو اچانک آگیا، اپنے آنے کی پیشگی اطلاع تک نہ دی۔''

عصامی نے جواب دیا۔''میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔''

فضل نے پوچھا۔''شرمندگی کی وجہ؟''

عصامی نے جواب دیا۔''اگر آپ گھر تشریف لے چلیں تو میں سب کچھ بتادوں گا۔''

فضل نے کہا۔''میں آج جانے ہی والا تھا، وہ تو تجھ سے یوں ملاقات مقدر میں تھی، تو ہوگئی۔ چل، گھر چلتے ہیں۔''

وہ دونوں کچھ دیر بعد دمشق روانہ ہوگئے۔

راستے میں فضل نے کہا۔''افسوس کہ بنوامیہ رخصت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ لوگ لے رہے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں اور جن کے اقتدار اور اقبال کا سورج جب طلوع ہوگا تو بنوامیہ اور ان کے حلیف خاک و خون میں لوٹ رہے ہوں گے، میں اپنے آپ کو بھی مردوں میں شمار کر چکا ہوں۔ میری عزت و آبرو، میرا مال و زر، میرا قصر، میرے باغات عنقریب دشمنوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ عصامی! آج کل میں بے حد رنجیدہ ہوں۔''

عصامی نے کہا۔''میں نے خراسان میں اہلِ اقتدار کو بے بس اور محکوموں کو جری دیکھا ہے۔''

فضل نے المیہ لہجے میں کہا۔''اگر مجھ کو پہلے ہی سے یہ اندازہ ہوجاتا کہ مروان بن محمد حالتِ چل چلاؤ میں ہے تو میں اس سے اجتناب برتتا اور اس کی امداد و اعانت میں پیش پیش نہ رہتا۔''

عصامی اور فضل جب اپنے محل میں داخل ہوئے تو وہاں بہار آگئی۔ بخشی اور عروسہ بھاگی بھاگی آئیں اور بڑے جوش و خروش سے خوش آمدید کہا۔ صفیہ بھی آئی مگر اس نے تحمل اور سنجیدگی سے دور کھڑے ہوکر پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا۔

فضل نے عصامی سے کہا۔''تو تھکا ہوا ہے، اس لیے پہلے تو غسل کر اور کچھ کھا پی کر آرام کرلے، اس کے بعد ہم دونوں آنے والے پُرآشوب دنوں کے لیے نئے منصوبے بنائیں گے۔''

عصامی واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے غسل کیا، کچھ دیر بعد مقامی موسمی پھل پیش کیے گئے جنہیں عصامی بڑے شوق سے کھاتا رہا۔

بخشی نے کہا۔''عصامی! تو اس لائق تو نہیں ہے کہ تجھ پر توجہ دی جائے۔ مجھ کو غصہ ہے کہ تو واپس کیوں آگیا، میں نے تو تجھ کو اپنے خیالوں تک سے نکال دیا تھا۔''

عصامی نے پوچھا۔''میری خطا؟ غلطی، قصور؟ پھر یہ سزا کیوں؟''

بخشی نے جواب دیا۔''تو نے خراسان جا کر ہم سب کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔''

عروسہ بھی ان دونوں کے بیچ میں بیٹھ گئی، بخشی کی بات کاٹ دی۔''میں نے تو یہ سنا تھا کہ امیر المومنین نے تجھ کو ایک خوبصورت کنیز عطا کی تھی، وہ کہاں چلی گئی؟ اور تو اس سے عشق کرنے لگا تھا۔''

عصامی کو رونا آگیا، بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔''مہ جبینو! تم کس بے وفا کا ذکر لے بیٹھیں!''

لیکن اس وقت عقیل بھی آگیا۔ اس نے بخشی اور عروسہ کے پاس عصامی کو جو دیکھا تو مشتعل ہوگیا، بولا۔''تو پھر آگیا؟ میرا خیال تھا کہ تو مرکھپ گیا ہوگا لیکن تو زندہ ہے۔'' پھر عروسہ کو ڈانٹا۔''عروسہ! مجھ کو تو یہ نوجوان ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، پھر تو اس میں کیوں دلچسپی لیتی ہے؟''

عروسہ نے جواب دیا۔''باوا جان نے عصامی کو اپنے خاندان میں شامل کرلیا ہے اور یہ ہم میں تیری ہی طرح رہے گا۔''

بخشی نے کہا۔''عقیل! اگر تجھ کو عصامی کی موجودگی پر اعتراض ہے تو اس سلسلے میں اپنے باپ سے بات کر۔''

عصامی نے کہا۔''دوستو! میں اس محل میں ہمیشہ نہیں رہوں گا کیونکہ اگر میں یہاں رہنا بھی چاہوں گا تو نہیں رہ سکوں گا۔''

عقیل نے طنزاً پوچھا۔''کیوں نہیں رہ سکے گا؟ عیش و عشرت کے اس محل میں، مال و زر کے اس ذخیرے میں تو کیوں نہیں رہ سکے گا؟''

عصامی نے جواب دیا۔''میرے مقدر کی برگشتگی مجھے کہیں بھی چین سے نہیں رہنے دے گی۔ بنوامیہ برسرِ اقتدار

رہیں یا بنو عباس اقتدار سنبھال لیں، میں دونوں ہی کا مجرم اور مستحقِ تعزیر ہوں۔ مجھے کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔"

عقیل نے اسی طرح ترش لہجے میں کہا۔ "میں حکومتوں کی بات نہیں کرتا، لیکن میں تجھ کو نہیں برداشت کرسکتا۔ کیونکہ تو کسی نہ کسی طرح میرے آبائی زرد مال اور جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

عقیل کا شور وغل اتنا بڑھا کہ محل کے سبھی لوگ وہاں پہنچ گئے۔ فضل نے بیٹے کو ڈانٹا۔ "یہ کیسی بدتمیزی ہے۔ عصامی ہمارا مہمان ہے اور مہمان کی تذلیل ہماری خاندانی روایات کے خلاف ہے۔"

عقیل نے بھی غصے ہی میں جواب دیا۔ "باوا جان! میں اس اجنبی نوجوان کو نہیں برداشت کرسکتا۔ آپ فیصلہ کرلیں کہ اس قصر میں مجھے رہنا چاہیے یا اس نوجوان کو۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوجاتا میں اپنے مضافاتی مکان میں چلا جاؤں گا۔"

فضل نے سختی سے کہا۔ "عقیل! مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ تو زیادتی کررہا ہے اس نوجوان پر، مجھ پر، پورے خاندان اور خاندانی روایات پر، تیرا طرزِ عمل جارحانہ اور ظالمانہ ہے۔"

عصامی کھڑا ہوگیا، بولا۔ "میرا خیال ہے خونی رشتوں کو آپس میں یوں لڑنا نہیں چاہیے۔ مجھ کو تو یوں بھی چلا جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ایک ہنستا کھیلتا، خوش و خرم خاندان انتشار اور ناچاقی کا شکار ہوجائے۔"

عقیل پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ صفیہ اس کو منانے دوڑی تو فضل نے منع کردیا۔ "صفیہ! اس کو چلا جانے دے، جب غصہ اترے گا تو اپنی غلطی کا خود ہی احساس ہوجائے گا۔"

عروسہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "بھائی عقیل اکثر زیادتی کرجاتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ انہوں نے آج تک اپنی کسی زیادتی کو تسلیم ہی نہیں کیا۔"

سختی نے بڑا گہرا طنز کیا۔ "رسول اللہؐ نے اولاد کو فتنہ اور آزمائش قرار دیا ہے، چنانچہ یہ نالائق بیٹا میرے آقا فضل کے لیے فتنہ اور آزمائش بنا ہوا ہے۔"

فضل نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں اور غصے کی شدت کو دباتے ہوئے بولا۔ "سختی! خدا کے لیے چپ ہوجا، میں عقیل کو بہت چاہتا ہوں اس لیے اس کو زیادہ دنوں تک ناراض اور دور نہیں دیکھ سکتا۔"

فضل کے غصے نے سبھی کو خاموش کردیا۔ عصامی شرمندہ تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے میزبان خاندان میں تلخیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ فضل کو افسوس تھا کہ اس کا بیٹا عقیل ایک مہمان کی بے عزتی کرکے اس کی اور اس کے خاندان کی اہانت کررہا تھا۔ عروسہ کو شکایت تھی کہ اس کا باپ فضل، عروسہ کے مقابلے میں عقیل کو ترجیح دے رہا تھا۔ صفیہ کو یہ دکھ تھا کہ ہر شخص اپنے اپنے احساسات اور جذبات کو کسی نہ کسی طرح عصامی پر ظاہر کررہا تھا لیکن وہ اس میں بالکل ناکام تھی اور سختی کو یہ ملال تھا کہ شاید عصامی بھی اس کی طرف زیادہ ملتفت نہیں تھا۔

☆☆☆

دریائے زاب کے ساحل پر مروان بن محمد اور بنو عباس کے لشکروں میں خوفناک تصادم ہوا اور اس معرکے میں بنو امیہ کی قسمت کا آخری فیصلہ ہوگیا۔ مروان شکست کھا کر بھاگا لیکن بنو عباس کے سپاہی اس کے تعاقب میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مصر میں بوصیر نامی گاؤں میں مروان کو اتفاقاً قتل کردیا۔ امام ابراہیم کا منجھلا بھائی عبداللہ ابوالسفاح امیر المومنین بن گیا اور اس نے فرمانِ خلافت جاری کرنا شروع کردیے خراسان اور اس کے آس پاس ابومسلم سیلاب کی طرح ہر پست و بلند کو کچلتا، پامال کرتا عراق کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔

دمشق میں مروان کے چچا کا بیٹا ولید حکمران تھا۔ اس نے مزاحمت کی لیکن وہ بھی مارا گیا۔ دمشق کو چاروں طرف سے محصور کرلیا گیا تھا۔ بنو امیہ کے خلفاء نے ان نئے حکمرانوں سے ساز باز شروع کردی تھی اور اب وہ بنو عباس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

بنو عباس کے پہلے خلیفہ ابوالسفاح کے حکم پر دمشق کا محاصرہ ابوالسفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے کیا تھا اور یہی وہ امیرِ عسکر عباسی تھا جس نے دریائے زاب کے ساحل پر مروان بن محمد کو شکست دی تھی۔

عبداللہ بن علی نے دمشق کے ہر دروازے پر فوجی دستے متعین کردیے تھے اور اندرونِ دمشق کھلبلی مچ گئی تھی۔ اکثریت امان کی شرط پر لڑے بغیر ہی محاصرین کو دمشق پر قبضہ دے دینا چاہتی تھی۔ فضل بے حد پریشان تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس نے ابھی سے امان کی کوئی تدبیر نہ سوچی تو چند دنوں بعد اس کے خاندان کا ایک متنفس بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے اس سلسلے میں عصامی سے مشورہ لیا، پوچھا۔ "عصامی! موجودہ حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

عصامی نے جواب دیا۔ "نئے حکمران کو خوش آمدید

کیجیے اور کوشش کیجیے کہ آپ ان کی دوستی حاصل کرلیں۔''

فضل نے کہا۔ ''افسوس کہ میں امیر المومنین مروان بن محمد کا معتمد ترین معاون تھا اور میری ان حیثیت سے ایک زمانہ واقف ہے۔ کیا یہ سب جاننے کے بعد بھی بنو عباس مجھ سے دوستی گوارا کرلیں گے؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''بنو عباس بھی انسان ہیں اور اب انہیں بہت زیادہ دوست درکار ہوں گے۔ یہ آپ کی صلاحیتوں پر ہے کہ آپ اپنی دوستی کا یقین کس طرح دلاتے ہیں۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ آپ ان کی دوستی بہر قیمت حاصل کریں گے اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو... جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کر کے دکھا دیتا۔''

فضل نے کہا۔ ''تب پھر ہم دونوں ہی بنو عباس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کریں۔''

عصامی نے جواب دیا۔ ''اپنے دل سے میرا تو خیال ہی نکال دیجیے کیونکہ میں جس جرم کا مرتکب ہو چکا ہوں، بنو عباس اس کو ہرگز معاف نہ کریں گے۔''

فضل نے پوچھا۔ ''کون سا جرم؟''

عصامی نے جواب دیا۔ ''بنو عباس کے پہلے خلیفہ ابوالسفاح کے بڑے بھائی امام ابراہیم کی گرفتاری اور ہلاکت میں میرا ہی ہاتھ تھا اور انہیں میں نے ہی گرفتار کرایا تھا، چنانچہ اب بنو عباس کو میری تلاش ہوگی۔''

فضل سوچنے لگا۔ ''تو یہ بات ہے! تو نے اتنا سنگین جرم کیا ہے، خدا تجھ پر رحم کرے۔''

فضل نے ایک دن اور ایک رات اسی سوچ میں غارت کردی کہ وہ بنو عباس کی دوستی کس طرح حاصل کرے؟ چنانچہ اس نے طے کرلیا کہ وہ جان پر کھیل کر بنو عباس کے پاس جائے گا اور ان کی دوستی حاصل کرنے کی... کوشش کرے گا لیکن وہ دمشق کے مشرقی دروازے سے جیسے ہی نکلا، عبداللہ بن علی کے آدمیوں نے اسے گرفتار کرلیا اور فضل کو اپنے امیر کے سامنے پیش کردیا۔ فضل نے عبداللہ سے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ''اے ابن علی! میں اپنی اور اپنے اہل خاندان کی زندگیوں کے تحفظ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''لیکن کل تو تُو آلِ مروان کا دوست تھا۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''بے شک اور اگر مروان بن محمد زندہ ہوتے تو میں اس وقت بھی انہی کا دوست ہوتا کیونکہ میں وفاداریاں بدلنے کا قائل ہی نہیں۔ اب آپ کا دوست بنوں گا۔ یہ دوستی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ ہم دونوں موجود اور زندہ ہیں۔''

عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''اس دوستی کی کون قدر نہیں کرے گا لیکن میں ایک شرط پر تیری دوستی قبول کروں گا۔''

فضل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پوچھا۔ ''کون سی شرط؟ وہ بھی بتا دیجیے!''

عبداللہ بن علی نے دل میں پیوست ہوجانے والی نظروں سے فضل کو دیکھا اور پوچھا۔ ''اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کررہا تو، تُو ہی وہ شخص ہے جس نے عصامی نامی نوجوان کو مروان بن محمد کی پراسرار خدمات پر تعینات کیا تھا اور شاید عصامی ہی وہ شخص ہے جس نے ہمارے تاجر دائی کو گرفتار کرادیا تھا اور پھر اس تاجر کو اسیر حرص کرلیا اور امام ابراہیم کی گرفتاری عمل میں آگئی اور وہ قتل کردیے گئے۔''

فضل جھوٹ نہ بول سکا، بولا۔ ''ہاں عصامی میرا ہی بھیجا ہوا تھا۔ میں بنو عباس کا گناہ گار ہوں اور معافی کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔''

عبداللہ بن علی نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں ہر مجرم کو معاف کرسکتا ہوں لیکن امام ابراہیم کے قاتل کو ہرگز معاف نہیں کرسکتا۔ میں تجھ سے اس کا پتا چاہتا ہوں۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں نہیں جانتا کہ آج کل عصامی کہاں ہے؟''

عبداللہ بن علی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''فضل! میں ان تمام سے نپٹوں گا جو اتنے سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔''

فضل نے کہا۔ ''جنابِ والا! میں کب کہتا ہوں کہ آپ اپنے خلاف ہونے والے جرائم کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اصولوں میں لچک ضرور ہونا چاہیے۔''

عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''جس طرح تو نے عصامی کو مروان کے حوالے کردیا تھا، اسی طرح عصامی کو میرے حوالے کردے، زندہ یا مردہ جس طرح بھی مناسب سمجھے یا جس طرح بھی بس چلے۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کروں گا۔ آپ مجھے موقع دیجیے۔''

عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''کوشش کرنا کیا معنی، یہ ناممکن ہے کہ تو عصامی کے ٹھکانے سے لاعلم ہو۔ چند دنوں میں دمشق فتح ہوجائے گا اس وقت تک اگر تو عصامی کو زندہ یا مُردہ پیش کرنے میں ناکام رہا تو میں بھی امان کا وعدہ نہیں کروں گا۔''

Digitized by Google

فضل مزید کوئی بات کیے بغیر اپنے قصر میں واپس آ گیا۔ اس کے اندر بڑی شورش تھی۔ بڑا ہیجان تھا۔ طوفان برپا تھا۔ وہ عصامی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ عصامی نے پوچھا۔ ''کیا عبداللہ بن علی نے امان دینے کا وعدہ کر لیا؟''

فضل نے عصامی پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر کر جواب دیا۔ ''ہاں، وعدہ کر لیا امان دینے کا۔''

عصامی نے شک و شبہے سے سوال کیا۔ ''کس شرط پر؟''

فضل نے جواب دیا۔ ''شرط فتح دمشق کے بعد بتائیں گے، فی الحال وعدہ کر لیا ہے۔''

عصامی نے محسوس کر لیا، جیسے فضل کچھ چھپا رہا ہے۔

چند دنوں بعد عبداللہ بن علی بزورِ شمشیر دمشق میں داخل ہو گیا۔ بنو امیہ کے نادان طرفداروں نے بنو عباس کے خلاف مسلح مزاحمت کی اور بے رحمی سے تہ تیغ کر دیے گئے۔

فضل ایک بار پھر عبداللہ بن علی کے پاس امان کی درخواست لے کر پہنچا۔ عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں لیکن تو نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''عبداللہ! میں تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں، اس کے بعد عصامی کو زندہ یا مُردہ پیش کروں گا۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''اے فضل! میں پندرہ دن دمشق میں رکوں گا اگر اس مدت میں تو نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تو خیر ورنہ بنو امیہ جیسا تیرا بھی انجام ہوگا۔''

فضل اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا، عصامی نے پوچھا۔ ''کیا میں آپ کی اداسی کا سبب معلوم کر سکتا ہوں؟''

فضل نے منہ پھیر لیا۔ ''عصامی! اپنا کام کر، سوال جواب سے میں تنگ آ چکا ہوں، خدا کے لیے خاموش رہ۔''

عصامی نے کہا۔ ''دمشق میں سکون ہو چکا ہے اور خدا نے آپ کے قصر کو مامون و مصئون رکھا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہیں اور چلا جاؤں۔''

فضل یوں تلملایا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ بولا۔ ''نہیں عصامی! تو کہیں بھی نہیں جائے گا۔ تو یہیں اس محل میں رہے گا۔''

عصامی نے کہا۔ ''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے، بنو عباس مجھ کو کسی طرح معاف نہیں کریں گے اور میری اس محل میں موجودگی آپ سب کی بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔''

فضل نے سختی سے جواب دیا۔ ''عصامی! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر۔ میں اپنی بربادی اور شادمانی کے اسباب جانتا ہوں، مجھ کو تیرے مشوروں کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

عصامی، فضل کے اس لب و لہجے سے اس نتیجے پر پہنچا کہ مہمان نوازی کے بوجھ تلے دبا ہوا یہ سردار اس لیے چڑچڑا ہو رہا ہے کہ اس نازک وقت میں وہ عصامی سے بے وفائی بھی نہیں کر سکتا اور اس کی موجودگی سے بنو عباس اس قصر پر جو تباہی لائیں گے، اس کا خوف سردار کے دل و دماغ پر بری طرح مسلط ہو چکا تھا۔

عروسہ نے بھی اپنے باپ کو بہت پریشان جو دیکھا تو پوچھا۔ ''باوا جان! ان دنوں آپ بہت پریشان ہیں، اگر کوئی حرج نہ ہو تو اس پریشانی کے سبب سے مجھ کو بھی آگاہ فرما دیں۔ ممکن ہے میں ہی کوئی معقول مشورہ دے سکوں۔''

فضل نے بیٹی کو وحشت ناک نظروں سے گھورا۔ ''عروسہ! اس وقت میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں کہ میری ذرا سی غلطی یا غلط فیصلہ میرے خاندان کی تباہی کا سبب بن جائے گا۔ مجھ کو بنو عباس نے موقع دیا ہے کہ میں اگر چاہوں تو ایک کو بچا کر پورے خاندان کو قربان کر دوں یا ایک کو قربان کر کے پورے خاندان کو بچا لوں۔''

عروسہ نے گھبرا کر سوال کیا۔ ''باوا جان! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

فضل نے جواب دیا۔ ''عروسہ! خاندانی اور نسلی روایات کو نظر انداز کر کے ایک کی قربانی دے کر پورے خاندان کو بچا لینا بہتر ہے یا یہ کہ خاندانی اور نسلی روایات کے پیشِ نظر پورے خاندان کو قربان کر کے ایک کو بچا لیا جائے۔ ان حالات میں میری جگہ تو ہوتی تو کیا کرتی؟''

عروسہ نے کسی حد تک باپ کا مفہوم پا لیا تھا۔ وہ لرز گئی، بولی۔ ''باوا جان! ان حالات میں آپ جو بھی فیصلہ کریں، پہلے یہ ضرور سوچ لیجیے گا کہ ہماری زندگیاں عارضی اور فانی ہیں۔ اس ہنگامۂ ابتلا میں نہ مرے تو بھی موت سے مفر نہیں۔ لیکن کسی غلط فیصلے سے جو داغ لگے گا، وہ ہمارے بعد بھی موجود رہے گا اور لوگ یہی کہیں گے کہ فضل نے اپنی عارضی اور فانی زندگی پر اعلیٰ قدروں کو قربان کر دیا۔''

فضل نے عروسہ کی ساری باتیں سنی نہیں، وہ اپنی بیٹی کے سامنے کھڑا تھا لیکن خیالات کہیں اور تھے۔ اس نے عروسہ کی آواز تو سن لی لیکن الفاظ نہیں سنے۔

فضل کا بہت برا حال تھا۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ عصامی کی تائید اور مخالفت میں ہانپنے لگا اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے آخری فیصلے پر زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا اور سوچ کے سارے دروازے بند کر کے عمل

Digitized by Google

کر گزرے گا۔

عشا کے وقت تک اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے خاندان اور مال وزر پر عصامی کو قربان کردے گا۔ اس میں اتنا حوصلہ اب بھی نہیں تھا کہ عصامی کو گرفتار کرکے عبداللہ بن علی کے حوالے کردے، چنانچہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ رات کو سوتے میں عصامی کو قتل کرکے اس کا سر عبداللہ بن علی کے حوالے کرکے..... اپنے خاندان اور مال وزر کے لیے امان حاصل کرلے گا۔ اس طرح وہ عصامی کی شاکی اور لعن طعن کرتی نظروں سے بھی محفوظ رہے گا اور کام بھی بہ آسانی انجام پاجائے گا۔

☆☆☆

عصامی، فضل کی تلخ گفتگو کے پس منظر پر بڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ اس نے رات کا کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا۔ اس کو بار بار یہی خیال ستا رہا تھا کہ شریف اور بہادر سردار حیا اور مروت کی وجہ سے اس کو روکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ عصامی کی اس قصر میں موجودگی اس کی بربادی اور تباہی کے محضر کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ نصف رات سے پہلے ہی عصامی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے میزبان کو تباہ و برباد نہیں ہونے دے گا اور صبح ہونے سے پہلے ہی چوری سے فرار ہوجائے گا۔

نصف رات سے ذرا پہلے ہی کسی نے آہستہ آہستہ اس کے دروازے پر دستک دی۔ عصامی کو شبہ گزرا کہ یہ بخشی یا عروسہ ہوگی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی رات کی تاریکی اور اپنی خواب گاہ کی تنہائی میں نہیں ملنا چاہتا تھا۔ اس نے دستک کا کوئی جواب نہ دیا اور دم سادھے پڑا رہا۔

کسی نے پھر دستک دی اور اس بار دستک میں ذرا غصہ اور جھنجلاہٹ بھی شامل تھی۔ عصامی دروازے کے پاس کان لگا کر کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''اس وقت میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا، کیونکہ رات کے سناٹے میں خلوت میں ملاقات کرکے میں اپنے محسن کی عزت و آبرو پر داغ نہیں لگاؤں گا۔ باہر جو بھی ہو، واپس چلا جائے۔ اللہ نے چاہا تو صبح ملاقات ہوجائے گی۔''

باہر سے مردانہ آواز میں اور بھنچے بھنچے لہجے میں کسی نے ڈانٹا۔ ''او خود غرض اور دوسروں کے مال وزر پر بری نظریں رکھنے والے بد دیانت اور خبیث انسان! میں ہوں، شرافت سے دروازہ کھول دے ورنہ میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرلوں گا۔''

یہ عقیل کی آواز تھی۔ عصامی نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ عقیل اندر داخل ہوگیا اور دروازہ بند کرکے اس سے اپنی پشت لگا دی۔

عصامی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ قدرے رک رک کر سوال کیا۔ ''اتنی رات گئے اس طرح میرے پاس آنے کا مقصد؟''

عقیل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آہستہ بول۔ آواز کمرے کے باہر نہ جائے۔''

پھر دروازے کے پاس سے ہٹ کر دوسرے کنارے چلا گیا اور عصامی کو اپنے پاس بلایا۔ عصامی اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

عقیل نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''عصامی! میں دن کے اجالے میں بھی آسکتا تھا لیکن میں اپنے ہی قصر میں رات کو چوری سے داخل ہوا ہوں۔ بنو امیہ کی حکومت ختم ہوگئی، بنو عباس نے اقتدار سنبھالا، میرا خیال ہے اب باوا جان کو تیری ضرورت نہیں رہی۔''

عصامی نے کہا۔ ''عقیل! جو کچھ تو کہنا چاہتا ہے، مختصراً کہہ دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں تجھے تنگ نہیں کروں گا۔ تو جو کچھ کہے گا، میں اسے مان لوں گا۔''

عقیل نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تو یہاں سے اسی وقت چلا جا۔ یوں بھی تیرا اس قصر میں رہنا ہمارے اور خود تیرے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے باپ کی میزبانی میں تجھ پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ اپنی خاندانی روایات اور اقتدار کے پیش نظر میں نے تیرے لیے گھوڑے اور زادِ راہ کا انتظام کردیا ہے۔ تو اسی وقت یہاں سے چلا جا اور اتنی دور چلا جا کہ میرا باپ تلاش کے باوجود تجھ کو نہ پاسکے۔''

عصامی نے درخواست کی۔ ''میں فضل، اپنے محسن سے ملاقات تو کرسکتا ہوں؟''

عقیل نے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں! تو خدا کے لیے چوری سے اسی وقت چلا جا۔''

عصامی نے اپنا مختصر سامان سمیٹا۔ عقیل نے اس کو قصر کے باہر گھوڑے تک پہنچا دیا اور خود عصامی کے کمرے میں چلا آیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو عصامی کی عدم موجودگی کا صبح سے پہلے پہلے علم ہوجائے۔ اس نے شمع بجھا دی اور بستر پر دراز ہوگیا۔ عصامی کے چلے جانے سے عقیل کو ذہنی سکون مل گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند سوگیا۔

فجر سے چند ساعت پہلے فضل نے اپنا بستر چھوڑ دیا

اور تلوار لے کر آہستہ سے عصامی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں خراٹوں کی آواز سے پورا کمرا گونج رہا تھا۔ فضل نے اس کے بائیں طرف کھڑے ہو کر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ تیجے تلے وار نے عقیل کا سر تن سے جدا کر دیا۔ فضل کو دکھ ضرور تھا۔ وہ مقتول کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مقتول کا سر ایک کپڑے میں باندھ لیا اور کمرے کو باہر سے مقفل کر کے فجر کی نماز ادا کی۔

نماز کے بعد بندھے ہوئے سر کی پوٹلی سنبھالی اور گھوڑے پر بیٹھ کر عبداللہ بن علی کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

عبداللہ بن علی نے روکھے لہجے میں پوچھا۔ ''تیرے وعدے کا کیا ہوا؟ اب میں دمشق سے جانا چاہتا ہوں اور جانے سے پہلے چند تصفیہ طلب امور کو نمٹا دینا چاہتا ہوں۔''

فضل نے کٹے ہوئے سر کی پوٹلی عبداللہ بن علی کی طرف بڑھا دی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، اس کا ضمیر بری طرح ملامت کر رہا تھا۔ اس نے ابن علی سے کہا۔ ''عبداللہ! اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی اور عزت و آبرو کے لیے آج جو کچھ میں نے کیا ہے، اس پر میرا ضمیر مجھے بری طرح لعنت ملامت کر رہا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔''

عبداللہ بن علی نے پوٹلی کو کھول کر سر نکال لیا اور اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ فضل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ وہ اس سر کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

عبداللہ بن علی نے کہا۔ ''لیکن فضل! ابو مسلم نے عصامی کا جو حلیہ مجھ کو لکھ کر بھیجا ہے، اس کے مطابق اس کی ٹھوڑی میں گڑھا اور بائیں آنکھ کے اوپر تل ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ دائیں طرف کنپٹی کے پاس زخم کا نشان بھی ہونا چاہیے۔''

فضل نے جواب دیا۔ ''اے عبداللہ! ذرا غور سے دیکھیے۔ ابو مسلم نے جو حلیہ لکھ بھیجا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ یہ عصامی ہی کا سر ہے۔''

اس کے بعد ڈرتے ڈرتے فضل نے خود بھی مقتول کا چہرہ دیکھا۔ دیکھتے ہی فضل کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔

☆☆☆

عصامی نے پہلے تو شمال کا رخ کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ سوچ کر مغرب کے کوہستانی سلسلوں کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔ اس نے مسلسل سفر جاری رکھا اور مشرقی لبنان میں داخل ہو گیا پھر شمال میں مڑ کر پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ اتنی دور تک چلا گیا کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہاں سے وہ مغرب اور پھر مغرب سے جنوب کی طرف بڑھا اور راشا نامی شہر کی سرائے میں قیام کیا۔ دو دن آرام کرنے کے بعد وہ دریائے لیطانی کے کنارے کنارے جنوب کی طرف سرگرم سفر ہو گیا۔ آگے دریا کے ساحلی شہر مرج عیون میں پھر ٹھہر گیا۔

مرج عیون دراصل دریائے لیطانی کے مشرقی کنارے اور دریائے حسانی کے سامنے مغرب میں واقع تھا اس لیے یہ دوآبہ کا شہر تھا۔ یہاں اس نے سان کش کا پیشہ اختیار کیا اور کئی ماہ بعد یہاں سے صیدا کی بندرگاہ چلا گیا۔ اس بندرگاہ میں اس کو سکون حاصل تھا کہ وہ بنو عباس کی دسترس سے دور ہو چکا ہے اور اگر کبھی کوئی خطرہ پیش بھی آیا تو وہ بحری سفر اختیار کر کے کسی دور دراز علاقے میں پہنچ سکتا تھا۔

زیتون اور صنوبر کی اس سرزمین میں بڑی دلکشی تھی۔ وہ فرصت کے لمحات میں یہاں کے کوہستانی جنت زار میں گھومتا پھرتا رہتا اور ماضی کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتا۔ روشنک، جوبے وفا نکلی۔ عروسہ، بیٹی اور صفیہ جو ہمیشہ معمار ہیں اور ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ عقیل جو اس کی طرف سے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا اور فضل، جس کی شفقت اور احسان کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ روایات اور اقدار کا پابند بزرگ۔ وہ ان سب کو یاد کرتا اور رونے لگتا اور اس کو یہ بات کبھی بھی معلوم نہ ہو سکی کہ فضل نے عصامی کے بجائے عقیل کو قتل کر دیا۔ حالانکہ یہ روایات اور اقدار کا پابند بوڑھا عصامی کے سر کے عوض بنو عباس سے امان حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب وہ عصامی کا سر پیش کرنے میں ناکام رہا تو عبداللہ بن علی جیسے مصلحتوں کو خاطر میں نہ لانے والے امیر نے اس خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

ماخذات

الاخبار الطوال۔ ابو حنیفہ الدینوری۔ تاریخ طبری۔ امام طبری۔ تاریخ ابن خلدون۔ ابن خلدون۔
الفہرست۔ ابن ندیم۔ فتوح البلدان۔ بلاذری۔ دعوت عباسیہ۔ ڈاکٹر رحمانی بیگم

صوفی کی یہ پہلی اور مارکوس کی دوسری شادی تھی۔ وہ اپنا لیس سال کا جبکہ صوفی اس سے تین سال چھوٹی تھی۔ یہ شادی کسی چرچ کے بجائے سترھویں صدی کی ایک پرانی عمارت میں ہوئی جس میں دوسو مہمانوں نے شرکت کی جس میں خوش ذائقہ کھانوں کا بھی اہتمام تھا۔

لیکن صوفی بہت حقیقت پسند تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کے ابتدائی چند دن پریوں کی کہانی جیسے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اسے ساری زندگی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا

تبدیلی

تنویر ریاض

کچھ لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کا اتنی گہرائی سے ادراک ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں کسی کی بھی زندگی پر اثرانداز ہوکر انقلاب لے آئیں... اسے بھی اپنی اس خوبی کا بخوبی احساس تھا جس کے بل پر وہ ان خونی رشتوں کے درمیان ایک خوبصورت دیوار بن کر یوں حائل ہوئی کہ انہیں اس دوری کا احساس تک نہ ہوسکا البتہ زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی کا گمان ضرور ہونے لگا۔

باپ اور بیٹے کے درمیان محبت کی رسا کشی کا

دلچسپ احوال

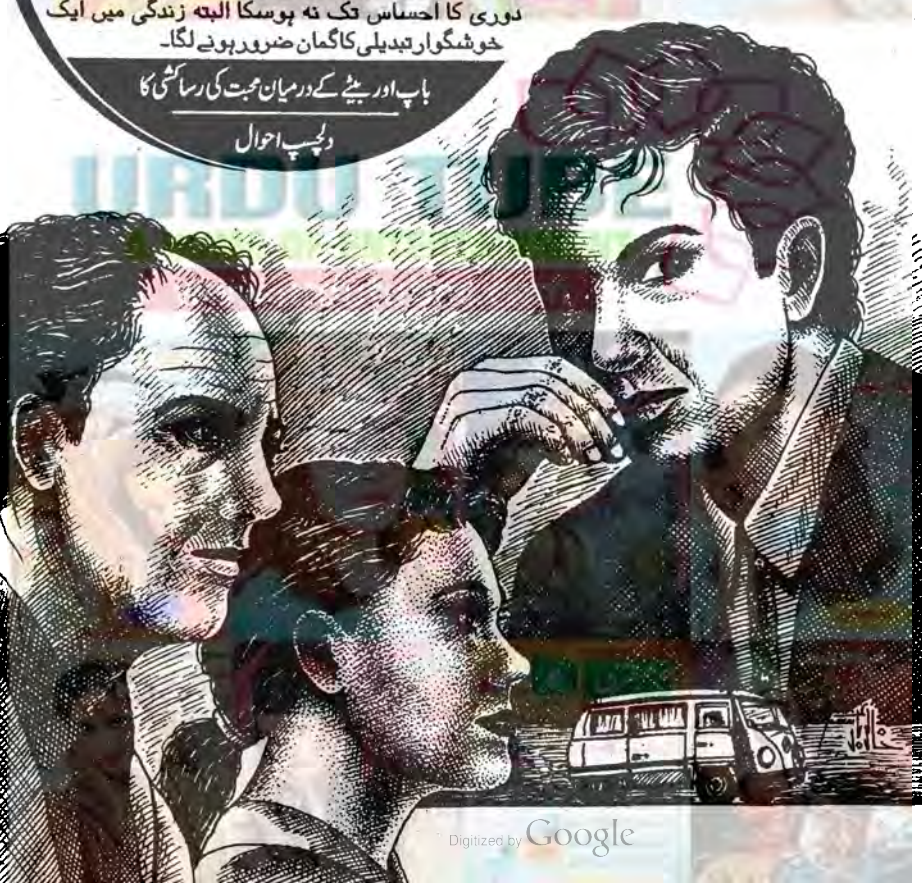

Digitized by Google

پڑے گا اور وہ اس بے کیف معمول کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس مشکل دور میں زندگی گزارنے کے لیے دونوں میاں بیوی کو کھانے کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ اس شادی کا روشن پہلو یہ تھا کہ وہ مارکوس سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ صوفی کی رائے میں پہلی بیوی اس کے لائق نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں بھی بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اپنی پہلی بیوی کو علیحدگی کا ذمے دار ٹھہرایا لیکن وہ یقیناً ایک نکمی بیوی اور خراب ماں تھی۔ اسی لیے جج نے اس کے بیٹے رک کو مارکوس کی تحویل میں دے دیا جبکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس معاملے میں عموماً ماں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ یقیناً ایک اچھی ماں بننے کی اہل نہیں تھی۔

مارکوس ایک پیٹرول اسٹیشن پر کام کرتا تھا۔ اس کے فرائض میں پمپ کو صاف کرنا اور انہیں چلانا، ٹینکر کی سپلائی کو چیک کرنا، شیلف میں سامان رکھنا اور ضرورت پڑنے پر ٹائلٹ کی صفائی بھی شامل تھی۔ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن تھا البتہ اوقات کار بہت مشکل تھے۔ یہ پیٹرول اسٹیشن چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا اور اسے شفٹوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی ہفتے میں تین بار نائٹ شفٹ لگتی تھی لیکن صوفی کا کہنا تھا کہ وہ رات میں اکیلے رہنے کی عادی ہے۔ اس نے بالغ ہونے کے بعد اب تک ساری زندگی تنہا ہی گزاری تھی۔ اس لیے اسے ہفتے میں تین راتیں مارکوس کی جدائی گوارا تھی۔ اس کے ساتھ بقیہ راتیں گزارنا ایک پُرلطف تجربہ تھا۔

البتہ صوفی کی اپنی ملازمت میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک کافی شاپ کی مقامی برانچ میں بارٹینڈر تھی جسے عرفِ عام میں بیرسٹا بھی کہا جاتا ہے۔ جب وہ پہلی بار مارکوس کے ساتھ ڈیٹ پر گئی اور اس نے صوفی سے اس کے کام کے بارے میں پوچھا تو اس کا جواب سن کر وہ سمجھا کہ صوفی بیرسٹر ہے اور پوچھنے لگا کہ وہ کس قسم کے مقدمات لیتی ہے۔ کافی دنوں تک ان کے درمیان یہ مذاق چلتا رہا۔

ان دونوں کی تنخواہ اتنی تھی کہ آسانی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے ڈربی شائر میں ایک چھوٹا مکان کرائے پر لیا اور بہت جلد اسے ایک آرام دہ گھر میں تبدیل کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا جس میں وہ اپنی سبزیاں خاص طور ٹماٹر اور پھلیاں وغیرہ اگاتے تھے۔ انہیں پڑوسی بھی اچھے ملے اور گھر کے قریب ہی کونے پر ایک دکان تھی جہاں تقریباً ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی اور انہیں روزمرہ استعمال کی اشیا خریدنے کے لیے مارکیٹ نہیں جانا پڑتا تھا۔

البتہ صوفی کا سوتیلا بیٹا رک اس کے لیے مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ شاید اس نے والدین کی طلاق کا بہت زیادہ اثر لیا تھا اور صوفی کی رائے میں اس کی وجہ ماں کی محبت اور توجہ سے محرومی تھی۔ مارکوس اسے ماں کا پیار نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس بیٹے کا خیال رکھنے کے لیے اتنا وقت تھا۔ بہرحال، وجہ کوئی بھی ہو، وہ ایک مشکل نوعمر لڑکا تھا۔ جب صوفی کی شادی ہوئی تو رک پندرہ سال کا تھا۔ اس نے شادی میں بھی شرکت نہیں کی۔ وہ بالکل بھی سوشل نہیں تھا اور صوفی کو بہت بعد میں اس کے ان رویّوں کا پتا چلا۔ اسے یقین تھا کہ مارکوس اپنے بیٹے کی بہت سی باتیں چھپا رہا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ سامنے آنے لگیں۔

اسے کئی بار مختلف الزامات کی وجہ سے نرسری اسکول سے نکالا گیا جن میں دوسرے بچوں پر حملہ کرنا، سرپھٹول، جگہ جگہ تھوکنا اور دیواریں خراب کرنا شامل تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک بڑھیا کی بلی تالاب میں پھینک دی۔ سیکنڈری اسکول میں آنے کے بعد وہ ایسے بچوں سے باقاعدہ پیسے وصول کرنے لگا جنہیں ڈر تھا کہ ان کی سائیکلیں تباہ نہ ہو جائیں یا ان کے بیگ چار دیواری کے باہر نہ پھینک دیے جائیں۔

جب وہ تھوڑا سا بڑا ہوا تو اسے صنفِ نازک میں کشش محسوس ہونے لگی۔ اس نے لڑکیوں کو تنگ کرنا اور موقع بے موقع ان کے جسم کے مختلف حصوں کو چھونا شروع کر دیا۔ اگر کوئی لڑکی اعتراض کرتی تو وہ سوشل میڈیا پر اس کے بارے میں بے بنیاد افواہیں پھیلانے لگتا۔ اسے ایک بار صرف اس لیے عارضی طور پر اسکول سے نکال دیا گیا کہ اس نے لڑکیوں کے لباس بدلنے والے کمرے میں ایک خفیہ کیمرا لگا دیا تھا۔ اس نے منشیات اور شراب کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا اور اپنے پاس چاقو رکھنے لگا تھا۔ غرضیکہ وہ مارکوس کے لیے ایک مستقل پریشانی بن چکا تھا۔ جب اس طرح کے واقعات بڑھنے لگے تو وہ پولیس کی نظروں میں بھی آ گیا۔ انہوں نے اس کے گھر دو مرتبہ فون کیا اور مارکوس سے بات کی۔

رک نے جیسے تیسے اسکول کی تعلیم مکمل کی اور بے روزگاروں میں اپنا نام لکھوا لیا۔ اسے جو بے روزگاری الاؤنس ملتا، اس سے کسی حد تک اس کی گزر اوقات ہونے لگی۔ وہ رات کا بیشتر حصہ نائٹ کلب میں گزارتا۔ دن بھر سوتا اور اگر باپ گھر میں ہوتا تو اس سے الجھنے لگتا۔ وہ عام طور پر صوفی کو نظر انداز کر دیتا۔ البتہ چند مرتبہ اس نے سوتیلی ماں سے تُند کلامی ضرور کی تھی لیکن صوفی نے مارکوس

سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اسے یہ شبہ ضرور ہوا تھا کہ وہ اس کے ہینڈ بیگ سے پیسے نکالتا ہے۔ اس لیے وہ ہر وقت بیگ اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔

ایک اتوار کو اس کی پڑوسن پامیلا اس سے ملنے آئی۔ اس وقت رک اپنے بستر میں سو رہا تھا اور مارکوس کام پر گیا ہوا تھا۔ صوفی نے کافی بنائی اور پڑوسن کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئی۔

''تم نے اپنے سوتیلے بیٹے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ہر کوئی دیکھ رہا ہے کہ وہ تمہارے لیے بدنامی کا باعث بنتا جارہا ہے۔ میں نے گزشتہ روز اسے ٹیسکو میں چیزیں چراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ایک ٹوکری لی اس میں ایک میگزین ڈالا اور اس کی آڑ میں آنکھ بچا کر دوسری چیزوں کے پیکٹ جیب میں رکھ لیے۔''

''اوہ نہیں۔''

''چلو کم از کم وہ احتیاطی تدابیر تو اختیار کررہا ہے۔ اس کے لیے تمہیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری بیٹی اس کے ساتھ ڈیٹ پر جائے۔ اگر تم نے اسے نہ روکا تو وہ عدالتوں کے دھکے کھاتا پھرے گا۔ کیا مارکوس کو کچھ اندازہ ہے کہ اس کا بیٹا کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک عام کہانی ہے، جب گھر ٹوٹ جائے تو اولاد کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ ماں کی محبت سے محروم ہوگیا ہے جبکہ اس وقت اسے اس کی ضرورت تھی۔''

''لیکن مارکوس کیا کررہا ہے؟''

''وہ اس کی حرکتوں سے واقف ہے اور اسے سدھارنے کی کوشش کررہا ہے۔''

''میرا شوہر کبھی یہ برداشت نہ کرتا اگر اس کا بیٹا سمجھانے کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تو وہ اب تک اسے گھر سے نکال چکا ہوتا..... ویسے بائی دا وے، تمہارے بیٹے کی عمر کتنی ہے؟''

''سترہ سال کا ہونے والا ہے۔''

''اس عمر کے بچوں میں اتنی عقل ہوتی ہے کہ وہ اچھے اور بُرے کا فرق محسوس کرسکیں۔ میں نے تو کئی ایک کو اپنے معذور والدین کی دیکھ بھال کرتے دیکھا ہے۔''

''ہم بھی یہی امید کررہے ہیں کہ بلوغت کے ساتھ ساتھ اس میں عقل آجائے گی۔ اس کے دل میں بھی کئی خواہشیں ہیں۔ وہ ڈرائیونگ سیکھنا چاہتا ہے۔''

''خدا بھی انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' پامیلا نے کہا اور وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

دو دن بعد گرجا کا ایک شخص صوفی اور مارکوس سے ملنے آیا۔ وہ مقامی چرچ سینٹ جونز کا پادری تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئے کیونکہ وہ کبھی چرچ نہیں جاتے تھے، بہرحال انہوں نے اس کو اندر بلالیا۔

''تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہورہے ہوگے۔'' پادری نے کہا۔ ''مجھ پر تین گرجا گھروں کی ذمے داری ہے لیکن میرا زیادہ وقت سینٹ جونز میں گزرتا ہے۔ بقیہ دو جگہوں پر میں کبھی کبھی جاتا ہوں۔ سینٹ میتھیوز، نارتھ اسٹریٹ کے آخر میں واقع ہے جبکہ سینٹ بارناباس، بارن اینڈ پر ہے۔ یہ دونوں پرانی لیکن خوب صورت عمارتیں ہیں اور بہت سے لوگ صرف انہیں دیکھنے کے لیے ہی آتے ہیں۔ ہم نے صدر دروازے کے ساتھ ہی پمفلٹ اور کتابچے رکھ دیے ہیں اور عطیات کے لیے ایک باکس بھی موجود ہے۔ کچھ لوگ زیادہ فیاض ہوتے ہیں اور ٹوکن اماؤنٹ سے کہیں زیادہ بڑا عطیہ دیتے ہیں۔''

صوفی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ پادری کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

''گزشتہ ہفتے کسی وقت سینٹ بارناباس کا باکس خالی ملا۔'' پادری نے کہا۔ ''یہ لکڑی کا بنا ہوا باکس ہے اور اس میں تالا لگا ہوتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ کسی نے اس کا تالا توڑ کر اس میں سے ساری رقم نکال لی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کتنی تھی لیکن جب ہم مہینے میں ایک بار وہ باکس کھولتے ہیں تو اس میں سے عموماً بیس سے تیس پاؤنڈ کے درمیان رقم نکلتی ہے۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟''

مارکوس اور صوفی دونوں ہی خاموش رہے۔

''سینٹ بارناباس کے سامنے والے فلیٹوں میں ایک عورت رہتی ہے۔ تمہیں اس کا نام جاننے کی ضرورت نہیں۔ وہ کبھی کبھی چرچ کی صفائی اور وہاں کے لیے پھولوں کا انتظام کرتی ہے۔ وہ اس سہ پہر صفائی کررہی تھی جب ایک نوجوان کو اندر آتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے دروازے میں قدم رکھا اور بڑی دلچسپی سے باکس کو دیکھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ باکس اور دوسرا تالے پر تھا۔ پھر اس کی نظر عورت پر پڑی تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

''ایک گھنٹے بعد وہ عورت کام ختم کرکے چلی گئی۔ اس نے اپنے فلیٹ کی بالکونی سے دیکھا کہ وہی نوجوان چرچ

Digitized by Google

میں داخل ہوا اور چند منٹ بعد باہر نکل آیا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور تیز قدموں سے ایک جانب چل دیا۔ اس عورت کو شبہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ واپس چرچ گئی اور دیکھا کہ باکس کا تالا ٹوٹا ہوا ہے اور اس میں سے رقم غائب تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے ہی اس عورت نے مجھے فون پر اطلاع دی، مجھے فوراً پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا لیکن میں نہیں گیا۔ اس کے علاوہ بھی غلطیوں کو درست کرنے کے طریقے ہیں۔ میں نے اس عورت کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس معاملے کی چھان بین کروں گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ لڑکا اس کے سامنے آیا تو وہ اسے پہچان لے گی۔''

''تم اسی لیے یہاں آئے ہو؟'' مارکوس نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ رک تمہارا بیٹا ہے؟''

''ہاں۔''

''اس عورت نے اسے شناخت کر لیا ہے۔ اسی نے گرجا میں چوری کی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس عورت کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ قابلِ بھروسا ہے اور کبھی غلط بات نہیں کرتی۔ بہرحال میں تمہارے بیٹے کو ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ چرائی ہوئی رقم واپس کر دے اور لکھ کر دے کہ وہ دوبارہ چوری نہیں کرے گا تو میں اسے معاف کر سکتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے اور اسے جان لینا چاہیے کہ میں اس کے ساتھ کیوں نرمی برت رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کسی جرم سے کرے اور عدالت میں پیش ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مارکوس نے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو۔'' صوفی بولی۔ ''اگر ہم تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟''

''اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟''

''تمہیں صرف اپنے پیسے واپس چاہئیں؟''

''تم نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ خود مجھے یہ پیسے واپس کرے۔ وہ خود اس میں بہتری محسوس کرے گا، بجائے اس کے کہ اسے عدالت سے سزا ملے پھر میں اس کے مستقبل کے بارے میں بات کروں گا۔ اگر تم بھی ایسا کرو تو ہم اس کے لیے کوئی بہتر راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ اسے تم دونوں کی مدد اور حوصلہ افزائی کی بہت ضرورت ہے۔''

''ہم تمہارے جذبے کی قدر کرتے ہیں۔'' مارکوس نے کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ رک بھی یہی کرے گا۔''

رات کو رک بہت دیر سے گھر آیا۔ اس لیے مارکوس کو اس سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ دوسرے دن بھی وہ دوپہر تک سوتا رہا۔ اس نے بیدار ہوتے ہی صوفی سے کھانے کے لیے کچھ مانگا۔ وہ فریزر سے چیزیں نکالنے کے بہانے کمرے سے باہر آ گئی اور مارکوس کو فون کر دیا۔ وہ لنچ کے وقفے میں گھر آیا تو اس نے صوفی کی موجودگی میں رک کو پادری کی آمد کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو اس نے باپ کی بات پر دھیان نہ دیا اور ناشتا کرنے کے دوران ایک میگزین دیکھتا رہا لیکن جب مارکوس نے باکس کے بارے میں بتایا تو اس نے نظریں اٹھائیں اور معصوم بنتے ہوئے بولا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ کہ تم جیل بھی جا سکتے ہو۔''

''ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' رک نے کہا۔

''تمہارے پاس ایک موقع ہے۔'' مارکوس نے کہا اور اسے پادری کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک جرم ہے لیکن وہ تمہاری رپورٹ کرنے کے بجائے تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہے۔''

''وہ رقم واپس لینا چاہتا ہے۔'' رک نے کہا۔ ''وہ اسے نہیں مل سکتی۔ میں وہ پیسے خرچ کر چکا ہوں۔''

''پھر تمہیں کہیں سے تیس پاؤنڈ کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''اس ڈبے میں صرف ساڑھے تئیس پاؤنڈ تھے۔''

''لیکن تم اسے تیس پاؤنڈ ہی دو گے۔ اسے باکس کی مرمت بھی کروانا ہوگی یا پھر نیا خریدنا ہوگا۔''

''میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ میں بالکل قلاش ہوں۔''

''پھر تمہیں نائٹ کلب جانے کے بجائے چند روز گھر پر ہی رہنا ہوگا تاکہ کچھ بچت ہو سکے۔''

''میرا وہاں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ ان کا ایک محافظ مجھے اندر لے جاتا ہے۔ وہ ہم جنس پرست ہے۔ اس لیے میرا خیال رکھتا ہے گو کہ اس نے ابھی تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔''

''اس طرح کی حرکتیں اب ختم ہو جانی چاہئیں۔'' مارکوس نے کہا۔ ''اگر تم گھر پر رہ کر کچھ کام کرو تو میں اس کا معاوضہ دوں گا۔ اس طرح تم اس کے پیسے واپس کر سکتے ہو۔ بہتر ہے کہ یہ کام اسی ہفتے ہو جائے۔ کیا ہم اسے ابھی فون کر کے جمعے تک کا وقت لے لیں؟''

رک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف کندھے اچکا دیے۔ مارکوس نے اپنا فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کا نمبر ڈائل کر دیا ہے۔ تمہیں صرف اس کا بٹن دبانا ہے۔''

رک فون کو دیکھتا رہا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔

مارکوس ہنسنے لگا۔ ''اگر تم نے اس سے بات نہیں کی تو میں خود پولیس کو فون کردوں گا۔''

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور رک نے فون کا بٹن دبا دیا۔

☆☆☆

''کیا اس نے اس واقعے سے کوئی سبق سیکھا؟'' پامیلا نے پوری بات سننے کے بعد صوفی سے کہا۔

صوفی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب بھی شبہ ہے۔ پادری نے اسے اپنے طور طریقے چھوڑنے کی نصیحت کی تھی لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کے بعد میرے پرس سے زیادہ پیسے غائب ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس کی نس نس میں بے ایمانی سما گئی ہے۔''

''یہ تو بڑی خراب بات ہے۔''

''مجھے خود یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن اس کے سدھرنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی۔''

''کیا مارکوس بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے؟''

''اس نے کبھی ایسی بات نہیں کہی۔ وہ اس کا خون ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دل ہی دل میں وہ بھی یہی سوچتا ہوگا۔''

''اس کی وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی بھی متاثر ہوسکتی ہے۔''

''تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس لڑکے کی طرف سے ناامید ہوچکی ہوں۔''

''میرا نہیں خیال کہ پہلے کبھی تمہارے سامنے یہ ذکر کیا ہو لیکن وہ ایک مقامی عورت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی بدل دیتی ہے۔ میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ایسا کس طرح کرتی ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے جس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔''

''کیا وہ بھی یہی دعویٰ کرتی ہے؟''

''نہیں بلکہ لوگ اس کے بارے میں یہ بات کہتے ہیں۔ وہ تھوڑی سی سنکی نظر آتی ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔''

''کیا اس کی فیس بہت زیادہ ہے؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ تمہیں خود معلوم کرنا ہوگا۔''

''میں شرطیہ کہتی ہوں کہ اس سے پہلے اسے کبھی رک جیسے شخص سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن میں نے سنا ہے کہ اس نے کئی بگڑے ہوئے نوجوانوں کو سیدھا کر دیا ہے۔''

صوفی سوچنے لگی کہ اس تجویز پر مارکوس کا ردِعمل کیا ہوگا پھر اس نے پوچھا۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

''نام جینیلا..... مجھے اس کا پورا نام معلوم نہیں۔''

''اچھا نام ہے۔''

''ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ نام کی مناسبت سے اس میں بھی فرشتوں جیسی خصوصیات ہوں گی۔ وہ صرف چھبیس سال کی ہے لیکن بڑی کامیابی سے اپنا کاروبار چلا رہی ہے۔ اس نے قریب ہی ایک چھوٹی سی دکان لی ہے جس میں وہ بیٹھتی ہے۔''

''وہ کیا کام کرتی ہے؟''

''کپڑوں میں تبدیلی۔ مثلاً لمبائی کم کرنا، بارڈر لگانا، بلاؤز کی فٹنگ وغیرہ۔ وہ یہ کام اپنی سلائی مشین پر کرتی ہے۔ یہ ایک مفید سروس ہے کیونکہ مہنگائی کی وجہ سے نئے کپڑے خریدنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔''

''کیا اس کی دکان کا کوئی نام ہے؟''

''انجیلا آلٹریشنز۔''

☆☆☆

''اچھا خیال ہے لیکن وہ ایسے کام کے لیے راضی نہیں ہوگا۔'' مارکوس نے کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ وہ کتنی مشکل سے پادری سے ملنے کے لیے تیار ہوا تھا۔''

''پہلے ہم خود جا کر انجیلا سے ملیں گے۔'' صوفی نے کہا۔ ''اسے معلوم ہونا چاہیے کہ مسئلہ کیا ہے۔''

''تم اسے کیا کیا مسئلے بتاؤ گی۔ چوری، دکانوں سے چیزیں اٹھانا، بلیک میلنگ، لڑکیوں کو تنگ کرنا، منشیات، شراب نوشی اور والدین سے بحث کرنا..... اس عورت کی تو سمجھ میں بھی نہیں آئے گا کہ وہ کہاں سے شروع کرے۔''

''بعض اوقات ایک نئی کوشش سے بھی فرق پڑتا ہے۔ کم از کم ہمیں اس سے ملنا تو چاہیے۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں تو وہ ہمیں ضرور بتائے گی۔''

ہفتے کے روز صبح میں دونوں نے اپنے کام سے ایک گھنٹے کی چھٹی لی اور انجیلا کی دکان پر پہنچ گئے۔ اس وقت وہ ایک اسکرٹ پر پنی زپ لگا رہی تھی۔ وہ پورے اعتماد سے کام کر رہی تھی اور اس نے غیر معمولی تیزی سے اسے مکمل کیا۔ وہ دیکھنے میں ان کی توقع سے زیادہ کم عمر لگ رہی تھی۔ گو کہ وہ کسی ماڈل گرل کی طرح خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کے سیاہ بال، بادامی آنکھیں اور چہرے کی مسکراہٹ دل موہ لینے کے لیے کافی تھی۔ اس نے ان کا خیر مقدم کرتے

ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

مارکوس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ بیچ میں صوفی بھی بولتی رہی۔

انہوں نے پوری کہانی بیان کر دی لیکن رک کا نام نہیں لیا۔ جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو انجیلا بولی۔ ”گویا یہ سلائی کا کام نہیں ہے۔“ اس پر ان سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”اب میں اس کا نام جاننا چاہوں گی۔“ انجیلا بولی۔ ”میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم نے اب تک اس کا نام کیوں نہیں بتایا۔ شاید تمہیں اندیشہ تھا کہ میں اس کا کیس لینے سے انکار نہ کر دوں۔“

مارکوس اور صوفی کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر مارکوس بولا۔ ”اس کا نام رک ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا معاوضہ کیا ہوگا؟“

”وہی جو میں کپڑوں کی آلٹریشن کے لیے لیتی ہوں۔ یعنی دس پاؤنڈ فی گھنٹا لیکن اس میں میٹریل کی قیمت شامل نہیں ہے۔“

”لیکن تم اتنی تیزی مت دکھانا جتنی تم نے یہ زپ لگانے میں دکھائی ہے۔“

”بے فکر رہو۔ جب تک گاہک کی تسلی کے مطابق کام نہ ہو جائے، میں معاوضہ نہیں لیتی۔“

”یعنی اگر کامیابی نہیں تو فیس بھی نہیں۔“ مارکوس نے کہا۔

”ہاں لیکن میں اپنے طریقے سے کام کروں گی اور تمہاری طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ تم رک سے نہیں کہو گے کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں خود ہی کوئی بندوبست کر لوں گی۔ اگر وہ میرے بارے میں کوئی بات کرے جس کا امکان بہت کم ہے تو اس طرح ظاہر کرنا جیسے تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں سنا اور نہ ہی اسے یہ بتانا کہ تم مجھے کوئی معاوضہ ادا کر رہے ہو۔“

”معاف کرنا، مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ یہ معاوضہ کچھ زیادہ ہے۔ ہم اتنے امیر نہیں ہیں۔“

”تم نے جو کچھ بتایا، اس کے حساب سے اس کام میں پانچ ہفتے لگ سکتے ہیں لیکن میں تم سے تمام گھنٹوں کا معاوضہ نہیں لوں گی۔ بہرحال مجھے اپنا کام بھی کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دے سکتی ہوں، یعنی ہفتے میں بارہ گھنٹے۔“

”اس طرح یہ تقریباً چھ سو پاؤنڈ ہو گئے۔“ مارکوس نے کہا۔

”ہاں زیادہ سے زیادہ۔ اس سے کم بھی ہو سکتے ہیں۔“

مارکوس نے صوفی کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ انجیلا کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس نے جس اعتماد سے بات کی تھی، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ رک کو سدھارنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆☆☆

تین دن بعد رک نے اعلان کیا کہ وہ ڈرائیونگ سیکھ رہا ہے۔ ”میں نے عارضی لائسنس کے لیے درخواست دے دی ہے لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کی کوئی فیس نہیں دینا ہوگی۔ میری ایک دوست اپنی وین میں مجھے گاڑی چلانا سکھائے گی۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ مارکوس سے پہلے صوفی بول پڑی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں مارکوس بحث شروع نہ کر دے اور دونوں میں جھگڑا ہو جائے۔ ”تم تو ہمیشہ سے گاڑی چلانا چاہتے تھے۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں ڈیڈ۔ تمہیں میری بات کا یقین کر لینا چاہیے۔“

مارکوس نے نرمی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم ڈرائیونگ سیکھنا شروع کرو۔ جب ٹیسٹ دینے کا وقت آیا تو اس کی فیس ہم ادا کریں گے۔“

رک کے جانے کے بعد صوفی نے کہا۔ ”انجیلا نے کام شروع کر دیا ہے۔ رک کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنی ہوشیاری سے منصوبہ تیار کیا ہے۔“

”دعا کرو کہ وہ اس کی وین کو کہیں ٹکرا نہ دے۔“

”وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس میں ایک اچھا ڈرائیور بننے کی صلاحیت موجود ہے۔“

اختتام ہفتہ مارکوس کام سے واپس آیا تو اس نے صوفی کو بتایا۔ ”آج میری انجیلا سے بات ہوئی تھی۔ وہ پیٹرول ڈلوانے گیراج پر آئی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی وین ہے جس کے دونوں طرف بڑے بڑے حروف میں ”انجیلا آلٹریشنز“ لکھا ہوا ہے اور اس کے آگے پیچھے "L" کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ یعنی ڈرائیور زیرِ تربیت ہے۔“

”اس نے کیا بتایا؟“

”سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ ایک پُراعتماد ڈرائیور ہے اور بہت جلد پوری طرح ڈرائیونگ سیکھ لے گا۔ اس کا خیال ہے کہ اس تربیت سے اس کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔“

”کیا اس نے بتایا کہ ان کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟“

''نہیں اور میں نے بھی نہیں پوچھا۔ لگتا ہے کہ وہ اپنے انداز میں کام کرتی ہے اور اس بارے میں زیادہ بات کرنے کو ترجیح نہیں دیتی۔''

پامیلا نے بھی صوفی سے یہی بات کہی۔ ''لگتا ہے کہ انجیلا نے تمہارے بیٹے کو قابو کرلیا ہے۔ میں نے آج صبح اسے گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے مختلف دکھا۔ وہ کافی پُرسکون نظر آرہا تھا۔''

''ہاں، ہم تمہارے شکرگزار ہیں۔ واقعی انجیلا نے اس پر جادو کردیا ہے۔ گھر پر بھی وہ کافی بدلا بدلا نظر آرہا ہے۔ اب وہ صبح جلدی اٹھ جاتا ہے اور تھوڑا بہت گھر کے باہر صفائی ستھرائی بھی کرلیتا ہے۔''

''کیا اس نے تمہارے پرس سے پیسے نکالنا چھوڑ دیے؟''

''ہاں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اب وہ اپنے باپ سے اچھی طرح بات کرتا ہے اور ان کے درمیان میوزک اور فٹ بال پر گفتگو ہوتی ہے۔''

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ تمہارے خیال میں تبدیلی کا یہ عمل کب تک مکمل ہوگا؟''

''میں نہیں جانتی۔ یہ تو وہی بتائے گی لیکن اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں اس کام کو کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ ہم پر زیادہ مالی بوجھ نہ آئے۔''

''میں نے سنا ہے کہ اس کا معاوضہ بہت مناسب ہے۔ وہ صرف بگڑے ہوئے بچوں کو ہی نہیں سدھارتی بلکہ اور بھی کئی کام کرتی ہے۔''

''مثلاً؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ مسوں اور جلدی بیماریوں کا بھی علاج کرتی ہے اور اسے وہ فوک میڈیسن کا نام دیتی ہے۔''

''اس طرح کے کام تو کوئی جادوگرنی ہی کرسکتی ہے۔''

''ہاں لیکن میں اسے جادو ٹونا نہیں کہوں گی۔''

صوفی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا۔ ہم اس کے بارے میں مثبت سوچ رکھنا چاہتے ہیں۔''

☆☆☆

مارکوس میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ دن گزرنے کے ساتھ وہ زیادہ پُرسکون نظر آرہا تھا اور رک کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر ہورہے تھے۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس عورت نے یہ سب کیسے کیا۔'' اس نے صوفی سے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ تبدیلی مستقل نظر آرہی ہے۔ اس سنیچر کو پہلی بار میں اور رک ڈرنک کے لیے جارہے ہیں۔''

''میں نے بھی نوٹ کیا ہے کہ اس نے اپنے کمرے کی صفائی کی اور بہت سی فالتو چیزیں باہر پھینک دیں۔ یہ ایک غیر معمولی تبدیلی ہے ورنہ اس کا کمرا ہمیشہ کباڑ خانہ بنا رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب تبدیلی کا یہ عمل مکمل ہوجائے گا۔''

''اس نے پانچ ہفتے کہے تھے۔ ابھی وہ پورے نہیں ہوئے۔''

''وہ وقت آنے پر تم کیا کرو گے؟ ہم نہیں چاہتے کہ رک کو یہ بات معلوم ہو۔''

''وہ جانتی ہے کہ میں کہاں ملوں گا۔ وہ خود ہی گیراج پر آجائے گی۔''

''کیا ہمارے اکاؤنٹ میں چھ سو پاؤنڈ ہیں؟ اس

دراصل

وہ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی اور میں ہر روز اسے گاڑی میں یونیورسٹی چھوڑنے جاتا اور لینے جاتا تھا۔ گیٹ کے پاس گاڑی روک کر میں نیچے اترتا اور دوسری طرف آکر گاڑی کا دروازہ کھولتا اور وہ میری بیوی (بانو قدسیہ) شہزادی کی طرح گاڑی سے اترتی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گیٹ سے اندر داخل ہوجاتی۔ پھر چھٹی کے وقت میں (بانو قدسیہ) کو لینے یونیورسٹی کے گیٹ پر آتا۔ دروازہ کھولتا۔ وہ میری بیوی (بانو قدسیہ) گاڑی میں سوار ہوتی، میں گاڑی کا دروازہ بند کرتا اور پھر واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آکر گاڑی اسٹارٹ کرتا اور ہم گھر چلے جاتے۔ یہ پریکٹس روزانہ (چھٹی کے دن کے علاوہ) جاری رہتی۔ میری بیوی کی سہیلیاں ہر روز دعا کرتیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی (جو غیر شادی شدہ تھیں) ایسا ہی فرمانبردار شوہر عطا فرمائے۔

اشفاق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ درحقیقت ہمارے درمیان کوئی ایسی ویسی افلاطونی محبت نہیں تھی بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہماری گاڑی کا دروازہ خراب تھا جو کہ اندر سے تو بالکل نہیں کھلتا تھا بلکہ باہر سے بھی بڑی مشکل سے کھلتا تھا۔ اس لیے مجھے نیچے اتر کر دروازہ کھولنا پڑتا تھا۔

اشفاق احمد کی تحریر سے اقتباس
مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

نے یہی فیس بتائی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ اتنی رقم ہوگی پھر بھی میں معلوم کرلوں گا۔ شاید وہ نقد رقم کو ترجیح دے۔''

رک میں تبدیلی کا عمل جاری تھا۔ مارکوس آفیسر صوفی کی ہر ممکن کوشش تھی کہ اسے یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کے لیے خاص طور پر یہ انتظام کیا گیا ہے لیکن اس نے ایک اتوار کی صبح ناشتے کی میز پر خود ہی بتا دیا کہ انجیلا سے اس کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ ''وہ عورت جو مجھے ڈرائیونگ سکھا رہی ہے، اس کا نام انجیلا ہے۔ ہماری سرراہ ملاقات ہوئی تھی۔ دراصل میں ایک پولیس والے سے بچ کر بھاگ رہا تھا جس نے مجھ پر دکان سے چوری کرنے کا الزام لگایا تب اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ اس کا پتا لگائے گی۔''

''کیا تم واقعی دکانوں سے چیزیں چراتے تھے؟'' مارکوس نے پوچھا۔

''یہ اس سے پہلے کی بات ہے۔'' رک نے کہا۔ ''انجیلا سے ملنے کے بعد میں نے یہ حرکت نہیں کی۔ وہ مجھے کافی پلانے لے گئی اور ہم آپس میں گھل مل گئے۔ اس کا ہائی اسٹریٹ پر ایک چھوٹا سا کاروبار ہے جہاں وہ لوگوں کے کپڑے ٹھیک کرتی ہے۔ اس کی عمر پچیس سال کے قریب ہے۔ اس کے پاس ایک وین ہے۔ اس نے مجھے ڈرائیونگ سکھانے کی پیشکش کی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب میں ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کرلوں گا تو وہ مجھے سامان لانے اور لے جانے پر رکھ لے گی اور اس کا معاوضہ بھی دے گی۔''

''زبردست'' صوفی بولی۔ ''کیا یہ شاندار پیشکش نہیں ہے مارکوس؟''

''لاجواب۔'' مارکوس نے کہا۔

''میں کسی وقت تم دونوں کو اس سے ملواؤں گا۔'' رک نے کہا۔

''اگر وہ انجیلا آلٹریشنز، والی انجیلا ہے تو میں اس سے مل چکا ہوں۔'' مارکوس نے کہا۔ ''وہ کبھی کبھی پیٹرول ڈلوانے ہمارے گیراج پر آتی ہے۔ واقعی وہ اچھی عورت ہے۔''

پانچ ہفتے گزر گئے تو صوفی نے مارکوس کو یاد دلایا۔ ''جہاں تک میں سمجھ رہی ہوں، اس نے ہمارے بیٹے کو بالکل بدل دیا ہے اور وہ پوری طرح سدھر چکا ہے۔ وہ پہلے کی طرح جھوٹی قسمیں نہیں کھاتا۔ اس نے نائٹ کلب جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں شادی کے بعد پہلی بار اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کررہی ہوں۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ ہمیں انجیلا کو چھ سو پاؤنڈ ادا کردینے چاہئیں؟'' مارکوس نے کہا۔

''اس سے یہی طے ہوا تھا اور ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔''

''کیوں نہ ہم دونوں اس سے ملنے جائیں؟''

''دونوں کا جانا ضروری نہیں۔'' صوفی بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم خود ہی پیسے لے کر اس کی دکان پر چلے جاؤ اور اس سے کہہ دینا کہ ہم دونوں اس کے بے حد شکر گزار ہیں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' مارکوس نے کہا۔

''ہوشیار رہنا۔ کہیں رک وہاں موجود نہ ہو۔ اگر اسے حقیقت معلوم ہوگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''وہ بہت چھوٹی دکان ہے۔ اگر وہ وہاں ہوا تو نظر آجائے گا پھر بھی میں ایسے وقت جاؤں گا جب مجھے یقین ہوگا کہ وہ دکان میں نہیں ہے۔ آج کل وہ مجھ سے بہت فری ہوگیا ہے اور بتاتا رہتا ہے کہ اس کا دن کیسے گزرتا ہے۔''

☆☆☆

''یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔'' صوفی نے پامیلا کو بتایا جب وہ تین ہفتے بعد کافی شاپ میں ملیں۔ ''مارکوس نے بینک سے چھ سو پاؤنڈ نکالے اور اس کی دکان پر گیا۔ اس نے انجیلا کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بھرپور توجہ اور محنت سے رک بالکل بدل گیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس نے کیا کہا؟''

''یہی کہ پیسے کم ہیں۔''

''نہیں، اس نے کہا کہ مارکوس نقد رقم دینے کے بجائے اسے شاپنگ کروادے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''وہ خود بھی یہ چھ سو پاؤنڈ خرچ کرسکتی تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ کوئی مرد اسے اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جائے اور اس کے لیے خریداری کرے۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔''

''پہلے مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا پھر میں نے اسے انجیلا کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ وہ کتنی محنت کرتی ہے۔ پورے ہفتے دکان میں کام کرکے لوگوں کے کپڑے تیار کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرد نہیں جو اسے شاپنگ پر لے جاسکے لہٰذا اس کی یہ خواہش بڑی بے ضرر لگی اور اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔''

''مارکوس نے کیا کیا؟''

''دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے شاپنگ سے نفرت ہے لیکن ہم انجیلا کے اتنے احسان مند ہیں کہ وہ اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوگیا۔''

''انجیلا نے شاپنگ کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا؟''

''پیرس..... بورڈ واسٹار کے ذریعے۔''

''اوہ میرے خدا..... اور تم نے اس کی اجازت دے دی؟''

''ہاں، ایک دن کی تو بات تھی۔ وہ صبح سویرے چلے گئے تھے اور آخری ٹرین سے واپس آگئے۔''

''مجھے یقین ہے کہ سب کچھ ٹھیک رہا ہوگا۔'' پامیلا نے خدشے کا اظہار کیا۔

''مجھے اپنے مارکوس پر بھروسا ہے اور ہم دونوں انجیلا کے..... بے حد شکر گزار ہیں۔ وہ ہم سے دس سال چھوٹی ہے۔ بے چاری معصوم لڑکی۔ ہم کیوں نہ اس کا خیال رکھیں۔ اس نے رک کے معاملے میں معجزہ دکھایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ رک نے ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کرلیا ہے اور انجیلا نے اسے اپنے پاس جز وقتی ملازمت دے دی ہے۔''

☆☆☆

موسم گرما کے اختتام پر رک نے اپنے باپ سے پوچھا کہ اگر وہ ذاتی وین خریدنا چاہے تو کتنے میں مل جائے گی۔ وہ انجیلا کے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے کے بجائے بڑے پیمانے پر سامان کی ترسیل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کی یہ خواہش پوری کردینی چاہیے۔'' صوفی نے کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو ہم قرض بھی لے سکتے ہیں۔''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' مارکوس نے کہا۔ ''ابھی اسے سدھرے ہوئے بہت کم دن ہوئے ہیں۔ چند ماہ قبل میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اسے کسی وین کے قریب جانے دوں۔ جب اگلی بار انجیلا مجھے ملے گی تو اس سے مشورہ کروں گا۔''

صوفی کو تھوڑا سا افسوس ہوا کہ اس کی رائے کو نظر انداز کرکے انجیلا کے مشورے کو اہمیت دی جارہی ہے لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆

''میں نے کل رک کو نئی وین چلاتے ہوئے دیکھا۔'' پامیلا نے بتایا۔ ''اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا جبکہ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''وہ نئی نہیں بلکہ ری کنڈیشنڈ وین ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''اچھا آئیڈیا ہے۔ اس سے کام چل جائے گا۔''

''دراصل یہ انجیلا کا ہی آئیڈیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ سستی پڑے گی۔ رک نے مارکوس کی مدد سے اسے مزید اچھا بنالیا۔ اب وہ اس پر فخر محسوس کررہا ہے کہ اسے انجیلا کے توسط سے ایک دو مستقل کام مل گئے ہیں۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اب تو تم دونوں کو اطمینان ہوگیا ہوگا۔ کیا مارکوس کام پر گیا ہے؟''

''نہیں، اوپر اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ اس نے پورے ہفتے نائٹ ڈیوٹی کی ہے۔''

''پورے ہفتے؟''

صوفی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، رات نو سے صبح سات بجے تک۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں معلوم ہوگا۔''

''اچھا، حیرت ہے۔ دراصل گزشتہ روز میرے پاس دودھ ختم ہوگیا تھا اور مجھے رات کو سونے سے پہلے دودھ میں اوولٹین ملا کر پینے کی عادت ہے لہٰذا میں گیراج کی طرف چلی گئی کیونکہ رات کے وقت صرف اس کی شاپ سے ہی یہ چیزیں مل سکتی تھیں۔ وہ دس بجے کا وقت تھا۔ میں نے مارکوس کو تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ اس کی جگہ ایک ایشیائی باشندہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ مارکوس ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔''

''نہیں، یہ جھوٹ ہے۔'' صوفی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''بہتر ہے کہ تم اس پر نظر رکھو۔''

وہ یہ سن کر ہی پریشان ہوگئی تھی۔ اگر مارکوس نے گیراج سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی تو وہ روزانہ رات کو ڈیوٹی کے بہانے کہاں جاتا رہا؟ اس نے محسوس کیا کہ گزشتہ چند روز سے مارکوس کا رویہ کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔ وہ عموماً بہت خاموش رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی اس پر غصہ بھی کرنے لگتا۔ وہ اس سلوک کی عادی نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا محبوب شوہر بھی کسی تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔

اس نے اس معاملے پر بات کرنے کے لیے رک کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اب کافی سمجھ دار ہوچکا تھا اور آزادانہ طور پر سامان کی ترسیل کا کام کررہا تھا۔

''میں تمہارے باپ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ اس کا رویہ عجیب ہوتا جارہا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کوئی تبدیلی آگئی ہے۔''

''میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔'' رک بولا۔ ''لیکن میں اس معاملے میں بولنا نہیں چاہتا۔''

''میں بالکل بھی خوش نہیں ہوں رک۔ میرا خیال ہے کہ اس کا کسی سے چکر چل رہا ہے۔''

''ڈیڈی ایسا نہیں کرسکتے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ میں نے اسے مکمل طور پر کھو دیا ہے لیکن اگر میں نے فوری طور پر کچھ نہ کیا تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کیا تم اس بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

''مجھے ایسے کئی اشارے مل رہے ہیں۔ کافی شاپ میں آنے والے گاہک جو مجھے جانتے ہیں، وہ اشاروں اشاروں میں کہتے ہیں کہ انہوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جس پر وہ مجھ سے بات نہیں کر سکتے لیکن پامیلا کا کہنا ہے کہ اس نے ان دونوں کو کئی بار ایک ساتھ دیکھا ہے۔''

''اس نے یہ بات کس کے بارے میں کہی؟''

''تمہارے ڈیڈی اور انجیلا کے بارے میں۔''

''انجیلا کے ساتھ؟ یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔''

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا لیکن ہر بات اسی جانب اشارہ کر رہی ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' رک کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ میں اس کی دکان پر بیٹھ کر اپنا کاروبار کر رہا ہوں۔ اب ہم پارٹنر بن چکے ہیں اور منافع میں دونوں شریک ہیں۔ اگر ڈیڈی کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ ہوتا تو مجھے ضرور پتا چل جاتا۔''

''میں نے بھی کافی دنوں تک اس پر یقین نہیں کیا۔'' صوفی بولی۔ ''وہ اس سے رات میں ملنے آتی ہے جب وہ نائٹ ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ وہ سنجیت کو کچھ دے دلا کر اپنی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔''

رک کے گالوں میں خون سمٹ آیا۔ وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ ''وہ میری پارٹنر ہے۔''

''صرف بزنس پارٹنر۔ اس کی ذاتی زندگی کا تمہارے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔''

رک لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے پھر وہ اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ میری دریافت ہے۔ اس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔''

صوفی نے سوچا کہ اسے حقیقت بتا دے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ رک کو بہت صدمہ ہوگا۔ رک اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ہوتے ہوئے ڈیڈی اس سے کیوں مل رہے ہیں؟ وہ ان سے عمر میں بہت چھوٹی ہے جبکہ میری اور انجیلا کی عمر میں بہت کم فرق ہے۔ اس نے بہت مشکل وقت میں میری مدد کی ہے۔ میں اس کا احسان مند ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ مجھے اب بھی اس کی مدد کی ضرورت ہے لیکن ہمارا تعلق دن بدن ایک نئی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اب ہم تقریباً برابری کی سطح پر آ گئے ہیں اور میں اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

صوفی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا، ورنہ تمہیں نہ بتاتی۔ میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتی۔ مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا بلکہ مجھ میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ خود مارکوس سے بات کروں۔''

''وہ اتنی ظالم نہیں ہو سکتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے بارے میں میرے کیا جذبات ہیں۔ ضرور ڈیڈی نے اسے ورغلایا ہوگا۔''

''میں تمہارے باپ سے بات کروں گی۔''

''نہیں.....'' رک نے کہا۔ ''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اس سے خود ہی نمٹ لوں گا۔''

☆☆☆

اس دن مارکوس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ دس بجے کے قریب رک ایک بیگ اٹھائے اپنے کمرے سے نکلا اور صوفی سے کہنے لگا۔ ''ڈیڈی کو بتا دینا کہ میں ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟''

''تمہاری شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا۔''

''تمہارے گھر چھوڑ کر جانے سے میری شادی کا کیا تعلق؟''

''میں نے انجیلا سے شادی کر لی ہے اور اب میں اس کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''لیکن وہ تو.....؟''

''ہاں، دراصل وہ ڈیڈی کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ اسے اپنی زندگی میں ایک مرد کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس طرح وہ صرف تمہاری نہیں بلکہ میری زندگی سے بھی کھیل رہی ہے تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں؟ تو میرا جواب اثبات میں تھا۔ ہم نے کل ہی گرجا میں شادی کر لی۔''

''لیکن تم دونوں ہمارے ساتھ ہی رہو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ انجیلا کبھی اس پر تیار نہیں ہوگی اور میں بھی ڈیڈی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ البتہ تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آئندہ ڈیڈی کو ایسے لوگوں سے دور رکھنا جو لوگوں کی زندگی میں تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔''

جون میکلین نہایت سادہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔ رہنے کو مکان بھی تھا اور ایک باوقار ملازمت بھی۔ اس کی زندگی میں پیچیدگیاں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کوئی ہلچل، کوئی ہنگامہ خیزی، کوئی پراسراریت، کوئی عجیب وغریب شے کچھ بھی تو نہیں تھی۔ کم از کم ابھی تک تو نہیں تھی۔

جون میکلین اپنی کار میں ائرپورٹ سے گھر کی جانب جاتے ہوئے راستے میں یہی سوچ رہا تھا کہ ان کے چھوٹے سے پُرسکون پڑوس میں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔ اس کی بیوی نے آج صبح اپنے کام پر جاتے ہوئے اس کے لیے وائس میل پر پریشان کر دینے والا پیغام چھوڑا تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ رات کے پچھلے پہر اس نے اپنے پڑوسی ہکمین کے گھر کے سامنے سڑک پر پولیس کی دو کاروں اور ایک ایمبولینس کو دیکھا تھا۔

جون میکلین جب اپنے گھر پہنچا تو اسے اپنا پڑوسی ہکمین اپنے گھر کے سامنے دکھائی دیا۔ وہ اپنے صحن میں گرے ہوئے پتے سمیٹ رہا تھا۔ جون میکلین نے اپنی کار ڈرائیوے میں پارک کی، اپنا سوٹ کیس کار سے اتار کر نیچے رکھا اور ٹہلتا ہوا ہکمین کی جانب چل دیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے نا، ہکمین؟ پیگی نے بتایا تھا کہ گزشتہ شب تمہارے یہاں کسی قسم کی ہلچل کا سماں تھا۔"

ہکمین نے پتے سمیٹنے روک دیے۔ وہ سرخ چہرے اور سنہری بالوں والا ایک توانا و دراز قامت شخص تھا۔ حالیہ ڈاؤن سائزنگ کی وجہ سے اس کی نوکری ختم ہوگئی تھی۔ البتہ اس کی بیوی میری جو کسی قسم کی کمپیوٹر گرو تھی، اس کی آمدنی سے ان کی گزر بسر ہو رہی تھی۔

ہلچل

سلیم انور

اللہ نے سب سے زیادہ متضاد مزاج سمندر کو عطا کیا ہے جس کی سطح اکثر پُرسکون مگر تہہ میں بڑے بڑے طوفان چھپے ہوتے ہیں... اگر ذرا اور غور کرلیا جائے تو سمندر سے بھی گہرا اللہ نے انسان کو تخلیق کیا ہے۔ جس کا اندازہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو انتہائی پرسکون نظر آتا تھا کسے خبر تھی کہ کتنی بڑی ہلچل دل میں لیے بیٹھا ہے۔

تضاد کائنات کے مانند متضاد شخصیت کے مالک ایک مجرم کا انداز

''تمہارا مطلب..... پولیس کی کاروں سے ہے؟'' ہکمین نے پوچھا۔

''اور پیگی نے ایمبولینس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔'' جون میکلین نے کہا۔

''یہ لمبی کہانی ہے۔'' ہکمین نے کہا اور زمین پر پھیلے ہوئے درختوں کے پتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ان سب کا سبب یہ کم بخت پتے ہیں۔''

جون میکلین حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ ''پتے؟''

''میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، میکلین۔ تم اپنے برساتی نالوں میں سے درختوں کے پتے کس طرح صاف کرتے ہو؟ تم اپنی چھت پر چڑھ کر خود ان نالیوں کو صاف کرتے ہو تاکہ بارش کا پانی چھت پر رکا نہ رہے؟ ایسا ہی کرتے ہو نا؟''

''جب ضرورت پڑتی ہے تو ایسا ہی کرتا ہوں۔ کیوں؟''

''ویل، لیکن میرے لیے یہ کام قدرے مشکل ہوتا ہے۔'' ہکمین نے سر کی جنبش سے اپنے گھر کی چھت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چھت کے سامنے کا حصہ تو اتنا خراب نہیں ہے لیکن چھت کا پچھلا حصہ..... ویل میمنٹ اور میرے مکان کی پچھلی چھت ڈھلوان پر ہے اور اس جگہ چھت اور زمین کا فاصلہ تین منزلوں کے برابر ہے۔ اگر میں عقبی چھت پر سے پھسل پڑوں تو میری موت یقینی ہے۔''

جون میکلین باری باری کبھی ہکمین اور کبھی اس کے گھر کی چھت کو دیکھنے لگا۔ وہ تصور کرنے لگا کہ اگر اس کا پڑوسی منہ کے بل عقبی چھت سے نیچے پختہ فرش پر گرا تو کیا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آگئی۔

''لیکن ہکمین، اس بات کا رات کی ہلچل سے کیا.....''

''سو میں نے جو فیصلہ کیا، وہ یہ تھا کہ مجھے ایک مضبوط سی رسی اور لنگنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوگی۔'' ہکمین نے جون میکلین کی بات ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جیسا کہ پہاڑوں پر چڑھنے والے کرتے ہیں۔ بس مجھے یہ اور کرنا تھا کہ رسی کا ایک سرا یہاں نیچے مکان کے سامنے کے حصے میں کسی مضبوط ٹھوس چیز سے باندھ دوں اور رسی کا دوسرا سرا اپنی کمر میں باندھ کر گیراج کی چھت پر سے ہوتا ہوا چھت کی چوٹی تک چلا جاؤں۔ سو اگر میں چھت کی دوسری جانب اتفاق سے پھسل بھی جاؤں تو رسی مجھے نیچے گرنے سے بچالے گی اور میں مرنے سے بچ جاؤں گا۔ تم نے اب تک کی میری بات سمجھ لی؟''

''نہیں۔'' جون میکلین نے بے چارگی سے جواب دیا۔

''سو کل میں نے یہی کچھ کیا۔'' ہکمین نے اس مرتبہ بھی اس کے انکار کو ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں میری کی کار کو بیک کر کے گھر کے بالکل سامنے لے آیا اور اسے پارکنگ بریک پر کھڑا کر دیا۔ پھر رسی کا ایک سرا کار کے عقبی بمپر سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا اور رسی کا دوسرا سرا مضبوطی کے ساتھ اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اچھی طرح گرہ لگا دی۔ پھر میں پوری طرح تیار ہوگیا۔ میں گیراج کی چھت پر جانے کے لیے کار کے اوپر چڑھ گیا اور گیراج کی چھت اور مکان کے سامنے کی چھت پر سے ہوتا ہوا چھت کے عقبی ڈھلوانی حصے میں چلا گیا۔ پھر میں نے وہاں نالیوں میں پھنسے اور چھت پر بکھرے ہوئے تمام پتے صاف کر دیے۔ میں نے یہ کام نہایت محفوظ اور مکمل طریقے سے سرانجام دے دیا۔'' یہ کہتے ہوئے ہکمین نے اپنے کنگھی نما لمبے پتے سمیٹنے والے اوزار سے ٹیک لگائی اور مسکرا دیا۔ ''کہو، کیسا رہا؟''

جون میکلین حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ''یہ تم نے کیا فضول گوئی شروع کر دی، ہکمین؟ میں نے تو تم سے ایمبولینس کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''یہی کچھ تو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔''

جون میکلین کو اچانک سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم چھت پر سے نیچے گر پڑے تھے؟''

''نہیں، نہیں۔ میں نہیں گرا تھا۔ ذرا ایک سیکنڈ کے لیے سوچو۔ اس بات کو ذہن میں رکھتا جو میں نے تمہیں ابھی ابھی بتائی ہے..... رسی اور ڈھلواں چھت کی صورتِ حال کو مدِنظر رکھو پھر سوچو کہ کیا بدترین واقعہ پیش آسکتا تھا؟''

''اس وقت جب تم چھت پر تھے، تمہارا یہی مطلب ہے نا؟'' جون میکلین نے بدستور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔

''درست!''

''مجھے نہیں معلوم۔'' جون میکلین نے ایک لمحے کے لیے غور کیا پھر بولا۔ ''رسی ٹوٹ گئی تھی؟''

''نہیں۔''

''رسی کی گرہ کھل گئی تھی؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا تھا؟''

''تم نے ہار مان لی؟''

''ہاں۔ میں ہار گیا۔''

''میری اپنی کار اسٹارٹ کر کے لے گئی۔'' ہکمین نے بتایا۔

''کیا؟'' جون میکلین تقریباً چیخ پڑا۔

ہکمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اپنے پڑوسی کے ردِعمل پر اس کی خوشی قابلِ دید تھی۔ ''فرض کیے لیتے ہیں کہ تم

Digitized by Google

اوپر چھت کی دوسری جانب اپنے آپ میں مگن اور خوشی خوشی کام کررہے ہو۔ رسی کا ایک سرا تمہاری کمر سے بندھا ہوا ہے اور دوسرا سرا میری کی نیچے ڈرائیوے میں موجود کار کے بمپر سے بندھا ہوا ہے۔ اسی اثنا میں میری گھر سے باہر آتی ہے اور اپنی کار میں سوار ہوجاتی ہے جس کا رخ سڑک کی جانب ہے۔ اسے کار کے بمپر سے بندھی رسی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ کار اسٹارٹ کرتی ہے، ہینڈ بریک ریلیز کرتی ہے اور کار آگے بڑھا دیتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟'' ہمین نے اپنے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جون میکلین منہ پھاڑے کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔

''پھر ہوتا یہ ہے کہ تم عقبی چھت کی ڈھلان پر سے گھسٹتے ہوئے چھت کی چوٹی پر آتے ہو، وہاں سے گھسٹتے ہوئے سامنے کی چھت پر، پھر وہاں سے چھجے سے ہوتے ہوئے دھم سے ڈرائیوے میں آن گرتے ہو اور پھر میری تمہیں گھسیٹتی ہوئی سڑک پر کچھ دور تک لے جاتی ہے اور تم اس دوران زخمی جانور کی طرح چلاتے رہتے ہو۔''

''گڈ گاڈ ہمین!'' جون میکلین نے دبی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''یہ سب کچھ حقیقت میں تمہارے ساتھ پیش آیا تھا؟''

''نہیں، نہیں۔ میرے ساتھ پیش نہیں آیا۔''

''تو پھر؟'' جون میکلین سٹپٹا گیا۔ ''تو پھر کس کے ساتھ پیش آیا تھا؟''

''نقب زن کے ساتھ!''

جون میکلین پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس نے قدرے سنبھلتے ہوئے دہرایا۔ ''نقب زن کے ساتھ؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس نے گزشتہ روز مجھے چھت پر چڑھ کر صفائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر گزشتہ شب جب ہم سونے کے لیے جلدی بیڈ پر چلے گئے تھے اور تمام روشنیاں گل کردی تھیں اور میری بہن رات کے کھانے کے بعد میراثک مستعار لے گئی تھی تو وہ نقب زن یہی سمجھا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں ہے۔ تمہیں تو علم ہے اوپری فلور کے عقبی حصے میں ایک چھوٹی سی بالکونی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نقب زن نے یہی سوچا کہ وہ میرے رسی والے آئیڈیے کو استعمال میں لاتے ہوئے وہاں اوپر پہنچ جائے اور بالکونی کی کھڑکی سے نقب لگا کر اندر داخل ہوجائے۔ میں نے رسی ابھی تک وہیں چھت پر چھوڑی ہوئی تھی اور سب کچھ ویسا ہی تھا۔''

جون میکلین پر ابھی تک سکتے کی سی کیفیت طاری تھا۔

ہمین نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''پھر ہوا یوں کہ میری کو بھی منہ اندھیرے ہی کام پر جانا تھا۔ اسے کوئی سافٹ ویئر انسٹال کرنا تھا۔ اسی لیے ہم رات کو جلدی سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ وہ صبح تین بجے اٹھ کر باہر آئی اور کار لے کر چل پڑی..... اور وہ بدنصیب نقب زن بالکونی پر سے گھسٹتا ہوا، چھت پر سے ہوتا ہوا نیچے ڈرائیوے میں آن گرا اور میری اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر دور تک لے گئی۔ اس شور وغل سے میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ کر باہر کی جانب لپکا۔ پورچ میں میری بائیسکل کھڑی تھی۔ میں اس سے الجھ کر گر پڑا اور میری گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔''

جون میکلین بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔ ''پھر برگر کو کیا ہوا؟''

''وہ غالباً ٹھیک ہی ہوگا۔ ایمبولینس کے لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ حالانکہ میری اسے گھسیٹتی ہوئی سڑک کے کارنر تک لے گئی تھی۔ تب شور وغل سن کر اسے احساس ہوا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے اور پھر اس نے کار روک دی تھی۔''

''وہ اسے سڑک کے کارنر تک گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی؟''

''ہاں کارنر تک!''

''ناقابل یقین۔ وہ پھر بھی زندہ بچ گیا؟''

''ہاں۔'' ہمین بڑبڑایا۔

''تمہارے خیال میں چوٹیں تو بہت بری طرح آئی ہوں گی؟''

ہمین کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''حقیقت میں چوٹیں بہت زیادہ تو نہیں آئیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک انگڑائی لی اور پھر کراہتے ہوئے اپنا ایک بازو تھام لیا۔ ''زیادہ چوٹ داہنے کاندھے پر لگی ہے۔ یہ میری اپنی غلطی سے ہوا۔ مجھے اپنی بائیسکل راستے میں پورچ پر نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔''

جون میکلین اپنے پڑوسی کو دیکھتا رہ گیا جو دوبارہ سے اپنے صحن میں پھیلے ہوئے پتے سمیٹنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ وہ اپنا سر سہلاتا ہوا اپنے گھر کی جانب واپس چل دیا۔ اس نے ڈرائیوے میں رکھا ہوا اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ کچھ دیر قبل ائرپورٹ سے گھر آتے ہوئے راستے میں جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی زندگی پرسکون ہے اور عجیب وغریب چیزوں یا افراد سے عاری ہے تو وہ غلطی پر تھا۔

اس کی زندگی میں چند عجیب وغریب لوگ بھی شامل ہیں اور ان میں سے ایک اس کا پڑوسی ہمین بھی ہے.....

تیرھواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT

Digitized

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اُوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل بخمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کو شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں ترپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔ ترپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی مجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی مجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سونجنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہابچاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے بچاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی مجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک مجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب مجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی ترپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر ایریہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا منجن ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ منجن ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار ایریہ کو بری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بچھو رام کرنل کو حتمی خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریز کوہ شالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔

ادھر بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کرلیں۔ دو پجاری رینا کو اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے ہیں، اسی وقت گولی چلنے کی آواز فضا میں ابھرتی ہے۔ انگریز وہاں حملہ کردیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک نادیدہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کالی کا مندر تباہ ہوجاتا ہے اور شوکی ملبے تلے دب جاتا ہے۔ ادھر شاہ زمان آزاد ہوکر اریبہ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ شاہ زمان فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اریبہ کو وہاں سے رہا کروالیتا ہے۔ ادھر رابرٹ اپنی بہن گارشیا کا گلا دبا کر سونجا کو راج محل سے بھگا لے جاتا ہے۔ تاہم گارشیا بچ جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے راج محل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شوکی کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک غار میں ہوتا ہے وہ غار سے نکلنے میں نیچے کھائی میں گر جاتا ہے تاہم وہی پراسرار ہستی اس کی جان بچاتی ہے۔ شوکی کے سامنے ایک حسین وجمیل عورت ہوتی ہے جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہوجاتا ہے۔ اسرشاہ زمان اور اریبہ سی ہاک پر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی وقت ایک موٹر بوٹ کی آواز آتی ہے جو اسی طرف بڑھی چلی آرہی ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موٹر بوٹ کی آواز پر وہ دونوں میاں بیوی بھی چونکے تھے۔

شاہ زمان اس وقت مخمصے کا شکار ہوگیا تھا۔ اریبہ کی نگاہیں بھی اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اس کے تذبذب کی وجہ جان گئی تھی۔ بالآخر سرگوشی میں جیسے اس نے شاہ زمان کی مشکل حل کرنا چاہی، بولی۔

''زمان! انہیں قتل مت کرو۔''

''کیا تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ ان دونوں نے اپنی خوشیوں بھری زندگی کی نئی ابتدا کی ہے؟'' زمان نے اس کی طرف دیکھ کر آہستگی سے کہا۔ اس کے پروجیہہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''یہ بات اپنی جگہ لیکن کیپٹن جیمس کے خیالات تم نے محسوس نہیں کیے؟''

''ہوں..... اسی لیے میں نے بھی اپنا ارادہ بدل ڈالا ہے، لیکن کیا یہ مشن سے غداری کے مترادف نہیں ہوگا؟''

''ہم کوئی غداری نہیں کررہے۔ بس! فی الحال انہیں چھوڑ دو۔'' اریبہ نے کہا۔ وہ خاصی سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

درحقیقت ان کا پہلا ٹارگٹ یہ دونوں میاں بیوی ہی تھے یا پھر کم از کم وہ کیپٹن جیمس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ کرنل اینڈرسن کی جگہ اس جزیرے میں تعینات کیا گیا تھا اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں، نوابوں اور راجاؤں کے قیمتی شاہی نوادرات کی چوری اور ان کی انگلستان ترسیل اسی کی زیرنگرانی عمل پارہی تھی لیکن اس سلسلے میں نوجوان اور خوبرو کیپٹن جیمس کے خیالات جان کر شاہ زمان ہی نہیں، اب اریبہ بھی مخمصے کا شکار ہوگئی تھی۔

''اوڈارلنگ..... ! شاید جزیرے سے کوئی آرہا ہے، وہاں کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ دھماکوں کی آوازیں یہاں تک سنائی دی ہیں۔ مجھے ذرا ان سے ملنے دو..... یہ اپنے ہی ساتھی ہیں۔''

اچانک کیپٹن جیمس کی آواز ابھری۔ نوبیاہتا ازابیلا نے بیزاری سے ہنکارا بھرا پھر کسی کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی آواز ابھری۔

زمان اور اریبہ کچن کے داخلی دروازے سے ایک بار پھر باہر آگئے۔

ان دونوں کے پاس گرکھ اور برڈ سے چھینے ہوئے ہتھیار تھے جو انہوں نے اب اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ اریبہ کے پاس گرکھ سے چھینا ہوا لمبی نال والا پستول تھا جبکہ زمان کے پاس برڈ کی رائفل۔

موٹر بوٹ کی مخصوص آواز قریب آگئی تھی۔ وہ دوسرے رخ پر اور ابھی نظروں سے اوجھل تھی۔ کیبن کا داخلی دروازہ بھی اسی جانب کھلتا تھا۔ یہ دونوں عقبی دیوار کی طرف چھپے کھڑے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ اوپری منزل تھی۔

زمان نے سرگوشی میں اریبہ سے کہا۔ ''تم ادھر ہی کھڑی رہنا۔ یہاں سے کوئی آسکتا ہے۔ میں ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔'' اریبہ نے آہستگی سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ زمان آگے کو کھسک گیا۔

وہ نیچے اترا۔ اوپری کیبن کی دیوار سے چپکا ہوا وہ اس کے داخلی دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر رکا۔ اس نے وہاں موجود چکردار زینے کے خلا میں اپنے نکلنے کی جگہ بنالی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھے، انہیں دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے لیے اسے نیچے جانے کی چنداں

ضرورت نہیں ہے، وہ موٹر بوٹ سے ہاؤس بوٹ پر سیدھا ادھر ہی کا رخ کریں گے پھر ذرا ہی دیر بعد اسے اپنا اندازہ درست ثابت ہوتا نظر آیا۔

مذکورہ دروازے سے کیپٹن جیمس اپنی مخصوص سرخ اور نیلی وردی میں نمودار ہوا اور نیچے جانے کے بجائے ریلنگ پر ہی کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ اسی وقت ایک مسلح فوجی اس کے پاس آیا اور مؤدبانہ کہا کہ جزیرے سے آفیسر رینالڈ آیا ہے اور وہ اس سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔

جواب میں کیپٹن جیمس نے فقط اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔

سپاہی واپس لوٹ گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد زمان نے دیکھا، سیڑھیوں پر قدموں کی آواز ابھری۔ نظر آنے والے پہلے شخص کو دیکھتے ہی زمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ اپنی رائفل اس کے ناپاک وجود پر خالی کر ڈالے مگر بڑی مشکل سے اس نے اپنی اس خواہش کو دبائے رکھا۔

وہ رینالڈ تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح سپاہی تھے۔ باقی شاید موٹر بوٹ میں موجود رہے تھے۔

رینالڈ کے چہرے سے غیظ و غضب کے علاوہ پریشانی اور تشویش بھی ہویدا تھی۔ اس نے بے حد خشک مگر مؤدبانہ انداز میں کیپٹن جیمس سے مصافحہ کیا اور اس سے کچھ کہا۔ کیپٹن جیمس انہیں اندر لے گیا۔

زمان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نہایت محتاط روی کے ساتھ اپنی جگہ سے نکلا اور اریبہ سے آن ملا۔

''واپس وہیں چلو جلدی۔'' اس نے جلدی سے اریبہ سے سرگوشی میں کہا اور ذرا ہی دیر بعد دونوں کچن کے باہر کی جانب کھلنے والے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

اریبہ کو زمان نے باہر کھلنے والے دروازے پر محتاط کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور خود اندر کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب وہ اس کی جھری سے دوسری جانب دیکھ بھی سکتا تھا اور ان کی باتیں بھی آرام سے سن سکتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کیپٹن جیمس اور آفیسر رینالڈ آمنے سامنے دو نشستوں پر براجمان ہو چکے تھے، جبکہ سپاہی رینالڈ کے عقب میں کنیں تھامے الرٹ کھڑے ہو گئے۔

ازابیلا اپنے شوہر کیپٹن جیمس کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس نے دیدہ زیب اور دلکش سا رنگین فراک پہن رکھا تھا۔ جس کا گریبان قدرے کشادہ تھا۔ اس کی عمر انیس، بیس سے کسی طور بھی زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اپنے شوہر کی طرح وہ بھی سرو قد تھی۔ رنگ گورا اور سرخی مائل تھا۔ آنکھیں گہری براؤن تھیں۔

کیپٹن جیمس اور آفیسر رینالڈ کے درمیان کسی قسم کی رسمی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ نشست سنبھالتے ہی رینالڈ نے کیپٹن جیمس سے کہا۔

''بہت معذرت اور افسوس سے مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کیپٹن کہ جب سے تم نے اس جزیرے کا چارج سنبھالا ہے، تب سے یہاں مسلم باغیوں کے چھاپا مار کوئی نہ کوئی گوریلا کارروائی کرتے رہتے ہیں۔ خاور حیات کے پورے کمانڈر گروپ کا تو کرنل اینڈرسن نے اپنی دانش مندی اور چابک دستی سے صفایا کر دیا تھا۔ مگر کرنل اینڈرسن کے جاتے ہی صرف دو مسلم گوریلوں نے یہاں تباہی و بربادی مچا دی ہے جن میں سے ایک عورت ہے۔''

آفیسر رینالڈ کرنل اینڈرسن کے گن گانے کے بعد ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نوجوان اور خوبرو کیپٹن جیمس اس کے کڑوے کسیلے جملوں پر سخت برہم ہوگا۔ مگر وہ خاموشی سے نشست سے پشت ٹکائے اس کی جانب دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو..... ''تم نے اپنی بات ختم کر لی ہو تو اب میں کچھ کہوں؟''

ازابیلا کی آنکھوں اور حسین چہرے سے بھی بے پروائی کے آثار ہویدا تھے۔

جیسا کہ مذکور ہوا، آفیسر رینالڈ، کرنل اینڈرسن کا منہ چڑھا آفیسر تھا، وہ صرف اینڈرسن کو ہی اپنا آفیسر سمجھتا تھا اور اس کی مانتا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اینڈرسن اور رینالڈ کا مزاج اور فطرت ایک دوسرے سے میل کھاتی تھیں۔ دونوں ہی مسلم باغیوں کے خلاف اپنے دل و دماغ میں نفرت، کینہ اور بغض رکھتے تھے۔ نیز ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کے عظیم خزانے کو چوری کر کے انگلستان منتقل کرنے میں بھی زیادہ پُرجوش تھے۔ یوں ان دونوں کے اس ناپاک مقصد میں دلچسپی بھی مشترکہ تھی۔

لہٰذا کیپٹن جیمس کو جب کرنل اینڈرسن کی جگہ یہاں تعینات کیا گیا تو رینالڈ کو یہ نوجوان آفیسر ایک آنکھ نہیں بھایا تھا کیونکہ نہ اس نے کبھی جیمس کو انگریزوں کی برصغیر میں برتری سے متعلق مثبت اظہار خیال کرتے دیکھا تھا نہ ہی سنا تھا۔ رینالڈ کا خیال تھا کہ یہ نوجوان اپنی حسین و جمیل اور نوبیاہتا بیوی ازابیلا کے سوا اور کسی مسئلے میں توجہ ہی نہیں دینا چاہتا۔

''اور .....'' کیپٹن جیمس کو بدستور سامع کی حیثیت

میں چپ پا کر رینالڈ نے دانستہ ایک طنزیہ سی نظر کیپٹن جیمس کے برابر میں براجمان حسین وجمیل از ابیلا پر ڈالی۔

''میرا خیال ہے آپ دونوں کو نئی نئی شادی کے بعد ہنی مون کے بجائے یہاں اس خشک ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا جو میرے خیال میں ایک غلط فیصلہ تھا۔''

رینالڈ کا خیال تھا کہ اس کے آخری طنزیہ ریمارکس پر تو ضرور کیپٹن جیمس بھڑک ہی اٹھے گا اور ایک حد تک یہ درست بھی تھا، کیونکہ کیپٹن جیمس بہرحال ایک نوجوان تھا۔ اس کی رگوں میں بھی جوانی کا گرم خون گردش کر رہا تھا۔ اسے بھی ایک دم غصہ آسکتا تھا، لیکن اس کے برعکس کیپٹن جیمس نے رینالڈ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت بردبارانہ انداز میں لیکن تیکھے اور کٹیلے لہجے میں کہا۔

''آفیسر رینالڈ! تمہیں سرکار نے کیا پھر یہاں جھک مارنے کے لیے بھیجا ہے؟ جزیرے کی ناکا بندی اور مشکوک افراد پر کڑی نگرانی کی ساری ذمے داری کرنل اینڈرسن نے تمہارے ذمے لگا رکھی ہے اور تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں یہاں اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوں؟ جہاں تک رہی اس جزیرے میں ڈیوٹی کی بات تو ہماری قوم کا ہر آدمی اس وقت پورے برصغیر میں ڈیوٹی پر ہی ہے۔ یہ تمہاری اپنی نااہلی ہے کہ صرف دو مسلم گوریلوں کے ہاتھوں تم اس قدر بے بس ہو گئے ہو اور منہ اٹھائے یہاں چلے آئے۔ اطلاع دینے والی بات اور ہے مگر تم نے یہاں آکر اپنی شکست اور ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے میرے سامنے خرافات بکنا شروع کر دیں۔''

کیپٹن جیمس کے یہ الفاظ رینالڈ کی پیشانی پر لگے۔ وہ بھی تڑخ کر بولا۔

''کیپٹن! میں یہاں زیادہ باتیں کرنے نہیں آیا ہوں۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سی ہاک کو اب انگلستان روانگی کا حکم نامہ تمہیں جاری کرنا ہوگا۔ اسی وقت..... بہ صورتِ دیگر مجھے اجازت نامے کے لیے کہیں اور رجوع کرنا پڑے گا۔''

اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔ کیپٹن جیمس سوچ میں پڑ گیا۔ جیمس کے لیے رینالڈ کا یہ رویہ نیا نہیں تھا کیونکہ اسے اب تک یہاں رہتے ہوئے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ رینالڈ، کس قدر خود سر اور منہ چڑھا آدمی تھا۔

اس کی وجہ کرنل اینڈرسن کی ڈھیل تھی جو اس نے خاور حیات والے گروہ کو نہایت سفاکی اور بے رحمی سے ختم کرنے کی وجہ سے اسے دے رکھی تھی اور جیمس یہ بھی جانتا تھا کہ اس بار صرف دو مسلم گوریلوں، جن میں ایک عورت بھی تھی، انہوں نے رینالڈ کا سارا غرور خاک میں ملا دیا ہے اور وہ اپنی اس ناکامی اور شکست پر بری طرح جھلایا ہوا ہے۔ یوں وہ اس کے سر اپنی ناکامی تھوپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کیپٹن جیمس نے سوچا، رینالڈ اعلیٰ حکام کو غلط تصویر پیش کر کے وہ اجازت نامہ حاصل بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے بحث کرنا فضول ہی تھا۔ اس نے زیادہ بات کرنے کے بجائے سی ہاک کی انگلستان روانگی کا حکم نامہ جاری کر دیا۔

ادھر شاہ زمان یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن جیمس کو منہ چڑھے ماتحت کے دباؤ میں آتا دیکھ کر زمان کو مزید رینالڈ پر سخت طیش آنے لگا۔ وہ جان گیا تھا کہ رینالڈ ..... اپنی ناکامی کیپٹن جیمس کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جیمس نے بھی اسے اپنی اوقات یاد دلا دی تھی۔

تاہم اب رینالڈ ڈر گیا تھا کہ کہیں وہ دونوں گورے پیلے (زمان اور اریبہ) سی ہاک کی روانگی کو بھی نہ خطرے میں ڈال دیں۔ یوں کیپٹن جیمس کو بھی حالات سے مجبور ہو کر یہ حکم نامہ جاری کرنا پڑا تھا۔

کیپٹن جیمس نے اسی وقت حکم نامہ جاری کر کے رینالڈ کو تھما دیا۔

شاہ زمان کسی بگولے کی طرح پلٹا اور اریبہ کو مختصر ترین الفاظ میں ساری بات بتاتے ہوئے جوش سے بولا۔

''رینالڈ کا خاتمہ اب ضروری ہو گیا ہے..... اس سے پہلے کہ وہ سی ہاک تک پہنچے۔''

دونوں باہر آگئے۔ کیبن کی عقبی بیرونی دیوار سے چپکے ہوئے وہ نیچے جانے والے زینے کے بجائے دوسری طرف سے نیچے کود گئے۔

''ہالٹ.....'' اچانک ایک کرخت آواز ابھری۔ یہ وہی پہرے دار تھا جو انہیں ہاؤس بوٹ پر کھڑا نظر آیا تھا۔ شاہ زمان کو اس بات پر پچھتانے کا بھی موقع نہ ملا کہ اس کا بندوبست اسے شروع میں ہی کر دینا چاہیے تھا، پہرے دار نے ایک فائر جھونک دیا۔

رات کے دم بہ خود سناٹے میں گولی چلنے کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ شاہ زمان کے گولی لگی اور اس کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑایا، اریبہ ہراساں ہو گئی۔

''زمان.....!'' اریبہ دکھ بھری پکار سے اسے سنبھالنے کو لپکی۔

فرنگی پہرے دار نے اپنی رائفل سے دوسری گولی داغی۔ اس بار اس کا نشانہ اریبہ تھی، مگر زمان نے گرتے ہوئے

بھی اپنے حواس بحال رکھے تھے اور خطرے کو قریب تر محسوس کرتے ہوئے اریبہ کو اپنے ساتھ ہی نیچے لڑھکا دیا تھا۔

رات کے سناٹے میں دوسری گولی کا دھماکا ہوا اور اریبہ کے بجائے گولی کیبن کی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ اریبہ نے اپنا پستول تولا اور غضب ناکی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایک آڑ سے فرنگی پہرے دار کی موجود سمت جانچی، جلد ہی اسے اس کا ہیولا ایک مستول کی آڑ سے جھلک دکھا گیا۔ اس نے تاک کر گولی چلا دی۔

ایک چیخ ابھری اور پہرے دار ریلنگ سے ٹکراتا ہوا ایک چھپاکے سے سمندر میں جا گرا۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ رینالڈ کی چلاتی ہوئی غضب ناک آواز سنائی دی۔

''الرٹ.....! وہ دونوں ہاؤس بوٹ میں موجود ہیں۔ گولیوں سے بھون دو ان دونوں کو.....''

گولی زمان کے دائیں شانے میں پیوست ہوگئی تھی۔ اریبہ نے اسے سنبھالے رکھا تھا۔ زمان کو زخمی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''یہ رونے کا وقت نہیں ہے اریبہ! میری گن اٹھاؤ اور اب اپنا پستول میرے ہاتھ میں تھما دو۔'' زمان نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا اور اریبہ نے اس کی گن جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب ہی گر پڑی تھی، خود تھام لی اور اپنا پستول شاہ زمان کو دے دیا۔ زخمی شانے کے سبب شاید وہ رائفل اٹھانے میں دقت محسوس کر رہا تھا، اسی لیے اس نے اریبہ سے پستول لے کر رائفل اسے دی تھی۔

''پہرے دار کو میں نے گولی ماردی ہے۔''

''لیکن رینالڈ کو ہاؤس بوٹ سے زندہ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔'' وہ بولا اور بہ مشکل تمام اریبہ کے سہارے اٹھا۔ وہ پریشانی سے بولی۔

''میں اس مردود سے نمٹ لیتی ہوں زمان! تم.....''

''ہرگز نہیں، وہ اکیلا نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ بزدل ہاؤس بوٹ سے فرار ہو کر کسی باک تک پہنچنے کی کوشش کرے.....'' زمان کو تکلیف کے باعث بولنے میں بھی دقت ہو رہی تھی لیکن ایک جوش تھا ایک جذبہ تھا جس نے اس کے ریختہ وجود میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔

ادھر اریبہ نے البتہ جلدی جلدی اسی کی قمیص پھاڑ کر اس کی پٹی سی زمان کے زخمی شانے پر اچھی طرح ..... لپیٹ کر باندھ دی۔ پٹی کرتے ہوئے خود اریبہ کے ہاتھ بھی زمان کے گرم گرم خون سے تر ہو گئے تھے، کیبن کی دیواروں پر بھی بڑے بڑے خون کے دھبے پڑ چکے تھے۔ خون کے یہ نشانات اور دھبے دشمن کی راہنمائی کر سکتے تھے۔ یہ خدشہ دونوں کو تھا اسی لیے وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔

زمان نے خود کو کچھ سنبھالا لیا، گن کو مضبوطی سے دوسرے ہاتھ میں تھاما اور دونوں آگے بڑھے۔ اریبہ کو ایک فرنگی سپاہی نظر آیا۔ اس نے اپنی رائفل تانی تھی کہ اریبہ نے بجلی کی سی پھرتی سے اس پر فائر کر دیا، وہ بھی کائیاں تھا، فوراً جھکائی دے گیا، نشانہ خطا گیا مگر اگلے ہی لمحے وہ حلق کے بل زور سے چلایا۔ ''وہ اس طرف ہیں۔''

''ہمیں الگ سمتوں میں بٹنا ہوگا اور سنو..... ہمارا اصل شکار رینالڈ ہے اریبہ.....! وہ کسی صورت بھی بچنے نہ پائے۔'' زمان نے اپنے درد پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا تو وہ فکر مند ہو کر بولی۔

''لل.....لیکن تم زخمی ہو اور.....''

''میری پروا مت کرو..... میں اب ٹھیک ہوں۔'' زمان سخت لہجے میں بولا اور..... اریبہ کو ایک سمت کی جانب بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ اریبہ نے اشک بار آنکھوں سے زمان کے چہرے کا بوسہ لیا اور ایک سمت بڑھ گئی۔

☆☆☆

گھپ نما اس غار کے باہر ہنوز سرد اور برفیلی کاٹ دار ہوائیں چل رہی تھیں، مگر اس چھوٹے سے غار کی محدود فضا میں سردی کا احساس کم تھا۔ سہ پہر بھی دن کی طرح کالی گھٹائیں اوڑھے ہوئے تھی اور اب جیسے اپنا برف جیسا چاندی کا آنچل شام کو اوڑھانے کی تیاریوں میں تھی۔ کچھ اسی سبب بھی سردی بڑھنے لگی تھی اور برف باری کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے۔

لیکن..... شوکی کو موسم کی سختی کی پروا نہیں تھی وہ تو بس یک ٹک..... اس پراسرار اور حسین حسینہ کو تکے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے کسی طلسمی سلطنت کی ملکہ ہو۔ جیسے کسی اجنبی اور پراسرار دیس کی دیوی ہو۔ سروقد، گھنے سیاہ ریشمی بال، تراشیدہ بدن جیسے کسی ماہر مجسمہ ساز کا شاہکار ہو۔ گمبھیری پلکوں تلے گجراری آنکھوں میں تو جیسے ایک مقناطیسی فسوں بھرا ہوا تھا۔ لبوں کی لطافت تو... بغیر بولے بھی شیریں سخن کا تاثر دیتی محسوس ہوتی تھیں۔

شوکی تو جیسے اس پری جمال کی سحر کاری سے مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ پراسرار مسکراہٹ سے ایک قدم اس کی جانب بڑھی۔

''تت.....تم کون ہو؟'' بالآخر شوکی نے خود کو اس

Google

کے سحر سے نکالنے کی سعی میں اکٹھے لفظوں کا سہارا لیا۔

''میں سدھا..... ہوں۔'' اس کے تراشیدہ لبوں سے جیسے شیریں سخن مدھر بیاں ہوا۔

ایکا ایکی شوکی کو یوں لگا جیسے وہ اسراریت میں گھرنے لگا ہو۔ اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے سوچا کہ اگر اس کا یہی حال رہا تو وہ اس پراسرار اور اجنبی لڑکی کے طلسم کا شکار ہو جائے گا۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ وہ کسی ساحر طراز حالات سے اس وقت دوچار ہونے لگا ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ اس کا پوری طرح شکار ہو جائے اسے ہمت اور حوصلے سے گفتگو کرنی چاہیے۔ سوآگے بولا۔

''لیکن میں تمہیں نہیں جانتا اور نہ ہی جاننے کی خواہش رکھتا ہوں ..... مگر میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہوں گا کہ تم نے میری جان بچائی۔''

وہ سدھا نامی لڑکی کھلکھلا کر ہنسی۔

''تم مجھ سے ڈر کیوں رہے ہو؟ میں نے تمہیں بھلا کب نقصان پہنچایا ہے؟'' سدھا کے لہجے میں معصومیت تھی۔ شوکی نے پھر کچھ حوصلہ پکڑا اور صاف گوئی سے بولا۔

''ہاں! میں تم سے کچھ خوف زدہ ہوں۔ اس لیے کہ تم عام انسانوں سے مختلف ہو۔''

''خاصے بہادر ہو تم..... اور ضدی بھی۔''

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور..... اور..... رینا کہاں ہے؟'' شوکی نے فوراً مطلب کی بات کر ڈالی۔

''بہت پریم کرتے ہو تم رینا سے.....!'' سدھا نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔ شوکی نے اس کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال دہرا دیا۔ وہ بولی۔

''تم اپنی منزل سے کچھ زیادہ دور نہیں ہو۔''

''میری منزل؟'' شوکی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا رینا تمہاری منزل نہیں ہے؟'' وہ پھر اسرار بھرے انداز میں مسکرائی۔

''ہاں.....! تو کیا رینا زندہ ہے؟ کہاں ہے وہ؟'' وہ بے قرار ہو گیا۔

''راج محل میں۔''

''راج محل میں؟'' شوکی الجھ گیا۔ ''لیکن..... میں کہاں ہوں؟''

''تم کوہ شالیہ کی پچھمی سرحدی وادی میں ہو۔''

''لل..... لیکن میں یہاں کیسے آیا؟''

''میں لائی تھی۔'' سدھا نے جواب میں کہا۔

''کیوں؟ میں تو اس شیطان پجاری بدری ناتھ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔''

''وہ بہت دور جا چکا ہے۔ تم اسے اب ہلاک نہیں کر سکتے۔''

''تم مجھ پر ایک احسان اور کر دو..... میری راج محل تک راہنمائی کر دو۔'' شوکی نے لجاجت سے کہا۔ اس کی بات سن کر سدھا کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ شوکی کو اس کی سنجیدگی میں اداسی کی رمق بھی محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سدھا شوکی کے یہاں سے جانے پر غمگین سی ہو۔

''کیا تم میرے بارے میں جاننا نہیں چاہو گے؟ میں کون ہوں؟'' سدھا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں اب کی بار عجیب سی یاسیت تھی۔ جبکہ حقیقت یہی تھی کہ شوکی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کون تھی اور کیا تھی۔ وہ بولا۔

''تم میری محسن ہو۔ تم نے کئی بار میری مدد کی لیکن یہ حسرت میرے دل میں ہی رہی کہ میں اس شیطان پجاری بدری ناتھ کو ہلاک نہ کر سکا جس نے رینا کو ہی نہیں اور بھی نہ جانے کتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو اپنی شیطانیت کی بھینٹ چڑھا دیا۔''

شوکی کے ان الفاظ کا سدھا پر جانے کیا اثر ہوا کہ وہ ..... جیسے ایک دم ہی اس کے قدموں میں ڈھے سی گئی۔

''تم بہادر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے منش بھی ہو۔ تمہاری یہ دونوں صفات تمہیں ایک بڑا مہان آدمی بناتی ہیں۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے.....؟''

شوکی حیران و پریشان سدھا کو دیکھتا رہ گیا۔ بلکہ ایک لمحے کے لیے تو وہ بوکھلا ہی گیا۔ تاہم اس کے اندر کا جبلی خوف کچھ کم ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ جس لڑکی نے اس کی ایسے خطرناک، کڑے اور پراسرار حالات میں مدد کی، وہ بھلا اس کے پیروں میں جھک کر کس قسم کی مدد کی خواہاں ہے؟

اس نے ذرا سنبھلتے ہوئے اسے.... چھوا تو وہ اسے انسانوں کی طرح لگی۔ تب اس نے مطمئن ہو کر بازوؤں سے تھام کر اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑا کر کے بولا۔

''سدھا! تم نے مجھے پہلے خوف زدہ اور اب حیران کر دیا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ جس نیک ہستی نے میری ایسے حالات میں بار بار مدد کی وہ بھلا کیونکر الٹا مجھ سے ہی مدد کے لیے کہہ رہی ہے؟''

شوکی کی بات پر سدھا کی آنکھوں میں..... چمک

ابھری۔ اس کے دل نشیں لب وا ہوئے اور وہ بولی۔

''شوکی! اس سنسار میں ایسا ہی کچھ ہے۔ کبھی کوئی کسی کے کام آتا ہے اور کبھی کوئی۔ شاید یہی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ ایک دوسرے کے کام آؤ..... تاکہ یہ سنسار آگے بڑھتا رہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیون کے کسی موڑ پر دو انسان ایک دوسرے کی مدد کے محتاج بھی ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک میں تمہاری مدد کر سکتی تھی، وہ میں نے کی، لیکن میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اسی لیے تم سے مدد طلب کر رہی ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا شوکی کہ میری مدد میں ہی تمہاری مدد شامل ہے۔ اب میں تم سے پوچھتی ہوں کہ کیا تم میری مدد کرو گے؟''

شوکی اس کی بات سن کر عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا۔ اسے کچھ تسلی تو ہوئی تھی کہ یہ لڑکی جو انسانوں ہی کی طرح باتیں کر رہی تھی، کوئی روح یا جن بھوت نہیں تھی لیکن اس میں اسراریت موجود تھی کیونکہ وہ اس کے نام سے بھی واقف تھی۔ اس نے جواب میں کہا۔

''دیکھو سدھا! پہلی بات تو یہ کہ میں جب بھی کسی مصیبت کا شکار ہوتا ہوں تو صرف اپنے اللہ سے ہی مدد طلب کرتا ہوں اور وہی سب کا پالن ہار ہے۔ پھر وہی کسی کو کسی کے لیے مدد کا ذریعہ بناتا ہے۔ تم بھی میرے بجائے ایک اللہ سے مدد مانگو، وہ رحیم و کریم ہے اور سب سے زیادہ طاقت والا بھی..... میں اور تم تو ایک کمزور ہستی ہیں۔''

''میں اللہ سے بھی مدد مانگتی ہوں تو کیا میں یہ نہ سمجھوں کہ اسی نے مجھے تمہاری مدد کرنے کی توفیق عطا کی اور اب وہ تمہیں بھی میرے لیے یہی توفیق عطا کر سکتا ہے؟''

شوکی اس کی بات سن کر لاجواب ہو گیا۔ سدھا کی زبانی اللہ کا نام سن کر اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس پراسرار لڑکی کا تعلق کسی ماورائی یا شیطانی ہستی سے نہ تھا لیکن پھر بھی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا جو بے اختیار اس کی زبان پر بھی آ گیا۔

''کیا تم مسلمان ہو؟''

''میں اس وقت کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ مسلمان نہ ہندو۔'' وہ بولی۔

''تو اس کا مطلب ہے، تم ہندو مت سے تعلق رکھتی ہو؟''

''رکھتی تھی، مگر اب کچھ بھی نہیں رہی۔'' اس نے جواب میں کہا۔ شوکی الجھ کر رہ گیا پھر بولا۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

اس کی بات پر سدھا نے اپنے آنسو پونچھے، پھر پلٹ کر اس سے چند قدموں کی دوری پر جا کھڑی ہوئی اور چند ثانیے اس کی طرف سوچتی نگاہوں سے تکتی رہی۔ شوکی کی نظریں بھی اس کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحات اسی طرح کی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ باہر سرد ہواؤں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر سدھا نے حلق سے ایک گہری ہمکاری سی خارج کی اور بولی۔

''شوکی! کیا تم میری جیون کتھا سننا پسند کرو گے؟ میرا خیال ہے اس کے بعد ہی تم میری مدد کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہو۔''

''میں تیار ہوں۔'' شوکی نے کہا۔ ''لیکن..... باہر شاید موسم خراب ہونے لگا ہے۔ شام اتر آئی ہے اور میرا خیال ہے برف باری بھی ہونے والی ہے۔''

اس نے دیکھا کہ سدھا اس کی رضامندی جان کر ایک دم خوش نظر آنے لگی تھی۔ فوراً اسی لہجے میں شوکی سے بولی۔

''اس کی تم چنتا مت کرو، ہم یہاں سے کسی اور جگہ پر چلیں گے۔ آؤ میرے ساتھ.....'' یہ کہتے ہوئے وہ غار کے دہانے کی طرف بڑھی۔ شوکی اس کے ساتھ کہیں جانے کے لیے تیار نہ تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے قدم خود بخود .... اٹھنے لگے۔ جیسے کوئی انجانی طاقت اسے سدھا کے پیچھے جانے پر مجبور کر رہی ہو۔ وہ اس کے عقب میں چل پڑا۔

دونوں غار سے باہر آ گئے۔ آسمان پر تاریکی چھانے لگی تھی، برفیلی ہواؤں کا زور جاری تھا۔ ترائی میں جا بجا برف سی نظر آتی تھی۔

عجیب پراسرار سا ماحول طاری تھا ہر سو..... شوکی کو حیرت ہوئی کہ اسے سردی کا کچھ خاص احساس نہیں ہو رہا تھا اور وہ سدھا کے پیچھے پیچھے اس دشوار گزار راہ گزر پر یوں آسانی سے چلا جا رہا تھا جیسے... وہ سیدھا سادہ راستہ ہو۔

تھوڑی دور چلتے رہنے کے بعد یہ دونوں قدرے ترائی میں اتر آئے اور ایک پہاڑی چھجے کے نیچے آئے تو انہیں ایک مڑھی سی نظر آئی۔ وہ اس کے اندر داخل ہو گئے۔

مڑھی میں آتے ہی سردی کا تھوڑا بہت احساس بھی جاتا رہا اور یہاں سکون سا محسوس ہوا۔ یہاں روشنی تھی۔ چھت سے ایک فانوس جھول رہا تھا۔ اندر شاید چربی کے تیل کا دیا روشن تھا۔ ایک طرف مرگ چھالا سی کھال کا گرم بچھونا تھا جو اتنا کشادہ تھا کہ اس پر تین چار افراد آرام سے بیٹھ اور لیٹ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹا موٹا عام سی ضروریاتِ زندگی کا سامان پڑا تھا۔

شوکی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس برفیلے ویرانے

میں یہ آرام دہ مڑھی آخر کس کی تھی؟

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شوکی کو دراصل سدھا کی باتوں نے کافی متاثر کیا تھا۔ بالخصوص اس کی یہ بات اس کے دل کو لگی تھی کہ ایک انسان ہی دوسرے کے کام آتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے کی مدد میں اس کی اپنی مدد بھی منتظر ہوتی ہے۔

سدھا نے اپنی داستان سنانے سے پہلے شوکی سے کہا۔

''شوکی! اپنی جیون کتھا سنانے سے پہلے میں تم سے پھر کہوں گی کہ میری مدد میں ہی تمہاری مدد شامل ہے۔ تم رینا سے محبت کرتے ہو، اسے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ مجھے بھی اس کی خوشی ہوگی لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک خطرہ پھر بھی تمہارے سر پر لٹکتی تلوار کی طرح منڈلاتا رہے گا اور کیا خبر اس کا وار کبھی کاری پڑ جائے تو پھر تم کیا کرو گے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ رینا کو حاصل کرنے سے پہلے ہی تم اسے ختم کر دو؟''

''یقیناً میں یہی بہتر سمجھوں گا۔'' شوکی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ جانے کیوں اس کے اندر کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ لہٰذا وہ اس سے مزید بولا۔

''تم کھل کر بات کرو سدھا! میں تمہاری بات سننا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں پہلے میری جیون کتھا سننا پڑے گی جو زیادہ طویل نہیں ہے۔ پھر بھی تمہیں اگر مجھے چھوڑ کر الگ راستہ اپنانا ہو تو میں دو چن دیتی ہوں پھر کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ ہاں! ایک بات ضرور کہوں گی کہ میری کتھا کو غور سے سننا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں ابتدا میں ان پراسرار واقعات پر وشواس نہ آئے اور کچھ سوالات بھی ضرور ذہن میں ابھریں گے لیکن تم صرف پہلے خاموشی سے میری کتھا سنتے رہنا مجھے پورا وشواس ہے کہ کتھا کے آخر تک تمہیں سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ اگر پھر بھی ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گی مگر اپنی جیون کتھا مکمل کرنے کے بعد۔''

''ہاں، میں سن رہا ہوں۔'' شوکی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

☆☆☆

نجو بائی کے حوالے سے راج محل کی فضا ''ساز گار'' دیکھ کر بچھو رام کو کچھ تسلی تو ہوئی کہ نجو بائی نے جو کہا تھا، وہ کیا نہیں تھا۔ وہ اب تک اور آئندہ بھی ایسا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی کچھ اس لیے بھی کہ اس میں اس کی اپنی بھی بدنامی اور جگ ہنسائی ہوتی، لہٰذا وہ مطمئن ہو کر دہلی جا پہنچا مگر وہاں کی ریزیڈینسی سے پتا چلا کہ دیوان شیورائے بھولکر جنرل مائیکل شاہ کے قلعہ بند محل میں ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہے۔

بچھو رام سیدھا وہیں جا پہنچا لیکن وہاں اسے انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ وہ شیورائے بھولکر کو اس خط کے بارے میں بتانے کا بے چینی سے منتظر تھا۔

اندر میٹنگ ہو رہی تھی۔ جنرل مائیکل شاہ اور بریگیڈیئر ڈان کیورشیم کو شالیہ پر چڑھائی کی نئی حکمت عملی ترتیب دے رہے تھے۔ جنرل مائیکل شاہ بڑے جوش و خروش سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بارعب لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ہم نے شکست ضرور کھائی ہے مگر ناکام نہیں ہوئے ہیں۔ ہم تین گنا طاقت کے ساتھ دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ کوہ شالیہ ہمارا ٹارگٹ ہے۔ مخبروں کی صحیح طور پر جان کاری نہ دینے کے سبب ہمیں شکست ہوئی، مگر ناکامی نہیں ہوئی ہے ہمیں۔''

یہ میٹنگ ایک گھنٹے تک چلی اور پھر آپس میں تبادلہ خیال کیا جاتا رہا۔ اسی دوران شیورائے بھولکر کے کان میں کسی باوردی خدمت گار نے جھک کر کچھ کہا اور اس نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کے بعد اس نے نیچی آواز میں کرنل بلسٹر وڈ سے کچھ کہا اور پھر اٹھ کر کمرائے نشست سے مہمان کمرے میں آ گیا۔

بچھو رام نے بھولکر کو دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر ''رام..... رام.....'' الاپنا شروع کر دیا۔ بھولکر کے چہرے پر گہری متانت کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے خشک لہجے میں بچھو رام سے کہا۔

''اب کیا کرنے آئے ہو یہاں؟'' وہ ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''مہاشے جی! مجھے بڑا افسوس ہے، کیا سرکار نے اب کوہ شالیہ سے نظریں پھیر لی ہیں؟'' بچھو رام بولا۔

''بچھو رام! تم ہمارے اندر کے اور اہم ترین آدمی تھے لیکن باوجود اس کے تم ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکے۔'' بھولکر بدستور روکھے لہجے میں بولا۔ بچھو رام کو افسوس ہوا کہ بھولکر اسے ایک ایسی بات کا الزام دے رہا تھا جس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا لیکن وہ انگریزوں کی فطرت سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ وہ اپنی ناکامی اور شکست کو دوسرے کے سر تھوپنے کے عادی تھے۔ طاقت اور غرور کے نشے میں

بھول گئے تھے کہ وہ کسی زیر دست علاقے میں چڑھائی نہیں کرنے جارہے، بلکہ وہ تین ریاستوں کی بقا کا معاملہ تھا..... انگریزوں کی سازش پہلے ہی طشت از بام ہو چکی تھی۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ فرنگیوں کے ساتھ رہ کر بھولکر بھی انہی کی زبان بولتا تھا۔ بچھورام نے کہا۔

''مہاشے جی! میں نے تو ایک ایک بات آپ تک پہنچا دی تھی جو درست بھی ثابت ہوئیں۔ اس میں نئے راجا پرتاب کمار کی غیر معمولی ذہنی فراست کا دخل تھا۔ اس نے تریپال اور پالن پور کی ریاستوں کو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ جنگ صرف ناگرہ کی نہیں ہے، آگے چل کر یہی فرنگی ان پر بھی ہلا بولیں گے۔ یوں پالن پور اور تریپال ان کے اتحادی بننے پر مجبور ہو گئے تھے۔''

''خیر..... خیر.....!'' بھولکر نے موضوع بدلنا چاہا۔ ''یہ بتاؤ اب کیا خبر لائے ہو؟''

''بہت ہی اہم سرکار!'' بچھورام بولا پھر اس نے بھولکر کو خط کے بارے میں صراحت کے ساتھ آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر بھولکر کا چہرہ تمتما گیا۔ فکر و پریشانی سے وہ گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ اس قدر کہ تصدیق چاہنے کے انداز میں اس سے بولا۔

''کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟ یہ سچی خبر ہے؟''

بچھورام کو اس کی بوکھلاہٹ کا اندازہ ہوا، ورنہ وہ یہ سوال نہ کرتا، وہ بولا۔

''ایک دم سچی خبر ہے مہاشے جی! بھلا میں نے آج تک کوئی غلط خبر دی ہے آپ کو؟ جلدی کچھ کیجیے۔''

''تم نے اور کوئی بات کہنی ہے؟''

سے پوچھا تو بچھورام نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بھولکر کا سر ہلا ہوا۔ بچھورام رخصت ہو گیا۔ بھولکر نے فوراً اہم نشست گاہ کا رخ کیا۔

وہاں ہنوز گفتگو جاری تھی۔ اس نے کرنل بلسٹر وڈ کے کان میں جا کر کچھ کہا اور پھر وہ دونوں وہاں سے نکل کر دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں کچھ دیر پہلے بھولکر، بچھورام کے ساتھ موجود تھا۔ سب سے آخر میں بھولکر، کرنل بلسٹر وڈ سے تشویش زدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''اگر یہ خط بکنگھم پیلس کی شہنشاہیت تک جا پہنچا تو کوہ شالیہ کی جنت گاہ پر قابض ہونے کا خواب نہ صرف ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گا بلکہ وہاں کے راجاؤں اور نوابوں کی حیثیت بھی برطانوی شہنشاہیت کے نزدیک مستند کہلائے گی۔''

کرنل بلسٹر وڈ بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا تھا فرنگی آفیسروں کا یہ مخصوص ٹولا کوہ شالیہ پر قابض ہونا..... اور مکمل طور پر اپنی اجارہ داری چاہتا تھا۔ درحقیقت ان کے لیے کوہ شالیہ کا یہ علاقہ بے حد کشش رکھتا تھا، وہاں سارے موسموں کی بہار ہوتی تھی اور یہ علاقہ ایک عظیم ''ہل اسٹیشن'' کہلاتا تھا۔

تھوڑی دیر تک بھولکر سے گفتگو کرنے کے بعد کرنل بلسٹر وڈ نے فوراً جنرل مائیکل شاہ سے ملاقات کر ڈالی۔

بچھورام نے اپنا ''کام'' نمٹا کر فوراً ناگرہ کا رخ کیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ اسے اب امید ہو چلی تھی کہ..... نجو بائی اس سے خوش ہو جائے گی اور سمجھے گی کہ وہ نچلا نہیں بیٹھا ہے اور ابھی تک اس کے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

لہٰذا راج محل پہنچتے ہی اس نے غسل وغیرہ کرنے اور نئی پوشاک زیب تن کر کے نجو بائی کے گوشے کا رخ کیا۔ دروازہ بند تھا اور آس پاس سناٹا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ کوئی آواز نہیں ابھری۔

اس نے ذرا توقف کے بعد دوسری دستک دی۔

''کون ہے؟'' بالآخر نجو بائی کی کمزور سی آواز ابھری۔

''میں ہوں، سیوک، بچھورام..... سرکار سے مل کر آرہا ہوں۔'' بچھورام نے نیچی نیچی آواز میں کہا۔

''اس وقت ہماری طبیعت ناساز ہے۔ ہم نہیں مل سکتے۔'' نجو بائی نے جواب دیا۔ بچھورام نے اصرار کیا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ زیادہ دیر دروازے سے اس طرح چپکے کھڑے رہنا بھی مناسب نہ تھا۔ بچھورام اس بار بھی نامراد واپس اپنی اقامت گاہ میں لوٹ آیا۔ وہ بہت ڈسٹرب تھا اور مایوس نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

راجا پرتاب کمار کے دل کی بے قراری دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ رینا جب سے راج محل میں آئی تھی، اس روز سے ہی پرتاب کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچنا شروع ہو گئی تھی۔

وہ سوچتا یہ محبت کیسا جذبہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ دنیا کے سارے اخلاقی، قانونی مذہبی اور سماجی ضابطے مل کر بھی اس باہم کشش کے جذبے کو نہیں مٹا سکتے تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ خود راجا پرتاب کمار بھی نہیں جانتا تھا۔ شاید یہ رینا کا حسن تھا، مگر حسن تو ایک احساس تھا جو رینا کے پورے وجود سے وابستہ تھا۔ جمال لب و رخسار، خوشبوئے زلف، رنگ پیراہن میں جواں جسم کی سحر انگیزی، قرب کے سلگتے لمحوں کی مہک میں اس کا انداز خود سپردگی،

اس کی نگاہوں کی شوخی، اس کی سیمابی طبیعت، قاتل مسکراہٹ کا طلسم، دلفریبی اندازِ نقش پا، نہ جانے حسن کس میں تھا اور کہاں تھا یا صرف راجا پرتاب کو ہی ایسا لگتا تھا۔ عورت تو عورت ہی ہوتی ہے، گوری ہو یا کالی۔ خوبصورت یا بدصورت لیکن کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مرد کے لیے وہی ایک عورت اس کی ذات کی تکمیل کرتی ہے۔ پرتاب کمار کے لیے رینا ایسی ہی عورت تھی۔

یوں رینا کے آنے سے پرتاب کمار بہت مسرور و خوش تھا۔ دل کو تسلی بھی ہوئی کہ اب وہ رینا سے اپنے دل کی بات ضرور کہہ کر رہے گا، اسے بھی پوری امید تھی کہ رینا اسے ٹھکرائے گی نہیں۔ وہ اپنی خودی کے زعم میں یہ سوچ کر اندر ہی اندر مسرور ہوتا کہ بھلا ایک ریاست کے راجا سے شادی کرنے پر رینا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن شوکی کی گمشدگی کا معاملہ درمیان میں آنے کی وجہ سے وہ رینا کو پریشان دیکھ رہا تھا، اسی لیے سردست اس نے رینا سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا، کیونکہ وہ پہلے ہی پریشان تھی، تاہم ایک معمولی ملازم کے لیے رینا کا اس قدر پریشان ہونا راجا پرتاب کو بھی کبھی کبھی تجسس میں ڈال دیتا۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ رینا کے لیے شوکی کیا تھا۔ یہ تو دل کا معاملہ تھا چاہے شاہ پر آئے یا فقیر پر اور رینا کا دل فقیر پر آچکا تھا۔

ابھی شوکی کا معاملہ تازہ تھا کہ گارشیا کا مسئلہ آن پڑا۔ رینا دہری پریشانی کا شکار ہوگئی، جیسا کہ مذکور ہو چکا، گارشیا انہیں نیم مردہ حالت میں ملی تھی۔ شاہی ویدوں نے اسی روز اس کا علاج شروع کر دیا تھا۔ اس کی گردن کے گرد نیل کے نشان سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں چل رہی تھیں۔ اسے فوراً علاج گاہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ رینا کو پتا چلا تو وہ ہراساں ہوگئی، آخر کو وہ رشتے میں اس کی بہن تھی۔

رینا نے اسی وقت راجا پرتاب کمار سے روتے ہوئے گارشیا کی زندگی بچانے کی درخواست کی۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں ..... مس رینا!'' راجا پرتاب کمار نے اسے تسلی دیتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ روتی ہوئی رینا کا معصوم چہرہ اس کے دل کو اور بھی بھایا تھا مگر بہرحال فکرمند وہ بھی تھا۔

''میں نے شاہی طبیبوں کو حکم دے دیا ہے کہ جب تک گارشیا کی حالت نہیں سنبھلے، وہ وہاں سے نہیں ہٹیں، لہٰذا..... وہ اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

''لل..... لیکن راجا صاحب! وہ ..... لوگ مجھے علاج گاہ کے اندر داخل نہیں ہونے دے رہے۔'' رینا نے آنسوؤں سے لبریز چہرے سے کہا۔ ایسے میں اس کا حسین چہرہ مصائب و آلام کی تفسیر نظر آتا تھا جو پرتاب کمار کے دل میں بھی اس کے لیے ہمدردی اور ترحم کے جذبات ابھار رہا تھا۔ لہٰذا مجبور ہو کر اس نے خود رینا کو ساتھ لیا اور علاج گاہ کا رخ کیا۔ باوردی دربان نے راجا کو دیکھا تو یک دم علاج گاہ کا دروازہ کھول دیا۔

دونوں اندر داخل ہوگئے۔ دو عمر رسیدہ شاہی وید اور ایک نسبتاً درمیانی عمر کی عورت وہاں گارشیا کی تیمارداری کے لیے موجود تھی۔ راجا کو دیکھتے ہی سب نے نہایت ادب سے اپنے سر جھکا دیے۔

رینا نے آگے بڑھ کر مسہری پر دراز گارشیا کو دیکھا تو اس کا چہرہ دیکھ کر ہی لرز گئی ..... وہ نیلا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور بند پپوٹوں سے ذرا ابھری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یوں جیسے ڈیلے باہر کو ابل آئے ہوں۔ گردن پر نیل کے نشانات واضح تھے جو اب سیاہ پڑنے لگے تھے۔ رینا کو وہ بالکل ایک زندہ لاش کی طرح نظر آرہی تھی۔ رینا اپنی بہن کی حالت دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ بے اختیار ساتھ کھڑے راجا پرتاب سے جا لگی اور اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کر رو پڑی۔ راجا پرتاب، اپنی منظورِ نظر کو اپنے اس قدر قریب پا کر ایک لمحے کے لیے تو ششدر سا رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ رینا کے شاخِ گل جیسے وجود کے لمس اور اس کے حسن و شباب کے لوچ کی تھرتھراہٹ نے راجا پرتاب کے دل میں ہلچل سی مچا دی۔ اس کے سنہری بالوں اور دلکش بدن کی خوشبو نے اسے مسحور کر دیا۔

وہاں موجود دیگر لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو پرتاب کمار خود بھی رینا کے گرد اپنے دونوں توانا بازو حمائل کر دیتا۔ وہ رینا کے گداز شانے کو ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپتھپانے اور اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس کا جی چاہا کہ رینا اسی طرح اس کے ساتھ لگی رہے مگر یہ قربت محض چند ثانیوں کے لیے قائم رہی اور رینا اس سے الگ ہو کر گارشیا کی مسہری کے سرہانے جا بیٹھی لیکن ایک عمر رسیدہ وید نے اسے گارشیا سے بات کرنے سے منع کر دیا۔

''بھائی جان!'' اچانک ایک تیز سی آواز ابھری۔ سب نے دروازے کی طرف دیکھا، وہاں پرتاب کمار کا

چھوٹا بھائی (سوتیلا) ایش کمار کھڑا برہمی سے ان کی جانب تکے جارہا تھا۔ وہ ابھی چند ثانیے پہلے ہی اندر داخل ہوا تھا اور اس نے رینا کو اپنے بھائی کے ساتھ لگے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ اسے قریبی لوگوں کی زبانی پتا چل گیا تھا کہ راجا پرتاب کمار اس فرنگن دوشیزہ کی جانب ملتفت رہنے لگا تھا۔

''کیا ہوا ایش؟ تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟'' راجا پرتاب نے شفقت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

''بھائی جان! آپ سے ایک انتہائی ضروری بات کرنی ہے مجھے۔'' ایش کمار نے ایک طنزیہ سی نظر رینا پر ڈالتے ہوئے بڑے بھائی سے مخاطب ہوکر کہا۔

''ہم ابھی یہاں مصروف ہیں۔'' راجا پرتاب کمار نے ایک دم سنجیدہ ہوکر کہا۔ اپنے چھوٹے بھائی کا یہ رویہ اسے برا لگا تھا مگر اس نے ضبط سے کام لیا تھا۔

''تم ایسا کرو ہمارے کمرے میں جاؤ، ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔''

''وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ آپ یہاں کتنے مصروف ہیں۔'' ایش کمار نے رینا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے زہریلے طنز سے کہا۔ ''لیکن..... آپ کو ابھی میری بات سننا ہوگی، یہ خاندان کی اور راج محل کی عزت کا معاملہ ہے۔''

راجا پرتاب کو اس کا رویہ بدستور برا محسوس ہوا لیکن اس کی آخری بات پر وہ چونک اٹھا اور پھر رینا کو ایک بار پھر تسلی دیتا ہوا بھائی کے ساتھ علاج گاہ سے باہر آگیا۔

''ایش! کم از کم اپنا لہجہ تو درست رکھا کرو۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں کیا تم نے..... یہ آج تمہیں کیا ہو گیا تھا؟'' دوسرے کمرے میں آکر راجا پرتاب نے بھائی کو سرزنش کی مگر ایش کمار پھر بھی باز نہ آیا اور بدستور اسی طرح زہر اگلتے ہوئے بولا۔

''بھائی جان! یہ بات ہی ایسی ہے۔ آپ کو تو راج محل میں اب سوائے اس فرنگن حسینہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا..... کہ یہاں اور لوگ بھی رہتے ہیں۔''

''ایش! اپنی زبان کو لگام دو..... جانتے نہیں کس سے مخاطب ہو تم..... آخر کہنا کیا چاہتے ہو تم.....؟'' راجا پرتاب کمار کو بھی غصہ آگیا اور جواب میں اس بار چراغ پا ہو کر بولا۔

''سوجھنا کو آپ جانتے ہیں یا نہیں.....؟'' ایش کمار کا زہر میں بجھا طنزیہ لہجہ ہنوز قائم تھا۔ ''وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔''

''کیا.....؟'' راجا پرتاب کمار کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو تم..... تمہیں شرم نہیں آتی اپنی بہن کے متعلق ایسی گندی بات کرتے ہوئے؟''

''شرم سے تو ہم سب کو ہی ڈوب جانا چاہیے اب بھائی جان!'' ایش کمار غصے سے بولا۔ ''جب یہ بات چار دانگ پھیلے گی کہ راج محل کے شاہی خاندان کی لڑکی ایک بدقماش فرنگی لڑکے رابرٹ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، لیکن آپ کو اس گوری حسینہ فرنگن سے فرصت ملے تو..... آخر آپ نے ان لوگوں کو کیوں راج محل میں دوبارہ گھسنے دیا؟''

راجا پرتاب کا سارا جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ رخصت ہونے لگا تھا جبکہ ایش کمار کی زہر افشانی جاری تھی۔

''لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ ایش کمار کی بہن بھاگ گئی، وہ یہ بول بول کر راج محل کی طرف انگلیاں اٹھائیں گے کہ ریاست ناگرہ کے راجا پرتاب کمار کی بہن ایک فرنگی کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''یہ تم کیا کہے جارہے ہو ایش! بھگوان کے لیے آہستہ بولو اور مجھے کچھ سوچنے سمجھنے دو۔'' بالآخر راجا پرتاب کمار ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا۔ ایش کمار اسی طرح جلتا سلگتا کھڑا رہا۔

''سنو! یہ کب کی بات ہے؟ آخری بار تم نے کب دیکھا تھا اسے؟''

''وہ رات سے ہی غائب ہے، میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ..... اپنے کمرے میں ہوگی۔ صبح بیدار ہوا تو بھی نظر نہ آئی۔ میرا دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام تھا۔ میں خود تین دنوں کے لیے جارہا تھا مگر اچانک مجھے چند گھنٹوں بعد ہی واپس آنا پڑا پھر بھی سوجھنا نظر نہ آئی۔ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ ماتا جی (نجو بائی) کے کمرے میں بھی دیکھا اور ان کی تخلیہ گاہ بھی گیا۔''

''تمہیں اس بات کا شبہ کیسے پڑا کہ یہ حرکت رابرٹ کی ہے؟'' پرتاب نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں ہی نہیں دربار کے اکثر لوگوں نے اس گورے لومڑ رابرٹ کو سوجھنا کے ساتھ دیکھا تھا اور میرے پتا کرانے پر معلوم ہوا کہ وہ مورکھ بھی اسی دن سے غائب ہے۔''

''تم مجھے تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔ میں پہلے اپنے طور پر پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد کوئی قدم اٹھاتا ہوں۔'' راجا پرتاب نے کہا۔ اس کا چہرہ پریشانی اور احساس تذلیل سے سرخ ہو گیا تھا۔

''آپ نے جو کرنا ہے وہ کرتے رہیں، لیکن را ٹ

کی دو بہنیں یہاں مہمان بنی بیٹھی ہیں۔ انہیں سب سے پہلے بندی خانے (قید خانے) کی نذر کریں۔"

راج کمار ایش نے کہا تو راجا پرتاب کمار بری طرح چونک کر اس کا چہرہ تکتا رہ گیا۔ وہ یک دم بگڑ کر بولا۔

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم .....؟ اس میں بھلا ان دونوں کا کیا دوش ہے؟"

"اوہو..... دوش....." ایش کمار زہریلے لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ اپنی منظورِ نگاہ رینا کو بندی خانے میں ڈالنا نہیں چاہتے۔"

"ایش! تم اب حد سے بڑھ رہے ہو۔ اپنی زبان کو لگام دو۔" راجا پرتاب کو بھی غصہ آ گیا اور وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نے کہا نا کہ مجھے تھوڑا وقت دو۔ ابھی تو ہم صرف اندازوں سے کام چلا رہے ہیں، حقیقت کا بھی پتا چلنا چاہیے۔ ہم ابھی اپنے مشیرِ خاص ستراج داس سے مشورہ کرتے ہیں۔"

ایش کمار غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

راجا پرتاب کمار تھوڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے کمرے میں ٹہلتا رہا، اس کے بعد اس نے ستراج داس کو ترنت اپنے روبرو پیش ہونے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

علی ریحان فطرتاً شریف اور سادہ مزاج آدمی تھا۔ مہر النساء سے اس طرح کی ملاقات اور خفیہ بات نے اسے واقعی ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے خود بھی اپنے آپ پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے میزبان کس قدر قدامت پسند اور معتبر تھے۔ اگر کوئی اس طرح اسے ایک عزت دار اور نواب گھرانے کی بہو سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو کیا سوچتا۔

لمحہ بھر کے لیے ایک خیال یہ بھی اس کے دل کے کسی کونے میں جاگزیں ہوا تھا کہ کہیں اس کے خلاف یہ دونوں باپ بیٹی سراج خان اور مہر النسا کسی قسم کی سازش تو نہیں کر رہے تھے؟ لیکن پھر پوپھیاں کی موجودگی سے اسے تسلی ہوئی تھی، اس لیے کہ پوپھیاں نواب صاحب کا پرانا اور بااعتماد ملازم تھا، بلکہ اسے گھر کے ایک فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔

بہرحال اب تو اس نے مہر النسا اور پوپھیاں کے بے حد اصرار پر بات کرنے کا وعدہ تو کر ہی لیا تھا اسی لیے اسے پوپھیاں ایک ایسے کمرے میں لے آئے جہاں کھڑکی پر پردے کا بندوبست کیا گیا تھا اور اس کے دوسری جانب نواب شہباز خان کی بہو اور اقبال خان کی بیوی مہر النسا بیگم موجود تھی۔

علی ریحان ذرا جھجکتے ہوئے پوپھیاں کے اشارے پر پردے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے مہین سے پردے کے پیچھے کسی خاتون کے سائے جیسی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"جی، مجھے یہ بالکل پسند نہیں تھا مگر چھوڑیں اب..... جو کہنا ہے جلدی کہہ دیجیے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔" علی نے قدرے مدھم آواز میں گفتگو کی ابتدا کر ڈالی۔

"میں آپ کی ممنون ہوں اور کوشش کروں گی کہ آپ کا زیادہ وقت نہ لوں۔" پردے کے دوسری جانب سے مہر النسا کی..... آواز آئی۔ "مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، آپ نے جو کچھ کیا وہ اپنے لیے نہیں بلکہ مسلم قوم اور اس عظیم وادی کو فرنگیوں کے ناپاک قدموں سے بچانے کی خاطر کیا۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا تھمی تو علی کو اس عورت کی منافقت پر غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ وہ چپ نہ رہ سکا اور تلخ سے لہجے میں بولا۔

"مگر آپ اور آپ کے والد سراج خان تو فرنگیوں کے یہاں قدم جمانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔"

"آپ ایسا کہنے میں حق بجانب ہیں علی ریحان صاحب!" وہ ہولے سے بولی۔ اس کے لہجے میں علی کو ندامت کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔ "اپنے بابا جانی کے بارے میں کیا کہوں اب..... لیکن میں بھی بس قوم کی بیٹی سے زیادہ اپنے باپ کی بیٹی کا ہی حق ادا کرتی رہی مگر اب ہم دونوں کو ہی سبق مل گیا ہے۔"

علی اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ لہٰذا وہ بھی اس بار کسی قسم کی کج روی اختیار کیے بغیر کھلے دل سے بولا۔

"مجھے خوشی ہوئی یہ جان کر..... میرا خیال ہے اب آپ مطلب کی بات کہہ دیں تاکہ میں اس آزمائش سے جلد نجات حاصل کر سکوں۔"

"میں آپ کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔" وہ ممنون بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ سے اتنی گزارش ہے کہ نواب صاحب اور میرے خاوند سے کہہ کر میرے بابا جانی کی نظر بندی ختم کرا دیں۔ ہم باپ بیٹی کو بھی نہیں ملنے دیا جاتا۔ بھلا ہم دونوں کا اس دنیا میں اور کون ہے۔ اب ہم بھی دونوں نہ مل سکیں تو اس زندگی کا کیا فائدہ؟"

کہتے ہوئے علی کو اس کی ہلکی سی غمزدہ سسکی کی آواز سنائی دی۔ علی جس قدر جنگجو فطرت کا آدمی تھا اسی قدر رحم کا جذبہ بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر مہر وسے یہ

پابندی ختم کرانے کی کوشش کا وعدہ کیا اور پھر چلا آیا۔

جب وہ اگلے دن یہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس نے نواب صاحب سے تو نہیں البتہ اقبال سے مل کر یہ ساری بات بتادی۔ وہ مسکرایا اور بولا۔ ''مجھے پپو میاں نے سب بتادیا تھا۔ تم بہت عظیم انسان ہو علی! بس، میں اس سے زیادہ تمہاری تعریف میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

علی اس کی بات پر ذرا چونکا اور پھر وہ بھی اپنا سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ بولا۔

''تو کیا میں سمجھوں کہ بھابی سے کیا ہوا میرا وعدہ ایفا ہونے جارہا ہے؟''

''میرے پیارے بھائی علی! بھلا ہماری جرأت ہے کہ تمہاری بات کو رد کریں۔''

''شکریہ بھائی کہ تم ایسا سمجھتے ہو۔'' کہتے ہوئے علی اس کے گلے لگ گیا۔

علی صبح سویرے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ایک بگھی میں اسے روانہ کیا گیا تھا جس نے اسے کوہ شالیہ کی حدود سے باہر شہر جانے والی سڑک پر چھوڑ دیا۔

بگھی سے اترنے سے پہلے اس نے کسی منڈی پر کام کرنے والے عام سے مزدور کا بھیس بھر لیا تھا۔

سڑک گھنے درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی اور وہ..... مسافر لاری کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی اسے سواری مل گئی اور وہ بمبئی آگیا۔

اس نے ایک وسطی شہر کا رخ کرنے کے بجائے کالی منڈی کا رخ کیا۔ آگے کشن پور کا علاقہ تھا۔ راستے میں اسے جا بجا وردی پوش مسلح فرنگیوں کی گشتی پارٹیاں بھی ملتی رہیں۔ وہ ہر کسی کو آتے جاتے نہیں روکتے تھے، صرف جن پر شبہ ہوتا انہیں ہی روک کر پوچھ گچھ کرتے تھے۔

یہاں فرنگیوں کا فوجی اور نظری قوت کے ساتھ مکمل تسلط قائم تھا اسی لیے کسی قسم کی ''خرابی'' کا ان کی نظر میں کوئی احتمال نہ تھا۔ یوں چیکنگ بھی خاص نہ تھی۔ وہ بڑے اعتماد مگر عام سے انداز میں چلتا ہوا ایک مارکیٹ کی تنگ سی گلی میں داخل ہوگیا۔ وہاں سے ہوتا ہوا وہ ایک سڑک پر نکل آیا۔

یہ بیٹن چوک کہلاتا تھا۔ وہ اپنے اطراف میں نظریں گھما لیتا تھا کہ کہیں کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہا۔ دن نکلا ہوا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت دیکھنے میں آرہی تھی۔ مارکیٹ میں کافی لوگوں کا رش تھا۔

وہ بیٹن چوک کی دوسری جانب والی سڑک پر آگیا۔ یہاں قطار میں دکانیں بنی ہوئی تھیں اور ان کے عقب میں رہائشی بلڈنگیں تھیں۔ وہ انہی کی ایک گلی میں گھس گیا۔ اب اس کی رفتار تیز ہوگئی۔

کافی رش والی جگہ تھی یہ..... اب اس نے چلتے چلتے ایک عجیب حرکت کرنا شروع کردی۔ وہ دو قدم چلتا اور تیسرے قدم پر تھوڑا اس طرح لڑکھڑاتا جیسے اس کی ٹانگ میں لنگ ہو۔

یوں وہ تھوڑی دیر تک بے مقصد اسی طرح ادھر ادھر گھومتا رہا، تب ہی اچانک دائیں جانب سے ایک شخص اس کی جانب بڑھا۔ اس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا۔

''کون.....؟'' اس نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

''علی.....'' اس نے جواب میں کہا۔ وہ دونوں اب آگے پیچھے چل رہے تھے۔

''میرے پیچھے آتے رہو۔'' طے شدہ مخصوص کوڈ ورڈز کا مختصر تبادلہ ہوتے ہی اجنبی نے کہا اور پھر دونوں اسی طرح چلتے ہوئے ایک مختصر سے میدان کی طرف نکل آئے، پھر اسے پار کرکے وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو بہ ظاہر کوئی گیراج یا ورکشاپ نظر آتی تھی اور ایسا تھا بھی کیونکہ وہاں ایک سالخوردہ سے ٹرک کی مرمت وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔

وہ اجنبی علی کو لیے اندر داخل ہوا اور پھر اس کے کونے میں بنے زینے چڑھنے لگا۔ علی اس کے پیچھے تھا۔

وہ ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوئے تو وہ خالی تھا۔ یہ کمرا بہ مشکل چھ بائی آٹھ کا تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔

''خوش آمدید علی بھائی! میں وقار الحسن ہوں۔'' اسی اجنبی نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے علی سے ایک جوش بھرے لہجے میں کہا اور دونوں گلے لگ گئے۔ وقار ان کا ساتھی تھا۔ وہ علی سے عمر میں چند سال چھوٹا مگر درمیانے قد و قامت کا نوجوان تھا۔

اس کے ذمے یہی کام تھا کہ وہ صبح سے رات تک اردگرد مٹر گشت کرتا رہتا، کبھی کسی فقیر کے بھیس میں تو کبھی عام راہ گیر کے بہروپ میں۔ جن لوگوں کو جنرل ثمیر نے مختلف مشن پر لگا رکھا تھا، ان کی متوقع واپسی پر وقار کو ہی اپنے ٹھکانے تک راہنمائی کرنا ہوتی تھی۔

کیونکہ جنرل ثمیر اپنے گروہ سمیت ٹھکانا بدلتے رہتے تھے۔ بھیس بدلنے کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کو پہچاننے کا یہی کوڈ رکھا گیا تھا کہ علاقے میں پہنچ کر تھوڑا مخصوص انداز

میں لنگڑا کر چلنا۔

''جنرل صاحب کہاں ہیں؟'' علی نے پوچھا۔ وہ لوگ دری پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ چکے تھے۔

''یہاں کی باتیں بعد میں دوست!'' وقار نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ..... مشن کیسا رہا؟ اور یہ تم اکیلے..... کیا باقی.....؟'' اس نے قدرے مغموم انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

علی اسے دھیرے دھیرے سب بتانے لگا۔ وقار کو باقی تین ساتھیوں شرجیل، قیصر شاہ اور احسان جامو کے اس عظیم مشن میں بچھڑ جانے پر دکھ ہوا۔

اس وقت مسلم باغیوں کا یہ ''آزادی گروپ'' سب سے زیادہ فرنگیوں کے خلاف متحرک تھا۔ تاہم بہ وقتِ ضرورت یہ لوگ آپس میں مشترکہ طور پر بھی مشن سرانجام دیا کرتے تھے۔

کوہ شالیہ کے مشن میں ان مذکورہ پانچ جری جانبازوں کا تعلق تین مختلف مسلم حریت پسند باغی گروپوں سے تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا ان میں علی ریحان، آزادی گروپ کے سپہ سالار جنرل ثمیر خان کا کمانڈر تھا۔ شرجیل اس کا ساتھی تھا۔ احسان جامو ''حریت'' نامی گروپ کے کرنل نہال خان کا آدمی تھا اور قیصر شاہ اس کا ساتھی، جبکہ شاہ زمان بذاتِ خود اپنی حریت پسند تنظیم ''کاروانِ مجاہد'' کا گروپ لیڈر تھا۔

اب ان میں احسان جامو، قیصر شاہ اور شرجیل کوہِ شالیہ کی مہم میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔

بدقسمتی سے جنگِ آزادی کی افسوسناک شکست کے بعد کئی مسلم جنگجو باغی گروپ ابتری کا شکار ہو کر ختم ہو چکے تھے۔ جو بچے کھچے تھے انہوں نے الگ گروپ بنا لیے تھے اور مذکورہ جنگ کو کئی سال بیت چکنے کے باوجود انہوں نے ہار نہیں مانی تھی اور فرنگی سامراج کے تسلط کے خلاف اپنی آزادی کی جنگ کو مقدور بھر سہی، جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کا جذبۂ آزادی ختم نہیں ہوا تھا۔

تاہم یہ الگ بات تھی کہ اب بس یہ گوریلا کارروائی کرنے کی ہی طاقت رکھتے تھے اور ان میں سب تربیت یافتہ کمانڈو ہی تھے۔ کیونکہ ان کی قوت کو فرنگی یکجا کرنے نہیں دیتے تھے۔ جہاں بھی اور جدھر بھی ان کے خفیہ اجتماع پر شبہ ہوتا، بے دریغ کارروائی کر ڈالتے اور گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ اسی لیے انہوں نے مستقبل میں اپنی طاقت کو دوبارہ فرنگی سامراج سے جنگ کرنے کے لیے کوہ شالیہ کا آزاد علاقہ منتخب کیا تھا۔

علی اب جنرل ثمیر خان کو یہی خوش خبری سنانے آیا تھا کہ وہ اب، یہ شمول دیگر مسلم باغی گروپوں کو یہ خوش خبری سنا سکتے ہیں کہ کوہ شالیہ ہمارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

یہاں انہیں خطرات درپیش ہوتے تھے۔ ہر سمے سانسیں کسی گورے فوجی کی آہٹ پر اٹکی رہتی تھیں۔

''جنرل ثمیر اس وقت اپنے دوسرے خفیہ ٹھکانے پر کرنل نہال خان اور کچھ ساتھیوں کے ساتھ اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔''

بالآخر وقار نے علی کو بتایا۔

''کیا کسی نئے مشن کی منصوبہ بندی تیار کی جا رہی ہے؟'' علی ریحان نے وقار کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، برادر! کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' وقار نے جواب دیا۔ علی کا چہرہ ایک نئے جوش سے چمکنے لگا۔

☆☆☆

رات بھر برستے آسمان کی صبح دم تک دھلی نکھری فضا کو جب شمال سے چلنے والی خنک ہواؤں نے تھپک کر رقصاں کیا تو اندر در آنے والے پہلے سحر خیز جھونکے نے سونجنا کو جگا دیا۔ وہ بڑی پیار بھری نگاہوں سے اور معصوم کلی کی طرح چٹختے ہوئے جذبات تلے رابرٹ کے، ہنوز محوِ خواب ..... چہرے کو تکے جا رہی تھی۔

یوں گھپا کے باہر سپیدیٔ سحر نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن معصوم سونجنا پر رابرٹ نے کبھی نہ ختم ہونے والی رات، سیاہی کی صورت میں مسلط کر دی تھی۔ وہ اپنا سب کچھ رابرٹ پر لٹا کر اسے ہی اپنا ''سب کچھ'' سمجھنے لگی تھی۔ رابرٹ سے اسے محبت ہو گئی تھی مگر رابرٹ کے دل میں کچھ اور تھا۔ سونجنا کو پیار کی دولت کی ضرورت تھی اور رابرٹ کو مادی دولت کی۔

دونوں کو اپنے اپنے انداز سے اپنی اپنی ''دولت'' مل رہی تھی۔ وہ خوش تھے۔ سونجنا کو واقعی اب رابرٹ سے محبت ہو گئی تھی مگر رابرٹ کے دل میں کچھ اور تھا۔ سونجنا کو پیار کی دولت کے سامنے اب مادیت ہیچ لگ رہی تھی جس کا رابرٹ ..... بار بار اعادہ کر رہا تھا اور وہ اپنے پیار کا اس سے اظہار کر رہی تھی۔

دونوں مرگ چھالا کی کھال پر لیٹے ہوئے تھے اور سونجنا کا سر رابرٹ کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے گھنے ریشمی سیاہ بال رابرٹ کے چہرے پر کالی گھٹاؤں کی طرح

پھیلے ہوئے تھے۔ چہرے پر آسودہ لمحوں کی لطافت اور آنکھوں میں رت جگوں کے خواب تھے۔ لبوں کی مسکان، چٹکی ہوئی کلیوں کی طرح گلاب کی بہار دکھا رہی تھی۔

شب گزشتہ میں جو اس کے دل میں تھوڑی بہت کسک اور چبھن تھی، وہ رابرٹ جیسے چالاک لومڑ نے تھپک کر سلا دی تھی۔

''رابرٹ.....!'' اس نے بڑے پیار سے رابرٹ کو پکارا مگر وہ بڑی مست نیند میں مستغرق رہا، جیسے کوئی بھیڑیا رات بھر شکار سے سیراب ہو کر لمبی تان کے گہری نیند پڑ کے سو رہتا ہے۔

سونجا نے پیار سے اس کے براؤن بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اٹھ بیٹھی۔ ایک تو یہ شکن انگڑائی لی اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر چند قدم چلتی ہوئی گپھا کے دہانے پر آن کھڑی ہوئی۔

دور و نزدیک ترائیوں اور مقدس بلندیوں کے دلکش قدرتی نظارے اس کے سامنے تھے۔ سرسبز ڈھلانیں، جہاں قطار اندر قطار شاہ بلوط کے درخت، محافظوں کی طرح استادہ نظر آئے تو ایک طرف کاسنی پھولوں کی بیلیں پہاڑیوں کے گرداحاطہ کیے محسوس ہو رہی تھیں۔ دور سفید پہاڑیاں برف کے تاج سجائے سر اٹھائے قدرت کی صناعی پر فخر کیے کھڑی نظر آئیں۔

وہ چند ثانیے مبہوت سی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور پھر جب واپس پلٹی تو کسی سے ٹکرائی۔ بے اختیار اس کے حلق سے ایک ہلکی چیخ سی نکل گئی۔ کسی نے اسے مضبوط بانہوں میں بھر لیا اور جیسے رات بھر کا قصہ طرب و کیف کا آخری پیرا گراف بھی اس کے سرخ گلابی لبوں پر ثبت کر دیا۔

یہ رابرٹ تھا۔ وہ جانے کب آنکھ کھلنے پر جاگ پڑا تھا اور اسے گپھا کے سرے پر کھڑے پا کر چپکے سے فتح مند مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد دونوں نکلے اور اپنا سفر شروع کیا۔ رابرٹ کا خیال تھا کہ وہ اپنے انکل جنرل مائیکل شا کے ہاں چلا جائے اور سونجا کی حقیقت چھپائے۔ وہ اسے عام سی انڈین لڑکی ظاہر کرے اور ..... انکل کی مدد سے پانی والے جہاز میں لندن کا رخ کرے۔

دونوں نے زاد راہ سے تھوڑا بہت کھایا پیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔ شہر جانے والی سڑک تک پہنچتے پہنچتے دن ڈھل آیا تھا اور اب سہ پہر ہو چلی تھی۔

گھوڑے کو خالی جنگل کی جانب روانہ کرنے سے پہلے ان دونوں نے منصوبے کے مطابق عام شہریوں والا

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

بھیس بدل لیا تھا۔ شہر کے حالات کہیں کہیں ٹھیک نہیں تھے۔ لہٰذا وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر مسافر لاری کا انتظار کرنے لگے۔

انہیں مسافر لاری تو نہیں ملی البتہ ایک بھلے مانس ٹرک ڈرائیور نے انہیں اپنے ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار کر لیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ یہ لوگ شہر پہنچ کر اتر گئے اور وہاں سے ایک یکہ لے کر جنرل مائیکل شا کی قلعہ بند حویلی تک بہ خیریت پہنچ گئے۔

جنرل مائیکل شا اپنے بھتیجے کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اس کے ہمراہ ایک انڈین جوان لڑکی کو دیکھ کر وہ چونکا ضرور تھا۔ جنرل مائیکل نے اس سے باقی لوگوں کے بارے میں پوچھا تو چالاک رابرٹ نے گول مول سا جواب دے کر اسے کچھ مطمئن کیا، کچھ نہیں۔ تاہم اس نے انکل سے گزارش کر ڈالی کہ وہ ان دونوں کو پانی کے جہاز میں انگلستان روانہ کرنے کا بندوبست کر دے۔

سونجنا کے بارے میں رابرٹ نے جنرل مائیکل شا سے اس کی حقیقت چھپاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اس کی ''گرل فرینڈ'' ہے اور اس کے ساتھ رہنے پر خوش ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں وغیرہ۔

لیکن زیرک اور گھاگ مائیکل شا نے سونجنا کے رکھ رکھاؤ، گفتار اور نشست و برخاست، اندازِ تکلم میں ''میں'' کے بجائے ''ہم'' کا صیغہ محسوس کیا تو فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔

انہیں وہاں رہتے ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ناگرہ کے ٹپاخانے سے ایک خط جنرل مائیکل شا کو موصول ہوا جس میں راجا پرتاب نے جنرل مائیکل شا کو مطلع کرتے ہوئے درخواست کی تھی کہ ان کا بھتیجا رابرٹ اس کی جوان کنواری بہن سونجنا کو ورغلا کر اپنے ساتھ بھگا کر لے گیا ہے۔ لہٰذا اس کی بازیابی کے لیے وائسرائے ہند سے مدد لی جائے۔ بہ صورتِ دیگر انہیں (راجا کو) انگلستان کے بادشاہ سے رجوع کرنا پڑے گا۔

جنرل مائیکل شا کو پہلے ہی رابرٹ اور سونجنا پر اسی قسم کا شک تھا۔ وہ کچھ پریشان سا دکھنے لگا۔ جب اس نے سونجنا اور رابرٹ کو یہ خط دکھایا تو مجبوراً رابرٹ کو یہ حقیقت اپنے انکل کو بتانا پڑی۔ ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اور سونجنا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انگلستان جا کر شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جنرل مائیکل شا نے سونجنا سے رابرٹ کی بات کی تصدیق کی تو اس نے بھی اس کی حمایت میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ جنرل مائیکل شا چند ثانیے کچھ سوچتا رہا۔

راجا پرتاب سے شکست کا زخم اس کے دل میں ابھی تازہ تھا اور کوہ شمالیہ پر بلاجواز حملے کے شکایتی خط والے معاملے پر بھی وہ تلملایا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے دونوں کو سمجھا دیا کہ وہ انہیں انگلستان روانہ کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا لیکن کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا کہ تم دونوں یہاں آئے تھے۔

جنرل مائیکل نے اسی دن کی شام ان دونوں کو بندرگاہ روانہ کر دیا اور خود جوابی خط لکھوا دیا کہ وہ ..... ناگرہ کے راجا پرتاب کی بہن کے اغوا سے قطعی لاعلم ہے نیز رابرٹ ایک طویل عرصے سے غائب ہے اور اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں۔

دونوں بندرگاہ پہنچ چکے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس وقت ان کے پاس لندن کے ٹکٹوں کے بجائے خصوصی پاس ہوتا مگر جنرل مائیکل شا مکار آدمی تھا وہ کسی طور پر بھی اپنی نشانی ان دونوں بھگوڑوں کے ساتھ نہیں جوڑنا چاہتا تھا کہ کل کلاں کو اس پر کوئی بات آئے۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کیا تھا کہ کنگلے ..... رابرٹ کو ایک خطیر رقم ضرور دے دی تھی کہ وہ اس سے ٹکٹ خرید لے۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد بھی ان کے پاس کافی رقم بچی تھی۔ یوں وہ دونوں لندن جانے والے بحری جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔

رات کو جہاز کا لنگر اٹھا دیا گیا..... وہ بندرگاہ سے روانہ ہوا اور کھلے سمندر میں آ گیا۔ یہ مسافر بردار جہاز تھا۔ اس میں ہر رنگ و نسل اور مذہب کے مسافر سوار تھے۔ اکثریت گورے مسافروں کی تھی اور کچھ انڈین بنگالی سوداگر بھی اس میں سوار تھے۔

جانے کیا بات تھی کہ جب جہاز کا بندرگاہ سے روانگی کے وقت بگل بجنے لگے تو ایکا ایکی سونجنا کے دل پر گھونسے لگنا شروع ہو گئے۔ اس کے دل اور احساس میں ابھرنے والی اس نئی زندگی کی خوشیاں پھیکی سی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ جو کر رہی ہے وہ صحیح نہیں۔ وہ اس وقت رابرٹ کے ساتھ ریلنگ سے لگی کھڑی بمبئی کی بندرگاہ کو دھیرے دھیرے دور ہوتا دیکھتی رہی۔ دیگر مسافر بھی بندرگاہ کی دور ہوتی ٹمٹماتی روشنیوں کو محویت سے دیکھنے میں مصروف تھے مگر سونجنا کی بھوری مائل سیاہ آنکھوں میں اداسی کے ویران ساحل اتر آئے۔

کیا اس نے رابرٹ کے کہنے میں آکر صحیح کیا تھا؟ وہ اپنی جنم بھومی اور اپنے لوگوں کو، اپنی ماں اور بھائی ایش کو۔ ہمیشہ کے لیے خیر آباد کر رہی تھی؟ لیکن نہیں..... رابرٹ نے تو اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ حالات میں بہتری آتے ہی وہ دوبارہ یہاں کا رخ کریں گے۔

یہ سوچ کر اسے تسلی تو ہوئی مگر اس کی آنکھیں کسی اندرونی کسک اور کرب سے بھیگ گئیں۔ رابرٹ اس کا محبوب تھا، وہ اسے نئے جہانوں کی سیر کرانے کا خواہاں تھا۔ اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن پھر اچانک جب اس کے چشم تصور میں گارشیا کا نیم مردہ چہرہ آیا تو وہ سرتاپا لرز گئی۔ اسے شاید اس حوالے سے سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا کہ رابرٹ اس کا محبوب ہی نہیں بلکہ اب ایک قاتل بھی بن چکا ہے۔ رابرٹ نے اسے سوچتا اور غمگین پایا تو سمجھ گیا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہو گی۔ وہ بڑی مکاری سے اسے پیار و محبت کے ساتھ بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

عرشے پر رونق بڑھنے لگی تھی۔ بندرگاہ کی بتیاں معدوم ہو چکی تھیں۔ اب حد نگاہ تک صرف سمندر تھا۔ شفاف آسمان پر تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ مسافر آہستہ آہستہ اپنے گرم کیبنوں کا رخ کرنے لگے۔ رابرٹ بھی سوجنا کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیے اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

جہاز اپنی منزل کی جانب گامزن تھا اور یہ دونوں اپنے کیبن میں موجود تھے۔

رابرٹ بہت مطمئن اور مسرور نظر آرہا تھا۔ سوجنا اس وقت باتھ روم میں تھی اور رابرٹ..... کیبن کے فرش پر بیٹھا زر و جواہر اور قیمتی نوادرات کے حامل دکش نمونوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی قیمت کا اندازہ کر کے خوش ہو رہا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ رابرٹ کا بیک گراؤنڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد تھا۔ گارشیا بھی اس کی سوتیلی بہن ہی تھی۔ تاہم باپ کی طرف سے سگی تھی، مائیں دونوں کی الگ تھیں۔ رینا سے بھی اس کا صرف فرضی کزن کا رشتہ تھا۔ پیٹر اس کا ناجائز باپ اس کی ماں کا انفارمل شوہر تھا۔ پیٹر کی اچانک موت کے بعد رابرٹ کی ماں نے بار پر قبضہ جما لیا تھا۔ رابرٹ اپنی ماں کو پسند نہیں کرتا تھا، جواب تک تین شادیاں کر چکی تھی اور پیٹر اس کا چوتھا انفارمل شوہر تھا۔ رابرٹ اسی کی اولاد تھا جبکہ گارشیا پیٹر کی دوسری بیوی کی بیٹی تھی۔ رابرٹ کی ماں نے دونوں کو ہی بے دخل کر دیا تھا۔ رابرٹ نے اس کے بارمیں دنگا فساد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ماں بڑی دبنگ عورت تھی، اس نے پولیس بلا کر بیٹے کو نکال باہر کر دیا۔

تب ہی رابرٹ اپنی خود غرض ماں سے نفرت کرنے لگا تھا، اب اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کس حال میں تھی۔

تاہم اس کا ارادہ اسی کے پاس جانے کا تھا۔

اسی وقت سوجنا نہا کر نکلی تو رابرٹ کو لپکائی ہوئی نظروں سے اس کی بیش قیمت چیزوں کو گھورتے پا کر اسے عجیب سا لگا۔ رابرٹ اسے دیکھتے ہی مچل اٹھا۔ کھڑے ہو کر اس نے محبت بھرے انداز میں سوجنا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ غیر متوقع طور پر سوجنا نے اس کی ''گرمجوشی'' کا ویسے جواب نہیں دیا جیسے وہ خود سپردگی کے انداز میں دیا کرتی تھی۔

''کیا ہوا ڈارلنگ؟ یہ سرد مہری کیوں؟''

''کچھ نہیں، ذرا تھکن..... محسوس کر رہی ہوں۔'' سوجنا نے بہانہ بنایا اور برتھ پر بیٹھ کر اپنے گیلے بالوں میں کنگھا کرنے لگی۔ رابرٹ اس کا چہرہ تکنے لگا پھر سارا سامان سمیٹنے لگا۔

''رابرٹ! پتا نہیں کیوں مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ ان چیزوں سے پیار ہے۔ تم ان میں زیادہ مگن دکھائی دیتے ہو۔'' بالآخر سوجنا نے دل کی بات اس سے کہہ ہی ڈالی۔ رابرٹ اس کی بات پر اندر سے تھوڑا جز بز ہوا مگر دوسرے ہی لمحے چہرے پر مسکراہٹ سموتے ہوئے اس سے بولا۔

''ڈارلنگ! یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ حیرت ہے تم نے اتنی جلدی میری محبت پر شبہ بھی کرنا شروع کر دیا؟''

''ہم جتنے دن بھی انکل مائیکل شا کے ہاں رہے، میں نے محسوس کیا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ ان چیزوں کے قریب رہے۔ جبکہ تمہارے پاس بھلا ایسی چیزوں کی لندن میں کیا کمی ہو گی؟''

''ہے کمی، کیوں نہیں ہے۔'' مکار رابرٹ نے اسے اسی کے انداز میں جواب دیتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔ آگے بولا۔ ''ان سب چیزوں کی ..... اہمیت الگ الگ ہے۔ میں اس لیے انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ جب میں وہاں ان چیزوں کو اپنے محل میں سجاؤں گا تو میرے دوست احباب کس قدر رشک کریں گے مجھ پر اور ایک چیز تو بڑی ہی خاصے کی ہو گی۔'' شاطر رابرٹ معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہ تم ہو گی۔''

معصوم سوجنا رابرٹ کے اس انداز سے ڈھے سی گئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کیبن سے نکلے اور ڈنر ہال کی جانب بڑھ گئے۔

اس بحری جہاز میں پچاس سالہ ایک بنگالی نژاد مسلمان تاجر مقبول مٹھون بھی سوار تھا۔ وہ کپڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ ڈھاکا میں ضلع راج باڑی میں اس کا شاندار مکان تھا۔ اس کی بیوی کا حال ہی میں کینسر کے سبب انتقال ہوا تھا، اب اس کا صرف ایک ہی جوان بیٹا شفیق احمد تھا۔ اب دونوں کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہ تھا۔ مقبول نے بیٹے کو بھی اپنے کاروبار میں شامل کرلیا تھا اور اب دونوں باپ بیٹے ایک طرح سے سیر اور تجارت ہی کی غرض سے انگلستان جارہے تھے، ان کی منزل لندن تھی۔ شفیق خوش نظر آرہا تھا کیونکہ پہلا موقع تھا کہ وہ بحری جہاز میں سفر کررہا تھا۔

دراصل بحری جہاز میں سفر کرنا ان سوداگروں کی مجبوری بھی تھی، اس طرح انہیں شہر شہر اپنی مصنوعات کی تجارت کرنے کا بھی موقع ملتا رہتا تھا۔

تاجر مقبول مٹھون کی عمر تو پچاس سال تھی مگر صحت قابل رشک تھی اور وہ چالیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا جواں سال بیٹا شفیق بیس اکیس سالہ ایک گبرو نوجوان تھا۔ وہ کھلنڈری طبیعت اور من موجی قسم کا نوجوان تھا۔ باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔

وہ بھی اس وقت ڈنر ہال میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا بہ ظاہر کھانے میں مشغول تھا مگر اس کی نظریں، چور زادیوں سے دو میزیں چھوڑ کر اس کے دائیں جانب سامنے کے رخ پر بیٹھی کھانا کھاتی اور رابرٹ کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی ہوئی سونجا پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

سدھا بتانے لگی اور شوکی نے اپنی ساعتیں اس کی آواز پر اور آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

''میرا نام سدھا ہے۔ میں مدھیہ پردیش کے شہر اجین کے ایک مضافاتی قصبے ملوٹی گنج میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن میری پیدائش احمد آباد میں ہوئی تھی۔ ان دنوں ہم وہیں رہتے تھے۔ یہ آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میرے والد کے ایک بہت گہرے دوست تھے، جن کا نام خواجہ محمد اختر تھا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ ولی محمد نام تھا اس کا..... میرے باپو کا نام سیٹھ مرلی لال تھا۔ میرے باپو سیٹھ مرلی لال اور ولی محمد کے بابا خواجہ محمد اختر آپس میں بڑی مثالی دوستی رکھتے تھے۔

''محمد اختر اجین میں پولیس کے سرکل انسپکٹر تھے، جبکہ میرے باپو کاروباری آدمی تھے۔ دونوں دوست نہایت متمول، خوش ذوق، ہنس مکھ اور یار باش انسان تھے۔ اکثر ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ دونوں دوست بیٹھک میں گھنٹوں ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول رہتے۔

''پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ رفتہ رفتہ میرے باپو سیٹھ مرلی لال کی فطری زندہ دلی اور خوش مذاقی نہ جانے کہاں غائب ہونے لگی۔ وہ کافی پریشان اور فکرمند سے دکھائی دینے لگے۔ ان کے دوست محمد اختر نے پہلے پہل تو باپو سے سرسری طور پر پریشانی کا سبب دریافت کیا جسے وہ پہلے تو نہایت خوش اسلوبی سے ٹال گئے لیکن جب کئی دن گزر گئے اور معاملہ ایسا ہی رہا تو ان کے دوست اختر کو تشویش ہوئی اور انہوں نے معاملے کی کچھ زیادہ ہی کرید کی۔

''آخر کار میرے باپو محمد اختر کے سامنے رو دیے۔ اختر نے بے اختیار باپو کو اپنے گلے سے لگالیا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ وہ دونوں بہت گہرے دوست ہیں اور مذہب سے ہٹ کر صرف انسانیت کے ناتے ان کے بیچ دوستی کا جو رشتہ قائم ہے وہ کسی بھی عقیدے سے کم نہیں ہے اور میرا مذہب اسلام بھی ہمیں پہلے انسانیت کا ہی درس دیتا ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں اور ہماری خوشیاں اور دکھ سانجھے ہیں۔ کیا مجھے بھی اپنی پریشانی نہیں بتاؤ گے؟ اس پر باپو نے انہیں جو بات بتائی اس پر ان کے دوست محمد اختر نے بجائے ملول ہونے کے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

''ارے مرلی لال! ایسی خرافات پر تم پریشان ہو گئے؟ میں تو سمجھا تھا کہ خدانخواستہ پتا نہیں تم پر کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔''

''یہ مصیبت سے کم تو نہیں ہے بھائی اختر!'' میرے باپو نے ان سے کہا۔

''میرے باپو نے درحقیقت انہیں یہ بتایا تھا کہ میں، یعنی سدھا ان کی بیٹی جو بہت خوش مزاج اور حسین تھی، عورت کے روپ میں ایک ناگن ہے۔ یہ بات..... ہمارے ہی مذہب کے کسی تانترک نے باپو کو بتائی تھی۔ کس برتے پر؟ اس کا کچھ علم نہیں تھا۔

''لہٰذا ان کے دوست محمد اختر نے اسے ہم لوگوں کی ضعیف الاعتقادی پر محمول کرنا چاہا کیونکہ مجھے محمد اختر نے بارہا دیکھا تھا اور میں اکثر خود بھی ان کے گھر آتی جاتی رہتی تھی لیکن میرے باپو نے اپنے دوست اختر کو میرے بارے میں تھوڑی تفصیل سے بھی آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ

اگرچہ یہ بات انہیں پہلے سے معلوم تھی، لیکن اس وقت انہوں نے بھی اس بات کا یقین نہیں کیا تھا مگر اب میرے جوان ہونے پر بھی یہی کہا گیا تو ان کی تشویش جو پہلے بھی کبھار ہی پریشان کرتی تھی، اب مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔

''کیونکہ باپو (سیٹھ مرلی لال) نے میری پیدائش کے موقع پر جب میری جنم کنڈلی بنوائی تھی، تو اس وقت پنڈتوں نے بھی لڑکی کے روپ میں مجھے ناگن ہی بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اس کا کسی مرد سے بیاہ نہ ہو سکے گا۔

''انہوں نے بتایا کہ اس وقت بھی وہ اور ان کی پتنی یعنی میری ماتا پنڈتوں کی اس پیش گوئی سے بہت پریشان ہو گئے تھے، یوں وہ ہر سال دان پن بھی کرتے تھے لیکن جیسے جیسے میں بڑی اور جوان ہوتی گئی یہ بات نہ جانے کس طرح احمد آباد کے ہندو حلقے میں پھیلتی چلی گئی اور آخر کار بات یہاں تک پہنچی کہ انہیں احمد آباد میں اپنا کاروبار بند کر کے اور آبائی مکان فروخت کر کے اجین کا رخ کرنا پڑا۔

''یہاں کچھ دنوں تک تو بات دبی رہی لیکن اب پھر اس قسم کی افواہیں اڑنے لگی تھیں اور اس لیے میرے باپو سیٹھ مرلی لال بہت پریشان تھے کہ اب کیا کریں اور کہاں جائیں؟

''ان کے دوست محمد اختر ان کی زبانی یہ تفصیلی حالات سن کر حیران رہ گئے کیونکہ ڈیڑھ سال پہلے ہی جب وہ اجین میں سرکل انسپکٹر ہو کر آئے تھے اس وقت سے ہی ان کے میرے باپو سے مراسم تھے اور پھر یہ مراسم روز بروز گہرے ہوتے چلے گئے تھے لیکن میرے باپو نے کبھی ان واقعات کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کے دوست اختر نے اس قسم کی کوئی افواہ سنی تھی۔

''محمد اختر نے پہلے تو میرے باپو کو بہت سمجھایا کہ اس وہم کو دل سے نکال دیں جس نے ان کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ پھر انہوں نے ہنستے ہوئے میرے باپو سے یہ تک بھی کہہ ڈالا۔

''ہمارے مسلمان ہونے کا سبب آڑے آئے گا ورنہ سدھا کے لیے تو خود ان کا بیٹا ولی حاضر ہے۔''

''اور اس وقت اختر کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میرے باپو نے بھی بالکل خلاف توقع یہ جملہ ان سے کہہ ڈالا۔

''اختر بھیو..... اب میں تو اس پر بھی تیار ہوں اور شادی کے بعد دونوں کو چپکے سے کہیں..... باہر بھیج دوں گا مگر یہ خیال ستاتا ہے کہ ہم تو برباد ہی ہیں..... کہیں بیٹے ولی محمد کا جیون بھی نشٹ نہ ہو جائے۔'' محمد اختر کو چونکہ اس جواب کی توقع نہ تھی اس لیے ان سے کوئی مناسب جواب نہ بن پڑا۔

''پھر چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد محمد اختر نے ان سے سوال کیا کہ وہ سدھا یعنی میرے بارے میں پنڈتوں کی اس پیش گوئی کو واقعی صحیح سمجھتے ہیں؟ اس کا جواب باپو نے اثبات میں دیا۔

''محمد اختر کا بیٹا ولی محمد اس زمانے میں گوالیار ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی اجین مہیلا پاٹ شالے کی طالبہ تھی۔ اس وقت میں کوئی بارہ چودہ برس کی ہوں گی۔

''محمد اختر نے جب باپو کی بات کا ذکر اپنی بیوی یعنی ولی محمد کی ماں سے کیا تو انہوں نے میری اور ولی کی شادی والی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس لیے نہیں کہ میں انہیں پسند نہ تھی، بلکہ وہ تو مجھ سے اس قدر خوش تھیں اور اتنی محبت کرتی تھیں کہ پیار سے مجھے ''پری'' کہتی تھیں۔ ہر تہوار کے موقع پر میرے لیے ایک قیمتی جوڑا اور مٹھائی ضرور بھجواتی رہتیں، میں بھی تو ان سے بہت مانوس تھی اور ان کی چھوٹی موٹی خدمت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

''حیرت کی بات تھی کہ ان کے بیٹے ولی محمد کو ان باتوں کا علم نہ تھا لیکن وہ چھٹی میں اجین آتا تو اسے مجھ سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا لیکن جانے کیا بات تھی وہ شاید فطرتاً شرمیلا تھا کہ مجھ سے گفتگو کبھی نہ کر سکا، بس خاموشی سے یک ٹک مجھے تکتا رہتا تھا۔ میں بھی اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہتی تو جانے کیا بات ہوتی کہ وہ ایک دم گھبرا کر نظریں پھیر لیتا۔

''صرف ایسی ہی ایک ملاقات کے لیے وہ دن گنا کرتا تھا کہ کب اتوار آئے اور چھٹی ہو اور وہ اجین پہنچے۔

''کیوں رے..... تو کبھی مجھے ٹکٹکی باندھے تکتا ہے اور کبھی اس طرح نظریں مجھ سے ترنت ہٹا لیتا ہے جیسے میں تجھے کھا جاؤں گی؟'' ایک دن میں نے اس سے کہہ ڈالا۔ اس نے بھی جواب میں صاف کہہ دیا۔

''ہاں، سدھا! میں تجھے دیکھتا ہوں، تو مجھے اچھی لگتی ہے نا..... لیکن پتا نہیں جب تو بھی مجھے اسی طرح تکنے لگتی ہے نا، پھر ایک دم تیری آنکھوں میں نہ جانے کیسی کشش پیدا ہوتی ہے کہ مجھے اپنی نظریں پھیرتے ہی بنتی ہے۔ تیری آنکھیں مجھے اس سے کسی جوگن کی آنکھیں محسوس ہوتی ہیں۔''

''میں ولی ..... کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ مجھے پتا تھا کہ لوگ باگ میرے بارے میں کیا باتیں کرتے تھے۔ ایک دن میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو کافی دیر تک دیکھا۔ میری یک ٹک نگاہیں آئینے میں اپنا شریر دیکھنے میں محو تھیں۔ حسین تو میں تھی ہی لیکن اس حسن

میں خود مجھے بھی ایک عجیب سی اسراریت کا احساس ہوتا تھا۔

"اس روز میں نے آئینے میں اچانک خود کو دیکھا اور دیکھتی چلی گئی کہ اچانک میں غائب ہوگئی اور اس کی جگہ آئینے میں ایک ناگن کو دیکھا، ناگن بھی کیسی سفید رنگ کی۔ کمال کی بات تو یہ تھی کہ میں بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوئی، مجھے یہ سب اچھا لگا۔ میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"ایک روز پگی راہ گزر پر جاتے ہوئے ایک سانپ میرے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک زبردست پھنکار مار کر پہلے تو مجھے ڈسنے کے لیے اپنا پھن یک دم اٹھا لیا، خود میں بھی خوف زدہ ہوگئی لیکن دوسرے ہی لمحے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یک دم اپنا خوفناک سیاہ پھن سکیڑ لیا اور بھربھری مٹی والی زمین پر رکھ دیا۔ وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں آگے بڑھ گئی۔

"غرضیکہ دھیرے دھیرے مجھ پر منکشف ہونے لگا کہ میرے اندر کچھ ان دیکھی قوتیں پرورش پا رہی ہیں۔ خواب میں خود کو میں سانپوں کی رانی کے روپ میں دیکھا کرتی۔ ایک روز خواب میں، میں نے ایک زخمی عورت کا سانپ کے کاٹے کا علاج کیا، یوں مجھے خواب ہی خواب میں سانپ کاٹے کے منتر سجھائی دینے لگے۔ یہ انہی دنوں کا ذکر تھا، جب ولی محمد بھی چھٹی پر اجمین آیا ہوا تھا۔ اجمین میں ان دنوں سانپ کے ڈسنے کے واقعات بڑھنے لگے تھے۔

"ملوٹی گنج میں ایک درمیانی عمر کی ہندو عورت کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ جھاڑنے کے لیے لوگ میرے باپو کے ہاں پہنچے۔ وہ مجھے سانپ ڈسا جھاڑنے کے لیے لینے آئے تھے۔ اس پر باپو کو غصہ آیا اور انہوں نے ان سے کہا کہ میری بیٹی یہ کام نہیں کرتی، لیکن اس عورت کے معصوم بچوں اور اس کے پتی کو روتے اور داد فریاد کرتے دیکھ کر میں ان کی مدد کو تیار ہوگئی۔ لاڈلی تھی میں اپنے ماتا پتا کی اس لیے چلی گئی۔

"جو مجھے خواب میں منتر دان ہوا تھا، وہ میں ان پر آزمانے کا ارادہ رکھتی تھی کہ پتا تو چلے کہ میں صرف خواب میں یہ کرتی ہوں یا حقیقت میں بھی کر پاتی ہوں یا نہیں۔

"وہاں پہنچی تو دیکھا، عورت پر غنودگی طاری تھی اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مارگزیدہ (سانپ ڈسے) کو چارپائی پر نہیں بیٹھنے دیتے، اس لیے اسے دری بچھا کر زمین پر ڈال دیا گیا تھا۔

"کوئی عامل نیم کی تازہ پتیوں کی جھاڑو بنائے منتر جنتر پڑھ کر اسے پانی میں بھگو کر عورت کے چہرے پر چھڑک رہا تھا مگر عورت کو ہوش نہ آیا۔ میرے وہاں پہنچنے پر لوگوں نے خوش ہو کر شور مچا دیا۔ میں نے ان میں چند لوگوں کو اپنے بارے میں ایک عجیب جملہ بولتے پایا۔

"ناگ نگری کی ملکہ آگئی..... سفید دیوی آگئی۔ اب شانتی جرور پچ جاوے گی۔" میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے سوکھے، خاکستری اور لبوترے تھے۔ ان کی چندی چندی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔ ان کی آنکھوں میں حوصلہ افزائی کی بھی چمک تھی۔

"وہ تین چار تھے، اتنے لوگوں کے درمیان میں کھڑے وہ مجھے جانے کیوں ان سب سے مختلف لگے اور پھر مجھے نظر نہیں آئے، یوں لگا جیسے وہاں وہ میرا تعارف کرانا چاہتے تھے۔ ان کی حرکت دانستہ تھی۔ دیگر لوگ باگ مجھے راستہ دینے کی غرض سے ہٹ گئے۔

"میں جونہی کچھ پڑھتی ہوئی عورت کے قریب پہنچی تو اس نے اینٹھ کر بل سالیا۔ اٹھ کر بیٹھی اور پھر بے ہوش ہو کر لیٹ گئی۔

"مجھے خواب کے سارے منظر اور منتر یاد تھے۔ میں عقبی دروازے سے باہر نکلی جہاں خودرو گھاس کا میدان سا تھا۔ مٹھی میں پانچ کوڑیاں دبا کیں، ان پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور میدان میں دور پھینک دیا۔

"اندر آکر میں نے مرغی کے دو چوزے اور پانچ سیر دودھ منگوایا، مگر دودھ تو نہ مل سکا البتہ چوزے لائے گئے۔ میں نے ایک چوزے کے پیٹ کے چند نرم نرم پر اکھاڑے، شاید کھال بھی ذرا سی پھٹ گئی اور چوزے کا وہی حصہ عورت کی گردن سے اس جگہ مس کیا جہاں سانپ کے دانتوں کا زخم تھا۔ پھر ہٹا کر چوزے کو جونہی چھوڑا، وہ پھڑپھڑا کر مر گیا۔

"سب لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے اور خود میں بھی اندر سے حیران تھی کہ یہ میں کیا کر رہی تھی؟ کیونکہ ایسا میں نے صرف خواب میں ہی خود کو کرتے دیکھا تھا حقیقت میں نہیں۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔ ہے بھی کہ نہیں؟ خود مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ منتر کامیاب بھی جاتا ہے یا نہیں، ناکامی کی صورت میں عورت مر جاتی۔

"شاید یہ میرا..... پاگل پن تھا۔ محض ایک حقیقت کو جانچنے کی غرض سے میں ایک انسانی جان سے کھیل رہی تھی، لیکن میں خود بھی چاہتی تھی کہ یہ عورت بچ جائے۔ اس کے تین چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اور غریب شوہر پر مجھے ترس آرہا تھا۔ ساتھ ہی ان غائب ہونے والے تین افراد کی

آنکھوں کی حوصلہ افزا چمک بھی ہمت بڑھا رہی تھی۔

''میرے منتر کا پہلا حصہ پورا ہوا ہی تھا کہ ٹھیک اسی وقت وہاں موجود سب لوگ چونک پڑے۔ چند لوگوں کی تو دبی دبی چیخیں بھی نکل گئیں۔ سچی بات تھی خود میں بھی اندر سے ششدر رہ گئی جب دیکھا کہ عقبی دروازے پر ایک بڑا سا ناگ پھن اٹھائے پھنکاریں مار رہا تھا۔

''یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر سب لوگ دور ہٹ گئے۔ ناگ عورت کی جانب بڑھا۔ میں منتر پڑھتی رہی اور اس سے کچھ کہتی رہی۔ ناگ عورت کے گرد چکر کاٹتا مگر اس کے قریب نہ جاتا بلکہ بار بار قریب پڑی ہوئی چارپائی کے سرہانے رک جاتا۔ سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کے پھن سے پانچ کوڑیاں یوں چپکی ہوئی تھیں گویا چپکائی گئی ہوں۔

''میں کچھ دیر سوچتی رہی، پھر میں نے عورت کو اٹھوا کر چارپائی پر ڈلوا دیا۔ اب سانپ چارپائی کے سرہانے ٹھہر گیا۔ وہ بار بار اپنا پھن اٹھاتا مگر پھر نیچے کر لیتا۔ تب میری نگاہ عورت کے لمبے اور کھلے ہوئے بالوں پر پڑی اور میرے ہی کہنے پر ایک آدمی نے بڑھ کر عورت کے بال چارپائی سے نیچے لٹکا دیے۔ اب ناگ انہی بالوں کے سہارے چارپائی پر چڑھا اور اس نے اپنا منہ عورت کی گردن کے زخم پر لگا دیا۔

''تقریباً دس پندرہ سیکنڈ بعد اس کے پھن کی دو کوڑیاں جدا ہو کر گر پڑیں۔ سانپ نے اپنا پھن ہٹایا اور میری جانب دیکھا، میں منتر پڑھنے میں مصروف رہی۔ اب سانپ نے وہی عمل دہرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے باقی پانچ کوڑیاں بھی جدا ہو کر گر پڑیں۔ سانپ اسی راستے چارپائی سے اترا اور رینگتا ہوا دروازے سے باہر نکل کر لمبی گھاس میں غائب ہو گیا۔

''جب سانپ جا رہا تھا تو بار گزیدہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنی آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ گویا گہری نیند سے جاگی ہو۔ جاتے ہوئے سانپ سے میں نے سختی سے کہا۔

''اب ادھر کبھی نہ آنا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''بعد میں مجھے اپنے آپ پر بھی حیرت ہوئی کہ میں سانپ سے اس طرح گفتگو کر رہی تھی جیسے وہ میری زبان سمجھتا ہو پھر میں نے پہلے کی طرح دوسرے چوزے کو بھی زخم سے مس کیا اور وہ نہ مرا تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ہم رخصت ہوئے۔

''اس عجیب تجربے کے بعد مجھے سانپوں سے متعلق علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ پیدا کیا ہوا علم تو مجھے از خود ہی آ گیا تاہم اپنے خوابوں والے علم پر میرا اعتقاد قائم ہو گیا اور جو لوگ میرے بارے میں افواہیں اڑاتے پھر رہے تھے، مجھے ان کی باتوں پر بھی اب وشواس ہونے لگا تھا۔

''میری اور ولی کی شادی والی باتیں آئی گئی ہو گئیں، وہ جس طرح مفروضے اور مذاق کے انداز میں کی گئی تھیں وہ اسی کی نذر ہو گئیں۔

''پاس کی پوروائی ''شانتی نگر'' سے میرے لیے رشتہ آ گیا۔ میرے باپو سیٹھ مرلی لال اور ماتا جی اس رشتے کی آمد پر بے حد خوش ہوئے اور یوں بات بھی پکی ہو گئی اور اس دیوالی پر منڈل بھی سجنے کی تاریخ طے پا گئی۔''

☆☆☆

راج محل کے ویدوں اور حکیموں کے علاج سے گارشیا کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ گلا دبنے کے باعث اس کے حلق پر اس قدر زور پڑا تھا کہ وہ چند دنوں تک تو بات بھی کرنے سے قاصر ہی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی سانسیں بھی بے ترتیب رہی تھیں اور ہوش آنے پر وہ کھینچ کھینچ کر سانس لیا کرتی تھی۔

گارشیا کی حالتِ زار پر رینا بھی بہت پریشان اور تشویش زدہ ہو گئی تھی۔ وہ بے چاری سارا سارا دن اس کے بستر کے قریب بیٹھی رہتی تھی جبکہ ادھر راجا پرتاب کمار اپنے اظہارِ دل کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا لیکن رینا کو شوکی کے بعد گارشیا کی پریشانی میں مبتلا دیکھ کر راجا کو دوبارہ اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا۔ اس لیے اس نے ویدوں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ گارشیا کی حالت کو جلد از جلد بہتری کی جانب لانے کی کوشش کریں۔

یوں چند روز بعد ہی گارشیا کچھ بات کرنے اور ٹھیک طرح سے سانس لینے کے قابل ہوئی تو اس نے رینا کو اپنے بستر کے قریب پایا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ رینا ایک لمحے کے لیے بھی اس کے پاس سے نہیں ہٹی تھی۔ رینا کے اس جذبۂ ایثار و ہمدردی نے پہلی بار گارشیا کا ضمیر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

رینا کو گارشیا کی طبیعت سنبھلتے دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی، گارشیا بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے اب بھی محسوس کیا کہ اس کی آواز پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ تھوڑی بھاری اور کھردری ہو گئی تھی۔ ممکن تھا تھوڑے دنوں بعد یہ کسر بھی جاتی رہتی، تاہم اس نے رینا کو ساری حقیقت بلا کم و کاست بتا دی۔

رینا نے جب یہ سنا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے بالکل بھی راجا برٹ سے ایسی ظالمانہ اور قبیح حرکت کی امید نہ تھی۔

پرتاب نے اس سے رابرٹ کے بارے میں بھی استفسار کیا تھا، اس وقت رینا اس کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی، تاہم پرتاب نے ایسے اعتماد میں لے کر اپنے اس خدشے کا اظہار کر ڈالا تھا کہ یہ قبیح حرکت رابرٹ نے ہی کی ہوگی کیونکہ شواہد سے اب تک یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اب جو گارشیا نے پوری طرح ہوش سنبھالنے اور حالت بہتر ہونے کے بعد اسے بتایا تو اسے یقین ہو گیا۔

''رینا سسٹر! تم فوراً یہ حقیقت راجا صاحب کو بتا دو، ایسا نہ ہو رابرٹ اس کی بہن کو.....''

''انہیں پتا چل چکا ہے گارشیا.....!'' رینا نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اسے بتا دیا۔

گارشیا بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو جاری ہو گئے۔

''ارے..... تمہیں کیا ہوا.....؟ کیوں رو رہی ہو؟'' رینا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔'' گارشیا دکھ سے سسکتے لہجے میں بولی تو رینا کو بے اختیار اپنی بہن پر ترس آ گیا اور اس نے اسے فوراً اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہوا تمہاری قسمت کو، تم اب بالکل بھلی چنگی ہو گئی ہو۔ شکر کرو کہ تمہارا بروقت علاج ہو گیا۔'' رینا کی اس طرح کی محبت اور ایثار نے گارشیا کو مزید شرمندہ کر دیا۔ اس نے اپنے آج تک کے اس کے ساتھ روا رکھے رویے کی معافی مانگی اور پھر شوکی کے بارے میں پوچھا..... شوکی کے ذکر نے رینا کو مغموم سا کر دیا۔ گارشیا بھی تھوڑا بہت جانتی تھی مگر رینا نے اسے تفصیلاً اس کے بارے میں بتا دیا۔

''مائی گاڈ.....!'' یہ سن کر گارشیا نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''کک..... کیا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا؟''

''خدا نہ کرے ایسا ہو، لیکن ابھی ایسا کچھ پتا نہیں چل سکا ہے۔ راجا صاحب اس کی تلاش.....'' میں لگے ہوئے تو ہیں مگر.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''مگر کیا.....؟ تم آگے کیوں نہیں بولتی رینا؟'' گارشیا پریشان ہو گئی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ راجا پرتاب.....'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ راجا پرتاب کمار ہولے سے کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس نے گارشیا سے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس کے بعد رینا نے پرتاب سے کہا۔

''وہ مجھے..... آپ سے کچھ ضروری بات کہنی ہے۔'' اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ خود راجا پرتاب بھی ایک عرصے سے ایسے ہی کسی موقعے کا منتظر تھا۔ وہ فوراً اسے اپنے کمرائے خاص میں لے گیا۔

رینا نے اسے گارشیا کی زبانی وہ ساری باتیں بتا ڈالیں جو رینا نے اس سے سنی تھیں۔

''ہمارے لیے یہ کوئی نئی خبر نہیں رہی اب..... ہم نے دو آدمیوں کو رابرٹ اور سونجا کی تلاش میں روانہ کر دیا ہے مگر اس کا بھائی ایش کمار ہمارے لیے اس حوالے سے بڑی مشکلات کھڑی کر رہا ہے۔'' پرتاب کمار نے کہا پھر کن انکھیوں سے رینا کے چہرے کو تکتے ہوئے مزید بولا۔

''مشکل تو یہ ہے کہ رابرٹ رشتے میں تمہارا اور گارشیا کا بھائی لگتا ہے اور اس ضمن میں ایش کمار معصر ہے کہ.....'' راجا خاموش ہو گیا۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے راجا صاحب..... خاموش کیوں ہو گئے؟'' رینا نے اسے الجھی ہوئی نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تو معلوم ہی ہے مس رینا کہ ہمارے درمیان سگے سوتیلے کا معاملہ ہے جس کے باعث ایش کمار کے دل میں ہمارے لیے کچھ غلط فہمیاں بھی جنم لیتی رہتی ہیں۔ وہ ہم پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ مبینہ طور پر رابرٹ کے اس ناقابل معافی جرم پر ان دونوں بہنوں کو قید خانے میں ڈلوا دیا جائے۔''

''اوہ.....!'' رینا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

''اب جب اسے یہ پتا چلے گا کہ گارشیا کی زبانی اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے تو وہ بالکل برداشت نہیں کرے گا۔''

''تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟'' رینا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں تشویش در آئی تھی۔

''ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' راجا پرتاب کمار نے جواب میں کہا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد اب یہاں بھی انگریزوں کو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جا رہا لیکن آپ فکر مت کریں ایسا کچھ میں ہونے نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں کبھی بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ پر کوئی ایک ذرا سی بھی آنچ آئے۔''

یہ کہتے ہوئے راجا پرتاب نے گہری اور معنی خیز نظروں سے رینا کے مضطرب چہرے کو دیکھا۔ رینا اس کی نظروں کی گرمی کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکی اور اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ جھکا لیا اور ہولے سے بولی۔

''ہم آپ کے تہ دل سے شکر گزار ہیں، لیکن ایش کمار کو سوچنا چاہیے کہ رابرٹ کے کرتوتوں کے ہم بھلا کیسے

ذمے دار ہو سکتے ہیں؟''

پرتاب کمار کو اس کی سادہ لوحی پر بے اختیار پیار آ گیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں مس رینا! میرے ہوتے ہوئے آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ہم تو بس آپ سے اپنے دل کی ایک بات کہنے کے لیے گویا برسوں سے بے چین ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے پرتاب محبت بھری مسکراہٹ چہرے پر لیے چند قدم رینا کی طرف بڑھا اور اس کے بالکل قریب اور سامنے کھڑا ہو گیا۔ رینا اب... چہرہ اٹھائے اپنی نیلی نیلی دلنشیں آنکھوں سے پرتاب کا چہرہ تکنے لگی تھی۔ پرتاب نے اسی طرح پیار بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور پھر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں تلے بولا۔

''مس رینا! ہم آپ کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ آج ہمیں کہنے دیجیے، اپنے دل کا آج ہمیں یہ بار اتار لینے دیجیے کہ آپ ہی ہمارے دل کا چین اور سکون ہیں۔ ہم آپ سے بے حد محبت کرتے ہیں..... اس قدر..... کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے، ہم ایک بادشاہ ہیں لیکن بس! ایک آپ کی کمی کے سبب ہم خود کو فقیر سمجھنے لگے ہیں، ہماری یہ کمی پوری کر دیں ہم آپ کو اس محل کی رانی بلکہ مہارانی بنانا چاہتے ہیں، کیا ہمارے دل کی بات آپ کو اچھی لگی؟''

پورے جذبات کے ساتھ راجا پرتاب کمار نے آخر کار اپنے دل و دماغ کی اس بے چینی سے چھٹکارا پا لیا جس اظہار کے اعتراف کے لیے وہ بے قراری سے ایسے ہی کسی وقت کا منتظر تھا، آج وہ اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی بات کہنے کے بعد خاموش نظروں سے رینا کے جواب کا منتظر تھا۔

رینا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ آنکھیں پھیل سی گئی تھیں۔ پھر اس کے چہرے پر مشرقی عورتوں کی طرح شرم کی ہلکی سی سرخی لہرائی مگر دوسرے ہی لمحے وہ گھبرا بھی گئی اور ایک دم خود کو راجا پرتاب کی نرم گرفت سے بہ آہستگی چھڑا کر چند قدم ایک طرف کو ہٹ گئی اور ایک دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

اس کی پشت راجا پرتاب کی طرف تھی اور چہرہ دیوار کی طرف۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ان گنت سوچیں ابھر آئی تھیں۔ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے، حالانکہ وہ بڑی حوصلے والی اور باہمت لڑکی تھی، لیکن شاید اس کے وجدان نے اسے باور کرا دیا تھا کہ زندگی کے بعض اہم فیصلے مرد سے زیادہ ایک عورت کو بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان میں تو اکثر ایسے امتحان بھی آتے ہیں کہ وقت کا کوئی لمحہ فیصلہ کرنے میں بے اختیار کر دیتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو تقدیر چاہتی ہے۔ رینا کے وجدان نے اسی گھڑی کی خبر دیتے ہوئے اسے دھڑکا دیا تھا۔

اس کی چشم تصور میں شوکی کی صورت ابھر آئی تھی۔ وہ کہاں تھا؟ زندہ بھی تھا یا نہیں؟ وہ کب تک اس کی راہ دیکھ سکتی ہے؟ وقت اور حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے اسے بے رحمانہ انداز میں بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ..... اگر شوکی اس دنیا میں نہیں رہا تھا تو اس کا ثبوت اس کا بے جان وجود تھا، جو ابھی اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا تو پھر..... تو پھر وہ کیسے یقین کر لے.....؟

''کیا سوچنے لگیں تم مس رینا.....؟'' بہت ہولے سے کسی نے پیچھے سے اس کے مرمریں کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ تھرا گئی۔ آگے دیوار تھی اور پیچھے آزمائش کا پل صراط۔ ناچار وہ وہیں جمی رہی۔ بالآخر اس نے ہمت مجتمع کی، اسے تقدیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا تھیں، سو وہ دھیرے سے پلٹی، کندھے سے کسی مردانہ ہاتھ کے دباؤ کا بار ہٹا، اب اس کے سامنے راجا پرتاب سرتاپا کڑا امتحان بنا کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''راجا..... صاحب!'' لہجہ اٹکنے لگا، مگر ہمت اسے کھدیڑتی رہی۔ ''مم..... میں نے اتنے بڑے فیصلے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔''

اسے تسلی ہوئی، اس کے دل نے ہی نہیں بلکہ دماغ نے بھی گواہی دی کہ اس نے کڑے امتحان کے سوالنامے پر بالکل درست جواب رقم کیا ہے۔

''تو آپ اب غور کر لیں۔'' راجا پرتاب کی محبت پاش نظریں ہنوز رینا کے شگفتہ چہرے پر ثبت تھیں، لیکن ثبات کے اس پیمانے کا جام محبت چھلکنے کے قریب محسوس ہوا تھا۔

''حالات اس طرف سوچنے کی بھلا کب مہلت دے رہے ہیں مجھے راجا صاحب!'' رینا نے مغموم لہجے میں کہا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ہجر کا اداس پپیکا چاند اتر آیا تھا۔

''آپ جب ہماری ہو جائیں گی تو یہ حالات بھی ہم اپنے قابو میں کر لیں گے۔ آپ ان کی کوئی فکر نہ کریں۔''

''آپ کی بہن سونجنا کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ حساس ہے اور بہ قول آپ کے رابرٹ کے حوالے سے ہمیں بھی اس کا ذمے دار ٹھہرایا جانے لگا ہے۔ اور..... اور..... شوکی.....!'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اپنے محبوب کا ذکر لو کپ زباں پہ لرز کر رہ گیا اور اداس چہرہ موہوم ہجراں کی تصویر بن کر رہ گیا۔

Digitized by Google

''شوکی.....!'' راجا پرتاب نے ہولے سے مگر عجیب انداز میں دہرایا اور واپس مڑ کر چند قدم چلا پھر دوبارہ رینا کی جانب گھوما، تو اس بار رینا کی نگاہیں اس کے تعاقب میں رہیں۔ دیکھا، فوراً دیر پہلے محبت کی تپش سے تمتماتا چہرہ ایک دم بردبارانہ سنجیدگی میں بدلا نظر آنے لگا تھا۔

''شوکی سے آپ کا کوئی قلبی رشتہ.....؟'' مختصراً پوچھا گیا۔

''وہ میرا ساتھی تھا۔'' رینا کے لبوں سے پھسلا۔ دل احتیاط کی تدبیریں تلاشنے لگا۔ تعلق خاطر ظاہر نہ کرنا ہی بہتر تھا۔

''ساتھی تو اور بھی بہت تھے آپ کے، لیکن ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آپ اپنے اس معمولی ملازم کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان نظر آتی ہیں۔'' راجا پرتاب کی نظریں بدستور اس پر مرکوز رہیں۔ رینا کی عزتِ نفس اور انا نے اسے جھنجوڑا۔

''یہ کون ہوتا ہے میرے ذاتی معاملات کی اس طور پوچھ گچھ کرنے والا؟'' تب دماغ نے مصلحت کوشی کا احساس دلایا۔ وہ اس وقت حالات اور موقع محل کے علاوہ راج محل کے دو بھاری پاٹوں کے بیچ تھی۔ ممکن ہے کہ وہ پیس ڈالی جائے۔ اسے خوف کا ہلکا سا دھچکا محسوس ہوا۔ سنبھل کر بولی۔

''ہمارے ساتھ تلاش کے اس سفر میں جو بھی تھے وہ ملازم نہیں ساتھی تھے۔ ہم نے اس سفر میں بہت کچھ..... کھو دیا ہے۔ میرے پاپا گھناؤنی سازش کا شکار ہوئے، کوئی انصاف نہیں ملا ہمیں، حالانکہ یہ آپ کا وعدہ تھا، پھر ہمارے دوسرے ساتھی اس مشن پر قربان ہو گئے، ان کی ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اب کیا اپنے آخری ساتھی کو بھی ہم بھول جائیں؟''

بڑی خوبصورتی کے ساتھ رینا نے راجا پرتاب کو اپنے مہل جواب سے نوازدیا۔ اس کا خاطر خواہ اثر پرتاب کمار کے چہرے سے ہلکی ندامت اور خفت کی صورت ظاہر ہوا۔

''بات کا موضوع ہم طویل نہیں کرنا چاہتے۔'' بالآخر اس نے فرار چاہی۔ ''شوکی کی تلاش جاری ہے۔ باقی کے حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ شوکی زندہ ہوگا تو مل جائے گا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ آپ کو اس اہم فیصلے سے یہ چیزیں روکے ہوئے ہیں۔''

''دل بے چین اور حالات پریشان کن ہوں تو ایسے اہم فیصلے کرنے سے گریز کرنا ہی دانش مندی ہے۔''

''آپ کا خیال ہے کہ ہم سے متعلق آپ کا فیصلہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے؟''

رینا خاموش رہی۔ چند ثانیے کی خاموشی..... اس ماحول پر طاری رہی۔ اس کے بعد راجا پرتاب نے ہولے سے مگر مسکت لہجے میں کہا۔

''ہمیں شاید ہمارا جواب مل چکا ہے۔ آج کے بعد ہم آپ سے کوئی جواب نہیں مانگیں گے۔''

یہ کہہ کر راجا پرتاب واپس پلٹ گیا۔ رینا اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اگلے دن اسے پتا چلا کہ راجا پرتاب کمار تین روز کے لیے شکاری مہم پر روانہ ہو چکا ہے۔ ایسے حالات میں راجا کا یوں اچانک شکار پر روانہ ہونا نہ جانے کیوں رینا کا دل وسوسہ انگیزی تلے دھڑکا گیا۔

☆☆☆

فرستادے کا نام چیتن شرما تھا۔ وہ راجا پرتاب کمار کے مشیر خاص ستیرام داس کا رشتے دار بھی تھا۔ اس کی عمر چالیس، پینتالیس کے پیٹے میں تھی اور وہ ایک دبلا پتلا اور ہوشیار آدمی تھا۔ ملکہ برطانیہ تک دستی خط پہنچانے کے لیے اس کا انتخاب ستیرام داس نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ کیونکہ چیتن شرما اس سے پہلے بھی دو بار لندن جا چکا تھا۔ یہی نہیں وہ اس سے پہلے شاہی وفد کی نمائندگی کے طور پر ایک بار ملکہ کی سلور جوبلی کی تقریب میں بکنگھم پیلس بھی جا چکا تھا۔ وہاں اسے کچھ لوگ جانتے بھی تھے۔

چیتن شرما کو معلوم نہ تھا کہ اس کا راز افشا.... ہو چکا ہے۔ تاہم پھر بھی وہ بہت احتیاط کیے ہوئے تھا۔

بمبئی آتے ہی وہ سب سے پہلے منصوبے کے مطابق ایک دو روز وہاں اپنے ایک رشتے دار کے گھر پر ٹھہرا تھا، جب دوسرے دن اسے کسی مشکوک نقل و حرکت کا احساس نہ ہوا تو اس نے اپنے بمبئی والے رشتے دار کے ذریعے انگلستان (لندن) کا ٹکٹ کروایا اور پھر ایک شام وہ بحری جہاز میں سوار ہونے کے لیے بندرگاہ پہنچ گیا۔

ادھر جنرل مائیکل شا کے بندرگاہ پر ڈپارچر سیکشن کے ٹکٹ انچارج کو خفیہ طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ انگلستان کے لیے جتنے بھی ہندوستانیوں کے ٹکٹ جاری کیے گئے ہوں ان کی تفصیلی فہرست سے فوراً آگاہ کیا جائے۔

فہرست ملتے ہی دہلی کی قلعہ بند حویلی میں اس کی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جانے لگی۔ شیورائے بھولکر اور کرنل بلسٹر وڈ کو مائیکل شا نے وہیں روکے رکھا تھا۔

شیودرائے بھولکر فہرست کا بہ غور جائزہ لینے لگا اور اس نے تقریباً گیارہ ہندوستانیوں کے نام الگ کر دیے۔ اس کے بعد دوبارہ ان گیارہ ناموں کی چھانٹی کی گئی اور چار نام ان میں سے ایسے الگ کر دیے گئے جن کے ساتھ کوئی فیملی نہ تھی، یعنی وہ تنہا تھے۔ ان کو موصول ہونے والی خفیہ رپورٹ کے مطابق فرستادہ اکیلا تھا۔ نیز اس کا حلیہ بھی بتایا گیا تھا۔

ان مذکورہ چار میں سے دو باپ بیٹا پائے گئے تھے، تیسرا ایک سوداگر تھا۔ جبکہ چوتھا صرف سیر و تفریح کرنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ یہی چیتن شرما تھا۔

اسے ٹریس کرلیا گیا اور یہی ان کا مطلوبہ شخص نکلا۔

اسی وقت جنرل مائیکل شانے اپنے دو سادہ لباس میں سپاہی بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیے۔ انہیں ہدایت تھی کہ وہ دونوں باقاعدہ ٹکٹ خرید کر عام مسافروں کی طرح جہاز میں سفر کریں گے اور دورانِ سفر چیتن شرما کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس خط کی عبارت کو بدل ڈالیں گے۔

پہلے ان کا ارادہ خط چھیننے اور فرستادے (چیتن شرما) کو ہلاک کرنے کا تھا مگر عیار دماغ فرنگیوں کو ایک اور اسکیم سجھائی دی، خط کی عبارت تبدیل کرنا ایک حساس کام تھا۔ اگر یہ چال کامیاب ہو جاتی تو کوہ شالیہ کی تقدیر کو ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیا جاتا۔

اسی سبب دو سپاہیوں میں ایک حسین عورت سے کام لیا جا رہا تھا۔ یہ انگریز نہیں تھے، ان کا انتخاب شیودرائے بھولکر نے کیا تھا۔ یہ دونوں بنگالی ہندو تھے جو فرنگیوں کے لیے اپنے لوگوں میں گھل مل کر گیرائی (جاسوسی) کا کام کرتے تھے۔

دونوں جوان تھے۔ مرد کا نام کیرتن تھا اور عورت شوبھا تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی کے روپ میں چیتن شرما سے جہاز میں گھلنے ملنے کی کوشش کرتے اور شوبھا چیتن کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خط برآمد کرتی اور کیرتن بڑی صفائی اور ''مہارت'' سے شاہی مہروں کو چھیڑے بغیر مخصوص کیمیکل کے ذریعے خط کے مضمون کو بدل دیتا۔

جہاز بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ اب جہاز میں گویا ایک بساط بچھ چکی تھی۔ ایک طرف اس جہاز میں سونجنا اور رابرٹ سوار تھے، دوسری جانب بنگالی نژاد مسلمان تاجر مقبول مٹھون اور اس کا جواں سال بیٹا شفیق بھی موجود تھا جو سونجنا میں غیر معمولی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

تیسری جانب ناگرہ کا فرستادہ چیتن شرما تھا، جبکہ چیتن شرما کی ابھی تک سونجنا پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ادھر فرنگیوں کے یہ دو جاسوس شوبھا اور کیرتن بھی اسے گھیرنے کے لیے جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

اریبہ کو ایک سمت کی جانب پیش قدمی کرنے کی ہدایت کے بعد شاہ زمان پستول سنبھالے تھوڑی دیر تک لمبے لمبے سانس بھرتے ہوئے اپنی.... حالت پر قابو پاتا رہا۔ اس کے بعد، وہ اس جانب کو بڑھا جہاں رینالڈ کی موٹر بوٹ، ہاؤس بوٹ کے ساتھ لنگر انداز تھی۔ اسے شبہ تھا کہ بزدل رینالڈ کہیں ہاؤس بوٹ سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

اچانک اسے کسی کی رائفل بدست جھلک نظر آئی، وہ ٹھٹک کر اور پرجاتی سیڑھیوں کے درمیانی خلا میں ہو گیا۔ اس کا شکار اس کے نشانے پر آنے والا تھا، یہ وہی تھا جس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کیا تھا اور اریبہ کی گولی سے بچ گیا تھا۔

غیر ملکی کھاوتیں

☆ فضیلی عورت اور ٹپکنے والا گھر یکساں ہوتے ہیں (ہندوستانی کہاوت)

☆ کل کے دو سے آج کا ایک بہتر ہے (انگلینڈ کی کہاوت)

☆ سستی چیزیں اچھی نہیں ہوتیں اور اچھی چیزیں سستی نہیں ہوتیں (چینی کہاوت)

☆ عمدہ دوائی اکثر کڑوی ہوتی ہے (جاپانی کہاوت)

☆ بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے (جرمن کہاوت)

☆ بھیڑ کو باپ نہیں، صرف گھاس یاد آتی ہے (روسی کہاوت)

☆ مچھلی اور مہمان سے تین دن بعد بو آنے لگتی ہے (امریکی کہاوت)

☆ نیلامی کے وقت اپنا منہ بند رکھو (اسپینی کہاوت)

☆ جو چیز شیر کو لومڑی بناتی ہے، وہ ضرورت ہے (فارسی کہاوت)

☆ زیادہ مکار سب سے پہلے پکڑا جاتا ہے (فرانسیسی کہاوت)

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ہل ہزارہ

وہ جیسے ہی اس کے نشانے پر آیا، زمان نے اپنے پستول سے اس کا نشانہ لینا چاہا کہ اچانک اس کی انگلی ٹریگر پر جمی رہ گئی۔ اس کے عقب میں دوسرا مسلح فوجی بھی تھا جو اسے گور کیے ہوئے تھا۔

زمان اگر اپنے شکار پر گولی چلاتا تو اس کا بھی دوسرے ساتھی کے ہاتھوں مارا جانا ممکن تھا۔ وہ ابھی اسی تذبذب کا شکار تھا کہ اچانک گولی چلی۔ کسی کی کریہہ چیخ ابھری اور ساتھ ہی کوئی چلایا بھی۔

''اس طرف..... اس طرف.....'' یہ رینالڈ کی آواز تھی۔ زمان کا دل دھڑکا۔ اس کا خیال اریبہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے یقیناً کسی فرنگی فوجی کو شکار کیا تھا۔

ادھر اس کے دونوں شکار میں سے ایک پلٹ گیا۔ یہی موقع زمان کو ملا اور اس نے اپنے پہلے شکار پر فائر کر دیا۔ گولی اس کی گردن پر لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا پلٹتا ہوا ساتھی، جاتے ہوئے رکا اور ایک دم گھوما لیکن زمان کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔

زخمی ہونے کے باوجود اس نے خود پر قابو پا رکھا تھا۔ جب تک دوسرا شکار پلٹ کر اس پر گولی چلانے کی پوزیشن میں آتا، زمان کا پستول ایک بار پھر گرجا۔ دوسرے شکار کی پیشانی میں سرخ روشندان بن گیا۔

''وہاں مستول کی طرف بھی اس کا ساتھی موجود ہے۔'' رینالڈ پھر پاگلوں کی طرح چلایا تھا اور زمان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

اس نے اپنے شکار کیے ہوئے ایک فرنگی کی لاش کی جلدی سے تلاشی لے کر اس کا پستول اچک لیا اور اپنا وہیں پھینک دیا جس میں شاید اب ایک آدھ ہی گولی بچی تھی۔

اس کے بعد وہ رینالڈ کی آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے آگے بڑھا پھر ایک آڑ سے اس نے دوسری جانب جھانکا۔ عرشے کی ریلنگ کے پاس پڑے ایک بڑے سے ڈرم کے عقب میں اسے رینالڈ نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے ساتھ ایک مسلح فوجی بھی رائفل تھامے چوکس کھڑا تھا۔ وہ اوپری منزل اور نیچے موجود کیبن پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

اصل شکار کو سامنے پاتے ہی زمان کے وجود کا رواں رواں جوش سے مرتعش سا ہو گیا۔ اس نے پستول سے اس کا نشانہ لیا، یہی وہ وقت تھا کہ نہ جانے کس طرح رینالڈ کو خطرے کا احساس ہوا یا پھر اس کی چاروں طرف گردش کرتی نظروں نے اچانک زمان کا مشکوک ہیولا تاڑ لیا تھا، ادھر زمان نے اس پر فائر جھونکا ادھر رینالڈ ڈرم کے پیچھے ہو گیا۔ گولی نے اس کے قریب کھڑے ساتھی کو چاٹ لیا۔ وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا، زمان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے دوبارہ گولی داغنی چاہی تھی، اس بار اس نے ڈرم کا ہی نشانہ لیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی رینالڈ نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر گولی داغ دی، زمان کو اگر پیچھے ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو گولی نے اس کا کام تمام کر دینا تھا۔ کیونکہ رینالڈ کی چلائی ہوئی گولی، سنسناتی ہوئی اس کے چہرے کے قریب سے ہو کر نکلی تھی۔

زمان نہایت احتیاط کے ساتھ دوبارہ آڑ سے ابھرا تو دیکھا رینالڈ کا کہیں پتا نہ تھا۔ البتہ فوجی اس کی جانب لپکتے چلے آ رہے تھے۔

زمان کے محتاط اندازے کے مطابق رینالڈ کے دو تین ہی فوجی ساتھی بچے تھے۔

ان دونوں کو چھپتے چھپاتے اپنی جانب بڑھتے پا کر زمان نے ان سے بھڑنے کی غلطی کرنے کے بجائے اپنی جگہ بدلنا زیادہ بہتر خیال کیا اور پلٹا تو یکدم ٹھٹکا۔

نچلے کیبن کے اندر سے ایک جوش سے چلاتی ہوئی آواز ابھری۔

''خبردار، رینالڈ! اپنا پستول پھینک دو، ورنہ اسے گولی مار دوں گی۔'' یہ اریبہ کی جوشِ غیظ سے بھری آواز تھی۔

'تو کیا یہ بدبخت رینالڈ اندر چلا گیا تھا؟' زمان نے دھڑکتے دل سے سوچا اور اسے اریبہ کی جان خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ اس طرف کو بڑھا لیکن اسے اپنے پیچھے آنے والے ان دونوں فوجیوں کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ بہرحال وہ ان کی طرف سے بھی محتاط تھا۔

''چھوڑ دو اسے..... ورنہ میں کوئی پروا کیے بغیر گولی مار دوں گا۔'' زمان کو رینالڈ کی غضبناک اور دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

پل کے پل زمان ایک متوقع خطرناک صورتِ حال کو بھانپ کر لرز گیا۔

''یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو رینالڈ!'' اسی وقت زمان کی سنی ہوئی سماعتوں سے کیپٹن جیمس کی مرتعش سی آواز ٹکرائی۔ زمان کو یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی کہ اریبہ نے اندر کیسا خطرناک جوا کھیلا ہوگا۔

''یہ بے وقوفی نہیں ہے کیپٹن!'' رینالڈ کی زہریلی آواز ابھری۔ ''یہ بہت خطرناک دشمن ہے۔''

''لل..... لیکن میری بیوی ازابیلا کی جان خطرے

میں ہے، یونول.....!'' کیپٹن جیمس شدید صدمے اور تشویش تلے دیوانوں کی طرح چلایا۔ زمان تب تک کیبن کی عقبی دیوار کے پورٹ ہول کے قریب کھسک آیا تھا، ساتھ ہی اسے اپنے پیچھے شکاری کتوں کی طرح بڑھتے ہوئے ان دونوں فرنگیوں کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اگرچہ ابھی تک ان کی نظریں اس پر نہیں پڑی تھیں، تاہم انہیں زمان کی موجودگی کا یقین تھا، لہٰذا وہ گاہے بہ گاہے ایک محتاط نظر اپنے عقب میں بھی ڈال لیتا تھا، یوں زمان بیک وقت دہری پریشانی کا شکار تھا۔

دوسری تشویش اسے اندر اریبہ کی طرف سے تھی جس نے ایک اندھا جوا تو کھیل لیا تھا مگر رینالڈ کی مکروہ خباثت نے اس کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔

زمان نے پورٹ ہول کے بند شیشے سے اندر کا جائزہ لیا اور دھک سے رہ گیا۔

کیبن کے سامنے والے دروازے پر رینالڈ اپنے پستول کی نال کا رخ اریبہ کی جانب کیے ہوئے تھا اور اریبہ اس سے کوئی سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر کیپٹن جیمس کی نوبیاہتا بیوی ازابیلا کو اپنی رائفل کی زد پر لیے کھڑی تھی۔ جبکہ کیپٹن جیمس کے چہرے پر اپنی حسین و محبوب بیوی کو خطرے میں دیکھ کر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

رینالڈ کے خبیث چہرے پر مکروہ مسکراہٹ ہویدا تھی، اس کی آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی اور اس کے خونخوار تیوروں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ..... وہ اپنے افسر کی بیوی ازابیلا کی جان کی پروا کیے بغیر اریبہ پر گولی چلا سکتا ہے۔ خود ازابیلا کا حسین چہرہ موت کو سامنے دیکھ کر دہشت زدہ ہو رہا تھا۔ اریبہ بھی رینالڈ کی سنگدلانہ خباثت کو محسوس کرتے ہوئے پریشان اور تردد کا شکار نظر آتی تھی۔

زمان جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس قدر مشکل صورتِ حال سے دوچار تھی، وہ ازابیلا کو گولی نہیں مار سکتی تھی۔

''میں صرف پانچ تک گنوں گا۔'' اسی وقت رینالڈ کی دہاڑ سنائی دی۔ وہ اریبہ سے مخاطب ہو کر تہدیدی انداز میں کہہ رہا تھا۔

''اگر تم نے اسے چھوڑ کر خود کو میرے حوالے نہ کیا تو..... میں اس خوب صورت دلہن کی پروا کیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے فرنگی آفیسر رینالڈ نے گویا کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر ڈالا۔

''ایک.....''

زمان نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے پھر پلٹ کر اپنے تعاقب میں چھپتے چھپاتے آتے ہوئے ان دونوں فرنگیوں کی موجودگی کا خیال کیا، مگر وہ دونوں شاید کسی دوسری طرف بھٹک گئے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اس طرف سے خطرہ ٹل چکا تھا۔ وہ کسی وقت بھی موت کے فرشتے کی طرح اس پر نازل ہو سکتے تھے۔

''دو.....'' اندر اس مردود رینالڈ کی گنتی جاری تھی۔ زمان کا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔

''تین.....''

اس جاں توڑ ٹنگ ودو میں زمان کے زخمی شانے کا زخم بھی ہرا ہونے لگا تھا۔ درد و تکلیف اور بہت سا خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بھی اپنے اندر نقاہت اور کمزوری محسوس کرنے لگا تھا مگر ایک جذبے نے اسے ان تکالیف پر ابھی تک حاوی کر رکھا تھا۔

وہ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیبن کے عقب میں موجود ایک چھوٹے سے چبوترے جیسی اونچائی پر چڑھ چکا تھا جہاں سے کھلا روشندان نظر آ رہا تھا۔ مردود رینالڈ چار کی گنتی تک پہنچ چکا تھا۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اچانک کیپٹن جیمس تشویش اور جوش تلے غراتا ہوا رینالڈ کی طرف بڑھا۔ اسی وقت رینالڈ کے پستول نے شعلہ اگلا، ازابیلا چلائی۔

''جیمس.....''

جیمس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور وہ گر پڑا تھا۔ جیمس کے پاس شاید اس وقت کوئی ہتھیار نہ تھا اور نہ وہ خود آگے بڑھنے کے بجائے رینالڈ کو اسلحے کے زور پر اس خطرناک حرکت سے روکنے کی کوشش کرتا۔

''پانچ.....''

زمان نڈھال سا ہو رہا تھا۔

''ٹھہر جاؤ..... میں سرینڈر کر رہی ہوں۔'' اچانک اریبہ نے شکست خوردگی سے کہا اور رینالڈ کے بدہیئت ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔

وہ فتح کے نشے سے چُور تھا۔ اریبہ نے اپنی رائفل فرش پر ڈال دی تھی اور ازابیلا کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ چیختی ہوئی اپنے شوہر کی جانب لپکی جو فرش پر پڑا اپنی زخمی ٹانگ پکڑے درد سے کراہ رہا تھا۔

پل کے پل زمان کو احساس ہوا کہ اریبہ کی موت صرف ایک پلک جھپکنے کی دوری پر ہے۔ زمان بدقت تمام اپنا پستول والا ہاتھ روشندان تک لایا، اس کا پستول والا

ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا، گولی چلی۔ رینالڈ کو اس نے چیخ مار کر لڑکھڑاتے دیکھا۔ پستول ابھی اس کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں تھا، اس نے بے دریغ اریبہ پر فائر داغ دیا مگر اریبہ تب تک اتنے سے موقعے سے فائدہ اٹھا کر داہنی جانب چھلانگ لگا چکی تھی۔ گولی کیبن کی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ زمان کا ایک لمحے کو دل دھڑکا تھا مگر اریبہ کو صحیح سلامت دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ رینالڈ تب تک دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔

گولی شاید ابھی اس شیطان کے کسی نازک حصے پر نہیں لگی تھی۔ زمان سنبھلا، دوسرا فائر کرنا چاہا، لیکن تب تک رینالڈ دروازے سے باہر نکل چکا تھا، زمان تلملائے ہوئے انداز میں غرایا اور پلٹا۔

ادھر گولی کی آواز نے اس کے پیچھے آتے ان دونوں فرنگیوں کو محتاط کر دیا تھا، لہٰذا جیسے ہی زمان چبوترا نما مقام سے نیچے اترا وہ دونوں فرنگی فوجی اس کے سامنے پہنچ چکے تھے اور یہی ان کی بھیانک غلطی ثابت ہوئی، کیونکہ زمان پہلے ہی ان کی طرف سے غیر معمولی احتیاط برتے ہوئے تھا۔ اس نے ایک کو اپنے پستول کا نشانہ بنایا۔ وہ چیخ مار کے گرا۔ دوسرا فرنگی فوجی اس پر اپنی رائفل سونت چکا تھا، زمان نے دوسرا فائر کرنے کی بے وقوفی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے دائیں جانب چھلانگ لگائی۔ اسی وقت گولی چلی، کیبن کی دیوار چیخنے کی آواز سنائی دی۔

زمان ایک مختصر سی راہداری پر گرا۔ گرنے سے اس کا زخم کھل گیا، تکلیف واذیت کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس پر جنون طاری تھا، اس نے پروا نہ کی اور گھسٹتا ہوا دیوار کے پاس آیا اور اٹھا۔ اسے فوجی کی جھلک دکھائی دی، وہ اسی طرف رائفل سونتے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید زمان اس کی گولی سے زخمی ہوا ہے، مگر جب تک وہ سامنے آیا، زمان نے اپنے پستول سے اس پر گولی داغ دی۔ وہ ادھر ہی ڈھیر ہو گیا۔

زمان نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس طرف کو دوڑ لگائی جہاں کیبن کے ٹکاسی کے دروازے سے رینالڈ زخمی ہو کر بھاگا تھا۔

اندر اریبہ نے سنبھالا لیا اور اپنی رائفل اٹھا کر رینالڈ کے پیچھے دروازے کی طرف دوڑی۔ رینالڈ اسے کہیں دکھائی نہ دیا، وہ اسے تلاشتی ہوئی دوسری جانب نکل گئی۔

زمان کو اندازہ تھا کہ رینالڈ کس طرف کا رخ کر سکتا ہے۔ وہ اس طرف پہنچا تو رینالڈ کو اس نے عرشے کی ریلنگ کے قریب پایا۔ وہاں اس کی موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ وہ فرار ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ زمان نے اس کی طرف دوڑتے دوڑتے اپنا پستول سیدھا کر لیا، ٹریگر دبایا مگر ''ٹرچ'' کی خالی آواز ابھری، اس نے جھلا کر پستول ریلنگ پر چڑھتے رینالڈ پر دے مارا جو اس کے سر سے ٹکرایا۔ وہ چیخ مار کے دوبارہ ریلنگ سے عرشے میں آن گرا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر سمندر میں جا گرا مگر جب تک زمان اس کے قریب پہنچتا، اس نے اپنی جیب سے لگے میں لپٹی ہوئی کوئی شے موٹر بوٹ کی طرف اچھال دی۔ وہاں ایک فرنگی موجود تھا۔ وہ سر اٹھائے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ اجازت نامہ لے کر سی ہاک..... پر پہنچو اور فوراً جہاز روانہ کرو۔''

رینالڈ چلا کر اس سے بولا۔ وہ شے موٹر بوٹ کے اندر کہیں گری تھی۔ وہاں موجود فوجی نے وقت کی نزاکت کو فوراً محسوس کر لیا تھا، اسی لیے بغیر وقت ضائع کیے موٹر بوٹ اسٹارٹ کرنے لگا۔ ادھر زمان، رینالڈ کے سر پر پہنچ چکا تھا اور ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر رسید کر دیا، وہ کراہا..... ریلنگ سے ٹکرایا مگر پھر اٹھا اور لات زمان کے پیٹ پر رسید کر ڈالی۔ زمان پہلے ہی تکلیف سے دُہرا ہو رہا تھا، پیٹ پکڑے گرا، رینالڈ وحشیانہ غراہٹ سے اس پر پل پڑا۔ اس کا ایک ہاتھ گولی لگنے سے زخمی تھا، مگر زمان کے مقابلے میں اس کی حالت پھر بھی کچھ بہتر تھی۔

اسی وقت موٹر بوٹ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ رینالڈ نے سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے پر تولے اور دوبارہ ریلنگ پر چڑھا۔ زمان نے اس کی ٹانگ کھینچنا چاہی مگر گرفت کمزور تھی۔

ٹھیک اسی وقت جب رینالڈ فرار کی نیت سے سمندر میں چھلانگ لگانے کی کوشش میں تھا، ایک گولی چلی۔

رینالڈ کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی۔ زمان نے اسے بالکل اپنے قریب گرتے دیکھا، اس کا چہرہ سامنے ہو گیا۔ رینالڈ کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں، مگر ان میں زندگی کی چمک معدوم ہو چکی تھی۔

زمان کا اب اپنا حوصلہ دم توڑتا محسوس ہونے لگا تھا، تاہم اس نے ڈوبتی آنکھوں سے ایک طرف رائفل سنبھالے کھڑی اریبہ کو دیکھ لیا تھا۔ رینالڈ اسی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔

(جاری ہے)

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

عالی دماغ

محمد طاہر عمیر

کچھ لوگ اپنی ذات کے مضبوط قلعے میں اس طرح قید ہوتے ہیں کہ نہ انہیں حبس اور گھٹن کا احساس ستاتا ہے اور نہ ہی تازہ ہوا کی لذت سے وہ آشنا ہو پاتے ہیں۔ وہ بھی بے بنیاد یقین اور سوچوں کی اتنی بلندی پر زندہ تھا جہاں کوئی عام انسان سانس بھی نہیں لے سکتا مگر... وہ زندہ بھی تھا اور خوش بھی... کیونکہ وہ بہت عالی دماغ تھا۔

اپنی تنہائیوں میں سایوں کے ہجوم میں زندگی گزارنے والے ایک عجیب انسان کا قصہ

آر اے انٹر پرائزز کے زیر زمین پارکنگ لاٹ کے ایک نیم اندھیرے گوشے میں موجود بی ایم ڈبلیو کے پاس ایک نوجوان کھڑا تھا..... جو اپنے ہاتھ میں موجود بریف کیس زمین پر رکھنے کے بعد اب پتلون کی جیب سے گاڑی کی چابیاں نکال رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اس وقت بظاہر اس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا لیکن جیسے ہی اس نے اپنی گاڑی کی چابی نکال کر گاڑی کے لاک میں لگائی، عین اسی وقت وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کر گاڑی کے

دروازے سے جا ٹکرایا۔ ایک بے آواز گولی اس کے پہلو میں گھسی تھی جہاں سے خون ابلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ گاڑی سے ٹکرا کر پیچھے کی سمت مڑا تو ایک دوسری گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور لڑھک کر زمین پر جا گرا۔ چند لمحوں تک تکلیف کی شدت سے اس کی ٹانگیں کانپتی نظر آئیں..... پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

☆☆☆

ایک عجیب طرح کا خلا تھا جس میں میرا جسم یوں تیر رہا تھا جیسے ہلکی ہوا میں کسی چڑیا کا ننھا سا پنکھ..... ایک بے وزنی کی سی کیفیت میں جیسے خود پر کوئی کنٹرول نہ ہو۔ چاروں طرف چھائے ہوئے سیاہ اندھیرے میں دور جیسے سیکڑوں ستارے ننھے ننھے جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے لیکن وہ سب اتنے دور تھے جیسے زمین سے آسمان پر تارے نظر آتے ہیں۔ میری سماعتوں میں کسی بچے کی آواز گونج رہی تھی جو دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا۔

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار..... ہاؤ آئی ونڈر واٹ یو آر۔

جانے کتنی دیر سے یہ کیفیت اسی طرح قائم تھی پھر اچانک ہی میرے کانوں میں میری ہی آواز گونجی۔

''کیا تم کنٹرول کھو رہے ہو؟''

تبھی سیاہ خلا کے افق پر ایک تیز سفید روشنی چمکی جس نے پھیل کر ساری سیاہی کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ میری آنکھیں کھل چکی تھیں اور اب اوپر موجود سفید چھت کو تک رہی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے تیزی سے گھومتے ہوئے کسی چکر سے نکل کر اچانک مجھے میرے پیروں پر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ میں ساکت تھا لیکن دماغ گھوم رہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو تھاما اور آہستہ آہستہ میرے سر کا چکرانا ختم ہوتا چلا گیا۔ مگر بچے کی آواز اب بھی گونج رہی تھی لیکن اس بار اس کا ماخذ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ میرے سائڈ ٹیبل پر پڑا ایک بچے کے کھلونے جیسا ٹیبل کلاک تھا جس پر صبح کے دس بج رہے تھے اور الارم کی صورت میں ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے اوپر موجود بٹن کو دبا کر اس آواز کو خاموش کیا۔

''کیا میں کنٹرول کھو رہا ہوں.....؟'' میں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر خود ہی سختی سے جواب دیا۔

''نہیں.....''

کمرے کی کھڑکی سے دھوپ نکل کر اندر پھیل رہی تھی میں نے اٹھ کر پردے کھڑکیوں پر گرائے اور اس سے پہلے ایک نظر ان کھڑکیوں کے پار دیکھا۔ جہاں میں تھا، یہ دوسری منزل تھی جس کے پار نیچے ایک ٹریفک میں اٹی ہوئی سڑک تھی جس کے دوسری طرف بازار تھا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور سب سے پہلے کچن میں آ کر ایک خاص جگہ پر رکھی اپنی دواؤں میں سے چند گولیاں اور کیپسول نکال کر نگلے اور پھر بلیک کافی بنا کر پی۔ اگلے ایک گھنٹے میں، میں شاور لے کر اور نیا لباس پہن کر اپنے کلینک والے حصے میں آ گیا۔ دراصل یہ کوئی گھریلو فلیٹ نہیں تھا بلکہ میرا کلینک تھا جس کے ایک حصے میں، میں نے رہائشی بندوبست کیا ہوا تھا۔ میں نے کلینک کا باہری دروازہ کھول دیا اور اس کے اوپر موجود سائن کو کلوزڈ سے اوپن کر دیا اور واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں میرے سامنے ایک شیشے کی ٹاپ والی میز کے دوسری جانب دو کرسیاں تھیں اور سائڈ پر ایک صوفہ اور ایک کاؤچ موجود تھا۔ میری زندگی کا ایک نیا دن میرا منتظر تھا۔

''سائیکاٹرسٹ کوئی نیورو سرجن نہیں ہوتا جو آپ کے دماغ کی سرجری کرے اور کسی ٹیومر کی طرح آپ کے دماغ سے چمٹی ساری الجھنیں نکال کر باہر پھینک دے..... آپ کو اپنے اندر کی ساری الجھنیں باہر نکال کر میرے سامنے رکھنی ہوں گی تاکہ میں انہیں سلجھا کر آپ کو واپس کروں..... اور یہی علاج کا بہترین طریقہ ہوتا ہے..... ورنہ دوسری صورت میں ہم ہپناسس کا استعمال کر سکتے ہیں۔'' میں نے میز کے دوسری طرف پریشان حال بیٹھے آج کے اپنے پہلے مریض کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی ساخت، آنکھوں کی پریشانی، ہاتھوں کی جنبش اور پیروں کی مسلسل حرکت اس کے بے پناہ تذبذب کو ظاہر کر رہی تھیں۔

''آپ کی خاموشی سے لگتا ہے کہ آپ زبردستی میرے پاس لائے گئے ہیں بلکہ آپ تو اکیلے آئے ہیں..... یا پھر دوسری صورت میں آپ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ آپ کو مجھے سب کچھ بتانا چاہیے یا نہیں..... تو مسٹر ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ جب تک آپ ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر لیں، تب تک ہم چائے پی لیتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے ساتھ تعارف بھی ہو جائے گا۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں اعتماد کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اٹھ کر الیکٹرک کیتلی سے چائے کپ میں انڈیلنے لگا۔

چائے کا پہلا گھونٹ بھرنے کے بعد وہ پہلی بار مسکرایا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ختم ہو چکی تھی اور

آنکھوں میں وہ چمک تھی جو ایک فیصلہ کر گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے پھر جیسے ہی مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنے والا ہے، میں نے آہستگی سے دراز میں رکھا وائس ریکارڈر آن کر دیا۔ وہ بولا۔

''میرا مسئلہ یہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کہ مجھے آپ کو بتانا چاہیے یا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں ابھی تک اس فیصلے پر نہیں پہنچا کہ مسئلہ ہے کس کے ساتھ..... میرے ساتھ یا میری بیوی کے ساتھ..... دراصل مسئلہ میری بیوی کے ساتھ ہی ہے لیکن اب مجھے لگنے لگا ہے کہ اس کی وجہ سے شاید میں بھی پاگل ہو رہا ہوں۔''

میں نے خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیا۔

''میرا نام جبران ہے۔ سارا دن جب میں دفتر میں سر کھپا کے گھر جاتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کا حال بُرا ہے۔ نہ صفائی کی گئی ہے، نہ بے ترتیب سامان کو ٹھیک کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ کھانا مانگوں تو پتا چلتا ہے کہ کھانا نہیں بنایا..... نہ گھر کی فکر ہے نہ گھر والے کی.....''

''ایسا کب سے ہے؟'' میں نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

''تقریباً ایک سال سے..... اس سے پہلے تو سب ٹھیک تھا..... ہماری محبت کی شادی ہے اور محبت بھی ایسی جس میں کوئی فلمی انداز نہیں۔ ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کیا اور ساتھ ہی گھر والوں کو بتا دیا۔ دونوں خاندان آپس میں ملے اور ہماری شادی طے کر دی۔ بعد میں مجھے نوکری کی وجہ سے اس شہر میں ماہ نور کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ بہت کیئر کرنے والی لڑکی ہے بلکہ میری امی تو اکثر اس سے کہا کرتی تھیں کہ ماہ نور! تم دوسروں کی خوشی حاصل کرنے کے لیے بیمار ہو جانے والوں میں سے ہو، ایسا مت کیا کرو لیکن اس کی یہ بیماری سی عادت کبھی نہیں بدلتی..... اور یہی اصل وجہ ہے سارے مسئلے کی۔''

''کتنا عرصہ ہوا شادی کو؟''

''آٹھ سال.....''

''کوئی اولاد.....؟''

''اس سوال کا جواب ہی ماہ نور اور میرا پاگل پن ہے۔'' اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا کہ ماہ نور بہت ہی خیال رکھنے والے لڑکی ہے لیکن پچھلے ایک سال سے میرے گھر کی بے ترتیبی اور مجھے بالکل اگنور کر دینے والی اس کیفیت میں سب سے بڑا ہاتھ ہماری اولاد کا ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ''ریان'' کو اتنی توجہ دینے لگی ہے کہ اب اس کے پاس نہ گھر کی دیکھ بھال کا وقت ہوتا ہے اور نہ ہی میری۔''

''اوہ، تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کے بیٹے کی وجہ سے آپ کی بیوی آپ کو اور گھر کو وقت نہیں دے پا رہی؟ اس کا تو بڑا آسان سا حل ہے..... یا تو بچے کے لیے آیا رکھ لی جائے یا گھر کے کاموں کے لیے کوئی ملازمہ۔'' میں نے اپنی طرف سے اس کا مسئلہ چٹکی میں حل کر دیا۔

''میرا مسئلہ وہ نہیں ہے جس کا حل آپ بتا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب..... مسئلہ تو ابھی میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں۔''

اس نے سادہ سے الفاظ میں کہا تو میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھنے لگا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔''

''کیا مطلب..... تو پھر ریان کون ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ریان میری بیوی کا ایک خیالی بچہ ہے۔''

میں نے اس کے فقرے کی بازگشت کئی بار اپنے اندر محسوس کی۔ اس کا جملہ کہ ''ریان میری بیوی کا ایک خیالی بچہ ہے۔'' میں نے اپنے اندر بالکل ایسے ہی محسوس کیا جیسے بیدار ہونے سے پہلے والے اپنے خواب میں، میں نے خود کو محسوس کیا تھا..... ایک بے وزنی کی سی کیفیت میں مسلسل تیرتے ہوئے۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اس کی باتوں پر توجہ دینے لگا۔

''سات سال سے ہم اولاد کے منتظر تھے۔ ایلوپیتھی سے ہومیوپیتھی، یونانی اور دیسی بھی جگہ سے علاج کروایا حالانکہ میڈیکل رپورٹس کے مطابق ہم دونوں میں سے کسی میں بھی بانجھ پن نہیں..... اور صرف علاج نہیں، پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ہم ہر اس جاہل کے پاس بھی گئے جس نے ہم سے جھوٹ موٹ بھی کہا کہ وہ ہمیں خوشخبری دے سکتا ہے..... مزاروں پر دھاگے باندھے، چادریں چڑھائیں..... ٹونے ٹوٹکے کیے، تعویذ کے کاغذوں پر یقین کیا۔ دعائیں کروائیں لیکن اولاد نصیب نہ ہوئی۔ بظاہر ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہر طرح سے خوش تھے لیکن اندر ہی اندر ہم اپنے آپ کو ادھورا محسوس کر رہے تھے۔ یہ ادھورا پن مجھ میں تو شاید کہیں کم تھا لیکن ماہ نور کے اندر کا یہ ادھورا پن اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ ہماری شادی کی آٹھویں سالگرہ تھی۔ میں نے مذاق ہی مذاق میں اسے اس بار تحفے میں ایک ''گڈا'' دیا۔ یہ پلاسٹک اور کاٹن کے ساتھ ملا جلا تقریباً ایک ماہ کے بچے جیسا کھلونا تھا اور یہی تحفہ ماہ نور کے پاگل پن کا باعث بنا۔ اس تحفے کو پا کر وہ بہت خوش تھی لیکن اس کی

خوشی جب کئی دن رہی اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، تب مجھے شک ہوا۔ میں نے کئی بار اسے گھر میں اسی گڈے کو تھامے دیکھا ..... اور پھر ایک رات میری آنکھ کھلی تو وہ میرے ساتھ بستر پر نہیں تھی۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ صحن میں اسی گڈے کے ساتھ یوں باتیں کرتی نظر آئی جیسے کوئی سچ مچ کسی بچے کو پچکار رہا ہو۔ تب میں پہلی بار ڈرا۔ اگلے کچھ دنوں تک میں نے ماہ نور اور اس گڈے کے درمیان ایک ایسا تعلق بنتے دیکھا کہ مجھے ایک فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ ماہ نور کے سونے کے بعد میں نے وہ گڈا چھپا دیا..... لیکن اگلی صبح ایک قیامت کی صبح تھی۔ میں نے اپنے سلیقے سے سجے ہوئے گھر کو کسی بھوچال کی زد میں آئے دیکھا۔ ہر شے الٹی پلٹی تھی۔ برتن، پودوں کے گملے..... کچھ شیشے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ کرسیاں اوندھی، سامان بکھرا پڑا تھا اور ماہ نور اپنے ابتر حلیے کے ساتھ اسی گڈے کو بانہوں میں تھامے سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ گھر کے سامان کو کیا ہوا۔ اس نے بڑے سپاٹ انداز میں جواب دیا کہ ''ریان'' کھو گیا تھا۔ اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ خیر میں دفتر چلا گیا اور جب واپس آیا تو گھر کا سامان ویسے ہی بکھرا پڑا تھا۔ اس نے کسی شے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے پانی ملے گا؟''

میں اس کی کہانی میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کے آخری سوال کو کہانی کا حصہ سمجھ کے چپ بیٹھا رہا۔ اس نے بھی شاید اندازہ لگا لیا کہ اس وقت پانی نہیں ملے گا اس لیے ایک توقف کے بعد پھر سے شروع ہو گیا.....

''دن گزرتے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ کیفیت ختم ہو جائے گی لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی اس گڈے کے ساتھ وابستگی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ تب ایک دن میں نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح تم بیمار ہو جاؤ گی یعنی میں نے نرم الفاظ میں اسے سمجھایا لیکن اس نے میری ساری باتیں یوں سنیں جیسے میں اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ مجھے غصہ آ گیا اور پھر میں نے اپنی آواز بلند کی ..... ہماری تو، تو، میں، میں ہوئی اور اس دوران میں نے غصے میں وہ پلاسٹک کا گڈا اس سے چھین کر فرش پر پھینک دیا اور تب ..... تب جانتے ہیں کیا ہوا..... وہ کسی ایسی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی جس کے بچے کو کسی شکاری نے مارنے کی جرأت کی ہو..... اس نے مجھے نیچے گرا کر میرے چہرے پر اپنے ناخن پیوست کر دیے اور زور زور سے چلاتی رہی ''میرے بچے کو کیوں مارا میرے بچے کو کیوں مارا۔'' میں نے بمشکل اسے قابو میں کیا اور اس کا ہیجان ختم ہونے تک اسے چھوڑا نہیں..... مگر جیسے ہی میں نے اسے چھوڑا اس نے لپک کر گڈے کو اٹھایا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس بند کمرے سے وہ تین دن بعد باہر نکلی، بنا کچھ کھائے پیے تین دن..... اور جب وہ نکلی تو اس نے بس یہی کہا ریان کو بھوک لگی ہے مجھے اسے کھانا کھلانا ہے..... کچھ دن اور گزر گئے اور پھر میں نے ایک اور فیصلہ کیا..... میں نے ایک چائلڈ سینٹر سے ایک بچہ ایڈاپٹ کر لیا اور اسے گھر لے آیا۔ میں نے ماہ نور سے کہا کہ اب سے یہ ہمارا بچہ ہے..... لیکن جواب میں وہ بولی۔ ''جب ہمارے پاس ریان ہے تو ہمیں کسی دوسرے بچے کی ضرورت نہیں۔'' اس دن ہماری دوسری بار لڑائی ہوئی۔ میں نے اسے باور کرانا چاہا کہ اس پلاسٹک کے بے جان کھلونے کے بجائے گوشت پوست کے زندہ بچے کو دیکھو، اسے کھانا کھلاؤ، اسے پیار کرو مگر اس کی زبان اور ذہن سے ریان ہی چپکا رہا..... اور جب میں نے اس گڈے کو اس سے چھیننے کی کوشش کی، تب اس نے وہی کیا جو پہلے کیا تھا۔ اس نے میرا منہ نوچ لیا..... اس نے اس زندہ بچے کو اپنانے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے مجھے مجبور ہو کر اس بچے کو واپس چائلڈ سینٹر بھیجنا پڑا۔ تب سے اب تک میں ماہ نور کو اس کے بچگانہ پن سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا ہوں ..... اسے ڈاکٹروں کے پاس بھی لے کر گیا..... اور اسی طرح جیسے میں اس کے ساتھ اولاد کی خواہش میں ہر جگہ گیا جہاں مجھے ذرا سی بھی امید تھی۔ اب میں ماہ نور کے لیے ہر اس نئی جگہ جاتا ہوں جہاں سے کوئی روشنی کی ننھی سی کرن بھی نظر آتی ہے۔ ..... ماہ نور میری زندگی سے یوں نکلتی جا رہی ہے جیسے مٹھی سے ریت..... میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں، اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔'' اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''یہ تو واقعی بہت عجیب و غریب صورتِ حال ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے اپنی بیگم کو یہاں لائیے۔''

''جی، میں جلد ہی اسے یہاں لاؤں گا لیکن آپ اس کا علاج کریں گے کیسے؟''

''یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں..... میں پہلے مریض سے خود مل کر اس کی کنڈیشن دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے بعد

Digitized by Google

علاج کی نوعیت پر فیصلہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! میں انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اسے لے کر یہاں حاضر ہو جاؤں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ میں نے دراز میں رکھا ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا..... اور خود کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ اس کی کہانی اسی کی آواز میں میرے اندر بار بار گونج رہی تھی لیکن ایک بہت عجیب بات تھی کہ میرے ذہن کے پردے پر ایک ایسے وجود کا عکس چھا رہا تھا جس کا اس کہانی میں بالکل ہی مختصر کردار تھا۔ وہ بچہ جو چائلڈ سینٹر سے لایا گیا تھا۔ میرا ذہن بار بار اس بچے کا عکس بنانے میں مصروف تھا۔

"کیا میں کنٹرول کھو رہا ہوں؟" میں نے خود سے کہا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کچن میں ایک خاص جگہ پر رکھی ڈبیا سے چند گولیاں اور کیپسول نکال کر نگل لیے اور واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن پُرسکون ہو گیا۔

جبران کے جانے کے بعد شام تک کوئی دوسرا مریض نہیں آیا۔ میں تب تک آڈیو ریکارڈنگ میں محفوظ اس کی کہانی کو کئی بار سن چکا تھا اور کاغذ پر اس کے متعلق نوٹس بناتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ شام کا وقت ہو گیا۔ میں نے کلینک کا دروازہ بند کیا۔ اپنے لیے کھانا بنا کر کھایا اور جس وقت میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا، اس وقت سائڈ ٹیبل پر رکھے بچے کے کھلونے جیسے ٹیبل کلاک پر نو بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ میں بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کی رات نیند نہیں آئے گی لیکن ٹھیک پانچ منٹ بعد ہی ٹیبل کلاک پر جیسے ہی نو بجے، کمرے میں ایک بچے کی آواز گونجنے لگی۔

"ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔ ہاؤ آئی ونڈر وہاٹ یو آر۔"

اور میں نیند کی وادی میں یوں ڈوبتا چلا گیا جیسے بیچ سمندر کوئی گرداب کسی چھوٹی سی کشتی کو نگلتے ہوئے اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

☆☆☆

یہ اگلی صبح گیارہ بجے کا واقعہ ہے، جب میرے آفس والے حصے میں ایک خاتون آئیں۔ خوش شکل تھی۔ چہرہ اور جسم بھرا بھرا سا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا جس نے سیاہ نیکر اور سرخ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم سے چہرے پر ایک روکی روئی سی کیفیت تھی۔ اس بچے کے چہرے کو دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایسا لگا جیسے میں نے اسے کہیں پہلے دیکھا ہو اور اگلے ہی پل ایک سنسنی سی میں نے اپنے اندر دوڑتی محسوس کی اور مجھے پتا چل گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ میں نے اس بچے کو کہیں اور نہیں بلکہ اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اپنے آپ میں۔ ہاں بالکل..... یہ بچہ بالکل میرے بچپن جیسا تھا۔ اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کے بالوں کا اسٹائل، اس کا لباس..... میرے پاس کہیں اب بھی وہ البم موجود تھا جس میں میرے بچپن کی تصاویر تھیں۔ یہ ہو بہو ویسا ہی تھا مگر میں نے اپنے تاثرات کو تیزی سے سنبھالا اور اس بچے کی ماں پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میں نے کل کے اخبار میں آپ کا اشتہار پڑھا۔ شکر ہے کوئی تو اچھا سائیکاٹرسٹ اس شہر میں بھی آیا۔ یقین مانیں ڈاکٹر صاحب، اس شہر میں بسنے والے آدھے سے زیادہ لوگوں کو سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" وہ بیٹھتے ہی بولی۔

"فی الحال تو پانچ دنوں میں آپ دوسری شخصیت ہیں جو یہاں تشریف لائی ہیں۔" میں نے اپنے اندر کے اس ارتعاش کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا جو اس بچے کو دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تھا۔

"اور بھی آئیں گے۔ بہت سارے آئیں گے لیکن شاید ابھی زیادہ لوگوں کو علم نہیں ہوا ہے۔" اس نے کہا۔

"شاید..... تو بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پروفیشنل انداز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! دراصل مجھے ٹھیک سے علم نہیں تھا کہ یہاں اپائنٹمنٹ کیسے حاصل کیا جائے، میں تو صرف وقت لینے آئی تھی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ فرصت سے بیٹھے ہیں تو میں مریض کو ساتھ لاتی۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"اوہ۔ تو اس کا مطلب مریض کوئی اور ہے۔ آپ کا کوئی عزیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی، میرے شوہر ہیں۔ کچھ عرصے سے ذہنی طور پر پرابلم کا شکار ہیں۔"

"اوکے۔ میں نے باہر دروازے پر نائم ٹیبل لگا رکھا ہے۔ ان اوقات میں آپ جب دل چاہے انہیں لے کر آ سکتی ہیں۔"

"جی، میں آج شام کو ہی انہیں لے کر آ جاؤں گی۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے ہمارا گھر لیکن اب اگر آ ہی گئی ہوں تو سوچتی ہوں کہ تھوڑا سا معاملہ میں ابھی بتا دوں کیونکہ ان کے ساتھ بھی آ کر بتانا تو مجھے خود ہی پڑے گا۔"

"ابھی اس وقت یہاں کوئی اور مریض انتظار میں

نہیں ہے۔ تو میں یقیناً آپ کا مسئلہ سننے کو تیار ہوں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک توقف کے بعد اچانک اس نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے دیکھ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب.....؟"

میں نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اس کا نام ریان ہے..... لیکن..... میرے شوہر کو لگتا ہے کہ یہ گوشت پوست کا زندہ بچہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بے جان گڈا ہے۔"

میں بری طرح چونک گیا۔ "کک..... کیا فرمایا آپ نے، ہم..... میرا مطلب ہے، دوبارہ کہیے۔"

خاتون نے وہی الفاظ دہرا دیے جو اس نے پہلے کہے تھے۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس بچے کے قریب آیا اور اسے باقاعدہ چھو کر دیکھا۔ اس کی نم آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سچ مچ کا ایک زندہ انسانی بچہ ہی تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے بدن کی گرمائش اور اس میں دوڑتی زندگی کو محسوس کیا اور واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ میری یہ حرکت بہت عجیب تھی لیکن اس خاتون نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

"معاف کیجیے گا....." میں نے کہنا شروع کیا۔

"آپ..... آپ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ آپ کے شوہر کو کب سے ایسا لگ رہا ہے اور کیوں.....؟"

"جی، میں، ہی بتانے والی تھی۔" اس نے کہا۔ "میرا نام ماہ نور ہے..... اور میرے شوہر کا نام جبران ہے۔"

اس کی یہ بات میرے اس اندازے کی تصدیق تھی جو میں نے ابھی ابھی لگایا تھا۔ یعنی کل جو جبران نامی آدمی اپنی بیوی ماہ نور اور اس کے بچے کے متعلق مجھے جو کچھ بتا کر گیا تھا، یہ وہی ماہ نور تھی..... لیکن اگر یہ وہی تھی تو پھر یہ بچہ کون تھا..... اور وہ خود کے بجائے اپنے شوہر کو مریض کیوں بتا رہی تھی؟ میں نے ان سوالوں کو کاغذ پر لکھا لیکن اپنی توجہ ماہ نور کی آواز پر ہی مرکوز رکھی جو کہہ رہی تھی۔

"ہماری محبت کی شادی ہے اور محبت بھی ایسی جس میں کوئی فلمی انداز نہیں..... ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کیا اور ساتھ ہی گھر والوں کو بتا دیا۔ دونوں خاندان آپس میں ملے اور ہماری شادی طے کر دی۔ بعد میں جبران کی نوکری کی وجہ سے ہم جبران کے والدین کے گھر کو چھوڑ کر اس شہر میں شفٹ ہو گئے۔ جبران بہت کیئر کرنے والے انسان ہیں بلکہ میں تو اکثر ان سے کہا کرتی تھی کہ جبران تم تو دوسروں کی خوشی حاصل کرنے کے لیے بیمار ہو جاتے ہو۔ ایسا مت کیا کرو، لیکن ان کی یہ بیماری سی عادت کبھی نہیں بدلتی..... اور یہی اصل وجہ ہے سارے مسئلے کی۔"

اُف..... حیرت انگیز..... یہ تو وہی جملے دہرا رہی ہے جو جبران نے دہرائے تھے۔ میری حیرانی ایک اضطراب میں ڈھلتی جا رہی تھی۔

"دراصل شادی کے بعد سات سال سے ہم اولاد کے منتظر رہے..... لیکن ہمیں اولاد جیسی نعمت نہ مل سکی۔ کئی جگہ سے علاج کروایا حالانکہ میڈیکل رپورٹس کے مطابق ہم دونوں میں سے کسی میں بھی بانجھ پن نہیں..... اور صرف علاج نہیں، پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ہم ہر اس جاہل کے پاس بھی گئے جس نے ہم سے جھوٹ موٹ بھی کہا کہ وہ ہمیں خوشخبری دے سکتا ہے۔ مزاروں پر دھاگے باندھے، چادریں چڑھائیں..... ٹونے ٹوٹکے کیے، تعویذ کے کاغذوں پر یقین کیا، ڈھائیں کروائیں لیکن اولاد نصیب نہ ہوئی۔ اس دوران بظاہر ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہر طرح سے خوش تھے لیکن اندر ہی اندر ہم اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتے تھے۔ یہ ادھورا پن مجھ میں تو شاید کہیں کم تھا لیکن جبران کے اندر کا یہ ادھورا پن انہیں دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ ہماری شادی کی آٹھویں سالگرہ تھی۔ انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سے گفٹ کیا لیکن میں نے مذاق ہی مذاق میں اسے تحفے میں ایک "گڈا" دیا..... یہ پلاسٹک اور کاٹن کے ساتھ ملا جلا تقریباً ایک ماہ کے بچے جیسا کھلونا تھا۔ اور یہی تحفہ جبران کے پاگل پن کا باعث بنا۔ اس تحفے کو دیکھ کر اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو میں نے مذاق ہی مذاق میں کہا کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔۔۔ میری بات سن کر اس نے دلچسپی سے اس گڈے کو دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا..... ہاں یہ ہمارا بیٹا ہے اور ہم اس کا نام بھی رکھیں گے۔ اس کے بعد ہم نے اس کا نام بھی رکھا، ریان۔ بعد میں بات آئی گئی ہو گئی۔ میں سمجھی کہ یہ ایک مذاق تھا جو ختم ہو گیا لیکن نہیں..... یہ محض مذاق نہیں تھا۔ یہ کوئی ایسی بات تھی جس نے جبران کے دماغ میں گھر کر لیا۔ جبران اس گڈے کو بالکل بچے کی طرح تھامے اس سے باتیں کرتا نظر آیا اور رات کو اس نے اسے اپنے ساتھ سلایا اور پھر اگلے دن جب وہ دفتر جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے باقاعدہ کہا کہ میں ریان کا خیال رکھوں۔ میں نے اس کی بات اگنور کر دی مگر شام کو آتے ہی اس نے میرا حال چال پوچھنے کے بجائے "ریان" کے بارے میں پوچھا تو

Digitized by Google

میں حیران ہوئی اور پھر کھانے کے دوران میں بھی وہ اسے گود میں لیے بیٹھا رہا اور مجھ سے پوچھتا رہا کہ سارا دن ''ریان'' نے کیسے گزارا۔ پہلے میں اس کے جھوٹ موٹ جواب دیتی رہی لیکن پھر اکتا کر میں نے جواب دینے بند کردیے اور پھر اگلے چند دنوں میں، میں نے جبران اور اس گڈے کے درمیان ایک ایسا تعلق پنپتے دیکھا جس نے مجھے خوف میں مبتلا کردیا۔ وہ گھر میں ہر وقت ''ریان'' نام کے اس گڈے کے ساتھ یوں رہتا جیسے وہ سچ مچ کا بچہ ہو اور دفتر سے بار بار فون کر کے اس کے بارے میں پوچھتا۔ ایک رات میری آنکھ کھلی تو وہ میرے ساتھ بستر پر نہیں تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلی تو وہ صحن میں اسی گڈے کے ساتھ یوں باتیں کرتا نظر آیا جیسے کوئی سچ مچ کسی بچے کو پچکار رہا ہو۔ میں نے پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ بولا۔ دیکھو، تمہیں تو اپنے بچے کی پروا ہی نہیں ہے۔ یہ کب سے رو رہا تھا۔ میں اسے باہر لے آیا۔ اب یہ سو گیا ہے۔ میں خوفزدہ ہوگئی۔ اگلے دن مجھے کچھ اور نہیں سوجھا تو میں نے اس گڈے کو کپڑوں کے ایک صندوق میں چھپا دیا۔ شام کو جبران آیا۔ اس نے ریان کا پوچھا تو میں نے کہا وہ سو رہا ہے۔ جبران نے کھانا کھایا اور کمرے میں چلا گیا لیکن اگلی صبح ایک قیامت کی صبح تھی۔

میں نے اپنے سلیقے سے سجے ہوئے گھر کو کسی بھونچال کی زد میں آئے دیکھا۔ ہر شے الٹی پلٹی تھی، بکھرے ہوئے برتن بوتلوں کے گملے، کچھ شیشے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ کرسیاں اوندھی، سامان بکھرا پڑا تھا اور جبران اپنے ابتر حلیے کے ساتھ اسی گڈے کو بانہوں میں تھامے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سپاٹ انداز میں کہا کہ ''ریان'' کھو گیا تھا لیکن اس نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ دفتر جانے سے پہلے اس نے مجھے تاکید کی کہ میں ریان کا خیال رکھوں۔ کہیں یہ دوبارہ نہ کھو جائے۔ اس کے ساتھ اس نے سرزنش بھی کی کہ میں اپنے بیٹے کا خیال نہیں رکھتی۔ بہرحال وہ دفتر چلا گیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دفتر پہنچتے ہی اس نے مجھے کال کی۔ ایک گلاس پانی ملے گا؟''

میں اس کی کہانی میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کے آخری سوال کو کہانی کا حصہ سمجھ کے چپ بیٹھا رہا۔ اس نے بھی شاید اندازہ لگا لیا کہ اس وقت پانی نہیں ملے گا اس لیے ایک توقف کے بعد وہ پھر سے شروع ہوگئی۔

''اس نے فون پر بھی ریان کے متعلق ہی پوچھا کہ کیا وہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد میں نے فوراً ان کے گھر فون کیا لیکن پتا چلا کہ ان کے امی اور ابا تو عمرے پر چلے گئے ہیں۔ میں نے اپنے گھر اپنے ابا کو فون کیا لیکن رابطہ نہ ہوسکا۔ پھر میں نے سوچا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ کیفیت ختم ہوجائے گی لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی اس گڈے کے ساتھ وابستگی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ تب ایک دن میں نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اس طرح تم بیمار ہوجاؤ گے۔ تم اپنے آپ کو اس دھوکے سے باہر نکالو لیکن اس نے میری ساری باتیں یوں سنیں جیسے میں اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ مجھے غصہ آگیا اور پھر میں نے اپنی آواز بلند کی..... ہماری تو تو میں میں ہوئی اور اس دوران میں نے غصے میں وہ پلاسٹک کا گڈا اس سے چھین کر فرش پر پھینک دیا اور تب..... تب جانتے ہیں کیا ہوا..... وہ کسی ایسے شیر کی طرح مجھ پر جھپٹا جس کے بچے کو کسی شکاری نے مارنے کی جرأت کی ہو..... اس نے مجھے تھپڑ مارے اور جب میں گری تو ٹھوکریں لگائیں اور اس دوران زور زور سے چلاتا رہا کہ۔ میرے بچے کو کیوں مارا میرے بچے کو کیوں مارا۔ میں بے سدھ زمین پر پڑی روتی رہی۔ اس نے لپک کر گڈے کو اٹھایا اور کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کردیا۔

''میں نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ اپنے ابا کو کال کی۔ وہ رات گئے پہنچے، تب بھی جبران اس گڈے کو لے کر کمرے میں بند تھا۔ ابا نے دروازہ بجایا لیکن اس نے اندر سے کہا کہ آپ اپنی بیٹی کو لے جائیں۔ یہ میرے بچے کو مارنا چاہتی ہے۔ ابا کچھ نہ کرسکے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن میں نے انکار کردیا۔ میں جبران کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ وہ تین دن بعد اس کمرے سے باہر نکلا بنا کچھ کھائے پیے تین دن..... اور جب وہ نکلا تو بس یہی کہا ریان کو بھوک لگی ہے مجھے اسے کھانا کھلانا ہے..... اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا اور گھر میں ''ریان'' کے ساتھ رہنے لگا۔ ابا ایک ڈاکٹر کو گھر لے آئے اور جبران کا چیک اپ کروایا۔ ڈاکٹروں نے..... اسے اسپتال میں ایڈمٹ کیا اور علاج شروع کردیا..... لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ایک سائیکاٹرسٹ سے ہمارا رابطہ ہوا، انہوں نے جبران کی تھراپی کی جس نے اسے کافی سنبھالا اور بہت حد تک اس کا پاگل پن کم کردیا۔ اسی دوران اسی سائیکاٹرسٹ کے مشورے سے میں نے ایک چائلڈ سینٹر سے ایک بچہ ایڈاپٹ کر لیا۔ اور وہ بچہ یہی ہے جو اس وقت آپ کے سامنے بیٹھا

Digitized by Google

ہے۔ میں نے جبران سے کہا کہ اب سے یہ ہمارا بچہ ہے ہمارا ریان..... اس نے بچے کی طرف دیکھا اور کہا..... یہ ہمارا ریان نہیں ہے۔ یہ تو گی ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا کھلونا۔

''اور تب ایک اور ہولناک انکشاف یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ اسے جس بات پر یقین دلایا تھا کہ تمہارا بچہ اصلی نہیں بلکہ کھلونا ہے، وہ بات اب اس کے اندر گھر کر گئی ہے۔ جبران نے اس حقیقت کو مان لیا کہ ان کا بیٹا ایک کھلونا ہے اور اس بات کو وہ اس درجے پر لے آئے کہ اب ایک اصلی بچے کو بھی وہ پلاسٹک کا بنا کھلونا سمجھتے ہیں۔ کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے لیکن ایک دن اس نے اس بچے کو اٹھا کر بیچ میں یوں پٹخ دیا، جیسے یہ واقعی کھلونا ہو۔ وہ تو شکر ہے کہ یہ نرم بستر پر ہی گرا۔ ورنہ.....''

وہ خاتون یہاں رک کر اپنی نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ میں نے لپک کر پانی کا گلاس اسے پیش کیا۔ لیکن خود میری حالت یہ تھی کہ میں نے اس گلاس کے خالی ہونے کا انتظار نہیں کیا اور ٹیبل پر موجود جگ سے منہ لگا کے پانی پی گیا۔ اس نے پانی کا گھونٹ بھرا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''تب سے اب تک میں جبران کو اس کے اس دوسرے پاگل پن سے آزاد کرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں۔ جس سائیکاٹرسٹ سے پہلے علاج کروایا تھا وہ بھی اس بار فیل ہو گیا۔ اسے اور ڈاکٹروں کے پاس بھی لے کر گئی ..... اور اسی طرح جیسے میں اس کے ساتھ اولاد کی خواہش میں ہر جگہ گئی جہاں سے ذرا سی بھی امید تھی۔ اب میں جبران کے لیے ہر اس نئی جگہ جاتی ہوں جہاں سے کوئی روشنی کی ننھی سی کرن بھی نظر آتی ہے..... لیکن جبران میری زندگی سے یوں نکلتا جا رہا ہے جیسے مٹھی سے ریت..... میں اسے بچانا چاہتی ہوں۔ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ سوچتی ہوں کہ اس بچے کو واپس کر دوں لیکن اب اس سے اتنی انسیت ہو گئی ہے کہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ یہ میری اپنی اولاد جیسا بن گیا ہے..... لیکن دوسری طرف جبران کی حالت برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کے بارے میں پڑھا تو فوراً چلی آئی۔ پلیز..... اگر میری مدد کر سکتے ہیں تو..... یہ صرف علاج نہیں ہوگا بلکہ مجھ پر احسان ہوگا۔'' اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ اور میرے اندر ایک بگولا سا گردش میں تھا۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ماہ نور! آپ اپنے شوہر کو جتنی جلدی ہو سکے۔ بلکہ آج شام ہی میرے پاس لے کر آیئے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنے بچے ریان کو تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے دروازے تک چھوڑنے آیا اور واپس آ کر اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں عجیب و غریب سی نڈھال سی کیفیت میں بیٹھا رہا پھر میں نے دراز کھولا اور ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ اس میں ماہ نور کی باتیں ریکارڈ ہو چکی تھیں۔ میں نے دوسری دراز سے ایک کیسٹ نکالی جس پر ''جبران'' کے نام کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ میں نے جبران کی گفتگو کو ایک بار پھر غور سے سنا۔ اس کے بعد میں نے ماہ نور کی گفتگو کو سنا۔ دونوں میں کمال کی مشابہت تھی لیکن ایک فرق سب سے بڑا تھا اور اس فرق کا نام تھا..... ریان۔ جبران کے نزدیک اس کی بیوی ایک کھلونے کو ریان سمجھتی تھی جبکہ ماہ نور کے مطابق وہ خود جبران تھا جو ایسا سمجھتا تھا۔ دونوں نے ہی اپنی اپنی کہانی اس تفصیل اور جزئیات سے بیان کی تھی کہ دونوں میں سے کوئی ایک ''مریض'' تو در کنار ''جھوٹا'' بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے دونوں کی شخصیت پر غور کرنا شروع کیا۔ جبران جب میرے پاس آیا تو اس کا رویہ، اس کی گفتگو کا انداز۔ اس کے لہجے سے چھلکتا غم..... وہ بہت حقیقی تھا لیکن اسی طرح ماہ نور بھی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں موجود بچہ اس کے سچے ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو اور اس کی گفتگو کا انداز بہت متاثر کن تھا لیکن دونوں میں سے کوئی تو ایک ایسا تھا جس کی بات سچ نہیں تھی۔

میں اس پر غور کرتا رہا اور اس شام کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا جس میں دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے اپنے پارٹنر کو اپنے ساتھ لے کر آئیں گے لیکن ان میں سے کوئی نہیں آیا۔

ہاں مگر اگلی صبح دو افراد وہاں آئے لیکن یہ جبران اور ماہ نور نہیں تھے۔ یہ دونوں کوئی اور تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کی عمر لگ بھگ چالیس سال ہوگی۔ سر کے سیاہ بالوں میں سفیدی چمک رہی تھی۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ البتہ نظر کے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ دوسرا ایک نوجوان تھا گھنگرالے بالوں والا۔ چہرہ کلین شیو اور مسکراتی ہوئی آنکھیں۔

''کیسے ہیں آپ؟'' چشمے والے نے پوچھا۔

''کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ جانتے ہیں.....''

''آپ دونوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم پہلے کہیں مل

چکے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں آرہا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں اور پلیز ذرا جلدی بتایئے گا۔ میں اپنے دو اہم مریضوں کا انتظار کررہا ہوں جو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''جو نہیں آئے، ان کی فکر مت کریں۔ جو آگئے ہیں فی الحال ان کی سنیں۔'' وہ بولا۔ ''ہم آپ کے لیے ایک خوشخبری لائے ہیں۔''

''خوشخبری..... کیسی خوشخبری؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ہمارے پاس کچھ ایسا ہے جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔'' اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ اور آپ کو کیسے پتا کہ میں کچھ ڈھونڈ رہا ہوں؟''

''ہمیں اس لیے معلوم ہے کہ آپ نے ہی ہمیں بتایا تھا۔ یاد کیجیے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے تو فی الحال یہ بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ میری آپ سے ملاقات کب ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''چلیں ہم خود ہی بتا دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس سے آپ کو یاد آجائے۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ ایک بچے کی اصلیت کو کھوج رہے ہیں۔ ایک بچہ جس کا نام ہے ریان احمد۔'' اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔

''کک..... کون..... کون ریان؟''

''وہی جسے آپ کھوج رہے ہیں۔''

''تت..... تم کیسے جانتے ہو اس کے بارے میں؟'' ..... میں نے اپنے حواس قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم سب جانتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے تو کسی کو بتایا بھی نہیں اور وہ دونوں تو۔'' میں کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''کون دونوں؟'' نوجوان نے پہلی بار زبان کھولی۔

''وہ..... جبران اور ماہ نور..... میرے پیشنٹ۔ ان کا بیٹا ہے ریان۔ آج شام کو آنا تھا انہوں نے۔'' میں نے بے ربطگی سے کہا۔

''آپ کے مریض..... وہ کب آئے تھے؟''

''کل اور پرسوں بھی..... کل ماہ نور آئی تھی اور پرسوں جبران..... لیکن ان سب کو چھوڑیے۔ پلیز پہلے آپ یہ بتایئے کہ آپ ہیں کون؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ڈاکٹر فاروق ہے اور یہ میرے اسسٹنٹ ہیں، ڈاکٹر شہریار۔'' چشمے والے نے اپنا اور نوجوان کا تعارف کروایا۔

''اوہ تو آپ ڈاکٹر ہیں؟''

''جی ہاں۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ دماغی امراض کا علاج کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق سٹی مینٹل اسپتال سے ہے۔'' وہ اسی متانت سے بولا۔

''لیکن آپ کیسے جانتے ہیں ریان احمد کے بارے میں؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''بتایا تو ہے کہ آپ نے ہی ہمیں بتایا تھا اس کے بارے میں۔ یاد کیجیے۔ جب آپ مینٹل اسپتال میں ہمارے پاس تھے۔''

''مم..... میں..... میں کب تھا وہاں؟''

''آپ وہاں تین سال رہے ہیں۔ میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ آپ کو تین سال پہلے مینٹل اسپتال میں لایا گیا تھا۔ آپ زبردست ہیلوسینیشن میں مبتلا تھے۔ آپ کو لگتا تھا کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں۔ ایک سائیکاٹرسٹ لیکن وہ آپ نہیں تھے۔ کیونکہ آپ نے نفسیات کی کہیں سے بھی تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ ہی آپ کے پاس ڈگری ہے۔ یہ محض آپ کی ایمیجی نیشن ہے اور یہ اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ آپ باقاعدہ ایک کلینک کھولے بیٹھے تھے جو کہ غیر قانونی تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ آپ کے پاس دو مریض آتے ہیں جو اپنے بیٹے کو لے کر پریشان ہیں۔ بقول آپ کے، ان دونوں کا کہنا تھا کہ ان کے پارٹنر کو لگتا ہے کہ ان کے بیٹے کا حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ وہ پلاسٹک کا ایک گڈا ہے اور آپ بطور ڈاکٹر ان کے بچے کی حقیقت جاننا چاہتے تھے..... اور یہ معاملہ کئی سالوں سے چل رہا تھا۔ ہم نے آپ کے کیس کو اسٹڈی کیا اور آپ کا علاج کیا لیکن آپ اپنے ''خود ساختہ تصورات'' سے باہر نکلنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اس کے بعد عموماً ہم ایسے مریض کا علاج مختلف طریقے سے کرتے ہیں اور اگر وہ خطرناک ہو تو انہیں سختی سے ٹریٹ کیا جاتا ہے جس کے بعد اس کا دماغ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ کچھ ''تصور'' کرسکے۔ لیکن آپ کے معاملے میں ہم نے ایک الگ راستہ بنایا۔ یہ میرا تھیسس تھا اور میں نے اس پر کافی کام کیا تھا۔ سو میرے تھیسس کے مطابق ڈاکٹروں کے بورڈ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں آپ کو آپ کی ایمیجی نیشن کے ساتھ آزاد چھوڑنا چاہیے تاکہ دیکھا جاسکے کہ یہ ایمیجی نیشن کہاں تک جاسکتی ہیں۔ ہمیں لگتا تھا کہ اگر ہم آپ کو آپ کی تصوراتی دنیا

Digitized by Google

کے ساتھ آزاد چھوڑ دیتے ہیں تو شاید آپ اپنی تصوراتی کہانی کو کسی انجام تک پہنچانے کے بعد اس دنیا سے باہر نکل آئیں لیکن ایک سوال ہو چکا ہے۔ آپ نے اپنی تصوراتی دنیا کی اس کہانی کو کسی انجام تک نہیں پہنچایا۔ آپ اپنے دونوں مریضوں ماہ نور اور جبران کے ساتھ ہی مگن ہیں۔ آپ ریان کی اصلیت کھوج رہے ہیں لیکن وہ آپ کو نہیں مل رہی اور جب آپ ریان کی اصلیت کا کھوج لگانے میں ناکام ہوتے ہیں تو دوبارہ پھر سے ماہ نور اور جبران کا خاکہ بناتے ہیں اور اس کہانی کو دہراتے ہیں۔ آپ ایک سعی لاحاصل میں مبتلا ہیں۔''

''کیا آپ کی کہانی مکمل ہو چکی ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ کوئی کہانی نہیں ہے مسٹر اظفر! یہ ایک حقیقت ہے.....'' نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔

''حقیقت.....'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس حقیقت پر میں یقین کرلوں گا، ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو.....؟''

چشمے والا مسکرایا اور پھر اس نے کہا۔

''آپ نے کہا تھا کہ آج شام آپ کے پاس دو مریض آرہے ہیں۔ یہ غالباً وہی ہیں جن کے بچے کا ایشو ہے۔ تو ان دونوں مریضوں کے بارے میں کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس کہ یہ دونوں آپ کے پاس آئے تھے یا؟'' اس نے وضاحت سے پوچھا۔

میں نے ٹیبل پر رکھا کاغذ کا پیڈ ان کی طرف بڑھا دیا جن پر جبران کی گفتگو کے نوٹس لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر دیکھ کر اسے پرے کردیا۔

''یہ تو محض کاغذ ہیں۔ کچھ اور ہے.....؟'' اس نے کہا۔

میں نے دراز کھول کر ٹیپ ریکارڈر ان کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے اشارہ کیا تو میں نے ماہ نور والی کیسٹ لگادی۔ چند لمحے سائیں سائیں کے بعد ایک آواز گونجنے لگی۔ یہ میری آواز تھی۔ میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے بعد ماہ نور نے جواب دیا تھا لیکن میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جب میں نے اپنے سوال کے بعد جو جواب سنا، وہ بھی میری ہی آواز میں تھا اور یہی نہیں اس ٹیپ میں موجود ماہ نور کی ساری گفتگو میری اپنی ہی آواز میں تھی۔ میں نے کیسٹ نکال کر جبران والی کیسٹ لگائی اور پلے کردی مگر چند لمحوں بعد میں ہکا بکا بیٹھا تھا کیونکہ جبران کی کہانی بھی میری اپنی ہی آواز میں ریکارڈ تھی۔

''یہ..... یہ سب..... کیا ہے؟''

وہ دونوں استہزائیہ انداز میں مسکرا رہے تھے پھر نوجوان نے اپنا بریف کیس اٹھا کر اسے کھولا اور اندر سے ایک جدید لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا اور پھر اسے میری طرف گھما دیا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر اسی کمرے کا منظر تھا جس میں ہم بیٹھے تھے۔ اس منظر میں، میں اکیلا تھا۔ یعنی وہ دونوں نہیں تھے۔ یہ ایک ویڈیو کی ریکارڈنگ تھی جس کے نیچے تاریخ اور وقت درج تھا۔ یہ تین دن پہلے ہی کی ویڈیو تھی۔

''یہ..... کیا ہے؟'' میں نے بے اختیار پوچھا تو نوجوان نے کمرے کے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں دیوار پر آرائشی پھولوں کی بیل نصب تھی۔

''وہاں ایک کیمرا نصب ہے جو اس کمرے کی ریکارڈنگ کرتا ہے۔''

اس نے لیپ ٹاپ پر انگلی گھماتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ دیکھیے.....'' اس نے ویڈیو فارورڈ کر کے کل کے دن کی تاریخ دکھائی اور اس وقت میں لے گیا جب میرے سامنے جبران بیٹھا تھا اور میں اس سے گفتگو کر رہا تھا لیکن ویڈیو حیران کن تھی۔ میں اکیلا بیٹھا ہاتھ ہلا ہلا کر ٹیبل کے دوسری طرف ایک خالی کرسی سے باتیں کر رہا تھا اور یوں پوز دے رہا تھا جیسے اسے سن رہا ہوں۔ اس دوران میں نے خالی کرسی کے سامنے چائے کا کپ بھی بنا کر رکھا لیکن جہاں جبران کو ہونا چاہیے تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسی خالی تھی۔ اسی طرح اگلی ویڈیو آج کی تھی جس میں ماہ نور کو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بھی نہیں تھی۔ میں خالی کرسی سے مخاطب تھا۔

میں ایک ناقابلِ یقین حیرت کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

''آپ کے پاس کوئی مریض نہیں آیا۔ نہ کل نہ پرسوں نہ اس سے پہلے کبھی۔ یہ صرف آپ کا تصور ہے۔''

میں اپنی جگہ گنگ بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر فاروق نے کہا۔ ''شاید ہم آپ کو آپ کے ان تصورات کے ساتھ مزید کچھ وقت دیتے لیکن ہمیں اب یہ کھیل بند کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے پاس آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے..... دراصل آپ کی دماغی حالت کا درست اندازہ لگانے کے لیے ہمیں آپ کے ماضی کی تلاش تھی اور آپ کے ماضی کے بارے میں ہمیں کہیں سے بھی کوئی معلومات نہیں مل رہی تھیں۔ اس بنا پر ہم نے ایک

Digitized by Google

پرائیویٹ سراغ رساں کو ہائر کیا اور اس سراغ رساں نے آپ کے ماضی کے بارے میں ہمیں جو بتایا اُس میں لگتا ہے کہ ہم اب آپ کی ذہنی حالت کو بہتر کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کی تمام تر ذہنی پریشانی کا تعلق ایک سوال سے ہے اور اس سوال کا جواب ہمیں مل چکا ہے۔''

''کون سا سوال..... کیسا جواب.....؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''یہی کہ..... ریان کون ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

اظفر ایک سال کا تھا جب اسے چائلڈ سینٹر سے ایک بے اولاد جوڑے نے گود لے لیا تھا۔ اظفر کے حقیقی..... والدین کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ یہ نوزائدہ بچہ ایک آدمی کو خالی پلاٹ میں پڑی ایک ٹوکری میں ملا تھا جس نے اسے اٹھانے کے بعد پولیس کے حوالے کیا۔ پولیس نے یہ بچہ معمول کی کارروائی کے بعد چائلڈ سینٹر کے حوالے کر دیا۔ اسے گود لینے والے عمران اور راحیلہ کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بانجھ پن کا شکار نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ علاج معالجے کی کوششوں کے بعد انہوں نے متفقہ طور پر ایک فیصلہ کیا اور چائلڈ سینٹر سے ایک بچہ گود لے لیا جو کہ اظفر تھا۔

بچہ گھر میں آتے ہی ان کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور انہوں نے اسے بہت لاڈ سے پالنا شروع کر دیا۔ دونوں کی ایک ہی خواہش تھی کہ اگر ان کے ہاں کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اس کا نام ریان احمد رکھتے۔ انہوں نے اظفر کو ریان احمد کا نام دے دیا اور اس کے مستقبل کے حوالے سے طویل پلاننگ بڑے عرصے سے کر رکھی تھی کہ وہ کہاں پڑھے گا۔ کیا پڑھے گا۔ اسے کیا بنایا جائے گا۔ اس کی پرورش کا معیار کیا ہوگا۔

ریان تین سال تک ان کے پاس رہا اور پھر وہ ہوا جو کسی نے سوچا نہ تھا۔ راحیلہ حاملہ ہوگئی اور وہ اس گھر کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا کیونکہ اس بات کو وہ فراموش ہی کر چکے تھے کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

ٹھیک نو ماہ بعد راحیلہ نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا اور ساری خرابی اس وقت شروع ہوئی جب اس نیو بورن بے بی کا نام رکھا جانا تھا۔ راحیلہ نے اس کا نام ''ریان احمد'' رکھنے کا فیصلہ کیا۔ عمران نے حیرت سے اسے بتایا کہ ریان تو ہمارے پہلے بیٹے کا نام ہے۔ اس کا نام کوئی اور رکھیں گے لیکن راحیلہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ ''ریان احمد'' وہ نام ہے جو وہ اپنے بیٹے کے لیے رکھنے کا بہت پہلے فیصلہ کر چکی تھی۔ عمران نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے سمجھا نہیں پایا اور یوں نوزائدہ بچے کا نام ریان رکھ دیا گیا۔ جبکہ اظفر کو دوبارہ اظفر کے نام سے پکارا جانے لگا۔ چار سالہ اظفر اس گورکھ دھندے کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی قبول کر سکا۔ وہ حیرانی سے دیکھتا جب اس کے چھوٹے بھائی کو اس کے نام یعنی ''ریان'' کے نام سے پکارا جاتا اور وہ خود کوئی ردِعمل نہ دیتا جب اسے اظفر کے نام سے پکارا جاتا۔ اور بات صرف اتنی نہیں تھی۔ اپنی اولاد کی نعمت پاتے ہی راحیلہ کی نظروں میں اظفر کی اہمیت کم ہونے لگی تھی۔ وہ اظفر کو ریان کے پاس نہ آنے دیتی اور نہ ہی اس پر دیسی توجہ دیتی جیسے کہ پہلے دیتی تھی۔ اظفر اپنی ماں کی توجہ کم ہوتا دیکھ کر اور ننھے بچے کے ساتھ اسے زیادہ مصروف دیکھ کر پریشان ہوتا رہا۔ یقیناً وہ اس کی کم سنی کا زمانہ تھا مگر ماں کے بدلتے ہوئے رویے کو وہ اپنے ننھے سے شعور سے اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ البتہ اسے عمران کا سہارا تھا جو ابھی تک اس سے دیسی ہی محبت کرتا تھا۔ وہ راحیلہ کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا کہ تم اظفر کے ساتھ یہ اچھا برتاؤ نہیں کر رہیں۔ مگر راحیلہ اب صاف صاف کہنے لگی تھی کہ اظفر اس کا بیٹا نہیں۔ اس کا بیٹا ایک ہی ہے اور وہ ہے ریان اور اس دن تو حد ہی ہوگئی جب راحیلہ کو کچن میں مصروف دیکھ کر اظفر نے ریان کو اٹھانے کی کوشش کی اور اسے زمین پر گرا بیٹھا۔ ریان کی چیخیں سن کر راحیلہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے پہلے تو ریان کو سنبھالا اور پھر خونزدہ اظفر کے گالوں پر طمانچے رسید کیے۔ شام کو عمران گھر آیا تو راحیلہ نے ایک آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اظفر نے ریان کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ عمران ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے لگا کہ ایک بچہ ایسی حرکت جان بوجھ کر کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن راحیلہ نہ مانی۔ اظفر بھی غصے میں آگیا اس نے کہا کہ اگر وہ اظفر کے ساتھ یہی سلوک رکھے گی تو وہ اسے دوبارہ چائلڈ سینٹر چھوڑ آئے گا۔ راحیلہ نے فوراً کہا کہ وہ بھی یہی چاہتی ہے اور چند دنوں بعد یہ بات سچ ہوگئی۔ اظفر کو دوبارہ چائلڈ سینٹر پہنچا دیا گیا۔ وہ اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن ایک حساس بچہ ہونے کی وجہ سے وہ اس صورتِ حال کے اثر کو بہت محسوس کرتا تھا۔ ابھی تک تو وہ اس نام کو نہیں بھولا تھا جس سے اسے پکارا جاتا رہا تھا یعنی ریان احمد۔ وہ خود کو ریان احمد سمجھتا تھا اور چائلڈ سینٹر میں واپس آنے کے بعد بھی جب اس کا نام پوچھا یا پکارا جاتا تو وہ حیرانی سے کہتا..... میرا نام تو

Digitized by Google

ریان ہے۔ چند دنوں میں ہی دوسرے بچوں نے اس کی یہ کمزوری پکڑ لی۔ وہ اسے گھیر لیتے اور پوچھتے، اظفر تمہارا نام کیا ہے۔ وہ بتاتا ریان احمد..... لیکن بچے زور سے ہنستے اور کہتے نہیں تمہارا نام تو اظفر ہے۔ وہ اس بات پر کبھی غصے میں آکر لڑ پڑتا اور کبھی رنجیدہ ہو کر اپنے کمرے میں بچھے پلنگ کے نیچے گھس جاتا۔ اس کے علاوہ وہ بار بار منیجر سے پوچھتا کہ اس کے ممی پاپا اسے واپس لینے کب آئیں گے لیکن کوئی بھی جواب اس کی تشفی نہ کر سکتا۔ ایک دن ایسے ہی چند شرارتی بچوں کے نرغے میں جب وہ اس کے نام کا مذاق اڑا رہے تھے، ایک بچہ جو اس کے بارے میں جان چکا تھا، بولا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم ریان نہیں ہو۔ اصلی ریان تو تمہارے ممی پاپا کے پاس ہے۔ تم نقلی ریان ہو۔''

وہ چلایا۔ ''نہیں، میں اصلی ریان ہو۔ وہ نقلی ہے۔ میں اصلی ہوں۔''

بچے ہنسنے لگے تو وہ روتے ہوئے ان سے لڑ پڑا اور لڑنے جھگڑنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے پلنگ کے نیچے جا چھپا اور دیر تک خود سے یہی کہتا رہا کہ میں اصلی ریان ہوں۔ وہ دوسرا نقلی ہے۔

وہ ایک بچہ ہی تو تھا اور تھا بھی چائلڈ سینٹر میں جہاں والدین جیسی تربیت کرنے والا اور ان کی طرح سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کی دو حقیقتوں کے درمیان گھر چکا تھا۔ ایک حقیقت جس میں وہ..... پیار کرنے والے ماں باپ کے ساتھ تھا جو اسے ریان کے نام سے پکارتے تھے اور دوسری حقیقت جب اس سے اس کا نام چھین لیا گیا اور اب یہاں اس سے کہا جاتا تھا کہ تم ریان نہیں ہو۔ ریان کوئی اور ہے۔ اس چیز نے پہلے تو اسے باقی بچوں سے رفتہ رفتہ دور کر دیا۔ وہ اپنا زیادہ وقت کمرے میں، پلنگ کے نیچے یا چھت پر پانی والی ٹینکی تلے، یا اناج والے اسٹور کی نیم تاریکیوں میں گزارنے لگا اور پھر اس تنہائی میں اس کے اندر سوال کی طرح اٹھنے والی دو حقیقتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی تنہائی کی دنیا میں اس سوال کے جواب میں سرگرداں ہو گیا کہ ریان کون ہے؟

☆☆☆

''جی ہاں مسٹر اظفر..... آپ تب سے اس سوال کی تلاش میں ہیں کہ ریان کون ہے اور آپ کو اس کا جواب اس لیے نہیں ملتا کیونکہ جو صحیح جواب ہے، وہ آپ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ صحیح جواب یہی ہے کہ ریان ایک حقیقی بچہ ہے۔ عمران اور راحیلہ کا۔ وہ کوئی نقلی یا پلاسٹک کا گڈا نہیں ہے..... اور جس جواب کی آپ کو تلاش ہے، وہ آپ کو اس لیے نہیں ملتا کیونکہ وہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ کہ ''ریان'' آپ ہیں۔ آپ ریان نہیں ہیں مسٹر اظفر اور جب تک آپ اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے، آپ اسی طرح اس سوال کی تلاش میں ایک ایسے دائرے کے گرد سفر کرتے رہیں گے جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ آپ اپنی تصوراتی دنیا سے باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ وہاں سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی دروازہ ہے..... حقیقت کا دروازہ۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ریان نہیں ہیں۔ آپ کے پاس دو راستے ہیں مسٹر اظفر! یا تو آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ آپ ریان نہیں ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ آپ ایسا کریں گے کیونکہ اگر ایسا کرنا ہوتا تو یہ بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا اب آپ کے پاس دوسرا راستہ ہے۔ ایک ایسا راستہ جو شاید دیکھنے میں صحیح نہ لگتا ہو مگر یہی ایک راستہ ہے جو آپ کو آپ کی شخصیت لوٹا سکتا ہے۔''

''کیسا راستہ؟''

''یقیناً وہ راستہ آسان نہیں ہے لیکن اس راستے کے سوا آپ کے پاس اور کوئی آپشن بھی نہیں ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ آپ کی دماغی حالت صحیح ہو سکتی ہے، صرف اس طریقے سے کہ آپ حقیقت میں ریان بن جائیں۔ مگر یہ تبھی ہو سکتا ہے جب اصل ریان کا وجود باقی نہ رہے۔ آپ اصلی ریان کو ختم کر دیجیے اور پھر آپ کی اپنے سوال سے یہ ذہنی جنگ ختم ہو جائے گی۔ آپ ہمیشہ کے لیے ریان بن جائیں گے۔'' ڈاکٹر فاروق نے کہا اور ساتھ ہی میز پر ایک نوجوان کی تصویر رکھ دی۔

میرا منہ کھلا کا کھلا تھا۔

''مسٹر اظفر! کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' ڈاکٹر فاروق نے اچانک میری کیفیت نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ڈاکٹر فاروق نے ڈاکٹر شہریار کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر شہریار نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ فضا میں ایک بچے کی گنگناتی آواز گونجی۔

''ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار..... ہاؤ آئی ونڈر واٹ یو آر۔''

میں نے اپنا سر میز پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

آر اے انٹر پرائزز کے پارکنگ لاٹ کے ایک اندھیرے گوشے میں کھڑے مجھے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اسی جگہ پر کھڑا ہوں۔ اس ایک گھنٹے کا ہر منٹ میرے لیے سال برابر

تھا لیکن اب وہ وقت آچکا تھا جس کا میں منتظر تھا۔ پارکنگ لاٹ کی لفٹ سے نکلنے والا نوجوان سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہاتھ میں بریف کیس تھامے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ آر اے انٹر پرائزز کا مالک تھا جس کا نام تھا "ریان احمد۔" وہی انسان جس نے مجھ سے میرے والدین کی محبت ہی نہیں میرا گھر حتیٰ کہ میری شناخت بھی چھین لی تھی۔ ہاں، میری شناخت جو ریان اور اظفر کے بیچ کہیں پاگل پن کے خلا میں بھٹک رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب آنے کا انتظار کیا اور جس وقت اس نے جیب سے کی چین نکالتے ہوئے اپنی گاڑی کو آن لاک کرنے کا بٹن دبایا، میں نے اپنے پسینے میں ڈوبے ہوئے ہاتھ کو اوپر کر کے سائلنسر لگے پستول کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ ریان لڑکھڑا کر اپنی گاڑی سے جا ٹکرایا۔ گولی اس کے پہلو میں کہیں لگی تھی۔ میں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اسے دوسری گولی تب رسید کی جب وہ میری جانب مڑ رہا تھا۔ یہ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ زمین پر جا گرا۔ میں محتاط قدموں سے دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کی موت کا یقین کر کے واپس اس جگہ آیا جہاں کار میں ڈاکٹر شہریار میرا منتظر تھا۔

"وہ مر گیا ہے۔ نکلو یہاں سے۔" میں نے آہستہ آواز میں اس سے کہا۔

گاڑی میں بیٹھے ڈاکٹر شہریار نے نہایت اطمینان سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"مبارک ہو۔ اب تم محفوظ ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ایک شوپیس پر لگا بٹن دبایا تو گاڑی میں ایک بچے کی گنگناتی آواز ابھرنے لگی۔

"ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار..... ہاؤ آئی ونڈر واٹ یو آر۔"

پسنجر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میرے کانوں میں بچے کی گنگناتی ہوئی آواز کے بیچ ایک اجنبی آواز سنائی دینے لگی۔

"اور جب تم بیدار ہو گے تو ہمارے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہوگا۔"

☆☆☆

(تین دن بعد)

میز کے دوسری طرف پانچ افراد بیٹھے جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ ڈاکٹر فاروق، ڈاکٹر شہریار، ماہ نور اور جبران تھے۔ پانچواں ایک نوجوان تھا جس کا نام شاہ زیب تھا جبکہ میز کے اس طرف پولیس انسپکٹر بیٹھا تھا۔ میز کے دوسری طرف ان پانچوں کی آنکھیں انسپکٹر پر گڑی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر شاہ زیب سے مخاطب تھا۔

"مسٹر شاہ زیب! پروفیشنل جیلسی، لالچ، خود اعتمادی جو بھی کہو مگر حقیقت یہ ہے کہ تم نے آر اے انٹر پرائزز کے لیے بہت محنت کی۔ اتنی محنت کہ تمہارے باس نے جو اعتماد تم پر کیا وہ اپنے کسی ساتھی پر نہیں کیا۔ اس نے تمہیں بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر کے ایک طرح سے اپنا بزنس پارٹنر بھی بنا لیا مگر کچھ لوگوں کو اتنی عزت کافی نہیں ہوتی۔ مشہور قول ہے کہ اختیار اور طاقت ملتے ہی انسان بدلتا نہیں بلکہ آشکار ہو جاتا ہے۔ بزنس پارٹنر بنتے ہی تمہارا کردار بھی آشکار ہو گیا۔ تم نے دیکھا کہ تمہارا باس اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے والد کی وفات ہو چکی ہے۔ والدہ بوڑھی ہو گئی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے بیٹے کی شادی ہو جائے اور تم نے یہ سوچا کہ اگر اس کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کا کاروبار اس کے بیوی بچوں میں منتقل ہو جائے گا۔ لہٰذا ابھی بہترین وقت ہے کہ باس کو رستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ اس کے سارے کاروبار کو اپنی مٹھی میں لے لیا جائے۔ اسی لیے تم نے شہر کے بہترین قاتلوں سے رابطہ کیا اور اپنے ہی باس کے قتل کی سپاری دے ڈالی اور جیسے ہی تمہارا باس قتل ہوا، تم نے اس کے کاروبار پر قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن جلد بازی میں تم یہ بھول گئے کہ جس باس کے قتل کو ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے تمہارا اس کے بزنس پر قبضہ جمانے کی کوشش کرنا تمہیں مشکوک بنا سکتا ہے اور آج تم یہاں ہو۔ کیا تم اپنا یہ جرم تسلیم کرتے ہو؟"

شاہ زیب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تو اس کے چہرے سے شکستگی کے آثار واضح نظر آرہے تھے۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔"

انسپکٹر نے اپنی آنکھیں ڈاکٹر فاروق پر مرکوز کر دیں اور بولنا شروع کر دیا۔

"خدا نے تم لوگوں کو انسانیت کی بھلائی کے لیے صلاحیت عطا کی لیکن تم لوگوں نے اسے انسانیت کی تباہی کے لیے استعمال کیا۔ علم نفسیات نے تمہیں لوگوں کی مدد کا طریقہ بتایا لیکن تم لوگوں نے اسی علم کو لوگوں کے قتل کے لیے استعمال کیا۔ تم لوگوں کا طریقۂ واردات کسی جاسوسی ادیب کے قلم کا شاہکار لگتا ہے۔

"تین اسٹیپ تم اپنے ٹارگٹ پر آزماتے ہو۔ پہلے اسے ہپناٹائز کرنا۔ جیسا کہ تم نے اظفر کے ساتھ کیا۔ اس کے ظلم میں لائے بغیر اسے اعصاب کو کمزور کرنے والی ادویات دیں

Powered by Google

جس سے اس کی ذہنی قوت مدافعت پر اثر پڑا پھر..... ہپناٹائز کے ذریعے تم نے اس کے ذہن کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ اسے تحویلی نیند میں اتارنے اور باہر نکالنے کے لیے تم لوگوں نے ایک بچے کی آواز میں نظم والے گیت کو استعمال کیا۔

''اس کے بعد دوسرا لیول ''مینٹل پریپریشن'' یعنی ذہن سازی..... جس کے لیے تم نے مسٹر اظفر کی بچپن کی یادوں کو ایک پراسرار کہانی کی صورت میں اس کے سامنے پیش کیا اور یہ کام تمہارے دو ساتھیوں ماہ نور اور جبران نے کیا۔ ایک مریض ڈاکٹر اظفر کے پاس آتا ہے اور اپنی بیوی اور بچے کا مسئلہ بیان کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ کہانی اظفر کو گود لینے والے باپ کی کہانی ہے۔ پھر دوسرا مریض آتا ہے اور اپنے بچے اور شوہر کے بارے میں فکرمند ہے لیکن حقیقت میں وہ اظفر کو گود لینے والی اور اسے چھوڑ دینے والی ماں کی کہانی ہے۔ دراصل یہ الجھی ہوئی کہانی کمزور پڑتے دماغ کو مزید الجھانے کے لیے تھی۔ بالکل ایسے جیسے فصل کاٹنے بونے سے پہلے زمین کو کھود یا جاتا ہے۔ ذہن جتنا الجھاؤ کا شکار ہوگا، اتنی ہی آسانی سے اس الجھاؤ میں راستہ بنانا آسان ہوگا اور اس کے بعد فیز تھری۔ ٹرانس میوٹیشن..... لیڈ کانشسنیس کی کوششیں۔ تم اور تمہارا اسسٹنٹ ڈاکٹر اظفر کے پاس آتے ہو اور اس کے الجھے ہوئے دماغ کو ایک نیا جھٹکا دیتے ہو۔ یہ کہہ کر کہ وہ ہیلوسینیشن کا شکار ہے۔ اس کے پاس ماہ نور یا جبران نام کا کوئی مریض نہیں آیا۔ یہ یقین دلانے کے لیے تم وہ ایڈٹ شدہ ویڈیو اور اس کی آڈیو ریکارڈنگ کا بھی ایڈٹ شدہ ورژن اس کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اسے بتاتے ہو کہ اس نے ماہ نور اور جبران کو صرف تصوراتی دنیا میں بسا رکھا ہے۔ اس کے بعد تم لوگ اسے یہ بتاتے ہو کہ وہ تم لوگوں کا مریض ہے اور اس کا علاج کیا جا رہا ہے اور تم اسے اس کی بیماری کے بارے میں بتاتے ہو۔ اظفر کے بچپن کی پوری کہانی سناتے ہوئے اس کے دماغ کو محدود سوچ کے دائرے میں قید کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ اسے یہ یقین دلاتے ہو کہ وہ پاگل پن کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور اس کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے..... ریان کو قتل کر دے۔ اس ذہن سازی کے بعد اس کے الجھے ہوئے دماغ نے اس صورت حال کو فوراً قبول کیا تاکہ وہ اپنے ذہنی الجھاؤ سے باہر نکل سکے اور پھر تم اظفر کو موقع فراہم کرتے ہو کہ وہ ریان کو قتل کر سکے۔ اسے پستول دے کر پارکنگ لاٹ میں لے جاتے ہو جہاں ریان کا قتل کیا جا سکے اور اظفر نے ایسا ہی کیا اور آخر میں تم لوگ آخری بار اسے ہپناٹائز کرتے ہو اور اس کے ذہن سے اس قتل کے سوا باقی یادداشتیں خاص طور پر اپنے بارے میں تمام یادداشتیں مٹا دیتے ہو۔ تاکہ اظفر پکڑا جائے تو اسے یہ تو یاد ہو کہ اس نے قتل کیا ہے لیکن یہ قتل کیسے ہوا اور تم لوگوں نے اس کے لیے اسے کیسے استعمال کیا، یہ اسے یاد نہ رہے۔

''یقیناً یہ ایک ناقابل یقین اور بے داغ قتل کا منصوبہ تھا۔ تم لوگوں نے اس شاطر پلاننگ کے لیے یقیناً بڑی محنت کی۔ تم لوگوں نے ریان کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل کی ہوں گی جس میں تمہیں اس کے بچپن کے حالات اور اظفر کے بارے میں بھی معلوم ہوا ہوگا کہ ریان سے پہلے اس کے والدین نے ایک بچہ گود لیا تھا اور بعد میں اسے چھوڑ دیا تھا۔ جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بچہ ذہنی طور پر بیمار ہو گیا تھا۔ تم نے اسی کمزوری کو پکڑا اور ریان کو قتل کرنے کے لیے اظفر کو استعمال کیا۔ یقیناً ان واقعات کو بہت عرصہ گزر چکا تھا لیکن نفسیات کہتی ہے کہ انسان درحقیقت کچھ بھی نہیں بھولتا۔ سب کچھ اس کے لاشعور میں موجود رہتا ہے۔ تم لوگوں نے اظفر کے لاشعور کو بیدار کر کے اس کی یہی خامی باہر نکال کر استعمال کرنے کا سوچا۔ یقیناً یہ کوئی عام بات نہیں۔ ایک انسان کے ذہن کو دوسرے انسان کا قتل کرنے پر آمادہ کرنا..... ایسا برین واش کرنے کے لیے بڑا طویل وقت درکار ہوتا ہے لیکن تم لوگوں نے صرف تین اسٹیپ کے ذریعے محض چند دنوں میں اس ناممکن کام کو ممکن بنایا۔ کیا تم میری باتوں کو تسلیم کرتے ہو؟''

پولیس انسپکٹر کی طویل گفتگو کے اختتام پر سوال سن کر ڈاکٹر فاروق کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی، وہ بولا۔

''فی الحال تو ہمیں آپ کی باتیں کسی جاسوسی ناول کی کہانی لگ رہی ہیں انسپکٹر صاحب۔ ہم نہیں جانتے کہ آپ ایسی بے سروپا کہانی سنا کر ہمیں قاتل کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔ اگر مسٹر ریان کا قتل اس کے جڑواں مریض بھائی نے کیا ہے تو اس میں ہمارا کیا کردار ہو سکتا ہے؟ کیا اس دنیا کا کوئی ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ ایک نفسیات کا ڈاکٹر کسی انسان کے دماغ میں دوسرے انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بٹھا دے؟ یہ قطعی ناممکن ہے۔ دنیا کا کوئی ماہر نفسیات کسی انسان کو ایسا کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا جس میں اس کی اپنی مرضی شامل نہ ہو۔''

انسپکٹر نے سر ہلایا۔ ''یقیناً..... میں اس بات سے اس وقت تک اتفاق کرتا تھا جب تک میں نے تم لوگوں کی پلاننگ کا خود مشاہدہ نہیں کیا اور میرے پاس ایسا ثبوت بھی ہے جو یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مسٹر اظفر کو تم نے ہی قتل کے لیے مجبور کیا اور اس کے لیے وہ طریقے آزمائے جو میں نے تمہیں بتائے۔''

''اچھا..... کہاں ہے ثبوت؟'' ڈاکٹر فاروق طنزیہ لہجے

میں بولا تو انسپکٹر نے کمرے کی دائیں دیوار میں نصب اندھے شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ شیشے کے پار میں کھڑا تھا۔ میں پلٹ کر بائیں جانب مڑا اور اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا جہاں انسپکٹر اور ملزمان بیٹھے تھے۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ سب چونک گئے۔

"ثبوت میں خود ہوں ڈاکٹر فاروق۔" میں نے انسپکٹر کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر فاروق اور اس کے اسسٹنٹ شہریار کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں تھیں۔

"تم لوگوں کی حیرت مجھے سمجھ میں آ رہی ہے کیونکہ تم لوگوں کے خیال کے مطابق تو مجھے ہپناٹائز ہونے کے بعد کچھ یاد بھی نہیں ہونا چاہیے، ہے نا؟ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہارے ہپناسس کے عمل کے دوران پوری طرح تنویمی نیند میں اتر ہی نہیں گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے ہپناٹائز کرو گے۔ مجھے اعصابی کمزوری کی ادویات دو گے اور مینٹل پریشرائز کرو گے۔ مگر میں نے تمہارے ہر عمل کا توڑ ساتھ ساتھ کیے رکھا مگر ان سب کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجھ پر تمہارے یہ تینوں سٹیپ اس لیے کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ میرا نام اظفر نہیں ہے اور نہ ہی میں ریان کا سوتیلا بھائی ہوں جو نفسیاتی عارضے کا شکار رہا ہے۔ شاید اصلی اظفر ہوتا تو تم لوگوں کو کامیابی مل جاتی لیکن میں وہ نہیں ہوں۔ اس لیے مجھ پر ریان اور اظفر کی جذباتی کہانی کا کوئی ذہنی اثر نہیں ہوا۔ میں تو صرف تم لوگوں کے سامنے اظفر اور بعد میں تمہارے ہپناٹزم کا شکار انسان کی اداکاری ہی کرتا رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے طریقہ واردات نے مجھے کئی بار کمزور کیا مگر درحقیقت میں ہر وقت اپنے پورے ہوش و حواس میں رہا ہوں۔ وجہ میں بتا چکا ہوں کہ میں اظفر نہیں ہوں۔ میرا نام علی ہے۔ میں فری لانسر سراغ رسانی کا کام کرتا ہوں اور اکثر پولیس کو بھی میری مدد کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر فاروق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا جبکہ ڈاکٹر شہریار کی آنکھیں تو جیسے باہر کو ابل آئی تھیں۔ ساتھ بیٹھے ماہ نور اور جبران کے چہروں پر بھی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ایک توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ "آج سے تقریباً آٹھ ماہ پہلے شہر کے مشہور بزنس مین سیٹھ نثار کا قتل ہوا تھا۔ قتل اس کی اپنی ہی بیوی نے کیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ کیس بڑا سیدھا سادہ تھا۔ ایک بیوی نے اپنے شوہر کو قتل کیا۔ وہ اس کا اعتراف بھی کر رہی تھی اور وہ ذہنی مریضہ بھی تھی۔ میڈیکل چیک اپ نے بھی ثابت کر دیا کہ قاتلہ ذہنی طور پر شدید الجھاؤ کا شکار تھی اور دماغی کمزوریوں کی ادویات استعمال کر رہی تھی اور ساتھ ہی کسی ماہر نفسیات سے اپنا علاج بھی کروا رہی تھی۔ لیکن جس سے وہ اپنا علاج کروا رہی تھی، اس ڈاکٹر کا کسی کو پتا نہیں تھا حتیٰ کہ مریضہ کو بھی یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کسی ماہر نفسیات سے ملتی رہی ہے۔ اس بات پر میرے دوست پولیس انسپکٹر کو شک گزرا۔ اس نے قاتلہ کا ذہنی معائنہ دوبارہ کروایا تو انکشاف ہوا کہ یہ ہپناسس کے عمل سے گزرتی رہی ہے اور اسی عمل کے دوران اس کے دماغ سے کئی باتیں محو ہو چکی ہیں۔ خاص طور پر اپنے معالج کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی۔ دراصل میرے دوست پولیس انسپکٹر کو اس کیس کے بعد چند اس سے ملتے جلتے اور داخل دفتر کیے اور کیس بھی یاد آ گئے۔ پچھلے چند سالوں میں ایسے چھ کیسز شہر میں رجسٹرڈ ہوئے تھے جن میں قاتل نہ صرف یہ کہ ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار پائے گئے بلکہ ان کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کسی ماہر نفسیات سے اپنا علاج کروا رہے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی کو بھی اپنے معالج کے بارے میں یاد نہ تھا اور سبھی ہپناٹائز کیے جا چکے تھے۔ میں نے اپنے دوست پولیس انسپکٹر کے کہنے پر اس کیس میں دلچسپی لی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ واقعی ان سب وارداتوں میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ ہے ان کا پراسرار معالج۔ جو نہ صرف ان کی یادداشت سے محو ہو چکا ہے بلکہ اس کا کوئی سراغ بھی نہیں مل رہا۔

"مگر سیٹھ نثار والے کیس میں مجھے تم لوگوں کا ایک کلیو مل گیا۔ سیٹھ صاحب کے ایک ڈرائیور نے ہمیں بتایا کہ وہ بیگم صاحبہ کو دو تین بار ایک رہائشی علاقے کی کوٹھی میں لے جاتا رہا ہے۔ وہاں سے ہمیں ایک سی سی ٹی وی کیمرے سے معلوم ہوا کہ تم لوگ وہاں آتے جاتے رہے ہو۔ لیکن قتل کے بعد تم لوگوں نے وہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ بہرحال تمہاری فوٹیج ہمارے پاس آ گئی تھی تو تمہیں تلاش کر لیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ جناب کا نام ڈاکٹر فاروق ہے۔ یہ ماہر نفسیات ہیں لیکن کہیں پریکٹس نہیں کر رہے۔ ان کا کہیں کوئی کلینک نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر تم لوگوں پر نظر رکھنا شروع کر دی اور مجھے بہت جلد پتا چل گیا کہ تم لوگ پیشہ ور قاتل ہو لیکن دوسرے پیشہ ور قاتلوں سے بالکل ہی مختلف۔ تم لوگوں نے قتل کرنے کا کوئی ایسا نیا طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور یہ ایسا عجیب ہے کہ تم لوگ قتل کرنے والوں کو انہی کے قریبی لوگوں سے قتل کروا دیتے ہو۔ کیسے..... یہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا مگر چند دنوں بعد میں نے آر اے انٹر پرائزز کے مسٹر شاہ زیب کو تمہارے ساتھ ملاقات کرتے ہوئے دیکھا اور پھر میں تم لوگوں کا پلان جان گیا۔ شاہ زیب نے اپنے ہی مالک

Digitized by Google

ریان کے قتل کی سپاری دی تھی تم کو اور ریان کے بارے میں بہت ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تھا جس میں اس کے سوتیلے بھائی کی کہانی بھی تھی اور تم لوگوں نے ریان کی پرفیکٹ زندگی میں اس اکلوتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور اس کے بھائی اظفر کی تلاش شروع کردی۔

''لیکن میں تم لوگوں سے پہلے اظفر نام کے اس آدمی تک پہنچ گیا اور اظفر سے ملتے ہی مجھے اس کی کہانی کا پتا چل گیا مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ تم لوگ اظفر کو استعمال کیسے کرو گے۔ سو میں نے ایک پلان بنایا۔ میں نے خود کو اظفر کے نام سے تم لوگوں کے سامنے پیش کردیا۔ تم لوگوں کے پاس اظفر کی کوئی تصویر نہیں تھی مگر میں نے جب ریان احمد کے متعلق باتیں کیں تو تم لوگوں نے میرا یقین کرلیا کہ میں ہی اظفر ہوں۔ حالانکہ ہم چاہتے تو... تمہیں گرفتار کر کے بھی تفتیش کر سکتے تھے لیکن میں تمہارا طریقۂ واردات جاننا چاہتا تھا اسی لیے میں نے خود کو تمہارے سامنے پیش کیا۔''

میں نے ایک توقف کیا اور پھر کہنا شروع کیا۔ ''میں نے تم لوگوں کو بتایا کہ میں بھی ایک نفسیات کا ڈاکٹر ہوں اور میں نے اپنا ایک کلینک بھی تم لوگوں کو دکھایا جس کے بعد تم لوگوں نے مجھے وہیں پر ٹریٹ کرنا شروع کردیا اور انہی تین اسٹیپ کی مدد سے مجھے قاتل بنانے کی کوشش کی جس کی بابت میرے دوست پولیس انسپکٹر تم کو بتا چکے ہیں۔ جس وقت تم لوگوں کو لگ رہا تھا کہ تمہارا پلان بڑی کامیابی کے ساتھ جاری ہے، دراصل اس وقت تم ہمارے جال میں پھنس چکے تھے۔''

''اگر..... اگر یہ سب..... سچ ہے تو تم نے ریان کو کیوں مارا؟'' ڈاکٹر فاروق ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اچھا سوال ہے لیکن اس کا جواب تمہیں پسند آئے گا۔ جواب یہ ہے کہ ریان زندہ ہے۔ ہم نے اس مشن کے دوران ہی ریان کو اپنے منصوبے میں شامل کرلیا تھا۔ اسے میں نے جس پستول سے گولیاں ماریں، وہ پستول نقلی تھا۔ ریان کی موت ایک ڈراما تھی۔ اس کے بعد اس کی موت کا چرچا کیا گیا تو صرف اس لیے تاکہ ہم ریان کی سپاری دینے والے اس کے بزنس پارٹنر شاہ زیب کو مکمل طور پر عیاں کرسکیں۔ چنانچہ جیسے ہی ریان کی موت کے بعد شاہ زیب نے اس کے بزنس کو ٹیک اوور کرنے کی کوشش کی، ہم نے شاہ زیب کو گرفتار کرلیا۔ ویسے ہمارے پاس وہ ویڈیو بھی موجود ہے جس میں شاہ زیب نے تم سے ملاقات کر کے ریان کو قتل کرنے کے لیے رقم سے بھرا ہوا ایک بیگ دیا تھا۔ اب تم لوگ سوچ رہے ہو کہ جب ریان قتل ہی نہیں ہوا تو تم لوگوں کو اس کے قتل میں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ تو میں ذرا تم لوگوں کو انسپکٹر صاحب کی وہ بات یاد کروادوں کہ اس قتل میں جو کہ ہوا ہی نہیں، ہم نے صرف تمہارا طریقۂ واردات جاننا ہے۔ اس سے پہلے تم چھ قتل کر چکے ہو، اب تمہیں انہیں قبول کرنا ہوگا اور ہمیں ان کی تفصیلات مہیا کرنا ہوں گی۔'' میں نے کہا تو ڈاکٹر فاروق کا چہرہ اتر گیا۔

انسپکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا اور ہم دونوں اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اور آخر میں تم لوگوں کے لیے ایک سرپرائز تا کہ آئندہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمہیں یہ سوال تنگ نہ کرے کہ اگر میں اظفر نہیں ہوں تو اصل میں اظفر کہاں ہے.....؟ اور میں تم لوگوں سے پہلے اس کے پاس کیسے پہنچ گیا..... تو جناب والا۔ مسٹر اظفر اس وقت آپ کے سامنے ہی ہیں۔ ان سے ملیے انسپکٹر اظفر۔'' میں نے ساتھ کھڑے انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ریان کے سوتیلے بھائی ہیں اور بچپن میں یقیناً یہ اسی ذہنی خلش میں مبتلا رہے ہیں جس کا آپ فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ مگر اب یہ اس فیز سے باہر آچکے ہیں اور ایک نارمل زندگی بسر کررہے ہیں۔ دراصل اظفر کو یتیم خانے میں دوبارہ چھوڑنے کے بعد اس کو اپنانے والے باپ عمران نے اپنی بیگم کو بتائے بغیر ایک کام کیا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اظفر کو یتیم خانے سے نکلوا کر ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کروایا اور جب تک زندہ رہے، وہ اس کی کفالت کرتے رہے۔ یہ انہی کے احسان کا نتیجہ ہے کہ اظفر اپنی ذہنی حالت سے جلد ہی باہر نکل آیا اور آج ایک پولیس انسپکٹر کے روپ میں آپ کے سامنے ہے۔ مسٹر ریان کو بچانے کی اس ساری پلاننگ میں مسٹر اظفر نے ریان کی کمزوری نہیں بلکہ طاقت بن کر اس کا تحفظ کیا ہے۔ شاید یہ بات آپ لوگوں کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہو۔''

اس کے بعد میں اور انسپکٹر اظفر کمرے سے باہر نکل آئے جہاں اظفر کے کمرے میں ریان اور اس کی بوڑھی ماں ہمارا انتظار کررہے تھے۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، ریان کی والدہ نے کئی سال پہلے دھتکارے ہوئے اپنے بچے اظفر کو گلے سے لگا کر اپنالیا اور کتنی ہی دیر روتی رہی۔

میں نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اتنے سالوں بعد اظفر کو آپ لوگوں سے ملانے کے لیے آپ کو ان پانچ افراد کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے جو اس وقت اپنے کیے کی سزا بھگتنے کو تیار بیٹھے ہیں۔''

میری بات سن کر ان سب کے چہروں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

دیر آید

مرزا امجد بیگ

اکثر چادر سے باہر پاؤں نکالنا انسان کو بڑی آزمائش میں مبتلا کردیتا ہے مگر یہ نادان اپنی غلطی ماننے کے بجائے اسے قسمت کا دوش ٹھہرا کر بلبلاتا رہتا ہے لیکن... پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے چادر کے تنگ ہونے اور اپنی خواہشوں کے بڑھ جانے کا دکھ ملتا ہے تو اس وقت اسے پھر سے اسی چھوٹی سی چادر کی خواہش ستاتی ہے بلکہ وہ اس کے سکون کو حسرت سے یاد کرتا ہے۔ یہ جوڑا بھی اپنی چال بھول کر زمانے کے چلن میں چلنے کے لیے گھر سے نکلا اور پھر زمانے کی ٹھوکروں میں اپنے گھر کا رستہ بھی بھول گیا... شاید ان کی یہ کوئی نیکی ہی تھی کہ مرزا امجد بیگ جیسے راہنما ان بھٹکے ہوئوں کو رستہ دکھانے کے لیے مل گئے... دیر تو لگی اس مہرباں کے آنے میں مگر اصل مجرم کیفر کردار تک پہنچ گئے۔

وکیلوں کی دلیلوں اور مجرموں کے سوئے ہوئے ضمیروں کے مابین

دلچسپ معرکہ آرائی

تاخیر کو عموماً پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا لیکن اگر کوئی شخص کسی خاص کام کو بڑے بھرپور انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سرخرو ہوجائے تو اس ذیل میں ہونے والی تاخیر کو یکسر نظرانداز کرکے اس شخص کی کامیابی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

''دیر آید، درست آید!''

زیرِنظر واقعہ بھی اسی فلسفیانہ محاورے کے گرد گھومتا ہے۔

اس کیس کو عدالت میں لگے کم وبیش چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کارروائی عمل میں نہیں آسکی تھی۔ بہرحال، میں نے چند روز پہلے ہی یہ کیس لیا تھا۔ مجھ سے پہلے اس کیس کی پیروی کوئی اور وکیل صاحب کررہے تھے۔ موکل ان وکیل صاحب کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا لہٰذا اب یہ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

جج کرسیِ انصاف پر آکر بیٹھ چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے ملزم خاور کی درخواستِ ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ دائر کردیا تھا۔ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''پہلے والے وکیل صاحب کہاں ہیں؟''

جج کا یہ سوال دراصل پیش کار سے تھا تاہم اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ پیش کار نے جج کو مطلع کیا۔ ''سر! تبدیلی

آ گئی ہے.....!''

جج نے پیش کار کے جواب میں کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک معزز فرد ہے.....''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اعتراض جڑ دیا۔ ''ملزم پر قتل ایسے سنگین جرم کا الزام ہے.....''

میں نے بھی ''جواب آں غزل'' کے طور پر اس کی بات کاٹ دی اور خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''میرے موکل پر قتل کا الزام ہے لیکن ابھی اس کا جرم ثابت نہیں ہوا اور ملزم کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ بھی عدالت کو کرنا ہے چنانچہ.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے جج کی جانب دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے جس سے اس کی نیک نامی کو بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے موکل کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے۔ وقت آنے پر میں ملزم کی بے گناہی کو ثابت کر دوں گا۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے ضمانت کو رکوانے کی کوشش کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس معاشرے بلکہ دنیا کے کسی بھی مہذب معاشرے کے معزز اور نیک نام افراد اپنی کار کی ڈکی میں لاش ڈال کر سڑکوں پر نہیں گھوما کرتے۔ پولیس نے ملزم کو ایک انسانی لاش کے ساتھ گرفتار کیا ہے لہٰذا اس کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

''پولیس نے میرے موکل کو ایک لاش کے ساتھ گرفتار کیا ہے۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔''

''بہت جلد یہ بھی ثابت ہو جائے گا۔'' وہ فخر سے سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تو عدالت کا رخ کیا ہے۔''

''جنابِ عالی! میرا موکل بے گناہ ہے۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ گرفتاری کے وقت اس کی کار کی ڈکی میں ایک لاش پڑی ہوئی ملی تھی لیکن ملزم اپنی کار کی ڈکی کے اندر اس لاش کی موجودگی سے آگاہ نہیں تھا ورنہ اس سے ایسی سنگین حماقت کبھی سرزد نہ ہوتی۔''

''کون سی سنگین حماقت وکیل صاحب؟'' جج نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

''جنابِ عالی! میرے موکل کو ایک پولیس ناکے پر حراست میں لیا گیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پولیس نے ایک چورنگی پر معمول کی چیکنگ کا ناکا لگا رکھا تھا۔ اگر میرے موکل نے کسی شخص کو قتل کیا ہوتا اور اس کی لاش کو اپنی کار کی ڈکی میں ڈال کر کہیں جا رہا ہوتا تو وہ پولیس والے ناکے پر کیوں پھنستا؟ چورنگی سے چند گز پہلے بائیں جانب ایک سڑک مڑتی ہے۔ ملزم اس سڑک پر اپنی کار کو ڈال کر پولیس کی گرفت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ پولیس کا ناکا تو دو سو گز کی دوری سے بھی نظر آ جاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرا موکل کار کی ڈکی میں موجود لاش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسی بے خبری میں وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔''

''ملزم نہ تو اتنا سادہ ہے اور نہ ہی اتنا معصوم جیسا کہ میرے فاضل دوست اسے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وکیل سرکار نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''حقائق یہی ہیں کہ ملزم نے قیصر نامی ایک شخص کو پہلے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس کی لاش کو اپنی کار کی ڈکی میں ڈال کر کہیں ٹھکانے لگانے جا رہا تھا کہ بدقسمتی سے پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ جب اس کی کار کی تلاشی لی گئی تو پولیس نے کار کی ڈکی میں سے قیصر نامی ایک شخص کی لاش برآمد کر لی۔ دیٹس آل یور آنر۔''

''حیرت ہے.....!'' میں نے استہزائیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست مقتول کی موت کی منظر کشی تو اس طرح کر رہے ہیں جیسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ واردات کرتے ہوئے دیکھا ہو۔''

''میں نے ملزم کو قتل کی یہ واردات کرتے نہیں دیکھا۔'' وکیل استغاثہ نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن استغاثہ کے پاس ایسے شواہد اور ثبوت کا ایک انبار لگا ہوا ہے جس سے ملزم کو مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل کا سلسلہ شروع کیا لیکن جج نے درخواستِ ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''داکورٹ از ایڈ جارنڈا''

پہلے بھی کئی بار بتایا جاچکا ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔ جج کے فیصلے سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی تک اس کیس کا بھرپور مطالعہ بھی نہیں کرسکا تھا۔ مذکورہ کیس گزشتہ روز ہی میں نے لیا تھا۔ آئندہ پیشی پندرہ روز کے بعد تھی۔ دو ماہتوں کا یہ وقت کیس اسٹڈی اور آئندہ کے لائحہ عمل کی تیاری کے لیے کافی تھا۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کردوں کہ جو خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے جارہا ہوں اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں ان کا ذکر پیشگی کررہا ہوں۔ اسی طرح میں نے اس داستان میں سے بعض باتیں دانستہ چھپالی ہیں تاکہ سسپنس کا عنصر برقرار رہے۔

☆☆☆

اس قصے کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا جب ملزم کی بیوی شبانہ نے رہائش تبدیل کرنے کے لیے ملزم پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا تھا۔ وہ لوگ گل بہار المعروف بہ گولیمار کے علاقے میں اپنے دو کمروں کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

خاور کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی پھلکی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ وہ میکلوڈ روڈ پر واقع ایک شپنگ کمپنی میں ملازم تھا۔ آپ اس کمپنی کا نام ''کے این اے'' شپنگ کمپنی فرض کرلیں۔ یہ ایک مختصر سی فیملی تھی یعنی میاں، بیوی اور ایک بیٹی۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا نام ثمرین تھا۔

ثمرین کی عمر بائیس سال تھی۔ اس نے گریجویشن کر رکھا تھا۔ شکل صورت کی بھی اچھی تھی مگر پچھلے ایک دو سال سے والدین اس کے کسی اچھے رشتے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس حوالے سے ان کی تشویش آمیز پریشانی میں اضافہ ہورہا تھا۔ ایک رات شبانہ نے اپنے شوہر سے کہا۔

''میں آپ سے پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ ہمیں سلطانہ باجی کے فارمولے پر عمل کرنا چاہیے۔''

سلطانہ، شبانہ کی بڑی بہن تھی۔ سلطانہ کا شوہر شوکت ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ ان کی بیٹی نرگس کے رشتے کا معاملہ بھی کافی عرصے تک اٹکا رہا تھا پھر بقول شبانہ، انہوں نے ایک عظیم فارمولے پر عمل کیا تو نرگس کی شادی بہ آسانی ایک اچھے گھرانے میں ہوگئی تھی۔

''تمہاری سلطانہ باجی کے فارمولے میں دم تو ہے۔'' خاور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس فارمولے کو بروئے کار لانے کے لیے جن دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے، وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔''

''سلطانہ باجی اور شوکت بھائی کے پاس بھی یہ دونوں چیزیں نہیں تھیں۔'' شبانہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن انسان اگر کوشش کرے تو سب ہوجاتا ہے۔ آپ ہمت کریں۔ میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ قدرت کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گی۔''

''تم کس طرح میرا ساتھ دو گی؟'' خاور نے الجھن زدہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''یہ دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے اور تم جانتی ہو، ہم دونوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ ایک اچھا گھر اور مناسب سی گاڑی خریدنا میری پہنچ سے باہر اور بہت دور ہے شبانہ۔''

''آج کل زمانہ بدل گیا ہے۔'' شبانہ نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ''پہلے وقتوں میں لڑکی کی سلیقہ شعاری اور اس کے والدین کی شرافت کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن اب لوگوں کی ترجیحات میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ لڑکے والے، لڑکی کی تعلیم، شکل صورت اور حسب نسب کو بعد میں دیکھتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکی کے والدین کی رہائش شہر کے کس علاقے میں ہے اور یہ کہ ان کے پاس گاڑی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کون سی ہے۔ اس ''لیبارٹری ٹیسٹ'' سے لڑکے والے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ لڑکی کتنی مالیت کا جہیز لاسکتی ہے اور یہ بھی کہ لڑکی کے والدین اپنے داماد کے مالی استحکام کے لیے کیا قربانی دے سکتے ہیں.....؟''

''میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا شبانہ۔'' خاور نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''واقعی آج کل انسان بے وقعت ہوکر رہ گیا ہے۔ ہم مادی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ یہاں اشیا کو انسانوں پر فوقیت دی جارہی ہے مگر.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مگر میں پھر یہی کہوں گا کہ میری اتنی پہلی نہیں کہ کوئی

Digitized by Google

عالی شان گھر خریدوں اور ایک کار بھی رکھ لوں.....''

''آپ سے گھر خریدنے کو کون کہہ رہا ہے۔'' شبانہ نے ایک ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہم سلطانہ باجی کی طرح اپنا گھر کرائے پر اٹھا کر کسی صاف ستھرے علاقے میں نسبتاً بڑا اور ہوادار گھر کرائے پر لے لیتے ہیں۔ سال چھ ماہ کی تو بات ہے۔ جیسے ہی ثمرین اپنے گھر کی ہو جائے گی، ہم واپس اپنے گھر میں آجائیں گے۔ ہماری ایک ہی اولاد ہے۔ کیا آپ اپنی بیٹی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

شبانہ کا آخری جملہ ایموشنل بلیک میلنگ سے لب ریز تھا۔ اس نے گویا خاور کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ خاور اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

''تم جانتی ہو، ثمرین کے اندر میری جان ہے۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں اس کی خوشی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں لیکن زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پوش علاقے میں کوئی گھر کرائے پر لینے کے لیے اچھا خاصا ایڈوانس دینا پڑے گا اور یقیناً کرایہ بھی زیادہ ہوگا۔ پھر گاڑی خریدنے کے لیے بھی رقم درکار ہوگی۔''

''کچھ قربانی آپ دیں، کچھ میں دیتی ہوں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''نئے گھر کے ایڈوانس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس کا میں بندوبست کرلوں گی۔ آپ اپنے آفس سے تھوڑا لون اٹھالیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر کا جو ایڈوانس ملے گا وہ بھی آپ رکھ لیں۔ ان دونوں رقوم کو ملا کر آپ کوئی اچھی کنڈیشن کی چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لیں۔ اس طرح ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

شبانہ کا آئیڈیا خاور کو بھی پسند آیا۔ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آفس میں میرا ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ میں نے جب بھی لون لیا، بروقت واپس بھی کیا ہے لہٰذا گاڑی کے ڈیل میں مجھے آفس سے لون مل جائے گا لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ نئے گھر کے ایڈوانس کا بندوبست تم کہاں سے کرو گی؟''

خاور نے نہایت ہی اہم اور معقول عملی سوال کیا تھا۔ شبانہ نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''میں سلطانہ باجی سے ادھار لے لوں گی۔ آج کل شوکت بھائی کا اسٹیٹ کا کام بہت اچھا چل رہا ہے لہٰذا یہ کام آسانی سے ہو جائے گا بلکہ اس سلسلے میں، میں نے تو باجی سے بات بھی کرلی ہے۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں کہ ثمرین کی شادی کے لیے ہمیں کسی پوش ایریا میں رہائش اختیار کرنا چاہیے۔''

شبانہ کی اس بات کے بعد خاور کے پاس اختلاف یا انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی چنانچہ اسی ماہ انہوں نے اپنے گولیمار والے ساٹھ گز کے مکان کو کرائے پر اٹھایا اور نارتھ ناظم آباد کے علاقے بغزدون میں ایک سو بیس گز کے ایک شاندار گھر میں شفٹ ہو گئے۔ مذکورہ گھر دراصل ایک سو بیس گز کے پلاٹ پر بنا ہوا ایک تین منزلہ مکان تھا جس کی درمیانی منزل پر مالک مکان زہرہ باجی خود رہائش پذیر تھی۔ بالائی منزل پر متمول قیصر کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا اور پہلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر ملزم خاور نے سکونت اختیار کی تھی۔ یہ تین کمروں والا ایک صاف ستھرا گھر تھا جس کا کرایہ پندرہ سو اور ایڈوانس دس ہزار روپے تھا۔ خاور کا گولیمار والا مکان آٹھ سو کرائے پر اٹھا تھا اور انہیں وہاں سے چھ ہزار ایڈوانس ملا تھا۔ آپ رقوم کے اعداد و شمار پر حیران نہیں ہوئیے گا۔ یہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اگر ان رقوم کو آج کل کی ویلیو دینا مقصود ہو تو آپ اسے کم از کم پندرہ سے ضرب دے لیں۔

اپنے مکان کے ایڈوانس میں آفس سے لی ہوئی لون کی رقم کو ملا کر خاور نے ایک سیکنڈ ہینڈ ڈاٹسن ون ٹو ٹکی وائے خرید لی تھی۔ گرے کلر کی اس گاڑی کی کنڈیشن تسلی بخش تھی۔ اپنے حلیے اور سائز کے اعتبار سے ''ون ٹو ٹکی وائے'' خاصی دبنگ دکھائی دیتی تھی لیکن اس گاڑی کی وجہ سے خاور کے لیے ایک پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔

اس گھر کی زیریں منزل پر گیٹ کے اندر صرف دو گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی جس میں ایک مالک مکان زہرہ باجی کی کھڑی تھی اور دوسری متمول قیصر کی۔ قیصر گزشتہ چھ ماہ سے بالائی منزل پر کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھا اور خاور ابھی یہاں شفٹ ہوا تھا لہٰذا اسے گھر کے اندر پارکنگ کی آسانی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنی ڈاٹسن کو گیٹ کے باہر ہی کھڑا کیا کرتا تھا جس کے سبب کئی مسائل کھڑے ہو گئے تھے جن میں سرفہرست تو اندر کھڑی دو گاڑیوں کے ''ان آؤٹ'' کا ایشو تھا۔ قیصر اور باجی زہرہ کے کہنے پر خاور کو کئی بار اپنی گاڑی گیٹ پر سے ہٹانا پڑتی تھی۔ علاوہ ازیں زہرہ کا پڑوسی عرفان بھی اس ایشو کو ہمیز کرنے میں ایک پراسرار کردار ادا کر رہا تھا۔

عرفان دراصل آٹو پارٹس کا کام کرتا تھا۔ تہت سینٹر پر اس کی اپنی شاپ تھی۔ اس کے علاوہ عرفان سیکنڈ ہینڈ گاڑیوں کی خرید و فروخت بھی کیا کرتا تھا چنانچہ اس کے گیٹ پر ہمہ وقت دو تین گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں جن میں سے بعض

گاڑیاں آدھی سے زیادہ پڑوسیوں کے گیٹ تک دراز ہوجایا کرتی تھیں۔ اس صورتِ حال میں خاور کے لیے گھر کے باہر گاڑی پارک کرنا بھی ٹیڑھی کھیر جیسا معاملہ ہی بن کر رہ گیا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ زہرہ باجی، عرفان کے اس ''ناجائز تجاوزاتی عمل'' پر کوئی سنجیدہ اقدام نہیں اٹھاتی تھیں۔ عرفان اور زہرہ باجی سالہا سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے لہٰذا زہرہ باجی کی جانب سے لحاظ مروت کا سلسلہ جاری وساری تھا مگر اس پڑوس گیری میں سب سے زیادہ خاور کی ذات متاثر ہورہی تھی۔ ایک تو اس کے پاس گاڑی پارک کرنے کی کوئی معقول جگہ نہیں تھی۔ دوسرے وہ جہاں بھی گاڑی کھڑی کرتا، اسے کسی نہ کسی کے ایما پر اپنی گاڑی کو ہٹانا پڑتا تھا اور یہ کوفت رات کے حصے میں زیادہ ہوا کرتی تھی۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس واقعے کے پیش منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں کیونکہ اس کہانی نے اسی تین منزلہ عمارت کے اندر ہی گھومنا ہے اور وہ بھی چند کرداروں کے اردگرد جن میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل دو کردار ہیں یعنی مقتول قیصر اور ملزم خاور۔

قیصر ایک شادی شدہ شخص تھا لیکن ایک ماہ پہلے اس کا اپنی بیوی فائزہ سے شدید نوعیت کا جھگڑا ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں فائزہ روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ فائزہ کے والدین پاپوش کے علاقے میں رہتے تھے۔ گویا گزشتہ ایک ماہ سے قیصر اکیلا ہی اس گھر کی بالائی منزل پر رہ رہا تھا۔ ان میاں بیوی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ قیصر ایک چلتا پرزہ قسم کا انسان تھا اور چلتے پھرتے مختلف نوعیت کے کام کرتا تھا۔ اس کا ذریعہ معاش فکس نہیں تھا۔ سادہ الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ قیصر جوڑ جگاڑ کے کاموں میں مڈل مین کے طور پر اپنی خدمات فراہم کرکے روزی روٹی کماتا تھا۔ اس طرح کے کردار ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔

مالکِ مکان دوسری منزل پر اکیلی ہی رہتی تھی۔ زہرہ باجی ایک بیوہ خاتون تھیں۔ ان کی عمر ساٹھ کے نزدیک تھی۔ ان کی صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک شادی شدہ بیٹی شازیہ جو پانچ بچوں کی ماں تھی اور ایک شادی شدہ بیٹا عارف جو ماں کو تن تنہا چھوڑ کر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بیرونِ ملک چلا گیا تھا اور کئی سال سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ شازیہ مہینے میں ایک آدھ بار ماں کو دیکھنے آجایا کرتی تھی۔ زہرہ باجی کی گزر بسر اسی مکان سے حاصل ہونے والے کرائے سے ہوتی تھی جو اس اکیلی جان کے لیے کافی سے زیادہ تھا لیکن عمر کے اس حصے میں اسے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے مستقل ساتھ کی ضرورت تھی جو اسے میسر نہیں تھا۔

انسان کی زندگی میں سکھ اور دکھ اس کے نصیب کے رہین منت ہیں اور نصیب ایک ایسی شے ہے جسے بازار سے خرید کر اپنی زندگی کو خوشیوں سے معمور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو صاحبِ ثروت افراد اس دنیا کے سکھی ترین انسان ہوتے..... مالک نے ہر انسان کے لیے دکھ اور سکھ کا کوٹا مقرر کررکھا ہے۔ بے شک اوپر کا تب نصیب ہے۔

خاور، شبانہ اور ثمرین پوش علاقے کے ایک صاف ستھرے گھر میں منتقل تو ہوگئے تھے لیکن یہاں آتے ہی انہیں نوع بہ نوع کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ گاڑی کی پارکنگ کے حوالے سے جو مشکلات تھیں وہ اپنی جگہ۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک مسائل تھے۔ پہلے مہینے کا بجلی کا بل آیا تو خاور اینڈ کمپنی کے ہوش اڑ گئے۔

''زہرہ آنٹی!'' شبانہ نے مالک مکان سے کہا۔ ''کہیں آپ نے ہمیں کسی اور کا بل تو نہیں تھما دیا؟ ہم نے جتنی بجلی استعمال کی ہے یہ تو اس سے چار پانچ گنا زیادہ کا اماؤنٹ ہے.....!''

''کسی ایک کا بل کسی دوسرے کو دے کر بھلا مجھے کتنے نفل کا ثواب مل جائے گا۔'' زہرہ باجی نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''تینوں گھروں کے الگ الگ میٹرز لگے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں گراؤنڈ فلور کا بل ہی دیا ہے۔ تم اگر چاہو تو بل پر درج میٹر نمبر دیکھ کر میری بات کی تصدیق کرسکتی ہو۔''

میٹر وغیرہ چیک کرنا اور بل سے اس کی ریڈنگ کا موازنہ کرنا شبانہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ رات کو جب خاور آفس سے گھر آیا تو شبانہ نے سارا ماجرا اسے کہہ سنایا اور کہا۔

''اس بل کا اماؤنٹ تو ہمارے گھر کے ماہانہ کرائے سے بھی زیادہ ہے۔ اب کیا کریں؟ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کیسے گزارہ ہوگا۔''

''پوش ایریا میں رہائش اختیار کرنے کا ایک اپنا مزہ ہے۔'' خاور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''یہ مزہ تو اب چکھنا ہی پڑے گا.....''

خاور نے بیوی کو چوٹ تو کردی تھی لیکن جب اس نے بغور بجلی کے بل کا جائزہ لیا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ شبانہ نے شوہر کی بدلتی ہوئی کیفیت کو فوراً نوٹ کرلیا۔

''کیا ہوا.....؟'' اس نے خاور سے پوچھا۔ ''یہ بل تو ہمارا ہی ہے نا۔''

''بل تو ہمارا ہی ہے۔'' خاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر یہ بجلی ہم نے استعمال نہیں کی۔''

''یہ آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''جب یہ ہمارا ہی بل ہے تو پھر بجلی ہم نے استعمال کیوں نہیں کی۔ کیا کسی نے ہمارے میٹر میں کنڈا لگایا ہوا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' شبانہ نے ضدی لہجے میں استفسار کیا۔

''معاملہ دراصل کچھ یوں ہے کہ.....'' خاور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو ماہ کا بل ہے۔ پچھلا بل بھرا نہیں گیا تھا اس لیے لگ کر آگیا ہے۔ اس اماؤنٹ میں یونٹس کے حساب سے دس سے پندرہ فیصد اماؤنٹ ہمارے کرنٹ بل کا ہے۔ باقی سابق بل کی رقم ہے۔''

''اوہ.....تو یہ بات ہے۔'' شبانہ نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن زہرہ آنٹی نے یہ معاملہ مجھ سے کیوں چھپایا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہیں خبر نہ ہو.....!''

''ایسا ہو سکتا ہے کہ زہرہ باجی کو واقعتاً اس بات کا علم نہ ہو۔'' خاور نے مثبت سوچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹینشن نہ لو۔ میں صبح خود ان سے بات کروں گا۔''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ بل کی آخری تاریخ میں دو دن باقی ہیں۔'' شبانہ نے بتایا۔ ''اس لیے ہم کل ہی یہ بل بھر دیں ورنہ متعلقہ محکمہ ہمارے گھر کو بجلی کی فراہمی منقطع کر دے گا۔''

''تم فکر نہ کرو۔ میں صبح ان سے ملوں گا۔'' خاور نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سنبھالوں گا۔''

اگلی صبح آفس جانے سے پہلے جب خاور زہرہ باجی سے ملا تو پتا چلا کہ دو ماہ کے بل والے راز سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ خاور اپنی بات کرنے گیا تھا۔ جواب میں باجی زہرہ اپنے مسائل کا رونا لے کر بیٹھ گئیں۔

''بھائی صاحب! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ سے پہلے گراؤنڈ فلور پر جو لوگ رہتے تھے، وہ کتنے کمینے اور پھڈے باز تھے۔ جب پچھلے مہینے بجلی کے بل آئے تو انہوں نے بلز کو اپنے گھر میں بند کیا اور خود عید منانے نواب شاہ چلے گئے۔ جب ان کی واپسی ہوئی تو بل کی آخری تاریخ کو گزرے کئی دن ہو گئے تھے۔ اس طرح وہ بل جمع نہ ہو سکے اور آپ والے حالیہ بل میں سابق بل کا اماؤنٹ بھی جمع ہو گیا۔ وہ بدذات لوگ اس بل کے علاوہ بھی مجھے بہت سا نقصان پہنچا کر گئے ہیں۔ پتا نہیں، اللہ ایسے نامعقول لوگوں کو اتنی ڈھیل کیوں دیتا ہے.....''

''اللہ کے ڈھیل دینے اور رسی کھینچنے کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔'' خاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اللہ کے معاملات اور اختیارات کو تو آپ اللہ پر ہی چھوڑ دیں اور یہ بتائیں کہ اس بل کا کیا کرنا ہے؟''

''بھائی صاحب! میری بات سنیں۔'' زہرہ باجی، خاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ ایک کام کریں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''جی بتائیں۔'' خاور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''آپ کا اشارہ کس کام کی طرف ہے؟''

''آپ صبح یہ بل بھر دیں۔'' زہرہ نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ''ہم بعد میں حساب کر لیں گے۔''

''یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے میڈم!'' خاور نے الجھن بھری نظر سے مالک مکان کی طرف دیکھا۔ ''میں محدود آمدنی والا ایک تنخواہ دار شخص ہوں۔ اگر میں نے یہ بل ادا کر دیا تو میرے گھر کا بجٹ بگڑ جائے گا۔ ہمارے لیے مہینا گزارنا مشکل ہو جائے گا۔''

''اصل میں اس وقت میرے ہاتھ میں بھی اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔ ''اگر دو روز میں بل نہیں بھرا تو گراؤنڈ فلور کی لائٹ کٹ جائے گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔ آپ کسی طرح یہ بل جمع کرا دیں۔ یہ اضافی اماؤنٹ آپ کرائے میں سے کاٹ لیجیے گا.....پلیز!''

جب کوئی خاتون کسی مرد سے ''پلیز'' کے ساتھ کسی کام کو کرنے کے لیے کہتی ہے تو پھر اس ''نسوانی پلیز'' کی بدولت اس کام کے ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ خاور کے لیے یہ بھاری بل ادا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا تاہم اس نے کسی طرح زہرہ باجی کی ''پلیز'' کی لاج رکھ لی۔ اس ایثار کے لیے زہرہ نے خاور کا اسپیشل شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

چند روز خیریت سے گزرے تو ایک اور مصیبت نے سر اٹھایا۔ واٹر بورڈ کی طرف سے لائن میں پانی آنا بند ہو گیا۔ زیر زمین ٹینک میں جو پانی ذخیرہ تھا وہ ہفتہ بھر چلا۔ اس کے بعد پانی کے ٹینکر خریدنے کی نوبت آگئی۔ اس موقع پر خاور نے صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ زہرہ باجی نے جو

Digitized by Google

تجویز دی تھی وہ خاور کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔

''بھائی صاحب! یہ چند دن کی پریشانی ہے۔ ہمیں مل جل کر اس سے نمٹنا ہوگا۔'' زہرہ باجی نے خاور سے کہا۔

''مل جل کر نمٹنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' خاور نے محتاط نظر سے اپنی مالک مکان کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ خریدے ہوئے پانی کا جو ٹینکر ڈلے گا اس کی قیمت کو ہم تین پر تقسیم کرلیں گے۔'' زہرہ باجی نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ٹینکر میں ڈلواتی ہوں، دوسرا آپ اور تیسرا قیصر صاحب۔ جب تک واٹر بورڈ کی لائن میں معمول کی سپلائی جاری نہیں ہوتی، ہم اسی طرح کام چلائیں گے۔ اس طرح کسی ایک فیملی پر بوجھ نہیں پڑے گا۔''

''کان سیدھی طرح پکڑیں یا ہاتھ گھما کر، بات تو ایک ہی ہے۔'' خاور نے بیزاری سے کہا۔ ''لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے آپ کے گھر کو پانی کے ساتھ کرائے پر لیا تھا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے لائن میں پانی مہیا کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔ پھر میں اس ذیل میں اضافی خرچہ کیوں کروں؟''

خاور نے ایک اصولی بات کی تھی اور زہرہ باجی کو اس کا وعدہ بھی یاد دلا دیا تھا لیکن دوسری جانب زہرہ کچھ اور ہی طے کیے بیٹھی تھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو میں کون سا اپنے وعدے سے پھر رہی ہوں۔ جب سے آپ لوگ یہاں آئے ہیں، چوبیس گھنٹے نل میں پانی کی موجودگی میری ہی ذمے داری رہی ہے۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ پانی اوپری ٹینک تک چڑھانے والی بجلی کی موٹر بھی میرے ہی میٹر سے چلتی ہے۔ ابھی جو چند روز کی پریشانی ہے۔ اس سے کسی نہ کسی طرح باہمی اتفاق کے ذریعے ہی نمٹا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے، دو چار روز کے بعد پانی آنے لگے۔''

''بات دو چار روز کی ہو یا مہینے بھر کی لیکن میں نہ تو اپنی جیب سے ٹینکر ڈلواؤں گا اور نہ ہی کسی کے ڈلوائے ہوئے ٹینکر میں شیئرنگ کروں گا۔'' خاور نے واضح الفاظ میں کہا۔

خاور کے دوٹوک انداز نے زہرہ باجی کی طبیعت مکدر کردی۔ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ ''لیکن قیصر صاحب تو اس کے لیے تیار ہیں۔ صرف آپ ہی تعاون نہیں کررہے.....''

''بعض لوگوں کے پاس پتا نہیں، کہاں کہاں سے کمایا ہوا پیسا ہوتا ہے۔'' خاور نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں اپنی محنت کی کمائی میں سے اس قسم کے اضافی اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔''

''پھر تو بڑی مشکل ہوجائے گی.....!'' زہرہ باجی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مشکل اور آسان کو آپ خود دیکھ لیں۔'' خاور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں جو اضافی بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس لیے ہامی نہیں بھروں گا۔ پہلے ہی میں آپ کو اچھا خاصا کرایہ دے رہا ہوں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں غلط ہوں تو آپ جب کہیں گی، ایک ماہ کے نوٹس پر میں آپ کا مکان خالی کردوں گا۔''

خاور کے حتمی جواب کے بعد مزید کچھ کہنے اور سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ زہرہ باجی نے خاموشی اختیار کی۔ پھر دو روز بعد اس خاموشی کا بڑا بھیانک نتیجہ بھی برآمد ہوا۔

خاور آفس جانے کے لیے گھر سے نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ قیصر نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ قیصر اس وقت ناشتے کا سامان اٹھائے گھر کی طرف آرہا تھا۔ خاور رک گیا اور سوالیہ نظر سے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی صاحب.....!''

قیصر نے رسمی علیک سلیک کا تکلف بھی ضروری نہ سمجھا اور خاصے کھرے لہجے میں خاور سے پوچھا۔ ''آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟''

''میں ایک شپنگ کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔'' خاور نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔ ''آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟''

قیصر نے اس کے استفسارات کا جواب دینے کے بجائے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ کسی دینی پرنٹنگ پریس یا ایسے ہی کسی فلاحی ادارے سے وابستہ ہیں۔'' قیصر نے استہزائیہ نظر سے خاور کی طرف دیکھا۔

''آپ نے کس بنا پر ایسا سمجھ لیا؟''

''آپ کی اخلاقی اقدار سے بھرپور سماج سدھار گفتگو کی بنا پر۔'' قیصر نے خاور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔

''پتا نہیں، آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔'' خاور نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''معلوم نہیں آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے۔''

''میں یہ ساری باتیں اس لیے کررہا ہوں کہ آپ کو احساس دلاسکوں، صرف ایک آپ ہی اس دنیا میں رزقِ

حلال نہیں کما رہے۔'' قیصر نے تیز نظر سے خاور کو گھورا۔ ''دوسرے لوگ بھی ایمان داری اور محنت کی روزی روٹی کما رہے ہیں۔''

قیصر کی مبہم اور تیکھی باتوں سے خاور کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اسے آفس کے لیے بھی دیر ہو رہی تھی۔ اس کا آفس صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک ہوتا تھا۔ اور گھر سے آفس تک کم از کم تیس منٹ کی ڈرائیو تھی لہٰذا خاور نے قیصر سے جان چھڑانے کی غرض سے کہہ دیا۔

''بھائی صاحب! فضول بحث وتکرار کے لیے میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، کھل کر کہہ دیں۔ اگر آپ کی شکایت جائز ہوئی تو میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ نے زہرہ باجی سے میرے ذریعہ آمدنی کے بارے میں کیا کہا تھا؟'' قیصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کچھ نہیں.....'' خاور نے بھویں سکیڑ کر قیصر کی جانب دیکھا۔ ''آپ کے بارے میں تو زہرہ باجی سے میری کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔''

''زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کریں۔ میں آپ کی چالاکی کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' قیصر نے معاندانہ نظر سے خاور کی طرف دیکھا۔ ''اگر آپ کو یاد نہیں آرہا تو میں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا زہرہ باجی نے آپ سے خریدے ہوئے واٹر ٹینکر کی قیمت میں شیئرنگ کی بات کی تھی؟''

''بالکل، انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔'' خاور نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور میں نے شیئرنگ کے لیے انہیں صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ گھر میں نے پانی کے ساتھ ان سے کرائے پر لیا تھا۔ اگر کسی بھی سبب پانی کی قلت پیدا ہوگئی ہے تو اس کمی کو پورا کرنا مالکِ مکان کی ذمے داری ہے۔''

''آپ نے گھر زہرہ باجی سے پانی کے ساتھ لیا تھا یا اس کرائے کے اندر بجلی اور گیس بھی شامل تھے.....'' قیصر بے حد رکھائی سے بولا۔ ''یہ آپ کا اور باجی زہرہ کا مسئلہ ہے۔''

''اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ کا کیا مسئلہ ہے؟'' خاور نے بیزاری سے کہا۔

''جب باجی زہرہ نے آپ کو بتایا کہ اوپر والا کرائے دار یعنی میں پانی کے ٹینکرز میں شیئرنگ کے لیے راضی ہوں تو آپ نے معنی خیز انداز میں کہا تھا..... بعض لوگوں کے پاس پتا نہیں، کہاں کہاں سے کمایا ہوا پیسا ہوتا ہے۔'' قیصر نے ناپسندیدہ نظر سے خاور کو گھورا اور تاکیدی انداز میں پوچھا۔ ''آپ نے ایسا کہا تھا یا نہیں؟''

''اس قسم کی کوئی بات ہوئی تو تھی لیکن میرا ہرگز وہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے اخذ کیا ہے۔'' خاور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں باجی زہرہ کو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میری آمدنی محدود ہے لہٰذا میں کسی بھی قسم کا اضافی خرچہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ ہاں، جن لوگوں کے پاس پیسے کی ریل پیل ہے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اپنی کہی ہوئی زہریلی بات کو مہذب الفاظ کا لبادہ اوڑھا کر آپ اپنی غلطی کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' قیصر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، میں اسے آپ کی پہلی کوتاہی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔ اگر آئندہ آپ نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔''

بات ختم کرنے کے لیے خاور نے مصلحت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سمجھ گیا جناب۔''

قیصر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ''دوسروں کی آمدن پر نظر رکھنے اور اس آمدن کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے زیادہ محنت کرو اور اپنی انکم کو بڑھانے کی کوشش کرو.....''

خاور اچھی طرح جانتا تھا کہ قیصر نے یہ الفاظ اسے سلگانے کے لیے ادا کیے تھے۔ اس دوران میں باجی زہرہ کا دیرینہ پڑوسی عرفان اپنے دروازے پر موجود تھا۔ وہ گیٹ پر کھڑا ان دونوں کی تکرار کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نے بیچ میں کودنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ جب قیصر بلڈنگ کے اندر داخل ہوگیا تو اس نے خاور سے پوچھا۔

''خاور بھائی خیریت تو ہے۔ یہ کیوں آپ کے ساتھ اکڑ رہا تھا؟''

''کوئی خاص بات نہیں عرفان بھائی۔'' خاور نے سرسری انداز میں کہا۔ ''پانی کی قلت کا ایشو ہے۔ باجی زہرہ کا کہنا ہے کہ پانی کا جو ٹینکر خرید کر ڈلوایا جا رہا ہے اس میں سب شیئر کریں۔ قیصر، باجی زہرہ کی اس تجویز سے متفق ہے مگر میں نے ویٹو کر دیا ہے کیونکہ جب میں نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا تو زہرہ باجی نے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے لائن میں پانی فراہم کرنے کی ذمے داری انہی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ٹینکر کی قیمت میں شیئرنگ سے انکار کر کے اصولی بات کی ہے۔''

''آپ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں خاور بھائی۔''

عرفان نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے موقف کی حمایت کرتا ہوں لیکن یہ سمجھ نہیں آرہا کہ قیصر اس معاملے میں ''مامے خان'' کا کردار کیوں ادا کررہا ہے۔ وہ تو آپ سے اس لہجے میں بات کررہا تھا جیسے اس بلڈنگ کا وہی مالک ہو۔''

قیصر کے لیے عرفان کے لہجے سے ناپسندیدگی جھلکتی تھی لیکن خاور اس معاملے کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا اس نے موضوع کا رخ تبدیل کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''عرفان بھائی آپ تو سالہا سال سے اس علاقے کے باسی ہیں۔ کیا یہاں پانی کی کمی کا مسئلہ پیدا ہوتا رہتا ہے؟''

''نہیں بھائی۔ ایسا دس سال کے بعد ہوا ہے۔'' عرفان نے بتایا۔ ''اس علاقے میں تو ہمیشہ پانی کی فراوانی رہی ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ اگر آپ اپنے زیرِ زمین ٹینک کا والو بند کرنا بھول گئے تو سمجھیں اوور فلو ہوکر آپ کے ٹینک کا پانی گلی کوندی نالے میں بدل دے گا۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں تھوڑی دیر میں جارہا ہوں۔''

عرفان کا آخری جملہ خاور کے پلّے نہیں پڑا تھا۔ بے ساختہ اس نے پوچھ لیا۔ ''آپ کہاں جارہے ہیں عرفان بھائی۔''

''واٹر بورڈ کے آفس۔'' عرفان نے جواب دیا۔ ''تاکہ یہ پتا چلے کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ لائن میں کب سے پانی آنے لگے گا؟ ہم کب تک ٹینکر خرید خرید کر گزارہ کریں گے؟''

''آپ تو ایک نیک کام کرنے جارہے ہیں۔'' خاور نے ستائشی نظر سے عرفان کی طرف دیکھا۔ ''اللہ آپ کو اس عملِ صالح کا صلہ دے گا۔''

''بس جناب، میں سماجی کاموں میں حسبِ توفیق اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہوں۔'' عرفان نے انکسار بھرے انداز میں کہا۔ ''ہماری آٹو اسپیئر پارٹس کی مارکیٹ ذرا دیر سے کھلتی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ دکان پر جانے سے پہلے واٹر بورڈ کے آفس کو ٹچ کرلیتا ہوں۔''

''آپ نے تعمیری انداز میں سوچا ہے۔'' خاور نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آفس سے دیر ہورہی ہے۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''نوکری کا معاملہ ہے بھائی۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

''اوکے..... اللہ حافظ!'' عرفان نے معتدل انداز میں کہا۔

خاور نے اپنے پڑوسی کو ''خدا حافظ'' کہا اور گاڑی کو آفس کے راستے پر ڈال دیا۔ راستے بھر وہ قیصر سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ زہرہ باجی ہی نے قیصر کو اس کے ''ریمارکس'' کے بارے میں بتایا ہوگا۔ قیصر کے حوالے سے اس نے صرف زہرہ باجی ہی سے بات کی تھی اور اس اظہارِ خیال سے اس کا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ وہ تو زہرہ کو اپنی مالی پوزیشن سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال، اس نے طے کرلیا کہ آئندہ زہرہ باجی سے بات کرتے ہوئے وہ محتاط الفاظ کا استعمال کرے گا کیونکہ تجربے سے ثابت ہوا تھا کہ باجی پیٹ کی ہلکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خاور نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ قیصر کے منہ لگنے سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ قیصر کا انداز اور مزاج خاور کو پسند نہیں آیا تھا۔ ایسے فتنہ پرور گرم دماغ لوگوں سے دور رہنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

اس شام جب خاور گھر آیا تو شبانہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔''

''کیا اس خوشخبری کا تعلق ثمرین کے رشتے سے ہے؟'' خاور نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

انہیں بفرزون کے علاقے میں شفٹ ہوئے اب ایک ماہ سے زیادہ ہوگیا تھا۔ یہ شفٹنگ انہوں نے ایک خاص مقصد سے کی تھی۔ وہ اپنا ذاتی مکان کرائے پر اٹھا کر یہاں اس لیے آئے تھے کہ ثمرین کی کسی اچھی جگہ پر شادی ہوجائے۔ شبانہ نے ''خوشخبری'' کے الفاظ ادا کیے تو خاور کا دھیان اسی طرف چلا گیا تھا۔

''نہیں!'' خاور کے سوال کے جواب میں شبانہ نے نفی میں گردن ہلادی۔

خاور نے الجھن زدہ نظر سے بیوی کو دیکھا اور کہا۔ ''پھر.....؟''

''زہرہ باجی دن میں آئی تھیں.....''

''کیا وہ تمہیں اس بات پر آمادہ کرنے آئی تھیں کہ ہم خریدے ہوئے پانی کی قیمت میں حصہ ڈالیں.....؟'' شبانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی خاور نے سوال داغ دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' شبانہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ کل سے ہماری لائن میں واٹر بورڈ کا پانی آنے لگے گا۔ ایک دن چھوڑ کر پانی کی سپلائی جاری کردی جائے گی یعنی ایک دن پانی آئے گا اور ایک دن ناغہ ہوگی۔ انہوں نے آج پڑوسی عرفان کو واٹر بورڈ کے آفس معلومات حاصل کرنے بھیجا تھا۔ وہیں سے پتا چلا ہے۔''

خاور کی آج صبح عرفان سے اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ اس وقت عرفان نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یہ نیک کام زہرہ باجی کے ایما پر کرنے جارہا ہے۔ ممکن ہے، وہ یہ

بتانا بھول گیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایسی کوئی بات سرے سے ہو ہی نا۔ عرفان کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر زہرہ باجی کریڈٹ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ موقع محل دیکھ کر کسی دوسرے کی محنت کا کریڈٹ اپنے نام کرلیتے ہیں۔

خاور کو کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا تھا۔ وہ ایک امن پسند انسان تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ فساد سے دور رہا جائے۔ عرفان نے ازخود کوشش کی تھی یا اس کے پیچھے زہرہ باجی کا ہاتھ تھا اس حوالے سے سوچ کر خاور اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ لائن میں پانی کی سپلائی شروع ہوجائے گی۔ پانی اور ہوا انسان کی زندگی کی دو سب سے اہم بنیادی ضروریات ہیں۔''

''یہ نہیں پوچھیں گے کہ اتنے دن تک پانی کی سپلائی بند کیوں تھی؟'' شبانہ نے دلچسپ نظر سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''واٹر بورڈ کے پاس پانی کی قلت ہوگی۔'' خاور نے اندازہ لگانے والے انداز میں کہا۔ ''یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا پمپنگ سسٹم خراب ہو۔''

''نہیں جی.....'' وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''اس کی کوئی اور ہی وجہ تھی۔''

''اچھا.....!'' خاور نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے بیوی کو دیکھا۔ ''پھر یہ بھی بتادو کہ وہ کیا وجہ تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم اس وجہ سے ناواقف ہو۔''

''واٹر بورڈ والوں نے عرفان بھائی کو بتایا ہے کہ ان کے مین سسٹم میں ایک کتا گر کر مرگیا تھا۔'' شبانہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''اتنے دن تک وہ اپنے سسٹم کو صاف شفاف کرنے میں لگے رہے اسی لیے ہمارے بلاک کی چند گلیوں میں پانی کی سپلائی کو بند رکھنا پڑا۔ ہماری گلی بھی انہی متاثرہ گلیوں میں شامل ہے۔''

''چلیں، اللہ کا شکر ہے کہ مسئلہ حل ہوگیا۔'' خاور نے مطمئن انداز میں کہا۔

اگلے روز سے لائن میں فراوانی سے پانی کی ترسیل شروع ہوگئی۔ کراچی والوں کی یہ فطرتِ ثانیہ ہے کہ جب پانی کی قلت کا سامنا ہو تو پانی کو بہت احتیاط سے استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ لوگ ہاتھ منہ دھونے والے استعمال شدہ صابن ملے پانی کو بھی کسی ٹب یا بالٹی میں جمع کرلیتے ہیں تاکہ ٹوائلٹ میں فلش کے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکے اور جب گھر میں پانی کی فراوانی ہو تو کفایت شعاری کے سارے اصول ذہن سے محو ہوجاتے ہیں۔ ان دنوں کچن کے سنک میں نل کو مستقل کھلا رکھ کر ہی برتن دھوئے جاتے ہیں اور پورے گھر کا فرش دھونا بھی روزمرہ کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔

باجی زہرہ کی بلڈنگ میں پانی کی صحت مند آمد نے سب سے زیادہ خاور کو متاثر کیا تھا اور یہ ''متاثر'' ہونا مثبت نہیں بلکہ منفی تھا۔ ایک روز وہ تیار ہوکر آفس جانے کے لیے گھر سے نکلا تو گاڑی کی چھت اور ایک طرف کے دروازوں کو نہائے ہوئے پایا اور مسلسل ناگہانی نے اس کی ڈائلن ''ون ٹوکٹی وائے'' کو بری طرح گندا کردیا تھا۔ گاڑی کے نیچے کی زمین پر بھی پانی پھیلا ہوا تھا۔ خاور اپنی کار کو گیٹ کے باہر پارک کیا کرتا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ یہ سب بالائی منزل کے رہائشی قیصر کا کیا دھرا تھا۔ اس نے انتہائی غصے کے عالم میں قیصر کے گھر کی گھنٹی بجادی۔

بالائی منزل کے ٹیرس کے پانی کی نکاسی کے لیے بالکونی میں دو انچ قطر کا ایک آہنی پائپ نصب کیا گیا تھا جو لگ بھگ ایک فٹ تک باہر کو نکلا ہوا تھا۔ خاور کی گاڑی اسی پائپ کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ یقیناً آج صبح ہی صبح بالائی منزل کا ٹیرس دھویا گیا تھا جس کی وجہ سے گندا پانی اس پائپ کے راستے ایک پرنالے کی صورت سیدھا خاور کی کار کی چھت اور ایک سائڈ کے دروازوں پر گرا تھا۔

پانچویں گھنٹی پر قیصر آنکھیں ملتا ہوا بالکونی میں نمودار ہوا پھر نیچے جھانکتے ہوئے غصیلے لہجے میں متفسر ہوا۔ ''کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے جو اس طرح مسلسل گھنٹی بجائے جارہے ہو؟''

''اس قیامت کا عنوان ہے..... گندگی پھیلانا۔'' خاور نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ ذرا نیچے آؤ پھر بات کرتے ہیں۔''

قیصر نے اوپر کھڑے ہوکر بحث وتکرار میں وقت ضائع نہیں کیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹراؤزر بنیان میں ملبوس خاور کے سامنے کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''اب بتاؤ، مجھے نیند سے کیوں جگایا؟''

''تم کتنے بے حس انسان ہو۔'' خاور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میری گاڑی کا ستیاناس ہوگیا اور تم اپنی نیند کا رونا رو رہے ہو۔ بتاؤ، میں اس حالت میں گاڑی کو آفس لے کر جاسکتا ہوں.....؟''

قیصر نے پہلی مرتبہ خاور کی گاڑی کا جائزہ لیا پھر نگاہ

اٹھا کر بالائی منزل کی بالکونی میں نصب ایک نئے پائپ کو دیکھا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ خاور کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''مجھے افسوس ہوا ہے، لگتا ہے، ماسی نے آج ٹیرس دھوڈالا ہے۔ بہرحال..... سوری بھائی۔''

خاور کی گاڑی کا جو حشر ہوا تھا، سو ہوا تھا۔ اس پر قیصر کے غیر انسانی انداز نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں پتا ہے نا، میں روزانہ اسی جگہ اپنی گاڑی کھڑی کرتا ہوں۔ اگر اتنی صبح ٹیرس کو دھلوانے کا مشورہ آپ کو کسی ڈاکٹر نے دیا تھا تو مجھے بتا دیتے۔ میں گاڑی کو یہاں سے ہٹا کر کہیں اور پارک کر دیتا.....!''

''میرے ذہن میں نہیں رہا تھا۔'' قیصر بے پروائی سے بولا۔ ''میں نے ماسی کے لیے دروازہ کھولا پھر سو گیا..... وہ صفائی ستھرائی کا کام کر کے چلی گئی۔ اس نے ٹیرس کو دھونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر اس لمحے مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ تمہیں گاڑی ہٹانے کے لیے کہہ دوں۔''

''جب تمہیں اپنی گاڑی کو وقت، بے وقت پارکنگ سے نکالنا ہوتا ہے تب تو تم میری گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے ہٹانے سے کبھی نہیں چوکتے۔'' خاور نے گہری چوٹ کی۔ ''خیر، اب بتاؤ۔ اس گاڑی کا کیا کرنا ہے؟''

''میں نے ''سوری'' بول تو دیا۔'' قیصر نے عجیب سی نظر سے خاور کی طرف دیکھا۔ ''اور کیا اب میں تمہارے پاؤں چھوؤں.....؟''

''کیا تمہارے سوری کہنے سے میری گاڑی صاف ہو جائے گی؟'' خاور نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''او..... ہو.....'' قیصر منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ ''کہیں تم مجھ سے یہ توقع تو نہیں کر رہے کہ میں صافی پکڑ کر تمہاری کھٹارا گاڑی کو صاف کرنے میں لگ جاؤں گا۔''

''اخلاقیات کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم نے جو گندگی پھیلائی ہے اسے خود صاف کر دیا کسی اور سے صاف کراؤ۔'' خاور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''باقی جہاں تک گاڑی کی کنڈیشن کا معاملہ ہے تو اندر کھڑی تمہاری نیلی ٹویوٹا اسٹارلٹ بھی کوئی شوروم سے نکل کر نہیں آئی۔ انسان کو منہ کھولنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیے۔''

''او بھائی.....'' قیصر نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''اخلاقیات کا درس کسی اور کو جا کر دو۔ صبح صبح میرا دماغ خراب نہیں کرو۔''

''واہ! یہ تو چوری اور سینہ زوری ہوئی۔'' خاور نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو میری گاڑی کا بیڑا غرق کر دیا۔ الٹا غرا بھی مجھی پر رہے ہو۔''

''میں غرا نہیں رہا، آرام سے سمجھا رہا ہوں۔'' قیصر ایک ایک لفظ پر زور دے کر خاصے خطرناک انداز میں بولا۔ ''میرا غرانا تم برداشت نہیں کر سکو گے۔''

''کیوں.....'' خاور کو بھی طیش آگیا۔ ''کیا غرانے کے دوران میں تم کاٹنے بھی ہو؟''

خاور کی بات سن کر قیصر کا پارا ہائی ہو گیا۔ وہ معاندانہ انداز میں خاور کی جانب بڑھا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ''ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو.....''

قبل اس کے کہ وہ دونوں دست و گریباں ہوتے، آس پڑوس والوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ان کی بحث و تکرار کے نتیجے میں عرفان اور دوسری طرف والے پڑوسی وحید صاحب اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ سامنے والے گھر سے یعقوب صاحب بھی نمودار ہو چکے تھے۔ یعقوب صاحب کا تعلق ایک مخصوص کمیونٹی سے تھا۔ یہ لوگ بہت امن پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے کاروباری ہوتے ہیں۔ دنگا فساد اور ہنگامہ آرائی سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں الغرض ان تمام افراد نے مل کر دونوں کو سمجھایا کہ محلے داری کا معاملہ ہے۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی عادت ڈالیں۔

''حضرت! میرے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے۔'' خاور نے وحید صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ میری گاڑی کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے تو اس اللہ کے بندے سے صرف شکایت کی تھی۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ الٹا دھونس دھاندلی پر اتر آیا۔''

خاور کی بات کے جواب میں قیصر نے کچھ کہنا چاہا تو وحید صاحب نے کندھے سے پکڑ کر اسے بولنے سے روک دیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قیصر صاحب! آپ اوپر اپنے گھر میں جائیں اور ماسی کو آئندہ کے لیے تاکید کر دیں کہ جب بھی اس کا ٹیرس دھونے کا ارادہ ہو، وہ بالکونی سے جھانک کر نیچے دیکھ لیا کرے۔ اگر پرنالے کے نیچے کوئی بھی گاڑی پارک ہو تو پہلے اس گاڑی کے مالک کو اپنی گاڑی ہٹانے کے لیے کہا جائے۔ اس کے بعد ٹیرس کی دھلائی شروع کی جائے۔''

وحید صاحب اس گلی کے ایک معتبر انسان تھے۔ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ دین کے ساتھ انہیں دلی لگاؤ تھا۔ وہ زیادہ تر درس وتدریس اور تبلیغ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ قیصر کے جائے فساد سے ہٹ جانے کے بعد وحید صاحب نے اپنے ملازم کو بلا کر کہا۔

''شاکر امیرے نکلنے میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ تم پہلے خاور صاحب کی گاڑی صاف کردو، بعد میں میری کر دینا۔ خاور صاحب کو آفس جانے میں دیر ہورہی ہے۔''

''وحید صاحب! اس تکلف کی ضرورت نہیں۔'' خاور جلدی سے بولا۔ ''میں خود صاف کرلوں گا۔ آپ نے احساس کیا، میرے لیے یہی بہت ہے۔ اس نیک جذبے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''شاکر کو میں نے کام کے لیے ہی ملازم رکھا ہوا ہے لہٰذا اسے اپنا کام کرنے دیں۔'' وحید صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''باقی جہاں تک احساس کرنے کا معاملہ ہے تو یہ خاصیت ہر ایک کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ اکیلا انسان کچھ بھی نہیں اسی لیے وہ گروہوں کی صورت رہنے پر مجبور ہے۔ انسان خاندان بناتے ہیں پھر مختلف خاندانوں کی بود و باش سے محلے تشکیل پاتے ہیں۔ سیکڑوں، ہزاروں محلوں کے ملاپ سے ایک معاشرہ بنتا ہے۔ انسان اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے لہٰذا انسان کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا احساس کرنا چاہیے تاکہ معاشرے کی فضا صحت منداور خوشگوار رہے۔''

جب تک وحید صاحب کی سنجیدہ اور پُراثر نصیحت و مفید گفتگو جاری رہی، اس دوران میں شاکر نے صافی بار کر خاور کی گاڑی کو چمکا دیا تھا۔ معاملہ خوش اسلوبی سے رفع دفع ہو چکا تھا چنانچہ خاور اپنے آفس کی جانب روانہ ہوگیا۔

جس وقت یہ بدمزگی جاری تھی، باجی زہرہ اپنے گھر میں موجود نہیں تھی۔ وہ گزشتہ روز اپنی بیٹی شازیہ سے ملنے گئی تھی اور اپنے نواسوں اور نواسیوں کے پُرزور اصرار پر رات کو وہیں رک گئی تھی۔ اگلے روز وہ خصوصی طور پر خاور سے ملنے آئی اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''وحید صاحب کی زبانی مجھے سارا قصہ معلوم ہو چکا ہے۔ قیصر کے رویے کا مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ مطمئن ہوجائیں، میں نے ان کی ماسی عابدہ کی کلاس لے لی ہے۔ آئندہ آپ کو ایسی کوفت کا سامنا نہیں ہوگا۔''

انسان کے بارے میں ال خوارزمی کا حساب

☆ جب انسان کے پاس صرف اخلاق ہو تو کُل نمبر=1

☆ اگر ساتھ خوب صورتی بھی ہو تو دائیں طرف صفر بڑھا دیں=10

☆ اگر ساتھ مال و دولت بھی ہو تو ایک صفر اور لگا دیں=100

☆ اگر ساتھ حسب نسب بھی ہو تو صفر اور لگا دیں=1000

☆ اگر یہ سب ہوں لیکن اخلاق نہ ہو تو 1 کو ہٹا دیں تو باقی بچے گا=000

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

باجی زہرہ کی اس مثبت سوچ پر کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں بچا تھا۔ خاور بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''باجی! آپ کا اوپر والا کرائے دار خاصا ٹیڑھا اور گرم دماغ کا بندہ ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ اس کے منہ نہ لگوں۔ باقی آپ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اگر دوبارہ ایسی صورتِ حال پیدا نہ ہو تو اچھی بات ہے۔''

خاور کو گزشتہ، پانی کے ٹینکر میں شیئرنگ والے معاملے سے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ زہرہ باجی پیٹ کی ہلکی ہیں۔ اس نے [illegible] یہ عہد بھی کیا تھا کہ وہ زہرہ باجی سے [illegible] کرے گا لیکن ابھی اس نے قیصر کے [illegible] یہ اس کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ باجی زہرہ من وعن یہ الفاظ قیصر تک پہنچا دے۔ قیصر کے جنگلی رویے کی وجہ سے اس کا دل خاصا کپا ہوا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ ان سخت الفاظ کے تیروں سے قیصر کا کلیجا بھی چھلنی ہو۔ یہ شعوری طور پر خاور کا انتقام لینے کا ایک مہذب انداز تھا۔

چند روز بخیر و عافیت گزر گئے۔ عید قربان کی آمد سے پہلے ایک نیا تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ قیصر قربانی کے لیے ایک صحت منداور خوب صورت بچھیا خرید لایا تھا جو اس نے گیٹ کے باہر خاور کی گاڑی کے ساتھ ملا کر باندھ دی تھی۔ اس کے بعد جو ہونا تھا اسے سمجھنے کے لیے انسان کا نیوٹن یا

آئن اسٹائن ہونا ضروری نہیں۔

بچھیا ایک جانور تھی۔ اسے کسی انسان کی طرح یہ نہیں سمجھایا جاسکتا تھا کہ..... دیکھو بی بی! تمہارے برابر میں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ تم اسے اپنے جیسا چار پہیوں والا کوئی جانور نہیں سمجھنا۔ یہ انسانوں کی سواری ہے لہٰذا تم اسے گندا نہیں کرنا۔ وغیرہ وغیرہ!

خاور نے دو تین روز برداشت کیا پھر ایک شام اس کا قیصر سے خاصا زوردار پھڈا ہوگیا۔ یہ عید سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ قیصر اپنی بچھیا کو اس کی گاڑی کی بغل میں کھونٹے سے باندھنے لگا تو اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''بھائی! کیا تمہیں جانور باندھنے کے لیے یہی جگہ ملی تھی۔ دیکھ رہے ہو، اس بچھیا کی وجہ سے میری گاڑی کا کیا حشر نشر ہو رہا ہے؟''

خاور نے شکایت کرتے ہوئے اپنے لہجے کو حتی الامکان معتدل رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسری جانب قیصر خاصے جارحانہ موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بچھیا کو باندھنے کے بعد دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر خاور سے مستفسر ہوا۔

''تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں قربانی کے اس جانور کو دوسری منزل پر لے جا کر اپنے گھر کے اندر باندھ دوں۔''

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' خاور جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کیا ضروری ہے کہ بچھیا کو میری گاڑی کے پہلو ہی میں باندھا جائے۔ تم کچھ فاصلے پر بھی اس کے لیے انتظام کر سکتے ہو نا.....!''

قیصر نے اپنی انگلی سے گلی کے دونوں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''غور سے دیکھو، ہر شخص کا جانور اس کے گھر کے سامنے ہی بندھا ہوا ہے۔ یہ میرا حق ہے کہ اپنی بچھیا کو یہاں باندھوں۔ اگر تمہیں اپنی گاڑی کی اتنی ہی فکر کھائے جا رہی ہے تو اسے دو تین روز کے لیے کسی قریبی پیٹرول پمپ پر پارک کرلیا کرو۔ جب تک قربانی نہیں ہو جاتی، میں تو اپنی بچھیا کو ادھر ہی باندھوں گا۔ تم جو کر سکتے ہو، کرلو.....''

قیصر کے آخری جملے میں ایک چیلنج تھا۔ خاور نے غصیلی نظر سے اسے گھورا اور پوچھا۔ ''اگر میں جا کر ابھی قربانی کا ایک جانور خرید لاؤں اور اسے تمہاری اسٹارلٹ کے پہلو میں باندھ دوں تو تمہیں کیسا لگے گا؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' قیصر نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں تمہیں زہرہ باجی سے این او سی لینا ہوگا کیونکہ میری اسٹارلٹ کے برابر میں ان کی گاڑی بھی کھڑی ہے۔ وہ ایسی حرکت کے لیے تمہیں کبھی بھی اجازت نہیں دیں گی۔ ویسے ایک بات کہوں.....''

قیصر کے آخری معنی خیز جملے کے جواب میں خاور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اگر بچھیا کو یہاں سے ہٹانے کے ذیل میں کوئی بات ہے تو فوراً سے پیشتر کہہ ڈالو۔''

''یہ بچھیا تو قربان ہو کر ہی یہاں سے ہٹے گی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا لیکن لگتا ہے، تمہارا سننے کا موڈ نہیں ہے۔''

''نہیں، نہیں..... میں اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں ہوں۔'' خاور نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔''

''قربانی کی توفیق اور سعادت ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔'' قیصر نے خاور کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم چونکہ اس سعادت سے محروم ہو اس لیے تمہیں اس بچھیا سے حسد ہو رہا ہے۔ اس وقت تمہارے دل سے میرے لیے اور اس بے زبان جانور کے لیے بددعائیں نکل رہی ہوں گی لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر قربانی سے پہلے میری بچھیا کو کچھ ہوا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ سمجھ گئے نا.....؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو.....!'' خاور نے بے ساختہ کہا۔

''اوئے منہ سنبھال کر بات کر۔'' قیصر نے خاور کو گریبان سے پکڑ لیا۔

خاور اس قسم کی صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ قیصر طاقت اور توانائی میں خاور سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جب قیصر نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکا دیا تو وہ الٹے قدموں پیچھے جا گرا۔ اس کے عقب میں گاڑی کھڑی تھی۔ وہ کمر کے بل اپنی گاڑی سے ٹکرایا تو اس کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔ گاڑی سے ہونے والے ٹکراؤ نے اس کی کمر کو چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ بمشکل تمام اٹھ کر کھڑا ہوا تو قیصر نے اسے ایک اور زوردار دھکا دے دیا۔ اب کی بار وہ بچھیا کے قدموں میں جا گرا۔

اس ہنگامے نے آس پاس موجود لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ شور کی آواز سن کر گھر کے اندر سے شبانہ بھی نکل آئی تھی۔ بچھیا کے انتہائی قریب گرنے کے باعث خاور کا لباس بھی بری طرح آلودہ ہو گیا تھا۔ لوگوں نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا۔

سب نے خاور کو سمجھانے کی کوشش کی کہ عید میں ایک آدھ دن رہ گیا ہے۔ وہ دل پر بھاری پتھر رکھ کر یہ تکلیف

برداشت کرلے۔ اہلِ گلی قیصر کے غیر انسانی رویے کی حمایت ہرگز نہیں کررہے تھے تاہم یہ موقع اور حالات کا تقاضا تھا کہ خاور کو ہر صورت تحمل اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔ خاور نے لوگوں کے اس مشورے کا کڑوا گھونٹ تو حلق سے اتار لیا لیکن قیصر کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔ بس، خیریت سے عید گزر جائے.....!''

پھر عید کے چند روز بعد ہی خاور کو قیصر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔

جب جھگڑا ختم ہوا اور شبانہ، خاور کو گھر کے اندر لے گئی تھی تو اس رات وہ کافی دیر تک قیصر کی بے ہودگیوں اور بدتمیزیوں پر بات کرتے رہے تھے۔ شبانہ کا کہنا یہ تھا کہ اس سلسلے میں انہیں باجی زہرہ سے بات کرنا چاہیے۔

''ان حالات میں ایک گھر کے اندر زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گا۔'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''باجی زہرہ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' خاور مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان کے لیے ہم دونوں کرائے دار ہیں۔''

''لیکن باجی کو یہ تو سمجھنا چاہیے کہ ان کے ایک کرائے دار نے دوسرے کرائے دار کی زندگی کس طرح اجیرن کر رکھی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''قیصر جو کچھ بھی کررہا ہے یہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔'' خاور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''باجی زہرہ اس کمبخت سانڈ کی فطرت کو تو نہیں بدل سکتی نا جبکہ انہیں ذاتی طور پر اس سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔ اگر ہم نے زیادہ زور دیا تو وہ کہہ سکتی ہیں..... ہمارا گزارہ نہیں ہورہا تو ہم گھر چھوڑ دیں۔ ہمیں اور بہت سارے گھر مل جائیں گے اور انہیں کرائے دار..... وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں پہلے بھی اس قسم کی بات کرچکی ہیں جب میں نے پانی والے ٹینکر کے لیے شیئرنگ کرنے سے صاف منع کردیا تھا۔''

''اگر وہ ایسی ہی جانب داری کا مظاہرہ کریں گی تو ہم ان کا گھر چھوڑ دیں گے۔'' شبانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''عید کی چھٹیاں گزر جائیں تو آپ اسی علاقے کے ایک دو اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کرلیں۔ اسی بلاک کی کسی اور گلی میں ہمیں اسی رینج کا کوئی گھر مل ہی جائے گا۔ یہ صاف ستھرا پوش ایریا ہے۔ اگر یہاں سے نزدیک ہی کوئی گھر مل گیا تو پھر شفٹنگ میں خاصی آسانی رہے گی۔''

اس فیملی کے تینوں افراد خاور، شبانہ اور شمرین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اگر زہرہ باجی نے ان کی دادرسی نہ کی اور قیصر نے بھی اپنی روش نہ بدلی تو وہ لوگ پہلی فرصت میں یہ مکان چھوڑ دیں گے۔

مگر نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے ہی خاور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور اس وقت وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول قیصر کی موت چودہ فروری کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ قیصر کو گردن توڑ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اگلی صبح یعنی پندرہ فروری نو بج کر دس منٹ پر ملزم خاور کو ایک پولیس ناکے پر گرفتار کرلیا گیا تھا۔ وہ گھر سے آفس جارہا تھا تو معمول کی چیکنگ میں جب اس کی گاڑی کی ڈکی کو کھول کر دیکھا گیا تو وہاں قیصر کی لاش موجود تھی۔ خاور اپنی کار کی ڈکی میں قیصر کی لاش کی موجودگی سے بے خبر تھا تاہم ناکے پر موجود پولیس اہلکاروں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے قیصر کے قتل کے الزام میں دھر لیا گیا تھا۔

کہانی کے ابتدائی حصے میں، میں نے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ یہ کیس مجھے تاخیر سے ملا تھا یعنی جب میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تو اس واقعے کو پیش آئے چند ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا تاہم اس دوران میں کوئی بھی قابلِ ذکر عدالتی کارروائی مکمل نہیں آئی تھی۔ خاور کی گرفتاری کے فوراً بعد شبانہ نے زہرہ باجی والا کرائے کا گھر چھوڑ دیا تھا اور وہ ماں بیٹی واپس اپنے گھر میں چلی گئی تھیں۔

اس کیس کے حوالے سے وجوانب کو باریک بینی سے اسٹڈی کرنے کے بعد میں نے اپنے موکل کی بیوی شبانہ کو اپنے آفس بلوا کر چند اہم کام ذمے لگا دیے تھے۔ شبانہ کو مقتول کی ذات کے حوالے سے ایسی معلومات حاصل کرنا تھیں جو اس کے شوہر کی بریت میں کلیدی کردار ادا کرسکیں۔ شبانہ نے مجھے وقوعہ کی رات کی جو کہانی سنائی تھی وہ میری ذاتی تحقیق سے میل کھاتی تھی۔ میں نے اپنے موکل خاور سے بھی تفصیلی بات کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قیصر کی موت سے خاور کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ خاور کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ میں نے پورے اطمینان سے اپنے موکل کی بیروی کا فیصلہ کیا تھا..... چند روز بعد شبانہ نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کردیں تو اس سے

میرے اطمینان کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

استغاثہ کی جانب سے کم و بیش نصف درجن گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی اہم بات ہوگی۔

اس کیس کا تفتیشی افسر ایک چاق و چوبند سب انسپکٹر تھا۔ عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے باجی زہرہ کا پڑوسی گواہی دینے وٹنس باکس میں پہنچا۔

عرفان کو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میری معلومات کے مطابق عرفان میرے موکل کا خیر خواہ تھا اور مقتول کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ تو اس کا نام صفائی کے گواہوں کی فہرست میں ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال، دیکھنا یہ تھا کہ عرفان کے بیان کی نوعیت کیا ہوگی۔

عرفان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

''عرفان صاحب!'' وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ باجی زہرہ کے پڑوس میں کب سے آباد ہیں؟''

''کم و بیش تیس سال سے۔'' عرفان نے جواب دیا۔ ''میری تو پیدائش بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔''

''باجی زہرہ کے دیرینہ پڑوسی ہونے کے ناتے آپ کو ان کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں گی۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ زہرہ باجی اپنی گزر اوقات کے لیے گھر کی زیریں اور بالائی منزل کو کرائے پر اٹھاتی ہیں اور خود دو منزل پر رہائش پذیر ہیں۔''

''جی۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میں، میں نے ان کے کئی کرائے داروں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔''

''کیا آپ کی نظر سے ملزم اور مقتول جیسے کرائے دار بھی گزرے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں گزرے جناب!'' عرفان نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

وکیل استغاثہ نے چیمبر خانی کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو ان دونوں میں کیا خاص بات نظر آئی تھی؟''

''مقتول اکھڑ مزاج تھا اور ملزم میں برداشت کی کمی ہے۔'' عرفان نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور یہی ان کے بیچ تنازع کا بنیادی سبب تھا۔''

''ایسا تنازع جس کا انجام ایک کی موت اور دوسرے کی گرفتاری پر ہوا۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''ہیں نا.....؟''

گواہ نے مختصر جواب دیا۔ ''جی بالکل!''

''عرفان صاحب! آپ ملزم اور مقتول کے بیچ ہونے والے بعض تنازعاتی واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کو ایک خاص زاویے پر موڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ عید قرباں سے ایک روز قبل ایسے ہی ایک جھگڑے میں ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔ کیا آپ ملزم کے وہ سنگین الفاظ معزز عدالت کے سامنے دہرائیں گے.....!''

''جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' گواہ نے خاصے توانا لہجے میں جواب دیا۔ ''ملزم نے بڑے خطرناک انداز میں مقتول کو وارننگ دی تھی۔''

''اس روز ملزم کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو دہرائیں۔'' وکیل استغاثہ نے اکسانے والے انداز میں کہا۔

گواہ نے جواب دیا۔ ''ملزم نے مقتول کی جانب انگلی اٹھا کر یہ وارننگ دی تھی..... تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔ بس، خیریت سے عید گزر جائے۔''

''ہاں، پھر عید قرباں خیریت سے گزر گئی۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور چند روز بعد مقتول اپنی جان سے گیا۔ آپ کو کیا لگتا ہے، ملزم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا تھا.....؟''

وکیل استغاثہ ایک خاص انداز سے اپنے الفاظ گواہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں وکیل مخالف کے طریقۂ واردات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ گواہ عرفان کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔

''جی۔ حالات و واقعات سے تو یہی نظر آتا ہے۔''

''وقوعہ کی رات آپ اپنے گھر پر موجود تھے۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس رات مقتول اور ملزم کی مالکِ مکان بھی اپنے گھر پر تھیں؟''

Digitized by Google

''میری معلومات کے مطابق، باجی زہرہ اس رات اپنے گھر میں موجود نہیں تھیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''چودہ فروری کی دوپہر میں جب میں اپنی شاپ کی طرف جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا تو باجی زہرہ سے میری بات ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی طرف جارہی ہیں اور کل صبح یعنی پندرہ فروری کو واپس آئیں گی۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وقوعہ کی رات اس بلڈنگ میں مقتول اور ملزم کی فیملی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا.....؟''

''جی۔ یہی حقیقت ہے۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات آپ نے زہرہ باجی کے گھر میں کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز سنی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس آواز نے آپ کو چونکا بھی دیا تھا..... ہیں نا؟''

''جی بالکل!'' گواہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''وہ کسی بھاری بھرکم چیز کے ''دھڑام'' سے گرنے کی آواز تھی۔''

''کیا آپ نے اس آواز کا سبب جاننے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ زیریں منزل کی گھنٹی بجا کر ملزم سے دریافت کروں کہ بھائی، گھر میں سب خیریت تو ہے نا.....'' گواہ نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''پھر میں نے اپنے اس خیال کو رد کردیا کہ خوامخواہ کوئی نیا پھڈا نہ اٹھ کھڑا ہو۔ ان دنوں ویسے بھی ملزم اور مقتول کے بیچ چپقلش عروج پر تھی۔ آدھی رات کو گھنٹی بجانے پر ملزم پتا نہیں، کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرے۔ ویسے بھی ملزم اور اس کے بیوی بچے رات جلدی سونے کے عادی ہیں اور مجھے کسی کے آرام میں خلل ڈالنا بالکل پسند نہیں ہے۔''

''اوہ..... یہ تو آپ نے بالکل نئی بات بتائی۔'' وکیل استغاثہ نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا واقعی ملزم رات کو جلدی سونے کا عادی ہے؟''

''جی۔ یہ لوگ رات دس بجے تک سو جاتے ہیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''اسی طرح یہ فیملی صبح جلدی اٹھنے کی بھی عادی ہے۔''

''لیکن جب آپ نے زہرہ باجی کے گھر میں کسی بھاری بھرکم شے کے ''دھڑام'' سے گرنے کی آواز سنی تو اس وقت آدھی رات کا عمل تھا۔'' وکیل استغاثہ نے تیکھے انداز میں دریافت کیا۔ ''کیا وقوعہ کی رات ملزم اور اس کی فیملی کے باقی افراد یرنیک جاگ رہے تھے؟''

''میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' گواہ نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''البتہ، زیریں منزل کے اندرونی حصے کی لائٹس تو آن تھیں۔''

''کیا پہلے بھی رات گئے تک ملزم کے گھر کی اندرونی لائٹس آن رہا کرتی تھیں؟'' وکیل استغاثہ نے گواہ سے سوال کیا۔

''نہیں جناب۔ میں نے پہلے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔'' استغاثہ کا گواہ تردیدی انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''دس بجے کے بعد ملزم کے گھر کے اندرونی حصے میں عموماً تاریکی ہی چھائی رہتی تھی۔ صرف پارکنگ ایریا کی لائٹ آن رہتی تھی جس کا کنکشن باجی زہرہ والے میٹر سے ہے۔''

''کاش آپ وقوعہ کی رات ''دھڑام'' کی آواز سننے کے بعد اپنے پڑوسی کی گھنٹی بجا کر ذرا خیریت لے لیتے تو آپ کو پتا چل جاتا کہ وہ بھاری بھرکم ''دھڑام'' سے گرنے والی کوئی بے جان شے نہیں تھی بلکہ مقتول قیصر کی لاش تھی۔ بہرحال.....'' لمحاتی توقف کرکے وکیل استغاثہ نے گہری سانس خارج کی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جنابِ عالی! اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ وقوعہ کی رات باجی زہرہ کی بلڈنگ میں صرف چار افراد موجود تھے یعنی بالائی منزل کا رہائشی مقتول قیصر اور زیریں منزل کے رہائشی ملزم خاور کی فیملی کے تین افراد اور..... ان تمام لوگوں میں صرف دو مرد تھے۔ ایک مقتول اور دوسرا ملزم لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ملزم ہی نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ دیٹس آل یور آنر۔ مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

وکیل استغاثہ کے بعد اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے جرح کے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور گواہ سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست کو اپنے گواہ اور ملزم کے پڑوسی عرفان صاحب سے اور کچھ نہیں پوچھنا لیکن مجھے تو استغاثہ کے اس گواہ سے بہت سارے اہم سوالات کرنا ہیں مگر اس سے پہلے نمبر ہے انکوائری آفیسر کا۔ میری

معزز عدالت سے استدعا ہے کہ مجھے اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات پوچھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔"

اس کیس کا تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ ایک نوجوان اور مستعد پولیس آفیسر تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا جاچکا ہے کہ کسی بھی کیس میں آئی او یعنی انکوائری آفیسر کی حیثیت بہت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ ایک لحاظ سے استغاثہ کا والی ہوتا ہے لہٰذا ہر پیشی پر ایک وارث کے روپ میں اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

میری فرمائش پر معزز عدالت کے حکم سے آئی او وٹنس باکس میں آگیا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

"آئی او صاحب! ماشاءاللہ! بہت کم وقت میں ..... اچھی خاصی ترقی کرلی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق آپ کم وبیش تیس سال کے ہیں جبکہ بعض پولیس اہلکار تو اپنی عمر بھر کی سروس میں بہ مشکل اے ایس آئی کے مقام تک پہنچ پاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اس تیز رفتار ترقی میں آپ کی قابلیت کا بڑا ہاتھ ہے۔"

"انسان اگر محنتی اور ایمان دار ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ترقی کرنے سے روک نہیں سکتی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ایسے لوگوں کے لیے قدرت خود بخود آگے بڑھنے کے راستے بنادیتی ہے۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں، محنتی اور ایمان دار ہونے کے علاوہ انسان کا ذہین ہونا بھی ضروری ہے یعنی اپنے شعبے کے تمام معاملات سے اسے گہری واقفیت چاہیے اور یہ کام ذہانت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آئی او صاحب! آپ سے میرا پہلا سوال۔" میں نے جرح کا ..... آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "میری نظر میں آپ ایک ہونہار اور قابل پولیس آفیسر ہیں۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ کے نزدیک "جائے وقوعہ" کی کیا تعریف ہے؟"

"وقوعہ، جائے وقوعہ، جائے واردات یا کرائم سین یا موقع واردات سب ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یعنی وہ مقام جہاں قابلِ دخل اندازی پولیس کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔"

"زیرِ سماعت کیس میں آپ کے خیال میں قابلِ دخل اندازی پولیس کون سا واقعہ پیش آیا تھا؟" میں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے گھیرنے کا عمل شروع کردیا۔

"قیصر نامی ایک شخص کا قتل۔" اس نے جواب دیا۔

"آئی او صاحب! میں آپ کے جواب سے صد فیصد مطمئن ہوں۔" میں نے اسے باتوں پر چڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی لیاقت کا قائل ہوگیا۔ اب ذرا آپ اس کیس کی مناسبت سے جائے وقوعہ کی نشاندہی بھی فرمادیں؟"

"باجی زہرہ نامی ایک بیوہ خاتون کے گھر کی زیریں منزل۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "جہاں ملزم کی رہائش تھی۔"

"ملزم کی رہائش کا کون سا حصہ؟"

"پارکنگ والا کونا۔" وہ بے ساختہ بولا۔ "جہاں سے اوپر جانے والا زینہ شروع ہوتا ہے۔"

اس نے بے دھیانی میں میرے بچھائے ہوئے ہم رنگِ زمین جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے جال کو سمیٹنا شروع کیا۔

"آئی او صاحب! آپ نے عدالت میں اس کیس کا جو چالان پیش کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ مقتول کی لاش سخی حسن اور حیدری کے درمیان ایک چورنگی کے نالے پر ملزم کی کار کی ڈکی میں سے ملی تھی۔" میں نے کہا۔ "پولیس نے پہلی بار لاش کو ملزم کی کار کی ڈکی میں دیکھا تھا۔ اس دن تاریخ پندرہ فروری اور وقت لگ بھگ صبح سوا نو بجے کا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب۔ آپ نے حقیقت بیان کی ہے۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول قیصر کو گردن توڑ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مقتول کو ڈکی میں فٹ کرنے کے بعد گردن توڑ کر موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا ہو۔" میں نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا۔ "اور جائے وقوعہ باجی زہرہ کے گھر کے علاوہ کوئی اور مقام ہو.....؟"

"نہیں جناب۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جائے وقوعہ تو وہی ہے جس کا میں نے رپورٹ میں ذکر کیا ہے۔"

"تو گویا آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات پر مصر ہیں کہ چودہ فروری کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران

Digitized by Google

میں میرے موکل نے مقتول قیصر کی گردن توڑ کر اس کی زندگی کا چراغ گل کیا پھر اس کی لاش کو اپنی کار کی ڈکی میں چھپا کر وہ اپنے گھر میں اطمینان سے سو گیا۔ اگلی صبح وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے گھر سے نکلا اور بدقسمتی سے چورنگی والے ناکے پر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ داڑھی یم از اپ.....!''

''بالکل!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میرا یہی خیال ہے۔''

''آپ کا خیال کوئی آسمانی صحیفہ نہیں کہ اس پر من وعن یقین کرلیا جائے۔'' میں نے پہلی بار قدرے سخت انداز میں کہا۔ ''آپ کی تھیوری میں بہت سارے تکنیکی سقم پائے جاتے ہیں، معزز عدالت کی باریک بین نگاہ جنہیں نظر انداز نہیں کرسکتی۔''

وہ میرے الفاظ کی ترشی سے قدرے حیرت زدہ ہوا پھر الجھن زدہ انداز میں پوچھ بیٹھا۔ ''مثلاً کون کون سے تکنیکی سقم؟''

''آپ کی تیار کردہ رپورٹ کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر میں دو منٹ کے بعد بات کروں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے آپ میرے ایک دو ضروری سوالات کے جواب دیں..... بہت سوچ سمجھ کر کیونکہ..... آپ کو جواب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے اس کیس کے ملزم اور اپنے موکل خاور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے اندازے کے مطابق اس کی عمر کیا ہوگی؟''

''لگ بھگ پچاس سال۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''بالکل درست۔ اب یہ بتائیں کہ اس کا قد کتنا ہوگا؟''

''پانچ فٹ یا ایک آدھ انچ زیادہ.....!''

''جواب درست۔'' میں نے ایک بار پھر اسے شاباشی دی اور پوچھا۔ ''اس کے وزن کے بارے میں آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے؟''

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''یہی کوئی ساٹھ کلوگرام۔''

''واہ بھئی وا.....'' میں نے کہا۔ ''آئی او صاحب! میں آپ کی قوتِ مشاہدہ کو مان گیا ہوں۔ اب آپ کی یادداشت کا امتحان ہے.....''

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ نومبر 2018ء
کی جھلکیاں

جوش ایمانی
اس شخص کا زندگی نامہ جس نے حرمتِ رسولؐ کے نام پر پھانسی چڑھنا قبول کیا

تاریخی مقابلے
ان اہم مقابلوں کا تذکرہ جو آج بھی لہو گرم کردیتے ہیں

قصہ پارینہ
فلمی دنیا کی کہی اَن کہی باتیں جو یادوں کے دریچے کھول دیتی ہیں

موت کا ہرکارہ
انسانوں سے انتقام لینے والے ہاتھی کا شکار خودکشی کے مترادف تھا کیونکہ کئی شکاری جان گنوا چکے تھے

کڑوا سچ
بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دینے کا انجام، ایک ایسی سچ بیانی جسے پڑھتے ہوئے آنکھیں نم ہوجائیں گی

اور بھی بہت کچھ ہے
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے اور سچی داستانیں، وہی کچھ جس کی توقعات سرگزشت سے ہے۔

بس ایک بار سرگزشت پڑھیں،
گرویدہ آپ خود ہوجائیں گے

اتنا کہہ کر میں چند لمحات کے لیے خاموش ہوا اور انکوائری آفیسر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مقتول کی لاش کا تو بغور معائنہ کیا تھا نا؟''

''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''یہ تو وقوعہ کی کارروائی کا سب سے اہم حصہ ہے۔''

''میرے علم کے مطابق.....'' میں نے آئی او کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پُرآواز بلند کہنا شروع کیا۔ ''مقتول قیصر لحیم شحیم اور قدآور شخص تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور وزن کسی بھی طرح سو کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ اس کی عمر بھی چالیس کے اریب قریب تھی۔ وہ اپنے جثے اور شخصیت کے اعتبار سے ایک دبنگ انسان تھا اور طاقت و توانائی کے حوالے سے خاور اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا.....''

''پھر.....؟'' آئی او نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ ''پھر..... پھر.....!''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس کی الجھن میں ناراضی بھی شامل ہوگئی۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے تند لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے مقتول کے ڈیل ڈول کے حوالے سے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں ان میں آپ کو کوئی خامی تو نظر نہیں آرہی؟ یہ بات میں آپ سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ میرے اس سوال کا جواب آپ سے زیادہ بہتر اور کوئی دے نہیں سکتا۔''

''کم و بیش آپ کا بیان درست ہے۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''شکریہ آئی او صاحب!'' میں نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں نے کس بات کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے اور سمجھنے کا موقع فراہم نہیں کیا اور اس پر تابڑ توڑ حملے شروع کردیے۔

''آئی او صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے جائے وقوعہ کی جو تعریف بیان کی ہے، باجی زہرہ کے گھر کی زیریں منزل کا کوئی بھی حصہ اس پر پورا نہیں اترتا۔ بفرضِ محال اگر چند سیکنڈ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ مقتول قیصر کو زیریں منزل والے زینے کے قریب موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تو اس امر کو ثابت کرنے کے لیے استغاثہ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''ایک لحاظ سے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن حقیقت وہی ہے جو چالان کے اندر بیان کی گئی ہے۔''

''آئی او صاحب! پولیس کا تیار کردہ چالان کوئی عدالت کا فیصلہ نہیں ہوتا جسے تسلیم کرنا لازم ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''عدالت میں ہر چیز کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ عدالت کو کوئی ایسا مستند مواد مہیا کرسکتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ مقتول قیصر کو آپ کے بیان کردہ مقام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ جب کوئی معقول اور مدلل جواب نہ بن پڑا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے چڑھائی کے عمل میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

''آئی او صاحب! خدا کو حاضر ناظر جان کر معزز عدالت کو بتائیں کہ کیا ملزم جیسا پستہ قامت سخنی سا ایک ناتواں پچاس سالہ شخص کسی گینڈا صفت چھ فٹے لحیم شحیم بندے کی گردن توڑ کر اس کی زندگی کا چراغ گل کرسکتا ہے؟''

''اگر آمنے سامنے سے مقابلہ ہو تو ہرگز نہیں۔'' آئی او نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن اگر زبردست کی بے خبری میں زیردست کا داؤ چل جائے تو ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔''

''تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملزم نے گھات لگا کر مقتول کو شکار کیا تھا؟'' میں نے اس کے موقف کی مناسبت سے کہا۔ ''مقتول بے خبری میں مارا گیا..... ہیں نا؟''

''جی ہاں!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''اور آپ کی تصوری کی روشنی میں یہ بھی ممکن ہے کہ ملزم نے تن تنہا مقتول کی لاش کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر کار کی ڈکی تک پہنچایا اور مذکورہ لاش کو ڈکی میں بند کرکے وہ چین کی نیند سوگیا۔ اگلی صبح وہ لاش کو ٹھکانے

لگانے کے لیے گھر سے نکلا اور آنکھیں بند کر کے کار کو روڈ پر دوڑانے لگا..... ہیں نا؟''

اب کی بار اس نے میرے سوال کے جواب میں ''جی ہاں'' نہیں کہا بلکہ الٹا مجھ سے مستفسر ہوا۔

''کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کس طرح ڈرائیونگ کر سکتا ہے؟''

''جس طرح میرے موکل نے کی.....'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس کی الجھن سوا ہو گئی۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب!'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

''اگر اس کیس کا ملزم یعنی میرا موکل آنکھیں کھول کر ڈرائیونگ کر رہا ہوتا تو چورنگی پر لگا ہوا پولیس کا ناکا اسے دور ہی سے دکھائی دے جاتا۔ آپ کے پیش کردہ چالان کے مطابق ملزم مقتول کی لاش کو اپنی کار کی ڈکی میں ڈال کر کہیں ٹھکانے لگانے جا رہا تھا۔ اگر واقعتاً ایسا ہی تھا تو پھر اسے چورنگی سے پہلے ہی اپنی کار کو بائیں موڑ لینا چاہیے تھا تاکہ پولیس کی گرفت اور دست برد سے محفوظ رہے لیکن اس بدنصیب نے تو اپنی آنکھیں اور دماغ کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔ اسے نہ تو چورنگی کے پار پولیس کا ناکا نظر آیا اور نہ ہی چورنگی سے پہلے بائیں طرف مڑنے والی سڑک دکھائی دی لہٰذا اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے، سیدھے جا کر ناکے پر موجود پولیس کو رضاکارانہ سلامی پیش کی اور دست بستہ یہ عرض کی..... میں اپنی سی کوشش کر کے برضا و رغبت آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں تاکہ آپ کا کام آسان ہو جائے..... ہیں نا؟''

قبل اس کے کہ وہ جواب میں ''ہاں نا'' یا ''نہیں جناب'' جیسا کوئی مختصر جملہ بولتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

''جناب عالی!'' عدالت کی برخاستی سے پہلے میں نے درخواست کی۔ ''جناب عالی! اس پیشی پر مجھے استغاثہ کے گواہ عرفان سے سوالات کرنے کا موقع نہیں مل سکا لہٰذا آئندہ پیشی پر گواہ مذکور کو عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور آنر۔''

میں نے آخری اوپر اپنی جرح کی مدد سے استغاثہ کی عمارت کی چھت اور دیواروں میں متعدد دراڑیں ڈال دی تھیں۔ جج اس دوران میں وقفے وقفے سے اپنے سامنے میز پر رکھے کاغذات پر کچھ نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا لہٰذا میری حالیہ استدعا کا پاس کرتے ہوئے اس نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ آئندہ پیشی پر گواہ عرفان کو عدالت میں لازمی حاضر کیا جائے۔

☆☆☆

اب اس کیس کی ایک مخصوص شکل نکل کر سامنے آ گئی تھی اور تمام متعلقین و متعلقات کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ زیر سماعت کیس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔ میرے لیے خوش آئند امر یہ بھی تھا کہ موکل کی بیوی میری کارکردگی سے کلی طور پر مطمئن تھی۔ اگلی پیشی سے قبل وہ مجھ سے ملاقات کرنے دفتر آئی اور اس نے مجھے مقتول کی بیوی کے حوالے سے گراں قدر معلومات فراہم کیں۔ شبانہ تندہی سے اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اس کا شوہر باعزت بری ہو جائے۔ خاور ان ماں بیٹی کا واحد سہارا تھا اور اس کی بریت کو یقینی بنانا میری ذمے داری تھی۔

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو پتا چلا کہ عرفان غیر حاضر ہے۔ اس کی جانب سے ناسازی طبع کا میڈیکل سرٹیفکیٹ آ گیا تھا۔ گویا یہ ''تو نہ سہی، تیرا سرٹیفکیٹ ہی سہی'' ایسی صورت حال تھی۔

اس پیشی پر چار پانچ گواہان استغاثہ کو بھگتایا گیا جن میں عرفان کے علاوہ وہ تمام افراد شامل تھے جو گاہے بگاہے مقتول اور ملزم کے بیچ ہونے والی بدمزگیوں کے عینی شاہد تھے۔ استغاثہ ان گواہان کے بیانات سے عدالت کو باور کرانا چاہتا تھا کہ مقتول اور ملزم کے درمیان شدید نوعیت کی رنجش پائی جاتی تھی۔ وکیل استغاثہ نے ہر گواہ پر جرح کرتے ہوئے ملزم کے اس مکالمے کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی تھی..... ''جنہیں تو میں دیکھ لوں گا۔ بس، خیریت سے عید گزر جائے۔''

اس تمام تر کارکردگی سے وکیل استغاثہ یہ ثابت کرنے کی سعی میں مصروف تھا کہ بالآخر ملزم نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مقتول کو ٹھکانے لگا دیا تھا یعنی مقتول قیصر کی موت ملزم کی انتقامی کارروائی کا نتیجہ تھی۔ میں اس دوران میں بڑے تحمل سے عدالتی کارروائی کو دیکھتا رہا تھا اور میں نے ان میں سے کسی گواہ پر بھی قابل ذکر جرح نہیں کی

تھی۔ بس، رسمی سوالات سے انہیں پاس آن کر دیا تھا لیکن جب ملزم اور مقتول کی مالک مکان باجی زہرہ گواہی دینے کے لیے کٹہرے میں پہنچی تو میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔

زہرہ جگت باجی تھیں یعنی ہر چھوٹا بڑا انہیں ''باجی'' کہہ کر پکارتا تھا اور یہ ''پکار'' اتنے تواتر کے ساتھ جاری وساری تھی کہ ''باجی'' کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا تھا۔

زہرہ باجی کی عمر ساٹھ کے آس پاس تھی۔ وہ درمیانے قد کی مالک ایک فربہ اندام عورت تھیں تاہم عمر کے اس حصے میں بھی وہ کافی چاق چوبند دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے نظر کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا جسے وہ وقفے وقفے سے اپنی انگلی کی مدد سے ناک پر سیٹ کرتی رہتی تھیں۔ جب زہرہ باجی کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب آ گیا۔

''زہرہ باجی!'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ ملزم اپنے رویے کے اعتبار سے بڑا عجیب وغریب انسان ہے؟''

''وکیل صاحب! آپ نے ملزم کے حوالے سے بڑے مناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے۔'' زہرہ باجی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ اللہ کا بندہ عجیب بھی ہے اور غریب بھی.....''

''کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گی؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

''میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کی ہے وکیل صاحب۔'' وہ وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی پھر ناک پر اپنے چشمے کو درست کرنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''عجیب ان معنوں میں کہ ہر معاملے میں اپنی منطق چلانا اور غریب اس حوالے سے کہ اگر چند روز کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو گئی تو خریدے جانے والے پانی کے بیٹر میں شیئرنگ سے صاف انکار کر دینا۔''

''لیکن اس خریدے ہوئے پانی کے استعمال سے ہرگز انکار نہیں کرنا۔'' وکیل استغاثہ نے میرے موکل کا تمسخر اڑانے کی غرض سے گہری چوٹ کی۔

عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم کی حیثیت کسی یتیم ویسیر بچے ایسی ہوتی ہے۔ ایک دم مجبور اور بے بس۔ اسے وکیل استغاثہ اور گواہان استغاثہ کی کڑوی کسیلی باتوں کو بڑے صبر اور برداشت کے ساتھ سننا اور سہنا پڑتا ہے۔ جواب میں ریمارکس پاس کرنے کی اسے اجازت نہیں ہوتی۔

وکیل استغاثہ کے معاندانہ تلخ جملے کو میرے موکل نے بڑی ہمت سے برداشت کر لیا تاہم اس دل آزاری کا عکس اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔ میں اپنے موکل کو پہنچنے والی تکلیف سے بخوبی آگاہ تھا اور اپنی باری پر وکیل استغاثہ کی اس غیر اخلاقی حرکت کا منہ زور جواب دینے کے لیے پُرعزم بھی۔

اس کے بعد بھی وکیل استغاثہ نے باجی زہرہ سے ایسے ہی سوالات کیے جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ملزم کے اندر مقتول کے لیے بہت زیادہ غم وغصہ بھرا ہوا تھا لہٰذا موقع میسر آتے ہی اس نے اپنے ناپسندیدہ شخص یعنی مقتول قیصر کا کام تمام کر دیا۔ اپنی جرح کے آخر میں اس نے گواہ سے یہ سوال کیا۔

''زہرہ باجی! مقتول لگ بھگ چھ ماہ تک آپ کا کرائے دار رہا۔ کیا اس دوران میں اس نے کبھی آپ کو شکایت کا موقع دیا؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں وکیل صاحب۔''

وکیل استغاثہ کے اس سوال اور گواہ کے اس جواب نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں باجی زہرہ سے جس نوعیت کی جرح کرنا چاہتا تھا اس کے لیے راہ ہموار ہو گئی تھی۔ اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''زہرہ جی!'' میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں بھی آپ کو باجی کہہ سکتا ہوں؟''

''سب کہتے ہیں۔ آپ بھی کہہ لیں۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''لیکن مجھے بہت فرق پڑتا ہے.....'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑ کر مستفسر ہوئی۔ ''مثلاً آپ کو کیا فرق پڑتا ہے وکیل صاحب؟''

استغاثہ کے معماروں (وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر) نے میرے موکل کو جس دیوار میں چھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا، میں نے اپنی جرح کی مدد سے اس دیوار کے متعدد مقامات پر دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اب دو تین زوردار دھکوں کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مذکورہ دیوار کا زمین بوس ہو جانا ایک لازمی امر تھا اور میرے موکل کی آزادی یقینی.....!

''اگر میں آپ کو باجی کہوں گا تو پھر یہ توقع بھی رکھوں گا کہ آپ مجھ سے کسی قسم کی دروغ گوئی نہ کریں۔'' میں نے زہرہ باجی کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ مجھ سے سچ بولنے کو تیار ہیں؟''

''میں نے دوسرے وکیل صاحب کے ہر سوال کا سچا اور کھرا جواب دیا ہے۔'' زہرہ باجی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو بھی مایوس نہیں کروں گی۔ کسی غلط بیانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''ملزم کتنے عرصے تک آپ کا کرائے دار رہا تھا؟''

''دو ماہ سے کچھ زیادہ۔'' اس نے بتایا۔

''کیا اس دوران میں ملزم نے آپ کو وقت پر کرایہ دیا؟''

''جی بالکل۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اس معاملے میں اس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔''

''کیا ملزم بروقت بجلی اور گیس کے بلز بینک میں جمع کرایا کرتا تھا؟'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

''کیا اپنے مختصر قیام کے دوران میں ملزم نے یا اس کی فیملی کے کسی فرد نے آپ کے مکان کے کسی حصے کو کوئی نقصان پہنچایا؟''

''قطعاً نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا کبھی ملزم نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی یا کسی قسم کا جارحانہ انداز اپنایا؟''

''ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پھر آپ نے..... زہرہ باجی! آپ نے.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے میرے موکل کو عجیب و غریب انسان کے لقب سے کیوں نوازا۔ آخر اس نے آپ کا کیا بگاڑا تھا؟''

''میں اس بات کی وضاحت کر چکی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''ملزم کے لیے ''عجیب'' کا لفظ میں نے اس کے معقول کے ساتھ روپے کی بنا پر استعمال کیا تھا اور ''غریب'' کا لفظ اس کے پانی کی قیمت میں شیئرنگ والے معاملے میں عدم تعاون کی وجہ سے تھا۔''

''مقتول کے ساتھ ملزم کے روپے کا ایک خاص سبب تھا اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جس بنا پر آپ نے میرے موکل کو ''غریب'' کہا وہ بداخلاقی اور بے اصولی کے زمرے میں آتا ہے۔''

وہ اپنی ناک پر چشمے کو ٹھیک طرح سے بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اس میں بے اصولی اور بداخلاقی والی کون سی بات ہے وکیل صاحب؟''

''ملزم نے بڑے واضح انداز میں آپ کو باور کرا دیا تھا کہ وہ بڑی محنت سے رزقِ حلال کماتا ہے لہٰذا اس کی آمدنی محدود ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی اضافی بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ملزم کی اس کمزوری کو ''غریب'' کا طعنہ دے کر اس کے مالی حالات کا مذاق اڑانا ایک بداخلاقی ہے اور جہاں تک بے اصولی کا معاملہ ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جب میرے موکل نے آپ سے یہ گھر کرائے پر لیا تھا تو اسی وقت یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پانی کی فراہمی آپ کی ذمے داری ہو گی لہٰذا میں سمجھتا ہوں، شیئرز کی قیمت میں شیئرنگ سے انکار کرنا میرے موکل کی غربت پر دلالت نہیں کرتا بلکہ یہ تو اس کے اصول پرست ہونے کا ثبوت ہے۔''

''میں مانتی ہوں کہ میں نے اپنے گھر کی زیریں منزل پانی کی فراہمی کے وعدے کے ساتھ ملزم کو کرائے پر دی تھی۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''لیکن باہمی تعاون بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پانی کی قلت کا معاملہ چند روز کا تھا۔ اگر ملزم تعاون کے لیے تیار ہو جاتا تو یہ اس کے بڑے پن کی بات ہوتی.....''

''باجی! اصول تو اصول ہی ہوتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''مثال کے طور پر اگر میں آپ سے سو روپے ادھار لوں تو مقررہ وقت پر یہ ادھار کی رقم مجھے آپ کو واپس کرنا ہو گی۔ یہ سوچ کر میں آپ کے سو روپے دبا نہیں سکتا کہ آپ تو کروڑ پتی خاتون ہیں۔ سو روپے کی آپ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ اگر میں یہ رقم آپ کو نہیں لوٹاؤں تو آپ خدانخواستہ غریب نہیں ہو جائیں گی۔ اگر میں ایسا کروں گا تو یہ سراسر اصول کی خلاف ورزی کہلائے گی۔''

''بہت خوب.....'' وہ تمسخر انداز میں بولی۔ ''آپ تو ہر حال میں ملزم کی حمایت پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔''

''اس کا ایک خاص سبب ہے زہرہ باجی!'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''اور وہ سبب یہ ہے کہ خاور اس کیس میں ملزم نامزد ہے جبکہ میرے ریکارڈ میں وہ میرا موکل ہے۔ اس کے حقوق کی حفاظت میری اخلاقی ذمے داری ہے۔ اگر کبھی آپ کو کسی قانونی معاملے میں میری خدمات کی ضرورت پیش آئی تو میں اسی طرح آپ کی بھی حمایت کروں گا۔''

''اللہ نہ کرے کہ مجھے کبھی عدالت کا منہ دیکھنا پڑے۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

Digitized by Google

"عدالت کا منہ دیکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ انسان کسی سنگین مقدمے ہی میں ملوث ہو۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت بھی آپ عدالت کے کمرے ہی میں کھڑی ہیں اور اس کورٹ روم تک قدم رنجہ فرمانے کے لیے یقیناً آپ نے کورٹ کا منہ بھی دیکھا ہوگا۔ سٹی کورٹ کے مین گیٹ سے گزر کر ہی آپ یہاں تک پہنچی ہیں۔"

وہ خفت بھرے انداز میں بولی۔ "کہہ تو آپ ٹھیک ہی رہے ہیں.....!"

"زہرہ باجی! آپ وقوعہ کے روز اپنے گھر میں موجود نہیں تھیں۔ غالباً آپ اپنی بیٹی شازیہ کی طرف گئی ہوئی تھیں۔" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "جائے وقوعہ سے آپ کی عدم موجودگی کے سبب میں آپ سے قیصر کو پیش آنے والے جان لیوا واقعے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس اتنا بتادیں کہ ملزم آپ کی نظر میں کیسا انسان ہے؟"

اس سے ملتا جلتا سوال جرح کے آغاز میں وکیل استغاثہ نے بھی باجی زہرہ سے کیا تھا جس کے جواب میں باجی نے میرے موکل کو ایک عجیب وغریب انسان قرار دیا تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے اسی حوالے سے میں نے زہرہ باجی کو خاصا رگڑا دیا تھا لہٰذا اس نے اب کی بار خاصا معقول جواب دیا۔

"مجموعی طور پر ملزم ایک اچھا انسان ہے۔"

"مطلب..... آپ کو میرے موکل سے ذاتی طور پر کوئی بڑی شکایت نہیں ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"جی بالکل نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل سرکار کے ایک سوال کے جواب میں مقتول کی ذات کے حوالے سے بھی اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔ "آپ بجا فرما رہے ہیں۔"

"کیا واقعی آپ کو مقتول سے کوئی شکایت نہیں تھی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے وکیل استغاثہ کے جواب میں غلط بیانی سے کام لیا ہے؟" الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"میں نے ایسا اس لیے سوچا کہ اصولی طور پر آپ کو مقتول سے شکایت نہیں بلکہ شکایات ہونا چاہئیں۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"وہ کس لیے بھلا؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"وہ اس لیے بھلا کہ شکیلہ کو مقتول سے اگنت شکایات تھیں۔" میں نے شبانہ کی فراہم کردہ اہم معلومات کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"شکیلہ.....!" اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولی۔ "کہیں آپ قیصر کی بیوی کا ذکر تو نہیں کر رہے؟"

"جی باجی.....!" میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ "میں مقتول کی بیوی ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"لیکن میرا شکیلہ کے معاملات سے کیا لینا دینا؟" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "آپ مجھے ان میاں بیوی کے گھریلو مسائل میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟"

"اللہ نہ کرے کہ میں کبھی ایسی بے ادبی کروں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے آپ کو باجی بولا ہے تو آپ کا احترام مجھ پر لازم ہے۔ میں آپ کو مقتول اینڈ کمپنی کے گھریلو معاملات میں گھسیٹنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ وہ تو میں نے کسی دوسرے مقصد سے بات کی تھی۔"

"اب ذرا اپنے مقصد کی وضاحت بھی کردیں؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ "میرا شکیلہ کے معاملات سے لینا دینا کیوں ہے۔"

"اس لیے کہ ایک عورت ہی کسی دوسری عورت کے دکھ درد کو سمجھ سکتی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ شکیلہ کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھیں.....!"

وہ کوئی مول جواب دے کر جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بہت فرق پڑتا ہے باجی.....!" میں نے بھی مبہم انداز میں کہا۔

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے مداخلت کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ "اس وقت عدالت میں قیصر مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ میرے فاضل دوست گواہ کو ادھر ادھر کی فضول باتوں میں الجھا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے روکا جائے۔"

میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے سلگانے والے انداز میں کہا۔ "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے.....!"

"بیگ صاحب!" جج نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ کے ان سوالات کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

Digitized by Google

''بہت گہرا اور نازک تعلق ہے جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت استغاثہ کی گواہ باجی زہرہ سے مقتول اور اس کی بیوہ شکیلہ کے بارے میں استفسار کر رہا ہوں۔ یہ دونوں کردار غیر متعلقہ کیسے ہو سکتے ہیں؟''

''مقتول کے حوالے سے جرح کرنا تو سمجھ میں آتا ہے۔'' وکیل استغاثہ ایک دوسرے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ''آپ اس کی بیوی کو کہاں سے اٹھا لائے ہیں؟''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آپ قانون داں ہیں۔ اتنا تو سمجھ سکتے ہیں کہ بھری عدالت میں آپ نے مقتول کی بیوہ کے بارے میں جو ریمارکس دیے ہیں ان پر آپ کے خلاف تعزیری یا کم از کم تادیبی کارروائی ہو سکتی ہے۔''

''کیوں.....!'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟''

''میں آپ کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔'' میں نے ناپسندیدہ نظر سے وکیل استغاثہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مقتول کی بیوہ شکیلہ کے حوالے سے مجھ سے سوال کیا تھا..... آپ اس کی بیوی کو کہاں سے اٹھا لائے ہیں.....'' میں نے اپنی بات کے اختتام پر درشت الفاظ میں سوال کیا۔ ''کسی کی بیوی کو اٹھا لانے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟''

''جو معنی آپ نے میری بات سے نکالے ہیں میرا ہرگز وہ مقصد نہیں تھا۔'' وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس سے میری مراد مقتول کی بیوہ کے ذکر سے تھی۔''

''آپ اس وقت اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھے ہوئے کہ جو منہ میں آیا، کہہ دیا اور اپنے کہے کی معذرتی کے معنی بھی پہنا دیے۔'' میں نے کڑی سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! یہ کورٹ روم ہے اور اس وقت عدالت کی کارروائی بھی عروج پر ہے۔ معزز جج کی موجودگی میں آپ کی زبان سے ادا ہونے والے ہر جملے کو انہی معانی کے تناظر میں لیا جائے گا جو لغت میں درج ہیں لہٰذا بولنے سے پہلے تولنا ضروری ہے اور کاٹنے سے پہلے ناپنا ورنہ..... محرم کو مجرم اور دعا کو دغا بنتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی۔ یہ ساعتوں اور ساعتوں کا کھیل ہے۔''

ہمیں آپس میں الجھتے دیکھ کر جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا مقتول کی بیوی شکیلہ کا زیر سماعت کیس سے کوئی سنجیدہ تعلق ہے؟''

''بہت ہی گہرا، حساس اور بنیادی تعلق جناب عالی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میرے فاضل دوست چند منٹ کے لیے صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو میں اس ''تعلق'' کو معزز عدالت کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔''

جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ غصّے بھرے انداز میں بغلیں جھانکنے لگا۔ میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ جگت باجی زہرہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''مقتول قیصر کو آپ کے گھر کی بالائی منزل کرائے پر لیے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت مقتول کو بالائی منزل پر رہائش اختیار کیے کم و بیش چھ ماہ ہوئے تھے۔'' زہرہ باجی نے جواب دیا۔

''اور ان چھ ماہ میں پہلے پانچ ماہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ رہے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر چھٹے ماہ شکیلہ روٹھ کر میکے چلی گئی تھی۔ جب قیصر کی موت واقع ہوئی ان دنوں وہ بیوی کے بغیر اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ شکیلہ کو اپنے والدین کے پاس پاپوش نگر گئے لگ بھگ ایک ماہ ہو گیا تھا۔ اگر میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں تو آپ مجھے ٹوک دیجیے گا باجی۔''

جج سمیت عدالت میں موجود ہر شخص کی نگاہ مجھ پر جمی تھی۔ آئی او اور وکیل استغاثہ تو گہری معاندانہ نظروں سے مجھے گھور رہے تھے جیسے وہ جانتے ہوں کہ میں شکیلہ کی پٹاری سے کون سا سانپ نکالنے والا ہوں.....!

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' زہرہ باجی نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ ان پانچ ماہ کے دوران میں مقتول اور اس کی بیوی شکیلہ کے بیچ اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''جس کی آوازیں آپ تک بھی پہنچتی رہتی تھیں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ میاں بیوی کے درمیان وجہ تنازع کیا تھی؟''

''دیکھیں وکیل صاحب! آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ''میں کسی کی عیب جوئی کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتی۔''

''یہ عیب جوئی نہیں، حقائق کی نقاب کشائی ہوگی۔''

Digitized by Google

میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس میں آپ کی کوئی ذاتی غرض بھی کارفرما نہیں ہے۔ آپ ایک حساس کیس میں گواہی دینے آئی ہیں اور آپ پر لازم ہے کہ سچائی کے اظہار میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کر جائیں کیونکہ اپنا بیان ریکارڈ کرانے سے پہلے آپ نے حلف اٹھایا تھا..... میں جو بھی کہوں گی، سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے پھر ٹھہرے ہوئے دا شگاف الفاظ میں کہا۔

''اس کے برعکس اگر آج آپ نے زبان بند رکھی تو انسانی تاریخ آپ کی اس غلطی کو کبھی معاف نہیں کرے گی کیونکہ آپ کی گواہی کے ساتھ ملزم کا مستقبل جڑا ہوا ہے۔ سچ بول کر ملزم کی بریت کی راہ ہموار کریں یا پھر مجرمانہ خاموشی اختیار کر کے ایک بے گناہ انسان کی زندگی میں تاریکی بھر دیں..... فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

اس کے چہرے پر زلزلے ایسے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کے ذہن میں مختلف خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ چند لمحات تک شش و پنج میں رہنے کے بعد وہ بے حد الجھے ہوئے اور لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا، کیا کہوں..... کیا نہ کہوں.....!''

''ری لیکس باجی! میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ آپ اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں۔ آپ صرف ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دیتی جائیں۔ اتنا تو کریں گی نا؟''

''ٹھیک ہے.....!'' وہ ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کے گھر کی بالائی منزل پر رہائش پذیر ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر ان لوگوں نے چار ماسیاں (گھریلو ملازمائیں) تبدیل کی تھیں۔ عابدہ ان کی پانچویں ماسی تھی؟''

''ہاں!'' باجی زہرہ نے جواب دیا۔

''جب تک مقتول کی بیوہ شکیلہ اس گھر میں موجود رہی، وہ پے در پے ماسیوں کی چھٹی کرتی چلی گئی؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے تولنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''اور پھر پانچ ماہ کے بعد شکیلہ مقتول سے جھگڑا کر کے اپنے میکے چلی گئی تھی؟''

اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔

''شکیلہ کے بار بار ماسیوں کو برخاست کرنے اور بالآخر مقتول سے خفا ہو کر اپنے والدین کے پاس چلے جانے کے پیچھے مقتول کا کردار کارفرما تھا۔'' میں نے جرح کے تابوت میں آخری میخ ٹھونکتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گی کہ مقتول ایک بدنظر شخص تھا؟''

''نہیں!''

''شکیلہ نے ایک دوبار آپ کے سامنے بھی ان مسائل کا رونا رویا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''خصوصاً جب آس پڑوس سے بھی مقتول کے کردار کے حوالے سے اس نوعیت کی شکایات موصول ہوئی تھیں؟''

''ہاں!'' باجی زہرہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے۔'' باجی زہرہ کے ''ہاں'' کہتے ہی وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''بزرگوں نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہیے لیکن میرے فاضل دوست تو ہاتھ دھو کر مقتول کی کردار کشی کرنے پر تل گئے ہیں۔ بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔''

وکیل استغاثہ کا آخری جملہ مجھے بڑی شدت سے چبھا لہٰذا اس رکیک جملے کا منہ توڑ جواب دینا مجھ پر واجب ٹھہرا تھا۔ میں نے نفرت آمیز نظر سے اپنے ہم پیشہ کو گھورا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یقیناً شرم کی ایک حد ہوتی ہے لیکن بے شرمی اور ڈھٹائی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہوا کرتی ہیں اور کسی بھی شرم والے کو ڈھٹائی اور سچائی کے درمیان موجود باریک لائن کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ جس طرح شرع میں شرم نہیں ہوتی، بعینہٖ عدالتی کارروائی کے دوران میں حقائق کی نقاب کشائی میں بھی کسی مصلحت یا رکاوٹ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اگر عدالت کے سامنے حالات کی اصل شکل پیش نہیں کی جائے گی تو وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کیسے دے گی۔ انصاف کے حصول کے لیے عدالتی تقاضے پورے کرنا انتہائی ضروری ہے۔''

''آپ تو سیدھا سیدھا مقتول کو ایک بدکردار شخص ڈکلیئر کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے حقائق کی اصلی تصویر کو اجاگر کیا ہے۔''

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور استغاثہ کی گواہ باجی زہرہ نے میرے موقف کی تائید بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ.....''

میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر روئے سخن جج کی جانب موڑا پھر نپے تلے الفاظ میں کہا۔

''اگر معزز عدالت میرے موقف کی تصدیق کی خواہش کرے گی تو میں اس سلسلے میں ایک ایسا جیتا جاگتا ٹھوس ثبوت مہیا کرسکتا ہوں جس کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''آپ کا اشارہ غالباً صفائی کے کسی معتبر گواہ کی جانب ہے؟'' جج نے دلچسپ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''غالباً نہیں، یقیناً جناب عالی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری نگاہ میں تو باجی زہرہ کی گواہی بھی لائق اعتبار ہے لیکن میں تصدیقی عمل کو فائنل جج لگانے کے لیے مقتول کی بیوہ شکیلہ کو آئندہ پیشی پر عدالت میں حاضر کرسکتا ہوں۔''

جج نے میری پیشکش نما تجویز پر صاد کیا۔

عدالت کا مقررہ وقت قریباً ختم تھا لہٰذا جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

میں نے شکیلہ کو عدالت میں پیش کرنے کا دعویٰ خوامخواہ ہی نہیں کردیا تھا۔ اس سلسلے میں میرے موکل کی بیوی شبانہ نے کافی سے زیادہ ہوم ورک کر رکھا تھا۔ شبانہ ایک ایسی مظلوم عورت کے روپ میں شکیلہ کے دل و دماغ میں بسیرا کرچکی تھی جس کا بے قصور شوہر ایک ناکردہ جرم میں پھانسی چڑھنے والا تھا۔ شبانہ نے شکیلہ کو عدالت میں آکر گواہی دینے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا تھا۔ میں نے شکیلہ سے سوال و جواب کے لیے اپنے ذہن میں ایک مربوط منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن اس سے قبل استغاثہ کے گواہ عرفان کی رگڑائی اور منجھائی بھی ضروری تھی۔ انکوائری آفیسر نے عدالت کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ پیشی پر وہ مذکورہ گواہ کو لازمی عدالت میں پیش کرے گا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں باجی زہرہ کا دیرینہ پڑوسی اور اس کیس میں استغاثہ کا گواہ عرفان موجود تھا گویا اب کی بار آئی او نے اپنا وعدہ ایفا کردکھایا تھا۔ عرفان پروسیکیوشن اپنی جرح مکمل کرچکا تھا۔ آج صرف مجھے اس سے سوال و جواب کرنا تھے۔ جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

عرفان کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے جسم کے ایک ایک اعضا سے تندرستی اور مضبوطی جھلکتی تھی۔ اس وقت وہ پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس خاصا اسمارٹ نظر آرہا تھا۔ ٹی شرٹ کی مختصر آستینوں میں اس کے بازوؤں کی مچھلیاں بڑی نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک نگاہ دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ قائم کرسکتا تھا کہ وہ باقاعدہ ورزش کا عادی ہوگا۔

''عرفان صاحب!'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''جی۔ اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کو کیا ہوا تھا؟'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مطلب آپ کی طبیعت کیسے بگڑ گئی؟''

''وکیل صاحب! مجھے فوڈ پوائزن ہوگیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اب بالکل ٹھیک ہوں۔''

''عرفان صاحب! اس کیس میں آپ کی گواہی کی بڑی اہمیت ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''خصوصاً اس لیے بھی کہ آپ ملزم اور مقتول کے درمیان جنم لینے والے تنازع کو اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ بعض ناخوشگوار واقعات کے تو آپ چشم دید گواہ بھی ہیں۔''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مسئلہ یہ تھا کہ ایک کے اندر صبر کی کمی تھی اور دوسرے کے اندر برداشت کا فقدان.....''

''اپنی بات کی تھوڑی وضاحت کردیں پلیز۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''خصوصاً ''کمی'' اور ''فقدان'' کے ذیل میں۔''

''مقتول غصے کا تیز اور منہ پھٹ تھا۔'' وہ اپنے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور ملزم کے اندر برداشت کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے ان دونوں کو تین چار بار معمولی نوعیت کے معاملات پر الجھتے دیکھا تھا اور جج بچاؤ کرانے میں بھی میں پیش پیش رہا تھا مگر پھر وہی ہوگیا جس کا مجھے ڈر تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''گھلے داری میں انسان کو بہت سی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنے کی عادت ڈالنا پڑتی ہے ورنہ تو صبح شام ہر گلی کوچے میں دنگا فساد ہی مچا رہے.....'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''عرفان صاحب! آپ نے ابھی اپنے کسی ڈر کا ذکر کیا

ہے۔ وہ ڈر کیا تھا؟''

اس نے مختصر الفاظ میں وہ واقعہ بیان کیا جب عید قرباں سے ایک روز پہلے مقتول نے ملزم کو زدوکوب کیا تھا اور ملزم نے مقتول کی طرف انگلی اٹھا کر یہ جملہ ادا کیا تھا..... ''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔ بس، خیریت سے عید گزر جائے۔'' اسی جملے کی دم پکڑ کر عرفان نے مجھے بتایا۔

''مجھے اسی وقت لگ رہا تھا کہ آگے چل کر کوئی خطرناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ پھر عید کے چند روز بعد مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا.....''

''عرفان صاحب! وقوعہ کی رات مالک مکان یعنی باجی زہرہ اپنے گھر میں موجود نہیں تھیں۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور استغاثہ کے مطابق آپ نے اپنے پڑوس والے گھر میں کسی بھاری بھرکم شے کے گرنے کی آواز سنی تھی؟''

''جی۔ میں نے ایسی آواز سنی تھی۔''

''استغاثہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس وقت آپ اپنے گھر کے باہر گیٹ پر کھڑے تھے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل ایسا ہی تھا۔'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے وہ مخصوص آواز کتنے بجے سنی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ میری بات تو سمجھ گئے ہوں گے؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا پھر ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''وہ آدھی رات کا عمل تھا۔ غالباً گیارہ اور بارہ کے بیچ کا کوئی وقت.....!''

''اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''دھڑام کی وہ خوف ناک آواز باجی زہرہ کے مکان کے کس حصے میں ابھری تھی؟''

جواب دینے سے پہلے وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرا ذہن پڑھنے کی کوشش میں معروف رہا پھر وضاحتی انداز میں بتانے لگا۔

''دیکھیں جی! زہرہ باجی کے گھر کے تین مالے ہیں۔ اوپری مالے (منزل) پر مقتول رہائش پذیر تھا۔ درمیانی مالے پر باجی خود رہتی تھیں اور نیچے والے مالے پر ملزم کی رہائش تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے وہ آواز عمارت کے نچلے حصے سے ابھرتی سنی تھی۔ باجی چونکہ گھر میں موجود نہیں تھیں اس لیے ان کی منزل پر کسی ایسی آواز کے پیدا ہونے کا کیا سوال۔ اب یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ آواز نیچے والے مالے یعنی ملزم کے گھر کے کسی حصے سے سنائی دی تھی۔''

''عرفان صاحب! آپ تو پھر بھی محتاط الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ انکوائری آفیسر نے تو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے وقوعہ کی لوکیشن کا بھی تعین کر دیا ہے۔ استغاثہ کے مطابق مقتول کو زیریں منزل کے اس کونے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے جہاں سے بالائی منزل کی طرف جانے والے زینے کا آغاز ہوتا ہے۔''

''جناب! میں تو اپنے علم، تجربے اور مشاہدے کی روشنی ہی میں بات کر سکتا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''استغاثہ کا کیا موقف ہے یہ اسی کو پتا ہوگا۔ سب کو مر کے اپنی قبر میں جانا ہے.....!''

''اپنی اپنی قبر میں جانے کے حوالے سے میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں عرفان صاحب۔'' میں نے اسے غیر محسوس انداز میں اپنی باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے علم، تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے آپ نے بڑی گہری بات کی ہے..... خصوصاً مشاہدے کے ذیل میں آپ نے استغاثہ کی بھرپور مدد بھی کی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب؟'' وہ یکا یک بے حد محتاط دکھائی دینے لگا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں عرفان صاحب!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میرا اشارہ آپ کی استغاثہ کو فراہم کردہ ان معلومات کی طرف تھا کہ ملزم اور اس کی فیملی رات کو جلدی سونے کے عادی تھے اور یہ لوگ صبح بیدار بھی جلدی ہو جایا کرتے تھے۔''

''اوہ.....'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''آپ نے پچھلی ایک پیشی پر وکیل استغاثہ کو بتایا تھا کہ ملزم اور اس کی فیملی رات دس بجے تک سو جایا کرتے تھے۔'' میں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ وکیل سرکار کو یہ بات وثوق سے نہیں بتا سکے کہ جب آپ نے گھر کے اندر کسی بھاری بھرکم شے کے ''دھڑام'' سے گرنے کی ہیبت ناک آواز سنی اس وقت ملزم جاگ رہا تھا یا نہیں۔''

''میں نے عدالت میں وہی بتایا جو حقیقت تھی۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ ''نہ ایک لفظ کم نہ زیادہ۔''

''اس وقت بھی آپ عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا آپ سے یہی امید کی جاسکتی ہے کہ حقیقت بیانی کی ڈگر پر چلتے رہیں گے۔ ہیں نا؟''

''جی بالکل۔'' وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ''اس حوالے سے آپ بے فکر ہو جائیں۔''

''میں کسی بھی حوالے سے بے فکر نہیں ہو سکتا عرفان صاحب!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیونکہ میرے موکل کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ جب تک میں معزز عدالت کی نظر میں اپنے موکل کو بے گناہ ثابت نہیں کر دیتا، کہاں کی بے فکری اور کدھر کا اطمینان.....؟''

اس نے میرے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، مختصر نگاہ سے مجھے دیکھتا چلا گیا جیسے اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میرا اگلا سوال کس نوعیت کا ہوگا۔ میں نے اس کے اندازوں اور ارمانوں پر اوس چھڑکتے ہوئے پوچھا۔

''عرفان صاحب! آپ کی فٹنس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ باقاعدہ ایکسرسائز کرنے کے عادی ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے وکیل صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''باڈی بلڈنگ.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''باڈی بلڈنگ بھی!'' وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''بھی..... کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''میں مارشل آرٹس سے بھی دلی لگاؤ رکھتا ہوں۔''

''فنٹاسٹک!'' میں نے توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کو بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز رات دس بجے کے بعد یعنی گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان آپ نے ملزم کے گھر کے اندرونی حصے میں لائٹس آن دیکھی تھیں۔ عین اس وقت جب ملزم کے گھر کے اندر آپ نے کسی بھاری بھرکم چیز کے ''دھڑام'' سے گرنے کی آواز بھی سنی تھی۔ آپ کا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ رات دس بجے کے بعد ملزم کے گھر کے اندرونی حصے میں عموماً تاریکی ہی چھائی رہتی ہے۔ صرف پارکنگ ایریا کی لائٹ آن رہتی ہے۔ کیا واقعی وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان آپ نے ملزم کے گھر کے اندرونی حصے کی لائٹس آن دیکھی تھیں؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا وکیل صاحب؟'' وہ خفگی بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جیتی جاگتی آنکھوں سے جو دیکھا وہی بیان کیا ہے۔''

''آپ میری بات کو دل پر نہ لیں۔ میں آپ کی نیت پر شک نہیں کر رہا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بس، جرح کا

قارئین متوجہ ہوں

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر ہاکر سپلائی کرتا ہے۔
☆ ہاکر کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

0301-2454188

حاسوس ڈائجسٹ پبلی کیشنز

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

عمل ہے ہی ایسا کہ بڑے سے بڑے متحمل انسان کی بھی ہمت کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ خیر..... مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو دیکھا وہی بیان کر رہے ہیں اور جو سنا اس کا اظہار کر رہے ہیں جیسا کہ اس دوران میں آپ نے جیتے جاگتے کانوں کے ساتھ ملزم کے گھر کے اندر کسی بھاری بھرکم شے کے ''دھڑام'' سے گرنے کی آواز سنی تھی..... ہیں نا؟''

''جی ہاں.....'' وہ بیزاری سے بولا۔

''عرفان صاحب! کیا آپ بھوتوں اور جنات کے وجود پر یقین رکھتے ہیں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟'' وہ بدکے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔'' میں نے اصراری اینڈ اسراری لہجے میں کہا۔ ''اقسام اور کوالٹی کنٹرول کی بات بعد میں کریں گے۔''

''جنات کا تو قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لہٰذا جنات کے وجود پر یقین رکھنا ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے اور الحمدللہ! میں مسلمان ہوں۔''

''ٹھیک ہو گیا عرفان صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا کہ آپ کم از کم جنات کے وجود کو تو مانتے ہیں۔''

''لیکن آپ کے اس سوال کا مقصد کیا تھا؟'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ وقوعہ کی رات آپ نے نصف شب ملزم کے گھر کے اندرونی حصے میں جو لائٹس آن دیکھی تھیں اور جو کسی بھاری بھرکم شے کے ''دھڑام'' سے گرنے کی ہیبت ناک آواز سنی تھی اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ سارا جناتی چکر تھا۔''

''کیا آپ مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''میں نے وقوعہ کی رات جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی دوران میں مقتول کا قتل ہوا تھا۔''

''میں اس امر سے انکار کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج نہیں کر سکتا کہ... چودہ فروری کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان مقتول قیصر کی گردن توڑ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''لیکن جہاں تک آپ کو بے وقوف سمجھنے کا معاملہ ہے تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''آپ نے میری بات کا مذاق اڑایا ہے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

''میں نے جو دیکھا اور جو سنا وہ ایک حقیقت ہے اور آپ اتنے بڑے واقعے کو جنات کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔''

''میں نے آپ کا مذاق نہیں اڑایا عرفان صاحب بلکہ ایک سفاک حقیقت بیان کی ہے۔'' میں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ حقیقت کہ آپ نے وقوعہ کی رات نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا۔''

''تو آپ مجھے جھوٹا کہہ رہے ہیں؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''اگر آپ کو جنات والی کہانی پسند نہیں آئی تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو آپ کے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر آپ.....''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ کے صبر کا پیمانہ لب ریز ہو چکا تھا۔ وہ چنگھاڑ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''یور آنر! میرے فاضل دوست نے تو حقائق کی دنیا کی تمام حدود پھلانگ ڈالی ہیں۔ یہ اپنے موکل کو سزا سے بچانے کے لیے جنات کا قصہ گھڑ لائے ہیں اور مقتول۔ کی موت کو کوئی جناتی کارروائی قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ معزز عدالت جانتی ہے کہ قانون کی کتابوں میں ایسی لغو باتوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''میرے فاضل دوست! میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بے یقینی سے مستفسر ہوا۔ ''پھر یہ جنات کا کیا قصہ ہے۔ آپ قیصر کی موت کو جنات کے کھاتے میں کیوں ڈال رہے ہیں؟''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، آپ کا دھیان کسی اور معاملے میں لگا ہوا ہے۔ اپنے ہوش وحواس کو ٹھکانے رکھ کر عدالت کا رخ کیا کریں۔''

وہ میری اس کاری چوٹ پر بری طرح تڑپ اٹھا۔ ''ہاں بھئی، ہم تو یہاں اپنا اور عدالت کا وقت برباد کرنے آتے ہیں۔ یہ اکھاڑا تو صرف آپ جیسے فلسفی افراد کے لیے ہے۔''

''اگر آپ نے میری بات پر دھیان دیا ہوتا تو دل کے پھپھولے پھوڑنے کی حالت محسوس نہیں ہوتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو معزز عدالت کو صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران میں استغاثہ کے گواہ نے ..... ملزم کے گھر

میں کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا تھا لیکن عرفان چونکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ یہ سب جنات کی کارستانی ہوگی کیونکہ.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! وقوعہ کی رات ملزم اور اس کی فیملی کے باقی دو افراد رات دس اور ایک بجے کے درمیان اپنے گھر میں موجود ہی نہیں تھے۔''

''اوہ.....'' جج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو پھر یہ لوگ کہاں تھے؟''

''وہ تینوں شادی کی ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔'' میں نے بتایا۔ ''جہاں سے ان کی واپسی ایک بجے کے بعد ہوئی تھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان مقتول اس گھر میں اکیلا ہی تھا لہٰذا اس کے کسی دشمن نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کا کام تمام کر دیا اور میرے موکل کو پھنسانے کے لیے مقتول کی لاش کو اس کی کار کی ڈکی میں چھپا دیا۔ میں عدالت کے حکم پر شہر کے تین ایسے معتبر افراد کو گواہی کے لیے وٹنس باکس تک لاسکتا ہوں جن کے بیان سے ثابت ہو جائے گا کہ وقوعہ کی رات میرا موکل جائے واردات سے کئی کلومیٹر دور شادی کی ایک تقریب میں موجود تھا۔''

''آپ نے تو آج مقتول کی بیوہ شکیلہ کو بھی عدالت میں حاضر کرنا تھا۔'' جج نے خاصی کراری آواز میں کہا۔

''شکیلہ اس وقت عدالت کے برآمدے میں موجود ہے جناب عالی۔'' میں نے بتایا۔ ''حسب ضرورت صفائی کی اس گواہ کو اندر بلا لیا جائے گا۔ اگر وکیل سرکار اس کا موقع دیں تو.....!''

آخری جملہ میں نے وکیل استغاثہ کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے ادا کیا تھا اور میرا یہ حربہ خاصا کارگر رہا۔ وہ زخمی سانپ کے مانند پھنکارا پھر تلملائے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''اگر آپ کی اس بات کو چند لمحات کے لیے درست مان بھی لیا جائے کہ وقوعہ کے روز رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ملزم واقعتاً کسی شادی کی تقریب میں موجود تھا تو پھر دو اہم سوالات اٹھتے ہیں۔ نمبر ایک..... وہ اپنی ذاتی گاڑی کو گھر کے سامنے کھڑا چھوڑ کر کسی رکشا یا ٹیکسی میں کیوں گیا تھا؟ نمبر دو، ملزم کے پڑوسی عرفان نے وقوعہ کے

جاپان میں ہر بس اسٹاپ پر یہ فقرہ درج ہوتا ہے۔

''یہاں صرف بسیں رکتی ہیں، وقت نہیں۔ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں۔''

☆☆☆

اللہ کو دل اور زبان کا سخت ہونا پسند نہیں۔ اس لیے اللہ نے دونوں کو ہڈی کے بغیر بنایا ہے۔

اسے نرم رکھو، دل محبت سے نرم ہوگا اور زبان اخلاق سے۔

مرسلہ۔ راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیو کراچی

وقت ملزم کے گھر کے اندرونی حصے کی لائٹس آن ہونے اور کسی بھاری بھرکم شے کے ''دھڑام'' سے گرنے کے حوالے سے غلط بیانی کیوں کی؟''

''کیا آپ نے کبھی کسی شادی کے دعوت نامے پر یہ شرط لکھی دیکھی ہے.....'' میں نے وکیل استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے سوال کیا۔ ''کہ جس شخص کے پاس اپنی گاڑی ہو وہ اسی پر سوار ہو کر شادی میں شرکت کرنے آسکتا ہے۔ اگر وہ کسی رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کر شادی ہال پہنچا تو اسے اندر داخل نہیں ہونے دیا جائے گا.....؟''

''نہیں جناب.....'' وہ بے حد الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے ایسا لکھا تو کہیں نہیں دیکھا۔''

''بس تو پھر جان لیں کہ آپ کا پہلا سوال انتہائی فضول اور واہیات قسم کا ہے۔'' میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''لہٰذا میں اس کا کوئی لمبا چوڑا جواب دے کر عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں... کرسکتا البتہ.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ... کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے آپ کے..... یعنی استغاثہ کے گواہ سے رجوع کرنا پڑے گا..... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔'' اس کے بعد میں دوبارہ عرفان کی جانب متوجہ ہو گیا اور قدرے رو کھے اور بدلے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''عرفان صاحب! آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''تین!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ان کی عمریں کیا ہوں گی؟''

"بڑے بیٹے عاطف کی عمر پانچ سال ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس سے چھوٹی نازیہ تین سال کی اور ثمیرا ابھی محض ایک سال کا ہے۔"

"میں نے سنا ہے، آپ اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔" میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "اور آپ کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان پر کوئی آنچ نہ آئے..... ہیں نا؟"

"ہر شخص اپنی فیملی سے محبت کرتا ہے وکیل صاحب!" وہ فلسفیانہ انداز میں مگر بیزاری سے بولا۔ "بہرحال آپ مجھ سے پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟"

ابتدا میں عرفان جس اعتماد سے بات کر رہا تھا اب اس میں کافی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی۔ وہ خاصا اکتایا ہوا اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ یقیناً یہ اس کے اندر کا کوئی چور تھا جو پکڑا جانے والا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اگر کوئی کمینہ شخص آپ کے پھول ایسے صاحب زادے عاطف کو بلاوجہ زناٹے دار تھپڑ رسید کر دے تو اس موقع پر آپ کے جذبات کا عالم کیا ہوگا؟"

"میں....." وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ "میں اس نامراد کا خون پی جاؤں گا۔"

"اور اگر....." میں نے استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "کوئی اوباش شخص آپ کی چہیتی بیوی فائزہ پر میلی نگاہ ڈالے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟"

"تو میں..... میں....." وہ دانت کچکچاتے ہوئے انتہائی جارحانہ انداز میں گویا ہوا۔ "اس بدبخت کی گردن توڑ دوں گا....."

میں نے ایک خاص انداز میں کندھے اچکائے اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے نہایت ہی احترام کے ساتھ کہا۔ "جنابِ عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ میں نے مقتول قیصر کی پراسرار موت کا معما حل کر دیا ہے۔ اگر اب بھی عدالت کو میرے موکل کی بے گناہی کے سلسلے میں کسی ثبوت کی ضرورت ہے تو باہر برآمدے میں موجود صفائی کی گواہ اور مقتول کی بیوہ شکیلہ کو گواہی کے لیے اندر بلایا جاسکتا ہے۔ وہ عدالت کو بتائے گی کہ عرفان کی بیوی فائزہ نے مقتول کے کرتوتوں کے بارے میں اس سے کس نوعیت کی سنگین شکایات کی تھیں..... دیٹس آل یور آنر!"

"کسی کو اندر بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عرفان دونوں ہاتھوں سے کٹہرے کی چوبی ریلنگ کو تھامتے ہوئے بڑے اعتماد سے بہ آوازِ بلند بولا۔ "میں ایک بہادر انسان ہوں۔ میں فائٹر ہوں۔ مجھے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہو رہا۔ ہاں..... میں نے ہی اس شیطان نما انسان قیصر کو جہنم رسید کیا تھا....."

"آپ ضرور ایک اچھے فائٹر ہوں گے۔" میں نے اقبالی قاتل کی طرف دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔ "لیکن خود کو بہادر کہہ کر آپ سچے بہادر انسانوں کی توہین کر رہے ہو کیونکہ بہادر لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ دوسرے انسانوں کے کندھوں پر نہیں ڈالا کرتے۔ میری نظر میں آپ ایک عیار شخص ہو اسی لیے آپ نے اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے ایک معصوم انسان کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال....." میں نے لحاظ توقف کر کے ڈرامائی انداز میں حاضرینِ عدالت کو دیکھا پھر استغاثہ کے گواہ یعنی قیصر کے قاتل کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے ایک اقدام کو ضرور سراہوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور گردن جھکا کر کھڑا رہا۔

وکیل استغاثہ کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اپنے گواہ کی ندامت آمیز خاموشی پر وہ خجالت آمیز انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

"کون سا اقدام؟"

"درست آید!" میں نے وکیل استغاثہ کو جواب دیا۔

"درست آید....." وہ منہ بگاڑ کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ایسے بلے باز خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں جو آؤٹ ہونے کی بجائے کریز چھوڑ کر میدان سے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی فرسٹ، سیکنڈ یا تھرڈ امپائر کی انگلی اٹھنے کا انتظار نہیں کرتے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اسی طرح ایسے مجرم بھی کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں جو اپنے خلاف عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے ہی اقبالِ جرم کر لیتے ہیں۔"

"اوہ..... اب سمجھا۔" وکیل استغاثہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

"اسی سمجھداری کے مظاہرے کی خوشی میں....." میں نے اپنے حریف وکیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی خاطر میں محاورے کو مکمل کر دیتا ہوں..... دیر آید، درست آید!"

وکیل استغاثہ مجھے گھور کر رہ گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

مظفر نگر قصبے میں چوری کی تیسری واردات کے بعد پولیس کو بھی سنجیدگی اختیار کرنی پڑی۔ پہلے پہل وہ اڑلی سستی اور کچھ بھلداروں کے مشورے کی بنا پر خاموش تھے۔ اکثر چوری کی واردات میں گھر ہی کا کوئی فرد ملوث ہوتا تھا اور بعد میں عزت بچانے کے لیے معاملہ دبا دیا جاتا تھا۔ اس لیے پہلی اور دوسری بار رپورٹ درج کروانے پر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی مگر تیسری واردات پر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ مہندی لگے بالوں والا وہ شخص پچاس کے پیٹے میں تھا۔

''او جی میرا نام عارف ہے، عارف زرگر..... میرے گھر سے کسی نے دس تولے سونے کا زیور چوری کر لیا ہے۔''

اس نے آتے ہی بنا تمہید کہا۔

''زرگر صاحب! آپ کے بات کرنے کا انداز بتا رہا

زیرو زبر

محمد ظہیر شیخ

پیشہ کوئی بھی ہو اگر فرض شناسی سے حق ادا کر دیا جائے تو جیت ہو یا ہار... مقدر سے کوئی شکوہ نہیں رہتا۔ وہ بھی ایک نمہ دار پولیس آفیسر تھا اور جانتا تھا کہ تقدیر زبر ہے اور انسان زیر اور جس کا سامنا ہر حال میں کرنا پڑتا ہے۔ چاہے کسی کو اس بات پر یقین ہو یا نہ ہو۔

قتل کی ایک لرزہ خیز روداد کا خوفناک انجام

ہے جیسے چوری ہم لوگوں نے کی ہے۔'' ایس ایچ او شفقت شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو عارف جھینپ گیا۔

''او جی بندہ معافی کا خواستگار ہے..... دراصل ایک دم ہی اتنا بڑا نقصان ہوگیا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کروں۔'' اس بار اس نے لہجے میں نرمی لانے کی کوشش کی۔

''اچھا اب ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے اور کسی پر شک ہے؟''

''او جی کیا بات کرتے ہیں۔ اگر کسی پر شک ہوتا تو ابھی تک اس کی ہڈی پسلی ایک نہ کردی ہوتی۔ جوانی میں باکسر رہا ہوں ایک ہی مکے میں.....''

''عارف صاحب! فی الحال چوری کی واردات کے پس منظر سے آگاہ کیجیے۔''

ایس ایچ او نے قطع کلامی کی تو وہ ایک دم دوبارہ ہڑبڑی پر واپس آیا۔ ''آپ کو تو پتا ہی ہوگا ہماری دکان ہے۔ اصلی اور خالص زیورات کی خریداری کے لیے مظفر آباد میں ہماری دکان کے مقابلے میں کوئی اور نہیں ہے۔ خیر چند دن پہلے ہی راولپنڈی سے جا کر اچھا خاصا مال لایا۔ ایک عزیز کی شادی تھی جس کے لیے انہیں سونا درکار تھا۔ اب دکان پر جا کر خریداری کرنے کے جھنجٹ سے وہ لوگ بھی نالاں تھے اس لیے ہمیں کہہ دیا کہ ان کا مطلوبہ زیور گھر لا کر رکھ دیا جائے۔ یہ چار دن پہلے کی بات ہے اور کل چونکہ شادی کے ہنگامے شروع ہوں گے اس لیے انہیں زیورات پہنچانے تھے مگر جوں ہی زوجہ محترمہ کو زیورات لانے کا کہا تو وہ اندر چلی گئی مگر واپسی پر ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے اور ہمارا زیور بھی۔''

''ہوں! تو یہ بات ہے۔ خیر، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ گھر ہی کا کوئی فرد ملوث ہو اور بعد میں تم کہو کہ معاملہ ختم کریں بدنامی ہوگی۔ اس لیے فی الحال سوچ لو، یہ نہ ہو کہ چور تو ہم پکڑ لیں مگر چھترول تمہاری کرنی پڑے۔'' شفقت شاہ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''او جی میرا باپ بھی چوری کرتا تو اسے بھی معاف نہ کرتا۔ آپ لوگ کارروائی کریں، جو مجرم ہوگا اس سے کسی قسم کی رعایت کرنے کا نہیں کہوں گا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم ابھی جاؤ ہم لوگ شام تک راؤنڈ پر نکلیں گے تو مزید تفصیلات تمہارے گھر آ کر لیں گے۔''

''رپورٹ تو لکھ لیں نا تھانیدار صاحب!''

''زرگر صاحب! یہ رپورٹ، رپورٹ ہمارا کام ہے۔ ہمیں پتا ہے کہ کس وقت کیا کرنا ہے۔ آپ سے جتنا کہا ہے اتنا ہی کیجیے برائے مہربانی!'' شفقت شاہ نے اس انداز سے کہا جیسے کہہ رہا ہو اب دفع ہو جاؤ۔ عارف زرگر جیسے دولت مند افراد سے بات کرتے ہوئے وہ محتاط رہتا تھا کہ کہیں پیسے اور تعلقات کے بل بوتے پر وہ اوپر شکایت نہ کردیں، ورنہ شفقت شاہ کے نام ہی کی دہشت اتنی تھی کہ رپورٹ درج کروانے والا بھی سوچ سمجھ کر آتا تھا۔ پولیس کی نوکری اور ایسے عہدے پر طبیعت کی سختی، عادت سے زیادہ مجبوری بن جاتی ہے۔ اس لیے وہ کرخت لہجے میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ شام کو راؤنڈ سے واپسی پر اس نے عارف زرگر کے گھر کی گھنٹی بجائی تو دروازہ عارف ہی نے کھولا۔ پولیس کو دیکھ کر شاید وہ واحد آدمی تھا جس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔

☆☆☆

مظفر نگر میں مہاجرین جموں و کشمیر کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ طبقاتی تفریق اور دولت کا فرق اپنی جگہ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ پورا قصبہ کمیونٹی کی ایک بڑی مثال تھا۔ امن و امان کی صورت حال اتنی بہتر تھی کہ تھانے کچہری تک کم ہی بات جاتی تھی۔ ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین ریٹائرڈ پروفیسر سعید لون صاحب کی سربراہی میں تمام صورت حال کنٹرول میں تھی۔ کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ان کی مشاورت لازم سمجھی جاتی تھی۔ پے در پے چوری کی وارداتوں پر انہیں بھی تشویش تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ چوری کی معمولی سی واردات بھی ہوئی ہو۔ ٹاؤن کمیٹی ہر یتیم، مسکین کی نہ صرف کفالت کرتی تھی بلکہ ایسے لوگوں کی باقاعدہ لسٹ بنی ہوئی تھی اور ہر گھر سے ایک مخصوص رقم لے کر مہینے کی پہلی تاریخ کو انہیں اتنی رقم پہنچا دی جاتی کہ کسی کے لیے فاقہ کشی کی نوبت نہ آتی۔ ایسے میں کسی کا دھیان کبھی چوری کی طرف گیا ہی نہیں تھا مگر..... شیطان کے وجود سے انکار کیسے کیا جاتا۔ اس لیے سعید صاحب کو جب عارف کے گھر چوری کا علم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر اسے پولیس سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ گو کہ پولیس سے کسی اچھے کی امید رکھنا دور حاضر میں ناممکن ہی تصور کیا جاتا ہے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ شفقت شاہ جیسے لوگ اگر پولیس کے محکمے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی ہو جائیں تو لوگ پولیس پر انگلی اٹھانا چھوڑ دیں۔ شفقت شاہ کے بارے میں متضاد رائے رکھنے کے باوجود لوگوں کو علم تھا کہ اگر وہ مجرم کے پیچھے پڑ جائے تو پھر اسے زمین کی تہ کے نیچے بھی پناہ نہیں ملتی۔ زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کا بھی کافی سخت تھا۔ جس پر شک ہو کہ وہ مجرم ہے تو اس کی بڑی سے بڑی سفارش سے پہلے ہی ایسی پھینٹی لگاتا کہ دوبارہ خواب میں بھی وہ کبھی جرم کرنے کا

نہیں سوچتا تھا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ دبی دبی زبان میں یہ بھی کہتے ہوئے پائے گئے تھے کہ شفقت ایک اپریلول کا راشی ہے جو چھوٹے موٹے کام کے لیے اپنی ساکھ برباد نہیں کرتا۔ وہ ان دنوں مظفر نگر میں تعینات تھا۔

عارف زرگر نے دروازہ کھولا تو سامنے شفقت شاہ کو دیکھ کر کھل اٹھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ پولیس والے بھی عہد کے پابند ہوتے ہیں۔ بہرحال وہ آیئے سر، بیٹھیے سر کی گردان کرتے ہوئے اسے اندر لے آیا۔ عارف کی خوش قسمتی کہ اسی وقت سعید لون صاحب کا گزر بھی وہیں سے ہو رہا تھا۔ وہ پولیس کی وین دیکھ کر ان کے گیٹ پر پہنچ گئے اور پھر اگلے چند منٹ تک تینوں افراد کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ باقی نفری باہر گاڑی میں ہی موجود تھی۔ شفقت اپنے ساتھ ایک خاص قسم کی ڈائری رکھتا تھا جس میں اکثر وہ اہم باتیں لکھتا رہتا تھا۔

''معاف کیجیے گا میں ذرا ٹوائلٹ سے ہو کر آتا ہوں۔ زرگر صاحب! کس طرف ہے ٹوائلٹ؟'' غالباً کچھ الا بلا کھانے کے باعث ایس ایچ او کا پیٹ خراب تھا۔

''وہ رہا سامنے بلکہ نہیں..... اس کی پائپ لائن اندر سے خراب ہے چوڑے (بھنگی) کو بلوایا تھا، ایک بار چیک کر کے گیا ہے دو دن پہلے۔ خیر آپ آئیں، اسی کے عقب میں ایک اور ٹوائلٹ بھی موجود ہے۔'' عارف نے کہا مگر شفقت کی توجہ اس کی باتوں کی جانب نہیں تھی۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور پھر جلد ہی وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا۔

''معاف کیجیے گا میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گا۔ غالباً فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ خیر میں کل ہر حال میں تشریف لاؤں گا، آج کے لیے نہایت معذرت.....''

''چلیں جی تقدیر میں اتنی ہی ملاقات لکھی تھی، خیر پھر سہی۔'' عارف کی آواز اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح لگی۔

وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر وہ سیدھا گاڑی میں بیٹھا اور تھانے پہنچ گیا۔ اگلے دن بھی وہ نہ آ سکا۔ طبیعت کی خرابی کے باعث وہ وعدہ وفا نہ کر سکا۔ اس کی جنونی طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ وہ کسی کام کو کرنے کی خواہش رکھتا ہو اور نہ کر سکے۔ اوپر سے عارف کا جملہ، اسے لگا کہ تقدیر اسے منہ چڑا رہی ہے۔ وہ تقدیر کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ ہر کام تدبیر سے ہو سکتا ہے اس لیے وہ ایک پل کے لیے بھی چوری کی اس واردات کو نہیں بھولا تھا جو اس کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔ اس کی الٹی کھوپڑی میں یہ بات سما گئی تھی کہ تقدیر کچھ بھی نہیں ہوتی، ہر کام زور بازو پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس نفسیاتی گرہ کے پیچھے اس کی زندگی کی واحد محرومی تھی۔ اس کی محبت، جو تقدیر کے الٹ پھیر میں یوں گم ہو گئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں..... اس کی نگاہیں بظاہر چھپکلی پر تھیں مگر اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ اس کے سامنے ہنستا مسکراتا چہرہ ثمرہ انور کا تھا۔

☆☆☆

ثمرہ انور کالج کی سب سے ہونہار لڑکی تھی۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ سماجی طور پر بالکل ہی پھوہڑ تھی۔ دو تین لڑکیوں کے ساتھ دوستی ضرور تھی مگر کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صبح بھائی کے ساتھ بائیک پر کالج پہنچتی اور چھٹی کے وقت بھائی موٹر سائیکل پر گیٹ سے اسے ساتھ لے جاتا۔ وہ خود یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ راوی ان کے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ شفقت شاہ سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ دو پہیے کا بائیک میں پھنسنا اور ایکسیڈنٹ ہو جانا اس کے لیے پہلا موقع تھا جب اس نے ثمرہ کو دیکھا۔ وہ پیدل چل رہا تھا کہ اس کے سامنے ایکسیڈنٹ ہوا۔ اس نے جلدی سے دونوں کو اٹھا کر رکشے میں ڈالا اور اسپتال پہنچ گیا۔ اگلے چند منٹ میں وہ جذبۂ انسانی سے جذبۂ الفت تک کا سفر طے کر چکا تھا۔ ثمرہ کے معصوم سے چہرے پر چند خراشیں اسے ایسے لگ رہی تھیں جیسے چاند پر داغ۔ اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ وہ حسن کے اس شاہکار پر مر مٹا۔ بھائی کے شناختی کارڈ سے اس کے گھر کا پتا چلا مگر فی الحال وہ کسی قسم کا رابطہ نہ کر سکا کہ وہ موبائل فون شاید گھر پر چھوڑ کر یونیورسٹی گیا تھا جس کی وجہ سے کوئی فون نمبر نہ مل سکا۔ وہ ثمرہ کے بیگ کی تلاشی لینے لگا کہ ممکن ہے اس میں کچھ ایسا مل جائے۔ وہ بیگ ساتھ اٹھا لایا تھا اور اب اسی کی وجہ سے گھر کا فون نمبر ایک کتاب پر لکھا مل گیا۔ اس نے فوراً رابطہ کیا اور مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا۔ گھر والوں نے یقیناً انور شاہ تک خبر پہنچا دی تھی۔ اس کا دفتر زیادہ دور نہیں تھا اسی لیے وہ اگلے پندرہ منٹ میں اسپتال میں تھا۔ آتے ہی وہ ایمرجنسی کی جانب لپکا مگر اسے روک دیا گیا۔ شفقت نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں دور پار کے رشتے دار تھے مگر گھر والوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے باعث سلام دعا کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ انور شاہ کے پاس پہنچا تو انور نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میں غلام حسین شاہ کا بیٹا شفقت ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''ان دونوں کو اسپتال تک میں نے ہی

Digitized by Google

پہنچایا تھا۔"

"بیٹا! اللہ پاک تمہیں اس کا اجر دے، چوٹ وغیرہ زیادہ تو نہیں لگی اور ایکسیڈنٹ ہوا کیسے؟" بے تابی سے پوچھتے ہوئے انور کی نگاہ ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر تھی۔

"شاید چادر ٹائر کے درمیان آگئی تھی۔ اسپیڈ زیادہ نہیں تھی جس کے باعث کافی بچت ہوگئی ہے۔ اللہ پاک کرم کریں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے تسلی تو دے دی تھی مگر وہ پری چہرہ اس کے سامنے پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہوگیا تھا۔ اس کے سر سے نکلنے والا خون شفقت کے ہاتھوں پر ابھی تک لگا ہوا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ انور کی نظر اس کے ہاتھوں پر نہ پڑے اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ واش بیسن میں ہاتھ دھو کر واپس پلٹا تو ایمرجنسی سے ڈاکٹر باہر نکل رہا تھا۔ وہ دونوں ڈاکٹر کی جانب لپکے۔

"اللہ پاک کا کرم ہوا ہے کہ ہڈی بچ گئی، ورنہ مشکل ہوجاتی۔ بہرحال ابھی سکون آور انجیکشن کے باعث دونوں سو رہے ہیں۔ لڑکے کو ٹانگ پر زخم آئے ہیں۔ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔ باقی معمولی زخم ہیں، مجموعی طور پر یہ سمجھ لیں کہ اللہ پاک نے کرم کیا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" انور بڑبڑایا اور پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے پوچھنے لگا۔ "کیا ایک نظر ان دونوں کو دیکھنے کی اجازت ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"جی نہیں! فی الحال آپ لوگ انتظار کیجیے جونہی ان دونوں کو اپنے اپنے بیڈ پر شفٹ کیا جائے گا، مل لیجیے گا۔" ڈاکٹر حوصلہ دے کر چلا گیا مگر انور کے دل کو قرار نہ آسکا۔ وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا اور پھر ایک خیال آنے پر چونکا۔

"ارے بیٹا! تمہاری طرف تو پریشانی میں دھیان ہی نہیں گیا۔ کالج یونیفارم میں ہو اس کا مطلب ہے کہ ابھی راستے میں ہی تھے گھر نہیں جاسکے۔ ابھی تک بھوکے ہوگے۔ میں کینٹین سے کھانا پیک کروا کے لاتا ہوں، یہیں رکو۔"

"ارے نہیں انکل! میں گھر جا کر کھالوں گا۔ ابھی فی الحال آپ کے گھر سے جب تک کوئی نہیں آتا، میں رکوں گا۔" وہ چاہتا تو ابھی واپس جاسکتا تھا مگر اس نے بھی دل کی تسلی کے لیے ثمرہ کو ایک نظر دیکھنا تھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ اس کے دل میں بس گئی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا جس میں آئے روز ہڑتالوں کے باعث معمول سے پہلے ہی چھٹی ہوجاتی تھی۔ اس دن اس کی قسمت میں ٹکراؤ لکھا تھا کہ وہ کالج سے واپس آرہا تھا کہ اس کے سامنے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اگلے آدھ گھنٹے میں گھر سے ثمرہ کا بڑا بھائی اور بھابی والدہ سمیت پہنچ گئے۔ انور شاہ نے بیوی کو بمشکل تسلی دے کر چپ کرایا تو باقی سب کے چہروں پر بھی اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔ ماں کی زبان سے ہر جملے کے ساتھ دعائیہ کلمات نکل رہے تھے۔ اتنے میں ایک نرس نے انہیں مریضوں کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ شفقت بھی اس ٹولے کے ہمراہ پہلے ثمرہ کے لیے مخصوص کمرے کی جانب گیا۔ سرخ وسپید کتابی چہرہ اس وقت سفیدی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ معصومیت کی انتہا ایک عجب ہی منظر پیش کررہی تھی۔ اسے لگا جیسے چھوٹی معصوم سی گڑیا کو کسی بچے نے بستر پر سلانے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ سارا قافلہ دوسری جانب محسن کو دیکھنے گیا۔ اس کی ٹانگ پر پٹی دیکھ کر فی الوقت تھوڑی بہت تسلی ضرور ہوئی کہ کوئی ایسی چوٹ نہیں آئی تھی جو جان لیوا ثابت ہوتی۔ اس سب کے دوران گھر سے آئے افراد کو وارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسی لیے کسی نے شفقت پر توجہ نہیں دی مگر جوں ہی فرصت میسر آئی تو ثمرہ کی والدہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"ارے معاف کرنا بیٹا، ہم لوگ تو تمہارے بارے میں پوچھنا بھول ہی گئے۔" انور شاہ نے مختصراً شفقت کے بارے میں سب کو بتایا۔

"بھائی آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ تو نہیں ہیں ہمارے پاس..... ہاں مگر اتنا ضرور ہے کہ آپ کے یہاں پر ہونے والے اخراجات ہم ادا کردیں، باقی آپ کی انسانی ہمدردی کا صلہ تو اللہ پاک آپ کو دیں گے۔" احسن نے خلوص دل سے کہا تو انور شاہ نے بھی اصرار کیا۔

"جی بہتر!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فی الحال وہ ان لوگوں سے اجازت لے کر واپس چلا آیا کہ اخراجات کی بات پھر کبھی ہوجائے گی۔ وہ گھر کی جانب روانہ ہوگیا تھا مگر اپنا دل اسپتال میں ہی چھوڑ آیا تھا جہاں سر پر پٹی بندھے ایک اپسرا دنیا سے بے خبر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ گھر پہنچا تو ماں کو پریشان پایا۔ اسے گھر پہنچنے میں دیر تو ہو ہی جاتی تھی مگر وہ سچ بتا کر جاتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے آنے تک کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ اسے دیکھ کر ماں کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ اس نے ماں کو سارا قصہ سنا ڈالا۔

"مجھے اپنی تربیت پر ہمیشہ فخر محسوس ہوتا ہے بیٹا۔" وہ ساری بات سن کر بولی۔ "تمہیں پتا ہے نا میں نے اپنے باپ سے بغاوت کر کے تمہارے باپ سے شادی کی تھی۔ اس لیے ڈرتی رہتی ہوں کہ کبھی مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر اپنی اولاد نہ گنوا دوں۔ اس لیے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ

تقدیر کہیں میرے ساتھ بھی وہ سلوک نہ کردے۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں امی! انسان اپنی سوچ کو تقدیر کے سہارے چھوڑ کر سو جاتا ہے۔ حالانکہ تقدیر انسان کی محتاج ہے۔ آپ سے آپ کا شوہر چھن گیا، کیونکہ وہ ایک مزدور تھا اور پلازا بنانے کے دوران گر کر مر گیا تو آپ نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر صبر کرلیا۔ میری تعلیم کے لیے اخراجات نانا جان نے اٹھانے کا فیصلہ کیا تو آپ نے تقدیر کے سہارے زندہ رہنے کی جدوجہد کرنے کے لیے ان کی پیش کش ٹھکرا دی۔ جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد آپ نے ہندو عورتوں کی طرح سوگ در سوگ ڈوبے رہنا اپنی تقدیر سمجھ لیا تو اس میں آپ کا قصور نہیں..... ہر کام میں تقدیر کو کیوں دوش دیتی ہیں آپ؟ اگر یہ بات تھی تو اپنے باپ سے بغاوت کرتے وقت آپ نے کیوں نہ سوچا کہ اگر تقدیر میں لکھا ہے تو ویسا ہی ہوگا..... خیر، مجھے بھوک لگی ہے کھانا دیجیے۔'' وہ کھانا لینے چلی گئی تو ایک بار پھر شفقت کی نگاہوں میں وہ چہرہ گھوم گیا۔ ماں واپس آئی تو وہ مسکرا رہا تھا۔ ''ایک بات بولوں امی..... وہ انور شاہ کی بیٹی.....''

''جس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، یا کوئی اور بھی ہے؟'' ماں نے اس کی بات سمجھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہی ہے۔ آپ دیکھیں گی تو.....'' اس کے پاس تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے۔ ماں اس کی دلی کیفیت سمجھ کر مسکرانے لگی مگر پھر اچانک سنجیدگی سے بولی۔

''بیٹا! وہ امیر لوگ ہیں اور امیروں کے بارے میں تم جانتے ہی ہو گے کہ مرغی جتنی بڑی بھی ہو جائے، انڈا چھوٹا ہی دیتی ہے۔ اس لیے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینے سے حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بقول تمہارے وہ ابھی کالج جاتی ہے تو فی الحال چند سال تک اس کی شادی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اگلے چند سالوں میں تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو ممکن ہے کہ وہ راضی ہو جائیں مگر اولین شرط یہی ہے کہ تم اپنی قابلیت ثابت کرو.....''

ماں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ دل لگا کر پڑھنے لگا۔ شکریہ کے لیے اسے دو تین بار انور شاہ نے اپنے گھر بھی بلایا۔ اندھا کیا چاہتا، اسے دو آنکھیں مل رہی تھیں۔ دیدار یار کی خاطر تو وہ تپتی دوپہر یا برستی بارش میں بھی گھنٹوں کھڑا رہ سکتا تھا۔ بہرحال دن گزرتے گئے اور اس کا آنا جانا لگا رہا۔ پرانی رشتے داریوں کو زنگ لگ گیا تھا جسے صاف کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ شفقت نے شروع شروع میں تو فقط دیدار تک ہی حد رکھی مگر جب اسے احساس ہوا کہ دوسری جانب بھی آگ برابر لگی ہے تو اسے ہمت ہوئی۔ ایک دن اس کا بھائی بیمار تھا اور وہ پیدل گھر کو جا رہی تھی کہ راستے میں اس کی ملاقات شفقت سے ہوگئی۔ اس نے شفقت کو دیکھا تو چہک کر بولی۔ ''کیا حال چال ہیں شفقت صاحب! کافی دن ہو گئے آپ آئے نہیں.....''

''جی ٹھیک ہوں..... اور آپ کو نانا یاد کرتے ہیں جو گھر آؤں۔'' اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''آپ کو کیا پتا کہ.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہاں سے آگے نکل گئی تو شفقت ہکا بکا رہ گیا۔ ایک دن وہ ان کے گھر میں موجود تھا کہ چپکے سے آکر ثمرہ نے ایک خط اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور وہاں سے بھاگ گئی۔ اس نے جلد ہی وہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچ کر بے تابی سے خط نکالا۔

خط کیا تھا..... کلیجا نکال کر الفاظ کی صورت میں اس نے بھیج دیا تھا۔ اس کے سارے وجود میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی باتوں میں اکثر ایک جملہ ضرور شامل ہوتا جو اسے الجھا دیتا تھا۔ ثمرہ کے خطوط میں یہ ہر بار لکھا ہوتا کہ اگر تقدیر میں ملن نہ ہوا تو وہ کیا کریں گے جبکہ شفقت اسے جواباً کہتا کہ تقدیر انسان خود بناتا ہے..... محبت کے دن اور راتیں تھیں، دونوں مطمئن و مسرور تھے کہ ان کی زندگی میں ایک طوفان کا گزر ہوا۔

ثمرہ کا بھائی محسن بھی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ لڑکی خاندان کی تھی مگر دونوں گھرانوں کے تعلقات اس طرز کے تھے کہ بظاہر رشتے داری مشکل نظر آتی تھی مگر محسن بضد تھا کہ وہ وہیں شادی کرے گا۔

دن گزرتے گئے اور شفقت کے ساتھ ساتھ محسن کی محبت میں بھی شدت آتی گئی۔ گھر والوں نے رشتہ مانگا تو وہاں سے ایک شرط پر رشتے کی ہامی بھر لی گئی۔ وہ لوگ وٹہ سٹہ کرنا چاہتے تھے یعنی ثمرہ کا رشتہ لے کر اپنی بیٹی دینا چاہتے تھے۔ ایسے میں انور شاہ نے بیٹی کی مرضی کے خلاف شادی سے انکار کر دیا۔ محسن ہارا ہوا جواری تھا اس نے دو تین مرتبہ خودکشی کی کوشش کی تو گھر والوں کے ہوش ٹھکانے آئے۔ دوسری جانب ثمرہ نے تمام صورتِ حال سے شفقت کو باخبر رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بھائی کی خاطر قربانی دے گی۔

آخر میں اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تقدیر میں ان کا ملنا نہیں لکھا ہوا اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ اس کے بھائی کی زندگی ختم ہو۔ اس نے ہر طرح کا ناتا توڑ لیا تھا۔

اور پھر ثمرہ نے اپنی راہیں جدا کرتے ہوئے بھائی کی

خاطر اس کے ہونے والے سالے سے شادی کی ہامی بھر لی۔ وہ لڑکی تھی' اسے قربانی دینی تھی۔ اس نے سب کچھ نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کرلیا۔ دوسری جانب شفقت نے پولیس کی نوکری کرلی۔ وہ شروع شروع میں تو ثمرہ کی یادیں سینے سے لگائے کھویا کھویا سا رہتا مگر پھر آہستہ آہستہ وقت کی گرد تلے اس نے اپنے زخم چھپا لیے۔ ایک چبھن جو اس کے سینے میں ہر وقت سمائی رہتی، وہ تقدیر کی ستم ظریفی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ انسان دوسروں سے جان چھڑانے یا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے تقدیر کا رونا روتا رہتا ہے وگرنہ دنیا کی کوئی چیز بھی عزم وارادے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس نے اپنی تقدیر خود بنانے کا فیصلہ کیا اور پھر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

☆☆☆

چھپکلی اپنے منہ میں کسی جاندار کو لیے بھاگ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں چھپکلی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ ٹیوب لائٹ کے آس پاس پروانے اپنی شمع پر نثار ہو رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی تقدیر میں یہی موت لکھی ہے۔

وہ جلد از جلد اسپتال سے روانہ ہونا چاہتا تھا مگر ہاتھ میں لگی ڈرپ نے اسے ایسے روکا ہوا تھا جیسے وہ مضبوط زنجیروں میں قید ہو۔ بہرحال وہ بے چینی کی کیفیت سے تب نکلا جب اسے کلیئر قرار دے کر اسپتال سے چھٹی دی گئی۔

وہ سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا اور مظفر نگر میں چوری کی واردات کی فائل نکالی۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کیس میں فی الحال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس نے اسپتال میں ہی ایک پلان ترتیب دے دیا تھا جس کے تحت اسے سب سے پہلے دوسری دو وارداتوں کے بارے میں چھان بین کرنا تھی۔ اس کے خیال میں یہ ممکن تھا کہ ان سب وارداتوں کا تعلق کسی ایک شخص یا گروہ سے ہو۔ اس لیے اس نے فی الحال مفروضات کی بنا پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

ماں کی وفات کے بعد اس کا کوئی بھی اپنا نہیں رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا اس لیے نفسیاتی طور پر عجیب وغریب کیفیات کا شکار ہوجاتا تھا۔ محدود ضروریات کی بنا پر دولت کی خواہش نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے رشوت لینے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ مجرموں کے ساتھ اس نے کوئی رعایت نہیں برتی تھی جس کے باعث ایک طرف لوگوں میں نیک نام جبکہ اعلیٰ حکام کی نظروں میں بدنام ترین افسر کہلاتا تھا۔

اس نے دوسری دو وارداتوں کی ایف آئی آر چیک کی۔ پہلا شخص جس کے گھر چوری ہوئی تھی خواجہ رفیق تھا۔

اس نے سب سے پہلے اسی گھر میں جانے کا فیصلہ کیا۔ مظفر نگر میں کریانہ اسٹور کے پروپرائٹر خواجہ رفیق کا گھر قصبے کے آخر میں مشرق کی جانب تھا۔ وہ ایک سپاہی سمیت اپنی ذاتی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر پولیس اسٹیشن سے نکل گیا۔ اس کا رخ خواجہ رفیق کے گھر کی جانب تھا۔

رفیق صاحب قصبے سے منسلک بازار میں دکان پر تھے۔ جب انہیں شفقت شاہ کی آمد کی خبر ملی تو وہ جلدی جلدی گھر پہنچے۔ شفقت شاہ سے سلام دعا کی اور چائے پانی کا پوچھا۔

''چائے تو ہم آپ سے تب ہی پئیں گے جب ہم نجی طور پر آئیں گے، فی الحال ہماری آمد سرکاری کام کے سلسلے میں ہے اس لیے مہربانی فرما کر ہمیں چوری کے حوالے سے کچھ تفصیلات درکار ہیں تاکہ ہم قصبے میں ہونے والی تمام وارداتوں کے پیچھے چھپے عناصر کو بے نقاب کرکے عبرت کا نشان بنائیں۔'' شفقت شاہ نے نہایت پُرسکون انداز میں اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

رفیق صاحب صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے گویا ہوئے۔

''جناب! بات کچھ یوں ہے کہ ہمارے پاس اتنا مال و دولت تو ہے نہیں جس کے لیے کوئی چور ڈاکو گھس آئے اس لیے مطمئن تھے اور دوسری بات گھر میں کوئی ملازم وغیرہ کا جھنجٹ بھی نہیں۔ گھر میں کل چار افراد ہیں جن میں ہم دو میاں بیوی اور بیٹے ناصر اور عامر ہیں۔ براہِ راست اس بات کی جانب آتا ہوں کہ دراصل ہمارے پاس کچھ پرائز بانڈز تھے جو اچھی خاصی مالیت کے تھے جنہیں چرا لیا گیا ہے۔ کب اور کیسے، اس کا ہمیں کچھ پتا نہیں کیونکہ ایک ماہ پہلے آخری دفعہ ہم لوگوں نے دیکھے تھے اس کے بعد وہیں ہی نہیں گیا اور پھر کوئی چیز ڈھونڈنے کے لیے ہم لوگوں نے الماری کھولی تو بانڈز نہیں تھے۔'' وہ اپنی بات مکمل کرکے ایس ایچ او کی جانب دیکھنے لگا۔ گھر والوں سے پوچھ گچھ کی گئی مگر بے سود.....''

''آپ کا بیٹا ناصر کہاں ہے؟'' شفقت نے سرسری سے بیانات لینے کے بعد رفیق صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جی..... کام کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا ہے۔''

''کس کام کے سلسلے میں؟ اور کیا آپ کے پاس اس کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟''

''نہیں جی رابطہ نمبر تو نہیں ہے۔ وہ دراصل گھر سے ناراض ہوکر گیا ہے جی.....''

''گھر سے ناراض ہوکر یا پھر لڑکی بھگا کر؟'' وہ سخت

لہجے میں بولا تو رفیق صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بستر کی چادر پکڑ کر وہ گرنے کے سے انداز میں نیچے بیٹھ گئے۔ ان کی بیگم کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ انہیں چوری کی رپورٹ درج کروانے کے اگلے دن ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہ کام ناصر نے کیا ہے مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سارے محلے میں خبر پھیل چکی تھی کہ گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ ایس ایچ او نے ان کے گھر آنے سے پہلے ہی ایک دو ہمسایوں سے معلومات حاصل کی تھیں جس کی بنا پر پتا چلا تھا کہ یہ کام گھر کے بھیدی کا تھا۔ قصے میں چوری کے ساتھ ساتھ ایک اور واردات ہو چکی تھی جس کا علم کم ہی لوگوں کو تھا۔ شفقت کے لیے یہ انکشاف بھی ایسا تھا کہ وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ بدنامی کے ڈر سے لڑکی کے اہل خانہ نے کوئی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ اسے فی الحال کسی دوسرے کیس میں سر نہیں کھپانا تھا مگر ایک کیس کی کڑیاں دوسرے سے ملنے کے امکان پر وہ تہ در تہ نیچے اترتا جا رہا تھا۔ ناصر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری تھیں کہ کہیں وہ اس چوری میں ملوث نہ ہو۔ چوری کی دوسری واردات خواجہ محمود کے گھر ہوئی تھی جس کے بارے میں اب انکشاف ہوا تھا کہ وہ چوری تو ان کی بیٹی نے کی تھی۔ ناصر اور شمع نے اپنے گھر سے جو جو مال ہاتھ لگا، لے کر رفو چکر ہو گئے تھے۔ لڑکی کے گھر والوں نے چوری کا کیس بتا کر پولیس کو ایک طرح سے اندھیرے میں رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس چور کو پکڑنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹی کا پتا بھی چلا لے گی مگر پولیس نے کیس کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ شفقت نے مزید تحقیق کی تو پتا چلا کہ پہلی دو چوریوں کا تیسری چوری سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ یہ چوری ان دونوں کے جانے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ دائرے میں گھوم پھر کر واپس پہلی چوک پر آ گیا تھا۔ اسے دوسرے کسی کیس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ اس کی زندگی کا آخری کیس تھا شاید جس کے لیے وہ رات دن ایک کرنے کو تیار تھا۔ آخر کار وہ دوبارہ عارف زرگر کے گھر پہنچا۔ اب جو سانپ نکلنا تھا وہ وہیں سے نکلنا تھا۔ اس کے گھر والوں نے نجانے صبح کس کا منہ دیکھا تھا، جو شام کے وقت ایک بار پھر ان کے گھر شفقت پہنچ گیا۔ وہ فی الحال سادہ لباس میں تھا۔ اس نے آتے ہی گھر والوں کے بارے میں تفصیلات سے آگاہی چاہی تو عارف زرگر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔ ''اوجی اتنا بڑا کنبہ تو ہے نہیں، ہم میاں بیوی ہیں، ایک ہمارا بیٹا ہے واجد..... ایک ملازم ہے جو ان دنوں گھر گیا ہوا ہے۔ کل

ویٹ پلیز

ایک صاحب پہلی دفعہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے جا رہے تھے جب انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ایئر ہوسٹس نے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ویٹ پلیز.....''

صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

''ایک سو ساٹھ پونڈ.....!''

☆☆☆

اعتماد

ایک دفعہ بہت سارے پروفیسر ایک ہی جہاز میں بیٹھے۔ جب بیٹھ چکے تو بتایا گیا کہ یہ جہاز آپ کے شاگردوں نے بنایا ہے۔

یہ سن کر سب اٹھ کر جہاز سے باہر آ گئے۔ سوائے ایک پروفیسر کے جب ان سے پوچھا گیا۔

''آپ کیوں باہر نہیں آئے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اگر یہ میرے شاگرد نے بنایا ہے تو یہ اڑے گا ہی نہیں۔''

☆☆☆

نکلے دھلے

☆ محبت سوز ہے یا ساز؟

○ ساز۔ جب تک شادی نہ ہو۔

☆ چور کے پکڑے جانے میں کب مزہ آتا ہے؟

○ جب اس نے دل چرایا ہو۔

☆ شہنائی کی آواز میں درد کیوں ہوتا ہے؟

○ شاید دلہا کو آنے والے وقت سے خبردار کرنے کے لیے۔

☆ بیوی کے سر پر بھوت کب سوار ہوتا ہے؟

○ جب شوہر کے سر پر کسی پری کا سایہ دیکھ لے۔

☆ دنیا کی سب سے خطرناک پولیس کونسی ہے؟

○ ہینڈ باجے والوں کی۔ ان کا قید کروایا ہوا ساری زندگی رہائی نہیں پا سکتا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اس کی واپسی تھی مگر ابھی تک پہنچ نہیں سکا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی ملوث ہوسکتا ہے اس میں؟ کوئی اندازہ ہے کہ چوری ہوئی کس دن ہے؟" شفقت نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "اوجی ہمیں تو لکھ نہیں معلوم کہ کس دن چوری ہوئی اور ممکن ہے کہ اسلم ہی چور ہو مگر اس کا فی الحال کوئی پتا نہیں کہ کہاں ہے۔ گھر تو اس کا گاؤں میں ہے البتہ ہمیں اس کا کوئی فون نمبر یا موبائل نمبر وغیرہ نہیں معلوم....."

"اسلم غالباً آپ کے ملازم کا نام ہے، خیر..... یہ بتائیں کہ واجد کہاں ہے اور اس کی حرکتیں آج کل کیسی ہیں.....؟"

"وہ تو بس جی اللہ میاں کی گائے سمجھ لیں۔ دکان سے گھر اور گھر سے دکان، بدقسمتی سے پڑھنے لکھنے میں کند ذہن واقع ہوا تھا اس بنا پر ہم لوگوں نے اسے ہٹا کر دکان پر بٹھا دیا۔ اب بھی وہیں ہوگا، رات دیر سے آتا ہے۔"

"وہ اللہ میاں کی گائے سگریٹ نوشی کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات سے باخبر ہیں؟" اس نے اچانک عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تو عارف بھونچکا رہ گیا۔

"نن..... نہیں نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا....."

"ایسا ہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ مشکوک قسم کے لڑکوں کی صحبت میں بھی وقت گزارتا ہے۔ آپ یقیناً شام سے پہلے گھر آجاتے ہوں گے اور بقول آپ کے وہ رات دیر سے آتا ہے، جبکہ میری اطلاع کے مطابق آپ کی دکان تو مغرب کے بعد ہی بند ہوجاتی ہے۔ اس بات کی تصدیق آپ میرے جانے کے بعد کسی سے بھی کرسکتے ہیں.....

بہرحال آپ کو یہ سب بتانے کا مقصد ہرگز اس کی شکایات کرنا نہیں بلکہ یہ سمجھانا ہے کہ فی الحال سب سے مضبوط شک اسی کی ذات پر ہے کیونکہ دوستوں کے ساتھ گل چھرے اڑانے اور عیاشی کرنے کے لیے معقول رقم کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ آپ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ آپ قارون کے خزانے پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اکلوتا بیٹا پائی پائی کا محتاج ہے۔ ایسے میں چوری کی واردات نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟"

"اوجی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔ کسی نے کان بھرے ہیں آپ کے۔ میں تو، میں تو واجد کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرے کسی دشمن کی سازش ہے میرے خلاف، جو میرے بیٹے کو پھنسوانا چاہتا ہے۔"

"آپ کتنے حاتم طائی ہیں اس سے واقف ہوں میں۔ بہرحال اگر آپ کا بیٹا اس جرم میں ملوث ہوا، چاہے وہ براہِ راست ہو یا سہولت کار کے طور پر، میں نے اسے بھی اٹالنکا دینا ہے۔"

"میری طرف سے آپ کو مکمل طور پر اجازت ہے کہ اگر ایسی صورتِ حال پیش آجائے تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو مجرم سے کیا جاتا ہے۔"

"شکریہ عارف صاحب! مجھے افسوس ہے کہ ایسی باتیں آپ سے کرنا پڑیں، ممکن ہے آپ ہمارے پیشے کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے درگزر کریں گے۔" اس نے خلوصِ دل سے کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بے شک یہ شخص کنجوسِ اعظم تھا مگر اس وقت لٹا ہوا مظلوم تھا جس کی واحد اولاد ہی نالائق نکلی تھی۔ "یاد رہے کہ کل صبح تو بچے واجد کو تھانے بھیج دیجیے گا۔ اور جونہی اسلم، گاؤں سے واپس آئے اسے بھی۔" شفقت نے مصافحہ کرتے ہوئے اس سے کہا، جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ فی الحال واپس جارہا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ کسی سے بھی بیان لینے یا ملنے سے قبل، وہ اس کے متعلق اپنے طور پر چھان بین کرتا تھا اور لوگوں کی رائے بھی لیتا تھا۔ لوگوں کی دوسروں کے خلاف دلی کدورت اکثر اس کے لیے نئے در کھول دیتی تھی۔ وہ واپس تھانے پہنچا تو حسبِ معمول کوئی نیا کیس اس کا منتظر تھا مگر فی الوقت وہ کسی دوسرے کیس میں ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دو جگہ فون کرکے مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کا کہا۔ اگلے دن واجد کی تھانے حاضری تھی، اس لیے وہ فی الحال اس کے بارے میں جلد سے جلد معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ کرسی سے ٹیک لگا کر سوچوں کے بھنور میں غوطہ زن ہوگیا۔

☆☆☆

واجد سترہ، اٹھارہ سال کا ایک مضبوط جسامت کا مالک لڑکا تھا جو اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی، اس کے باوجود وہ خود کو نارمل رکھے ہوئے تھا۔

"بیٹھو..... اور جو کچھ میں پوچھوں بالکل سچ سچ اور سوچ سمجھ کر بتانا۔" شفقت نے نرم لہجے میں اس سے کہا تو وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"تمہارا اٹھنا بیٹھنا بالی اور اس کے دوستوں کے ساتھ ہے۔ وہی بالی جس کے بارے میں کئی لوگ جانتے ہیں کہ وہ منشیات فروش ہے۔ اس کے شہر بھر میں مختلف مقامات پر منشیات کے خفیہ اڈے موجود ہیں....." اس نے کہنا شروع کیا تو واجد کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ شفقت کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ فرشتۂ اجل ہو۔ وہ بولا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے آواز کسی اور کی ہو۔

"کچھ نہ کچھ تو لوگوں سے سنا ہوا تھا مگر جو کچھ آپ بتا رہے ہیں وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ کچھ مشکوک قسم کی سرگرمیوں کا سنا تو تھا مگر میری اس کے بجائے اس کے بھائی سے جان پہچان ہے۔ اس کا بھائی مڈل اسکول تک میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ وہ روز میری دکان پر آجاتا ہے اور پھر مغرب کے فوراً بعد ہم دونوں ہوٹل پر چائے پینے چلے جاتے ہیں۔ وہ یاروں کا یار بندہ ہے، اس لیے کبھی بھی اس نے مجھ سے چائے پلانے کی فرمائش نہیں کی بلکہ ہر بار خود ہی پیسے ادا کردیے۔"

"اچھا..... تو اس کی گفتگو کا مدعا کیا ہوتا ہے؟ یعنی اس نے تمہارے والد کی کنجوسی کا رونا رویا ہوگا پھر آہستہ آہستہ اس نے تمہیں سگریٹ نوشی کرنے پر مجبور کیا ہوگا اور پھر اپنی جیب سے کھلا پلا کر ایک دن تمہیں مشورہ دیا ہوگا کہ یہ سب کچھ تمہارا ہے تو تمہاری ملکیت کو اتنی آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے مجبوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی ہوگی اور پھر اس کے مشورے پر عمل پیرا ہو کر اپنے گھر سے قیمتی زیورات لاکر اس کے حوالے کردیے ہوں گے۔" شفقت نے پوری کہانی اس کے گوش گزار کی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اب کی بار اس نے اپنے اندر ہمت جمع کی اور جھٹ سے بولا۔

"آپ کی پہلی چند باتیں تو بالکل درست ہیں۔ ہمارے درمیان ایسی باتیں ہوئی ضرور ہیں مگر صرف مذاق کی حد تک۔ سگریٹ نوشی کی عادت مجھے بہت پہلے کی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نے مجھے کافی عیاشی کرائی مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ میرے ہمسائے میں رہنے والی ایک لڑکی کا عاشق ہے جس کی خاطر وہ میرے ساتھ میرے گھر تک آتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ مجھے بطور ڈاکیا استعمال کرنے کے چکر میں تھا۔ ان دونوں کی ملاقات کے دوران میں چوکیدار کا کردار ادا کرتا ہوں۔ آپ کی گفتگو کا آخری حصہ بہرحال فضولیات ہے۔ اس چوری کا حقیقت میں مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر زیورات ہی چوری کرنے ہوتے تو یہ کام دکان پر زیادہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے جہاں میں کافی وقت اکیلا ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بات ختم کی تو شفقت اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ واجد سچ کہہ رہا ہے۔

اس نے دوسرا جال پھینکا۔ "تو پھر تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے..... تم لوگوں کا کوئی دشمن؟"

"دشمن ایک نہیں، ہزار ہوں گے مگر وہ آستین کے سانپ جیسے۔ بظاہر دوست مگر اندر سے دشمن۔ ایسے میں کسی کو پہچاننا نہایت مشکل ہے۔ البتہ جس نے بھی یہ واردات کی ہے، چپکے سے کی ہے اور دن کے وقت کی ہے کیونکہ ہمارا کتا دن بھر پھرتا رہتا ہے جبکہ رات ہوتے ہی گھر کے باہر بیٹھ کر اندر آنے والوں کو بلا وارننگ کاٹ لیتا ہے۔"

"فی الحال تم جاسکتے ہو مگر یاد رہے کہ کسی بھی طرح کا کوئی بھی کلیو ملے تو فوری طور پر مجھ سے رابطہ کرو۔"

جان بچی سو لاکھوں پائے کے مترادف وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ شفقت شاہ کے شکنجے سے بچ جانا واقعی اس کی خوش قسمتی تھی مگر اس کے جاتے ہی شفقت کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔ کیس جوں کا توں تھا۔ اسے امید تھی کہ محنت رائگاں نہیں جائے گی مگر واجد کے متعلق ساری معلومات بوگس ثابت ہوئیں۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا تفتیر اسے پیچھے دھکیل دیتی۔ اب آخری مہرہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھریلو ملازم اسلم۔ اس کی مشکوک حالات میں گمشدگی بھی معنی خیز تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ اسے یوں لگا جیسے بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ بڑبڑایا۔ وہ جوں جوں غور کرتا گیا، اسے اپنا آپ دلدل میں دھنستا محسوس ہونے لگا۔ وہ نیچے ہی نیچے جارہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے ہٹایا اور پھر باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آرہے تھے۔ یہ اسے ملازم کے ساتھ ساتھ ایک اور ہستی سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ اس کا رخ عارف زرگر کے گھر کی جانب تھا۔

☆☆☆

اسلم ابھی تک گاؤں سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے گاؤں بندہ بھیج کر اسے بلوایا گیا تو یہ مشکل ہی آسکا کیونکہ وہ سخت بیمار تھا۔ بیماری کی حالت میں اس نے جو بیان دیا، اس میں کسی پر شک ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ وہ خود چونکہ خالی ہاتھ ہی گاؤں گیا تھا جس کی گواہی اس کے ساتھ جانے والوں نے بھی دی تھی، اس لیے اسے بے گناہ قرار دے دیا گیا تھا۔ واجد کی نگرانی کا بندوبست بھی کیا گیا تھا مگر وہ بھی فی الحال کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ اب رہ جاتا تھا صرف ایک بندہ..... جس کے بارے میں اسے اچانک ہی خیال آیا تھا۔

وہ عارف زرگر سے ملا اور تھوڑی دیر اس سے ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد تھانے آگیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک سپاہی سمیت روانہ ہوگیا۔ اس

کا رخ دریا کے قریب بستی کی جانب تھا۔ وہاں جا کر اس نے ایک شیلٹر نما مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے ''پام'' کا پوچھا۔

''جی یہیں ہیں۔'' اس نے بتایا اور پھر پام کو آواز دی جو غالباً سو رہا تھا۔ پام بمشکل آنکھیں ملتے ہوئے باہر آیا تو وہ اجنبیوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''ہم سادہ لباس میں ہیں اس لیے آپ ہمیں نہیں پہچان سکتے۔ فی الحال آپ کو تھانے چلنا ہوگا ہمارے ساتھ۔'' شفقت نے نرم لہجے میں کہا تو پام کی آنکھوں میں خوف کے آثار اسے صاف دکھائی دینے لگے۔ اس نے بہتیرا ٹالنے کی کوشش کی مگر پولیس کے آگے کس کی چل سکتی تھی۔ چنانچہ اسے ساتھ آنا ہی پڑا۔ اسی رات دس بجے تک وہ اپنا جرم قبول کر چکا تھا۔ شفقت نے اس کے بتائے ہوئے پتے پر جا کر تمام زیور اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ کیس حل کر چکا تھا مگر تقدیر کو شکست نہ دے سکا۔ اسے مجرم پکڑنے کی خوشی نہیں تھی بلکہ اس بات کا دکھ تھا کہ وہ ایک بار پھر تقدیر کے آگے ہار گیا تھا.....

☆☆☆

اپنے بیان میں پام نے بتایا کہ اس نے جونہی گھر میں قدم رکھا تو اندر سے زیور کی بابت سوال، جواب شروع تھے۔ کسی عورت نے شادی کے زیورات کا ذکر کیا تو عارف کی بیوی نے اسے بتایا کہ آپ کا زیور تو فلاں جگہ پر محفوظ ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ جونہی اسے لگا کہ بیگم صاحبہ سو گئی ہیں اور مہمان بھی واپس چلے گئے ہیں تو وہ دبے پاؤں اندر کی جانب چلا۔ اسے گٹر کھولنے سے زیادہ لاک کھولنے کا تجربہ تھا۔ واجد اسے ٹوائلٹ اور گٹر کی نشاندہی کر کے واپس دکان پر چلا گیا تھا۔ گھر میں فقط بیگم صاحبہ تھیں جو سی پی کرتی الحال خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو وہ جلد ہی چپکے سے لاک کھول کر اس میں سے زیور نکال کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں پر دستانے پہلے سے ہی تھے۔ زیور اس نے فی الحال گھر میں ہی رکھا تھا۔ چوری کرنے کے کچھ دن بعد وہ دوبارہ، سن گن لینے عارف کے گھر کام کے بہانے گیا۔ ان لوگوں کی پریشانی دیدنی تھی۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر تھوڑا سا کام کر کے واپس چلا گیا۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ جب تدبیر کندہ اپنی تدبیریں آزما رہا ہوتا ہے تو تقدیر اس پر ہنس رہی ہوتی ہے۔

شفقت شاہ اس رات نہ سو سکا۔ اس نے مجرم پکڑ لیا تھا۔ مال برآمد کر کے عارف زرگر کے حوالے کر دیا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا مگر وہ پھر بھی پریشان تھا۔ اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا کہ جس واقعے کو وہ تقدیر کی شکست سمجھ رہا تھا، وہی اس کے لیے تقدیر کا اشارہ تھا۔ اسے لگا تھا کہ اس کا پیٹ خراب ہونا اور اچانک ہی چوری والے گھر میں ہونا، تقدیر کی خرابی تھی مگر درحقیقت وہ ایک اشارہ تھا۔ مجرم کا تعلق جس چیز سے تھا اسے تقدیر اسی سمت لے کر گئی تھی مگر وہ نادان یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تدبیر ہی سب کچھ ہے۔ وہ اپنے زورِ بازو اور عقل پر نازاں تھا مگر تقدیر اسے خراب پیٹ کے ذریعے مجرم تک پہنچانا چاہتی تھی۔ ایک دائرے میں گول گول گھومتے ہوئے وہ جب واپس آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جھک مارتا رہا ہے جبکہ مجرم تو سامنے ہی تھا۔ اسے چیخ چیخ کر متوجہ کر رہا تھا مگر وہ..... اپنی تدبیر پر بھروسا کیے مطمئن تھا کہ اچانک ایک خیال نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔ اسے ثمرہ یاد آئی، جو تقدیر کے ہاتھوں میں بیٹھ کر آج مطمئن تھی اور خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ وہ ضد کرتی تو ممکن تھا کہ تدبیر کے ہاتھوں کھلونا بن کر آخر کار پھر وہیں پہنچ جاتی مگر اس نے ایسا نہ کیا تھا، جبکہ دوسری جانب شفقت کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے حقیقت پسندی سے منہ موڑ کر زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ہارا ہوا جواری تھا جسے اپنے آپ پر بھروسا تھا۔

عارف زرگر نے اس کے لیے شاندار دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں اسے مجبوراً شرکت کرنا پڑی۔ وہ باتونی شخص اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کر رہا تھا جنہیں وہ بے دلی سے سن رہا تھا۔ اچانک ایک جملہ سن کر وہ چونکا۔ ''اوجی شاہ جی سب کچھ اپنی جگہ آپ کی محنت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ایک بات تو آپ کو ماننا پڑے گی۔ یہ سب کچھ مجھے واپس ملنا تھا سو مل گیا۔ میرا تو ایمان ہے کہ حق حلال کی کمائی سے جو کچھ بنایا جائے، وہ اگر گم بھی ہو جائے تو جلد ہی آپ کو مل جاتا ہے۔ تقدیر بھی انسان کے ساتھ برا نہیں کرتی۔ کامیاب تقدیر پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ مجھے یقین تھا کہ میری قسمت میں اگر یہ سب لکھا ہے تو مجھے مل کر رہے گا۔ اس لیے اپنی سی کوشش کر کے میں نے صبر کر لیا تھا۔'' ایسے جملے سن کر وہ چڑ جاتا تھا مگر آج اس کے کانوں کو یہ جملے بھلے لگ رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ تقدیر زبردست ہے اور انسان زیر..... ہمیں ہمیشہ اس کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔

کلارا مارٹن اگر کسی بات پر فخر کر سکتی تھی تو وہ یہ کہ اس نے اپنے باپ کو غلط ثابت کر دکھایا تھا اب اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں رہی کیونکہ وہ سولہ برس پہلے مر گیا تھا یہاں تک کہ اس کے بھائی کو بھی اپنے باپ کی آواز یاد نہیں رہی ہوگی۔ اگر کسی کو ان کے باپ کی کوئی بات یاد ہو تو وہ کلارا کا بھائی ڈیوڈ ہی ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے ہی باپ کا لاڈلا اور چہیتا تھا زمانۂ طالب علمی میں ہی اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مرد عورتوں کو کیوں حقیر جانتے ہیں اور ان سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ اس کے ایک پروفیسر ڈاکٹر آرلنگٹن نے اسے کئی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں جن میں بتایا گیا تھا کہ

سچ پر جھوٹ کی سبقت اور..... خونی رشتوں کے درمیان خونی واردات کا احوال

مثبت ہو یا منفی ... قدم کوئی بھی ہو جس نے بھی اٹھانے میں پہل کر دی سیانے کہتے ہیں کہ فتح اسی کی ہوئی... کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ جو سوچوں میں گھری تھی اچانک اپنے ہی رشتوں کے دام میں الجھ کر گر پڑی اور پھر... شکست اپنا وار چل گئی۔

سبقت

شاہ زین رضوان

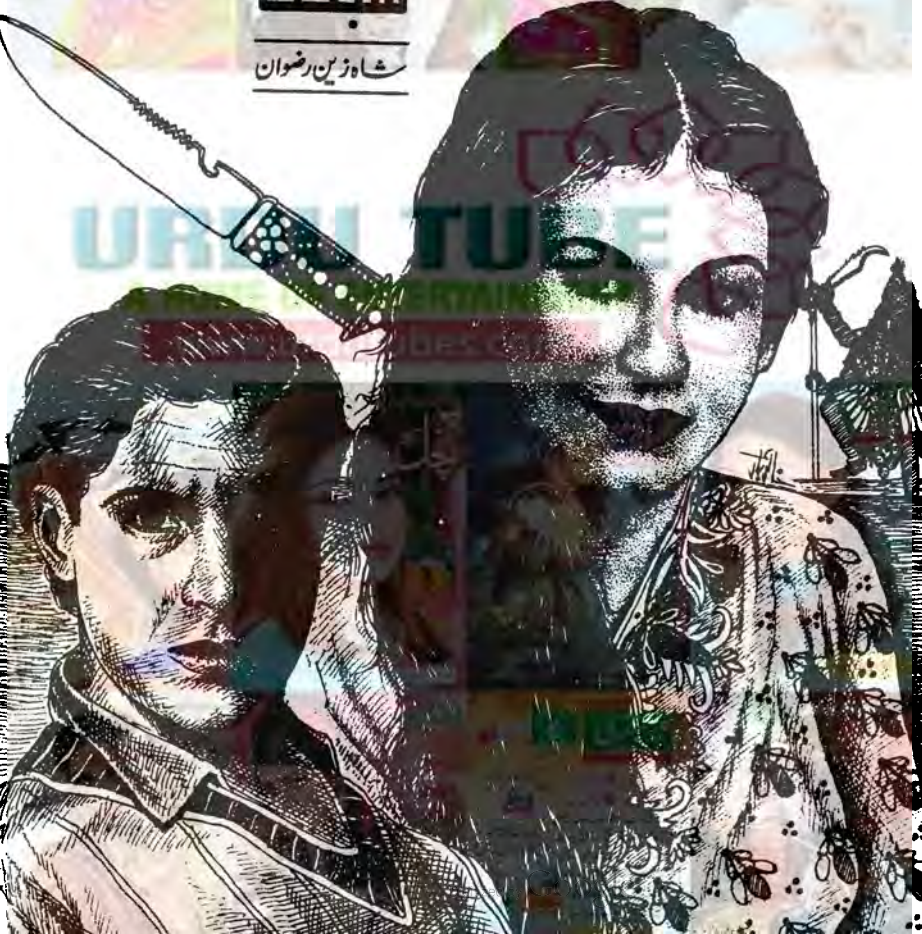

مرد عورتوں کو کن طریقوں سے حقیر سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان سے کس طرح آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر کلارا نے محسوس کیا کہ پوری دنیا میں ایسا ہو رہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کبھی بیٹی کی خواہش نہیں رہی اور وہ چاہے کچھ بھی کرلے، اس کا باپ کبھی مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ کلارا کو ملک کے بہترین کالجوں میں سے ایک میں داخلہ ملا اور اسے جونیئر ائر میں امریکا کی اعلیٰ ترین سوسائٹی کا رکن منتخب کرلیا گیا جبکہ اس کے بھائی ڈیوڈ کو باپ نے بھاری فیس ادا کرکے ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں داخل کرادیا جہاں اس نے ہمیشہ کم نمبروں سے امتحان پاس کیا۔

کلارا کو بہت جلد محسوس ہوگیا کہ کوئی رشتہ خالص نہیں اور سب میں کہیں نہ کہیں کوئی کھوٹ ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ اس کا باپ ہو، بھائی، پروفیسر، پڑوس میں رہنے والی عورتیں یا وہ لڑکے جن کے ساتھ وہ ڈیٹ پر جاتی تھی کیونکہ وہ کسی اور کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب ویسٹ پوائنٹ سے کیڈٹ فل یونیفارم میں آتے اور جمنازیم کی دیوار سے ساتھ لگ کر کھڑے ہوجاتے پھر ان میں سے ایک آگے بڑھ کر کسی لڑکی کو رقص کی دعوت دیتا۔ اگر یہ مرحلہ بخوبی سر ہوجاتا تو اس کے بعد وہ دونوں باہر گھومنے چلے جاتے، اس کے بعد اگلے مرحلے میں کیڈٹ اپنی یونیفارم سے ایک بٹن نکال کر لڑکی کو پیش کرتا۔ کلارا کبھی نہ سمجھ سکی کہ اس طرح بٹن دینے کا کیا مقصد ہے۔ گریجویشن مکمل ہونے تک اس کے پاس تین بٹن جمع ہوچکے تھے۔

جب اس کے باپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ہمیشہ کی طرح کلارا کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھی کیڈٹ تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ اس طرح اس کا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔“

جب اس کے باپ کو معلوم ہوا کہ وہ انڈیا جارہی ہے تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کررہی ہو۔ ہمارے مذہب میں کچھ خامیاں ہوسکتی ہیں لیکن اس میں معقولیت ہے جبکہ.....“

وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بات کررہا تھا۔ کلارا کی کمر دکھنے لگی۔ اس کی کمر کے پیچھے لٹکا ہوا تھیلا بہت بھاری تھا۔

”تم سدا کی احمق ہو۔“ اس کے باپ نے کہا۔ ”تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔“

☆☆☆

اس کے باپ کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ کلارا کا دفتر کولنڈ واٹر یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف ریلیجین اسٹڈیز کی دوسری منزل پر واقع تھا اور اس کے دروازے پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ”کلارا مارٹن، پی ایچ ڈی“ اس کا دفتر عملی طور پر دیویوں کی دیوی ”مہادیوی“ کے مندر کا منظر پیش کرتا تھا۔ جب کلارا پہلی بار اس دفتر میں آئی تو اس نے اپنی بھارت یاترا کی کئی تصویریں وہاں آویزاں کردیں۔ کسی میں وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی تو کسی میں ننگے پاؤں، ایک تصویر میں وہ دیوار پر بنی ہوئی وشنو کی ایک بڑی پینٹنگ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی جس میں وہ ایک غیر معمولی لمبائی والے سانپ پر لیٹا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے دفتر میں صرف وہ تصویریں تھیں جو اس نے مندروں کے باہر دکانوں سے خریدی تھیں اور وہ سب تصویریں دیویوں کی تھیں جنہوں نے مختلف روپ دھارے ہوئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو یہی بتاتی کہ لوگوں کے خیال میں ہندوازم، بت پرستوں کا مذہب ہے جہاں قدم قدم پر دیوتا موجود ہے اور وہ انسانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سارے دیوی اور دیوتا ایک ہی بھگوان کے اوتار ہیں جس نے انہیں تخلیق کیا اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس روز وہ جیسے ہی دفتر پہنچی اسے ڈیوڈ آتا دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مختلف کمروں کے دروازوں پر نظر ڈالتا ہوا آرہا تھا۔ کلارا کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے دفتر میں قدم رکھا اور رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں اس طویل قامت مجسمے پر جم گئیں جو کلارا نے اپنی کتابوں کی الماری کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دیوی کا مجسمہ تھا جس کے چار بازو تھے اور اس پر گہرے نیلے رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔

”اوہ میرے خدا۔“ ڈیوڈ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”یہ کالی کا مجسمہ ہے۔“ کلارا نے کہا۔ ”تم یہاں کیا کررہے ہو؟“

ڈیوڈ اندر آیا اور اس کی میز کے سامنے اس کرسی پر بیٹھ گیا جو اس نے اپنے طالب علموں کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ ایک ایک تصویر اور مجسمے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”میں کئی ہفتوں سے تمہیں فون کررہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”کئی ای میلز بھی بھیجیں لیکن تمہاری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔“

”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

''تم اس طرح اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکتیں۔ اگر یہ ظاہر کررہی ہو کہ تم نے دنیا کے معاملات سے لاتعلقی اختیار کرلی ہے تو بہتر ہے کہ یہ دفتر بھی چھوڑ دو۔''

''یہ میرے کام کرنے کا وقت ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ تم صرف یہ بتانے کے لیے اوہایو سے نہیں آئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں کوئی عقل کی بات بتاؤں۔ کیا تمہارے لیے اس بات کی کوئی اہمیت ہے کہ ہماری ماں نرسنگ ہوم میں زندگی گزار رہی ہے اور اسے وہ قانونی سرپرست اندھا دھند لوٹ رہا ہے جو صرف تمہاری وجہ سے ہم پر مسلط ہوا ہے کیونکہ تم نے کبھی ایک نارمل انسان کی طرح سوچنے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں نے اسے مسلط نہیں کیا بلکہ عدالت نے اس کا تقرر کیا تھا۔''

''کیونکہ تم نے مجھ پر مقدمہ دائر کردیا تھا۔ اس لیے عدالت کو ایسا کرنا پڑا۔''

''میں نے تم پر اس لیے مقدمہ کیا کہ تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہے تھے جبکہ میں نے تمہیں فون کیے۔ ای میلز بھیجیں۔ ٹیکسٹ میسج بھیجے لیکن تم نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہ سب کچھ یاد ہوگا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنا مصروف رہتا ہوں۔''

''تمہاری رہائش نیویارک میں ہے اور ہماری ماں تم سے صرف ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر رہتی ہے۔ تم نے نرسنگ ہوم والوں کو مجھ سے بات کرنے سے منع کردیا تھا۔ تم ماں کے مالی معاملات خود دیکھ رہے تھے۔''

''کوئی بھی وہ حساب کتاب دیکھ سکتا ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''عدالت نے بھی وہ کھاتے دیکھے تھے۔ وہ بالکل شفاف تھے اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔''

''میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہمیشہ ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کرسکتی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا تھا۔ اگر تمہیں اس کا نتیجہ پسند نہیں آیا تو اس کے ذمے دار بھی تم ہی ہو۔ تم نے ہی مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔''

ڈیوڈ اپنی کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی پشت کلارا کی طرف تھی۔

''ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔ وہ خبیث ماں کو بری طرح لوٹ رہا ہے۔ مجھے یہ کریڈٹ ضرور ملنا چاہیے کہ میں مالی معاملات کے بارے میں جانتا ہوں۔''

''کیونکہ تم سٹہ بازی کا فنڈ چلاتے ہو؟''

''نہیں بلکہ میں ایم بی اے ہوں اور اکاؤنٹنگ کو سمجھتا ہوں۔ جب میں حساب کتاب دیکھوں گا تو سمجھ جاؤں گا کہ کیا ہورہا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اسے عدالت میں لے جاؤ اور ہٹادو۔''

''جب تک میرے پاس ثبوت نہ ہوں، میں اسے عدالت نہیں لے جاسکتا۔''

''اگر تمہارے پاس ثبوت نہیں ہیں تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حساب کتاب میں کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے اس کی طرف سے ماہانہ رپورٹیں ملتی رہتی ہیں۔ تمہیں بھی ملتی ہوں گی۔ تم نہیں چاہتے کہ سب کچھ کنٹرول میں رہے۔''

''یہ لاکھوں ڈالر کا معاملہ ہے اور ماں کے دماغ میں خلل واقع ہوگیا ہے لیکن اس کی جسمانی صحت بہت اچھی ہے اور وہ مزید پندرہ سال زندہ رہ سکتی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اس کے مرنے پر تمہیں مجھ سے زیادہ مایوسی ہوگی جب یہ معلوم ہوگا کہ اس نے کچھ نہیں چھوڑا۔''

''میں اب بھی یہی کہوں گی کہ میری طرح تمہیں بھی ماہانہ رپورٹ ملتی ہوگی۔ اگر واقعی کوئی گڑبڑ ہورہی ہے تو تم ان رپورٹوں کو ثبوت کے طور پر استعمال کرسکتے ہو۔''

''نہیں، میں یہ نہیں کرسکتا۔''

''اور میں بھی اس پوزیشن پر واپس نہیں جانا چاہتی جہاں ہم شروع میں تھے۔'' کلارا نے کہا۔ ''میں نے پانچ سال تمہارا رویہ برداشت کیا اور اب میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گی۔''

''مجھے صرف ایک کاغذ پر تمہارے دستخط چاہئیں جس کے ذریعے مجھے تمام اکاؤنٹس حاصل کرنے اور ان کا معائنہ کرنے کی اجازت ہو۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟ یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس میں بھی کوئی چال ہے۔'' کلارا نے کہا۔ ''تم کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ رہے ہو جس کے ذریعے تم ایک بار پھر اس پیسے پر اپنا کنٹرول کرسکو۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمارے باپ نے سب سے بڑی حماقت یہ کی کہ ماں کی وفات کے بعد ہمیں اس دولت کا وارث بنادیا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ ماں تو زندہ درگور ہو جاتی اگر وہ صرف تمہیں اس دولت کا وارث بنا دیتا پھر اسے دماغی خلل بھی نہ ہوتا اور وہ تمہاری اصلیت جان جاتی۔''

''اور میں تمہاری اصلیت جان گیا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

کلارا نے ایک فائل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے کام کا وقت ہے ڈیوڈ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کتنی دور سے آئے ہو۔ تم نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں صرف تمہیں وقت دینے کے لیے اپنا شیڈول خراب نہیں کر سکتی۔''

''اگر میں اس کاغذ پر تمہارے دستخط حاصل نہ کر سکا تب بھی میں ایک ہفتے میں یہ معاملہ سیدھا کر لوں گا۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔''

☆☆☆

جب کلارا پہلی بار انڈیا آئی تو اس کا خیال تھا کہ وہ کسی آشرم میں جائے گی تاکہ وہاں کچھ سیکھ سکے۔ اس کے جو دوست انڈیا آ چکے تھے، انہوں نے بھی یہی کیا تھا اور انہوں نے اسے اس آشرم کا نام اور پتا بھی بتایا تھا جہاں وہ خود جا چکے تھے۔ وہ آشرم اتر پردیش میں تھا۔

''وہاں زیادہ گرمی نہیں ہوگی۔'' اس کی دوست سارہ نے بتایا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں گرمی سے ڈرتی ہوں۔''

کلارا کو گرمی کی نہیں بلکہ پیسوں کی پریشانی تھی۔ ڈیوڈ کی یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہو گئی تھی اور وہ ایک سال کے لیے یورپ جا رہا تھا۔ ان کے باپ نے اسے کریڈٹ کارڈ کے علاوہ بڑی مالیت کے ٹریولرز چیک بھی دیے تھے لیکن اس نے بیٹی کو سفری اخراجات کے لیے کچھ نہیں دیا۔ جب اس نے باپ سے پیسے مانگے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

''تم محض اپنا وقت ضائع کرنے وہاں جا رہی ہو۔ میں اس کے لیے تمہیں پیسے نہیں دے سکتا۔''

''تم نے ڈیوڈ کو بھی تو پیسے دیے ہیں۔''

''اس کا سفر تعلیمی نوعیت کا ہے۔''

''اگر میں بھی اسی مقصد کے لیے یورپ جانا چاہوں تو کیا تم مجھے پیسے دو گے؟''

''نہیں۔'' اس کے باپ نے صاف جواب دے دیا۔

باپ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کلارا نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کلارا نے جان بوجھ کر ایسا لباس پہننے سے اجتناب کیا تھا جسے دیکھ کر وہ منٹوں میں آگ بگولا ہو جاتا۔ باپ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں جا کر بیمار پڑ جاؤ گی اور بہت ممکن ہے کہ تم کسی گنوار کے ورغلانے میں آ جاؤ۔ وہ تمہارے سارے پیسے لے لے گا اور تمہیں حاملہ کر کے چھوڑ دے گا اور پھر مجھے ہی تمہیں واپس لانے اور ابارشن کرانے کے اخراجات برداشت کرنا ہوں گے۔ اگر تم نے ابارشن کروانے سے انکار کیا تو میں تمہیں سڑک پر بھیک دوں گا اور تمہاری ماں چلاتی رہے گی۔''

کلارا کی ماں ایک دبلی پتلی زرد رو عورت تھی جس کا چھوٹی چھوٹی بات پر نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا تھا۔ کلارا بچپن سے ہی یہ دیکھتی آئی تھی۔ جب وہ ہائی اسکول میں تھی تو اس کی ماں نے ایک آرٹ گیلری میں ملازمت کر لی۔

''دراصل وہ سمجھ ہی نہیں رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہی ہو۔'' اس کی ماں نے کلارا سے کہا۔ ''ڈیوڈ کی بات دوسری ہے۔ تمہارا باپ سمجھتا ہے کہ وہ تعلیم کی غرض سے یورپ گیا ہے۔''

''وہ میری بات سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔'' کلارا نے جل کر کہا۔

اس کی ماں بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''تم اب بھی جا سکتی ہو۔''

کلارا نے چونک کر اسے دیکھا اور سوچنے لگی کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ اس کے باپ نے اسے پیسے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ماں کے پاس کچھ رقم تھی جو اسے نانی سے ورثے میں ملی تھی گو کہ وہ اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی کہ اس کے باپ نے ڈیوڈ کو دی لیکن اگر وہ احتیاط سے خرچ کرتی تو اس کا گزارہ ہو جاتا۔

کیونکہ اس کے پاس پیسے کم تھے اس لیے وہ اتر پردیش کی براہِ راست فلائٹ نہیں لے سکتی تھی۔ اسے کسی ایسی پرواز کا انتخاب کرنا تھا جس میں اسے رعایت مل سکے۔ لہٰذا وہ کولکتہ چلی گئی۔ اس زمانے میں وہ کلکتہ کہلاتا تھا۔ ان دنوں وہاں خاصی گرمی تھی اور وہ کانپی گنجان آباد شہر لگ رہا تھا۔ اس نے ائرپورٹ سے ہوٹل جانے کے لیے ایک عام ٹیکسی لی۔ اس نے اپنا سامان ایک لاکر میں رکھوایا۔ اپنا پاسپورٹ اور ٹریولرز چیک ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھ کر گردن میں ڈالا اور قمیص کے نیچے چھپا لیا۔

ہوٹل میں ایک لڑکی اسے کمرے دکھانے لے گئی۔ وہ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں درجن بھر بستر لگے ہوئے تھے لیکن اس وقت وہاں صرف وہ دونوں ہی تھیں۔

''کل سے تم یہاں چار بجے کے بعد آؤ گی۔'' اس لڑکی نے کہا۔ ''اور صبح نو بجے چلی جاؤ گی۔ یعنی دن میں تم

باہر رہو گی اور اپنی کوئی اہم چیز یہاں مت چھوڑنا۔''

اگلے روز وہ دوسرے طالب علموں کے ساتھ گھوم رہی تھی جب اس نے مہادیوی کو دریافت کیا۔ جب ہوسٹل میں ایک لڑکی نے اس سے کہا۔ ''تمہیں کالی گھاٹ جانا چاہیے۔ اس جگہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں تمہیں تمام دیویوں کے مندر مل جائیں گے۔''

اس کے اگلے روز ہی کلارا کو ماں کا خط ملا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ڈیوڈ بارو رڈنر نس اسکول سے گریجویشن کر رہا تھا۔ باپ ایک ہفتے کے لیے کیلی فورنیا جا رہا تھا اور ماں خیریت سے تھی۔ وہ ہمیشہ خیریت سے ہی ہوتی تھی۔ اس نے کبھی دوسروں پر اپنی تکلیف ظاہر نہیں کی۔

کلارا ایک اونچی عمارت کے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ کئی اسٹال بنے ہوئے تھے جن پر مختلف اقسام کی اشیا خاص طور پر مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے پمفلٹ فروخت ہو رہے تھے۔ وہ ان زبانوں سے واقف نہیں تھی بلکہ اس نے ان میں سے کئی ایک کا نام بھی نہیں سنا تھا، اہم بات یہ تھی کہ ان میں سے کئی پمفلٹ انگریزی زبان میں تھے۔

کلارا ایک ایسے اسٹال پر گئی جو عمارت کے مرکزی دروازے سے ذرا فاصلے پر تھا۔ وہاں دو عمر رسیدہ خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے رنگین ساڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کی ساڑی کا رنگ نیلا اور دوسری کا سرخ تھا۔ کلارا اسٹال کے سامنے کھڑے ہو کر انگریزی میں لکھے ہوئے ایک پمفلٹ کو دیکھنے لگی۔ یہ پمفلٹ ایک رسی میں کلپ کے ذریعے لگائے گئے تھے جو اسٹال کے دونوں جانب بانسوں کے درمیان بندھی ہوئی تھی۔ اس پمفلٹ پر دو مسیوں کی تصویر تھی جن میں ایک سیاہ اور دوسری سفید تھی۔

نیلی ساڑی والی عورت نے کہا۔ ''تم انگلینڈ سے آئی ہو مہادیوی کی پوجا کے لیے؟'' اس نے برطانوی لہجے میں کہا۔

''امریکا۔'' کلارا نے بے ساختہ جواب دیا۔

سرخ ساڑی والی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ کرسی پر بیٹھنا چاہتی ہو؟''

کلارا بولی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے پمفلٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں بالکل نہیں جانتی کہ مہادیوی کون ہے۔''

سرخ ساڑی والی نے کاؤنٹر کے نیچے سے بالکل ویسا ہی پمفلٹ نکالا۔ ''اگر تم وہ پمفلٹ خریدنا چاہتی ہو تو یہ لے لو۔ میں رعایتی قیمت پر دے دوں گی۔''

''میں مہادیوی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' کلارا نے دوبارہ کہا۔

''مہادیوی، دیوی ماں ہے۔'' نیلی ساڑی والی نے کہا۔ ''یہ گوری بھی ہے اور کالی بھی۔'' پھر اس نے کاؤنٹر میں رکھے ہوئے ایک سفید مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ گوری ہے۔ یہ محبت، شفقت اور پیار کی دیوی ہے۔''

''اور یہ کالی ہے۔'' سرخ ساڑی والی نے سیاہ مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تباہی اور موت لاتی ہے۔''

نیلی ساڑی والی نے کاؤنٹر پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''لوگ مہادیوی کو یاد رکھنے کے لیے یہ چیزیں خریدتے ہیں۔''

کلارا نے دیکھا کہ کاؤنٹر میں پمفلٹ کے علاوہ بھی کئی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مختلف اقسام کی چھوٹی انگوٹھیاں اور مختلف سائز کے چھوٹے بڑے مجسمے شامل تھے۔

''اگر تم گوری کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتی ہو تو ان میں سے کوئی ایک چیز خرید لو۔'' اس نے ایک سفید مجسمہ اور ایک گلدان اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ جب تم اس کے درشن کے لیے مندر میں جاؤ تو یہ گلدان اسے پیش کر سکو۔''

''اگر میں دوسری دیوی کو یاد رکھنا چاہوں تو مجھے کیا خریدنا ہوگا؟'' کلارا نے پوچھا۔

''کالی۔'' اس عورت نے کہا۔ ''لیکن تم اسے برا نہیں کہہ سکتیں۔ کوئی تخلیق تباہی کے بغیر نہیں ہوتی۔ اندھیرے کے بغیر روشنی نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں اچھائی اور برائی ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن گوری کے مقابلے میں کالی زیادہ دلچسپ ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر جھکی اور اس نے کاؤنٹر سے کوئی چیز نکالی۔ یہ ایک بڑا چاقو تھا اس کے دستے پر کئی رنگین موتی جڑے ہوئے تھے اور اس کا نکیلا پھل سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس عورت نے کہا۔ ''یہ ہمارا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اور مہنگا آئٹم ہے۔ شاید اسے لوگ اپنے دشمن کو قتل کرنے کے لیے خریدتے ہوں۔''

''پاروتی!'' دوسری عورت نے اسے گھورا۔

☆☆☆

کلارا نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ یقین نہیں کیا کہ ان کی ماں کا سرپرست اسے لوٹ رہا ہے۔ وہ اس شخص کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اچھی طرح جانتی تھی لیکن وہ اسے ہر مہینے رپورٹ بھیجا کرتا تھا جس کے ساتھ اس کی صحت اور سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹیں ہوتی تھیں۔ وہ چند ماہ کے وقفے سے اس کی تصویریں بھی بھیجا

کرتا تھا۔ کلارا اپنی مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ نیویارک نہ جاسکی۔

ڈیوڈ کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ ماں کے لیے سرپرست کا تقرر کلارا کی درخواست پر عدالت نے کیا تھا۔ اس سے پہلے ڈیوڈ ہی ماں اور اس کے اثاثوں کی دیکھ بھال کررہا تھا۔ اس نے کچھ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرلی تھیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا کہ ان کی ماں اپنے مکان میں رہتی رہے لیکن جب ان لوگوں نے اس کی دیکھ بھال کرنے سے معذوری ظاہر کی تو ڈیوڈ نے ماں کو نرسنگ ہوم میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر کلارا خوش نہیں تھی لیکن وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی ماں کو بھولنے کا مرض تھا۔ وہ اکثر گاڑی لے کر باہر چلی جاتی اور اسے واپسی کا راستہ یاد نہ رہتا۔ ایک مرتبہ پولیس اسے ڈھونڈ کر لائی تھی۔

''اسے کسی روز حادثہ پیش آسکتا ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''تمہیں چاہیے کہ کار کی چابی اس کی پہنچ سے دور رکھو۔''

''ہم نے سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ چابیاں چھپا دیں۔ انہیں تالے میں بند کردیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح انہیں تلاش کرلیتی ہے۔''

''چابیاں گھر میں مت رکھو۔''

''جو لوگ اس کی دیکھ بھال کے لیے آتے ہیں' انہیں کار کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے پاس اپنی کار نہیں ہے۔''

کلارا نے کئی حل تجویز کیے لیکن ڈیوڈ کے پاس ہر ایک کا جواب تھا۔ بالآخر ماں کو ایک انتہائی مہنگے نرسنگ ہوم میں بھیج دیا گیا جہاں وہ ایک کمرے میں اپنی پالتو بلی کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ تاہم ماں کے وہاں جانے کے بعد کلارا کو اس کے بارے میں اطلاعات ملنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ ایک دفعہ جب اس نے نرسنگ ہوم فون کیا تو وہاں کے عملے نے اس سے بات نہیں کی اور کہا کہ اس کا نام منظور شدہ فہرست میں نہیں ہے اگر وہ ماں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہے تو اسے مسٹر ڈیوڈ مارٹن سے بات کرنی چاہیے جو مسٹر مارٹن کے سرپرست ہیں۔

''میں نے انہیں تم سے بات کرنے کو منع نہیں کیا تھا۔'' ڈیوڈ نے اس کی فون کال کے جواب میں کہا۔ ''ممکن ہے کہ پرائیویسی کے حوالے سے ایسا کوئی قانون ہو۔''

''اس کا انتظام کرو۔''

ڈیوڈ نے ایسا انتظام کیا کہ کلارا کو ماں یا اس کے اثاثوں کے بارے میں کوئی معلومات نہ مل سکیں، وہ پیسا تاحیات اس کی ماں کی تحویل میں تھا اور وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرسکتی تھی لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کرسکتی تھی اور اس کے مرنے کے بعد وہ دولت ڈیوڈ اور کلارا کے حصے میں آتی۔ اگر اس کے باپ کے بس میں ہوتا تو وہ تمام پیسا ڈیوڈ کے نام کردیتا۔ کلارا کو ڈیوڈ پر شک تھا کہ وہ یہی سوچتا ہوگا۔ اس کے خیال میں ساری دولت اس کو ہی ملنی چاہیے تھی۔

ڈیوڈ کے ماضی کو دیکھتے ہوئے عدالت نے کلارا کی درخواست پر غیر جانبدار سرپرست مقرر کردیا جس کے بارے میں کلارا اتفاقیہ طور پر جان گئی تھی۔ اس کے والدین نے کبھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ کیوں گرفتار ہوا اور اس پر کیا الزامات تھے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ گرفتاری کے بجائے صرف تحقیقات پر ہی معاملہ ختم ہوگیا۔

وہ اپنی میز پر بیٹھی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ سارے واقعات اس کے باپ کی زندگی میں ہی پیش آئے۔ اس کے مرنے کے بعد ڈیوڈ کسی مشکل میں نہیں پڑا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا یا وہ ماں کا سرپرست ہوتے ہوئے اس کی دولت کا غلط استعمال نہیں کررہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لکڑی کی کیبنٹ تک گئی جس میں وہ اہم کاغذات رکھا کرتی تھی۔ ماں کا سرپرست اسے انٹرنیٹ کے ذریعے رپورٹ بھیجا کرتا تھا اور وہ اس کا پرنٹ نکال کر فائل میں رکھ لیتی تھی۔ اس کا ریکارڈ کمپیوٹر میں بھی تھا لیکن وہ ہیک بھی ہوسکتا تھا۔

اس نے آخری تین رپورٹیں نکالیں اور انہیں پڑھنے لگی۔ وہ سب چھ یا سات صفحات پر مشتمل تھیں اور زیادہ تر صفحات میں اس کی میڈیکل رپورٹ تھیں جو کلارا کو پہلے ہی نرسنگ ہوم کے اسٹاف سے مل چکی تھیں۔ ہر رپورٹ کے آخر میں ڈیڑھ صفحات پر اس کے مالی معاملات کی تفصیل دی گئی تھی۔ صرف نرسنگ ہوم کی فیس ہی دس ہزار ڈالر ماہانہ تھی۔ علاج معالجہ اور اس کے ملبوسات پر ہونے والے اخراجات اس کے علاوہ تھے۔

کلارا نے وہ رپورٹیں فائل میں رکھیں اور دوبارہ کیبنٹ کی طرف گئی۔ جب اس نے ڈیوڈ کی جگہ غیر جانبدار سرپرست مقرر کرنے کے لیے عدالتی کارروائی کی تھی تو اسے

اپنی ماں کے اثاثوں کی تفصیل فراہم کی گئی تھی جو غیر معمولی مالیت کے تھے۔ اس کے بعد سرپرست بھی ہر سال اس کی رپورٹ بھیجتا رہا جس پر اس نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔

اس رپورٹ کے مطابق ماں کے سیونگ اکاؤنٹ میں تقریباً ساڑھے بائیس لاکھ ڈالرز تھے۔ اس کے علاوہ ساڑھے چودہ لاکھ کے میونسپل بانڈز، چھیاسٹھ لاکھ کے دوسرے بانڈز، تریسٹھ لاکھ ڈالر کے سٹیٹرز اور بیس لاکھ ڈالرز کے میونسپل فنڈز تھے۔ ان اثاثوں کی مجموعی مالیت دو کروڑ کے لگ بھگ تھی۔

کلارا کو یقین نہیں تھا کہ ڈیوڈ نے باپ کے مرنے کے بعد پہلے والی حرکتیں چھوڑ دی ہوں گی البتہ وہ چوری چھپے انہیں جاری رکھے ہوئے تھا لیکن اب اسے پیسوں کی ضرورت پیش آرہی تھی اور وہ دوبارہ ماں کا سرپرست بن کر اس کے مالی معاملات اپنے ہاتھ میں لینا چاہ رہا تھا اور اس لیے وہ دور دراز کا سفر کر کے کلارا سے ملنے آیا تھا۔

اس نے وہ رپورٹیں واپس اپنی جگہ پر رکھیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اب اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ واپس اپنی میز پر آئی اور فون اٹھا کر کیمپس سیکیورٹی کا نمبر ملایا۔

''میں ڈاکٹر کلارا مارٹن بول رہی ہوں۔ مجھے ایک چوری کی رپورٹ درج کروانی ہے۔''

جب ان کے باپ کا انتقال ہوا تو وکیل نے اس کی وصیت کی نقول ڈیوڈ اور کلارا کو دیں۔ اس کے مطابق ماں اور باپ دونوں میں سے کسی ایک کے مرنے کی صورت میں اثاثے دوسرے کو منتقل ہو جائیں گے اور اس کے بعد ساری دولت ڈیوڈ اور کلارا میں برابر، برابر تقسیم ہو جائے گی اور اگر وہ دونوں پہلے مر گئے تو ان کے بچے اس دولت کے حقدار ہوں گے۔

اس وصیت میں اہم نکتہ بچوں سے متعلق تھا۔ ڈیوڈ کے لیے بے اولاد ہونے کی صورت میں اس کے بعد تمام دولت کلارا کو مل جاتی لیکن ڈیوڈ پچھلے کئی ماہ سے اسے جوای میل، وائس میل اور پیغامات بھیج رہا تھا' اس میں مایوسی جھلک رہی تھی اور یہی مایوسی اسے اس وقت نظر آئی جب وہ چند گھنٹے قبل اس کے دفتر میں آیا تھا۔

کیمپس سیکیورٹی سے آنے والی عورت چھوٹے قد اور بھاری جسم کی تھی۔ ''وہ بہت زیادہ قیمتی نہیں تھا۔'' کلارا نے اسے بتایا۔ وہ عورت اس کے سامنے میز پر بیٹھی رپورٹ لکھ رہی تھی۔

''اسے ایک نشانی کہا جا سکتا ہے۔ جب میں پہلی بار انڈیا گئی تو وہ میں نے ایک مندر کے باہر اسٹال پر سے خریدا تھا۔ اس کے دستے پر لگے ہوئے پتھر ہیروں کے مانند دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ محض رنگین شیشے کے موتی ہیں۔''

''کیا کوئی شخص انہیں ہیرے سمجھ سکتا ہے جسے اس کی پہچان نہ ہو؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ اب وہ چاقو کیوں چوری ہوا۔ میں دس سال پہلے اس دفتر میں آئی تھی۔ تب سے ہی وہ یہاں رکھا ہوا تھا۔''

''تم وہ جگہ بتا سکتی ہو؟''

کلارا نے ایک شیلف کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں اور بھی کئی چیزیں رکھی ہوئی تھیں ان میں گوری کا سفید اور کالی کا سیاہ مجسمہ بھی تھا۔

''یہ کالی کا مجسمہ ہے۔'' کلارا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہندو روایات کے مطابق اس چاقو کا تعلق کالی سے ہے۔''

''کیا وہ بہت پرانا ہے؟'' آفیسر نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ کوئی نادر شے؟''

''نہیں۔ یہ اس کی نقل ہے۔'' کلارا نے کہا۔ ''اس کی قیمت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ درحقیقت وہ ایک عام سا چاقو ہے جسے مختلف کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

بالآخر وہ آفیسر یہ وعدہ کر کے چلی گئی کہ وہ اس واقعے کی رپورٹ پولیس اسٹیشن میں درج کروا دے گی۔ اس کے جانے کے بعد وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔ ڈیوڈ اپنا کارڈ اس کی میز پر چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت کلارا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن اب اس نے وہ کارڈ اٹھا لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس پر ڈیوڈ کا نام، دفتر کا پتا اور کئی فون نمبر درج تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق فہرست میں دوسرا نمبر اس کے سیل فون کا تھا۔

وہ اسے فون کرنے ہی والی تھی کہ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ شہر میں موجود ہے یا واپس چلا گیا۔ ایسی صورت میں اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ بہرحال اس نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ڈیوڈ نے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا۔

''میں اس بارے میں سوچ رہی تھی۔'' اس نے کہا۔

''اوہ میرے خدا۔'' ڈیوڈ بولا۔ ''مجھے یقین نہیں

آرہا۔"

"تم جو کچھ سوچ رہے ہو' اس کی تمہارے پاس کوئی وجہ بھی ہوگی۔ کوئی ایسی چیز جو تم مجھے دکھا سکو۔"

"شاید میرے پاس ایسی کوئی چیز ہو۔" وہ محتاط انداز میں بولا۔ "لیکن وہ کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔"

"کیا تم اسے لے کر میرے پاس آسکتے ہو؟"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ "اس کے لیے مجھے ایک کمپیوٹر کی ضرورت ہوگی۔"

"میں اس کا انتظام کردوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارے دفتر آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں۔ ویسے بھی میں نہیں جانتا کہ اس وقت میں کہاں پر ہوں۔"

"یہاں مت آنا۔ میرا مطلب ہے کہ میرے دفتر مت آنا۔" کلارا بولی۔ "یہ جگہ اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے اور ویسے بھی میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ شام کو میرے گھر آجاؤ۔ میرے پاس سب انتظام ہے۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے اپارٹمنٹ آجاؤں۔"

"ہاں۔ شام سات بجے۔"

ڈیوڈ سے بات کرنے کے بعد کلارا نے کمپیوٹر پر ڈیوڈ کی کمپنی ہورزین فنڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انٹرنیٹ پر اس سے متعلق بہت کم مواد تھا۔ البتہ کمپنی کی اپنی ویب سائٹ ضرور تھی لیکن اس میں صرف کمپنی کی تشہیر کی گئی تھی جس سے کلارا کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ سہ ماہی رپورٹیں اور سالانہ گوشوارے بھی اس ویب سائٹ پر موجود تھے۔ اس نے ڈیوڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص بات پتا نہیں چل سکی۔ وہ اپنا کام ختم کرکے گھر چلی گئی۔ اس کے گھر یا قرب وجوار میں کہیں بھی سیکورٹی کیمرے نصب نہیں تھے۔ اس کا مکان شہر کے مضافات میں واقع تھا اور ابھی یہ علاقہ پوری طرح ڈیولپ نہیں ہوا تھا۔ مکان کے عقبی حصے میں ایک سوئمنگ پول تھا جسے کلارا نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت ہفتے میں دوبار آتی اور ایک مرتبہ باغ اور بیرونی صحن کی دیکھ بھال کرنے والے آتے۔

اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور عقبی دروازے سے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے پاس ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ تھا جس میں اس کی اسکول کی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے وہ بیگ کچن کی میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ لیونگ روم میں گئی۔ وہاں مینٹل پیس پر وہی چاقو رکھا ہوا تھا جس کی گمشدگی کی رپورٹ اس نے درج کروائی تھی۔ وہ جب اس گھر میں آئی تب سے ہی وہ چاقو اس جگہ موجود تھا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں کسی نے کسٹم پر نہیں پکڑا۔" اس کے باپ نے وہ چاقو دیکھ کر کہا۔ "لگتا ہے کہ اس سے تم کسی کا سر کاٹو گی۔"

وہ آتش دان کے پاس..... کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور چاقو اس کی گود میں تھا تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے چاقو سائڈ ٹیبل پر لیمپ کے نیچے رکھا پھر اس نے لیمپ روشن کردیا اندھیرے میں بیٹھنا کچھ عجیب لگتا۔

وہ ڈیوڈ کو ساتھ لے کر لیونگ روم میں آئی اور بولی۔ "میں کافی بنا سکتی ہوں اگر تم پینا چاہو۔"

پھر اس نے ڈیوڈ کی جانب پشت کی اور اپنی کرسی کی طرف چلی گئی لیکن اس پر بیٹھی نہیں۔ ڈیوڈ کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا اٹیچی کیس تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس اسکاچ ہوگی؟"

"نہیں۔" کلارا نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں شراب نہیں پیتی۔"

"تم شراب نہیں پیتیں۔ تم گوشت نہیں کھاتیں کیونکہ تم ہندو بن چکی ہو۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہندو نہیں ہوں۔"

ڈیوڈ کاؤچ کی طرف گیا اور اپنا اٹیچی اس کے برابر میں رکھ دیا پھر اس نے اسے کھولا جو تقریباً خالی تھا پھر اس نے اس میں سے ایک فلیش ڈرائیو نکالی اور اسے فضا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "اس میں وہ سب موجود ہے جو تمہیں چاہیے۔ عدالت بھی اس ریکارڈ کو دیکھ کر کچھ سوالات کرسکتی ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں نے عدالت کو وہی بتایا جو سچ تھا۔" کلارا نے کہا۔ "اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی، اگر تم گرفتار ہوئے۔"

"میں کبھی گرفتار نہیں ہوا، اور نہ ہی مجھ پر کوئی الزام عائد کیا گیا۔ ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ مجھ پر کبھی کوئی الزام لگایا گیا تھا۔"

"کیونکہ ہمارے باپ نے وہ معاملہ دبا دیا تھا۔" کلارا بولی۔ "تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"تمہیں مالی معاملات کا کچھ پتا نہیں ہے جس طرح میں قتل کی سزا کے بارے میں نہیں جانتا۔ اسی طرح تمہیں بھی مالی قوانین کا علم نہیں ہے۔ اس کے کچھ ضوابط ہیں۔ ان

میں کچھ وجیجہ گیاں ہوتی ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں سمجھدار لوگ صحیح سمجھتے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔"

"تم نے کسی کے ساتھ فراڈ کیا۔" کلارا بولی۔ حالانکہ اس کا ارادہ بحث کرنے کا نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ "اور تم نے ماں کے پیسے بھی چرائے جب تم اس کے سرپرست تھے۔"

"خدا کے واسطے کلارا۔ تم نے عدالت میں بھی یہی کہا تھا لیکن ثابت نہ کر سکیں اور جج نے اس کے باوجود غیر جانب دار سرپرست کا تقرر کر دیا ورنہ تم بہت شور مچاتیں۔"

"اس نے کہا تھا کہ یہ تشویش کی بات ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔

"کمپیوٹر کہاں ہے؟" ڈیوڈ نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

تین کمروں کے اس مکان میں کمپیوٹر سب سے چھوٹے کمرے میں رکھا ہوا تھا جسے کلارا ہوم آفس کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ "میں تمہیں وہ جگہ دکھا دیتی ہوں۔" کلارا نے کہا۔ "جب تک تم کام کرو، میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔"

اس نے ڈیوڈ کو کمپیوٹر پر بٹھایا اور خود کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ پھر اس نے کافی کے کپ ایک ٹرے میں رکھے اور اسے لے کر لیونگ روم میں آ گئی۔ اس کا ارادہ..... کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے کا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھنا چاہ رہی تھی۔ اسے اپنے منصوبے پر اچھی طرح غور و فکر کرنا تھا تاکہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اس نے ٹرے بڑی سی گول کافی کی میز پر رکھی اور آتش دان کے سامنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب وہ چاقو کو استعمال کرنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ چاقو کو کس طرح پکڑنا ہے۔ اسے اس کا پہلے سے اندازہ ہونا چاہیے۔

اسے ڈیوڈ پر چاقو کا وار اس طرح کرنا تھا کہ یہ ایک حادثہ نظر آئے۔ یعنی یہ کہ وہ اس پر چاقو سے حملہ کر رہا تھا لیکن خود اسے لگ گیا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ کلارا پہلے ہی اس چاقو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا چکی تھی۔ اس لیے پولیس یہی سمجھتی کہ یہ چاقو ڈیوڈ نے اس کے دفتر سے چوری کیا تھا۔ کلارا نے منصوبے کا یہ حصہ تو بخوبی مکمل کر لیا تھا۔ اب اسے اگلے مرحلے پر عمل کرنا تھا۔

کمپیوٹر کے کمرے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے قالین پر کرسی کھسکائی جا رہی ہو پھر اس کے چلنے اور کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ جب ڈیوڈ دوبارہ لیونگ روم میں آیا تو وہ اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا قد نسبتاً زیادہ لگ رہا تھا جبکہ درحقیقت وہ اتنا طویل قامت نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کس طرح چاقو کو اوپر لے جا کر اس کا پیٹ چاک کر سکے گی۔

"میں نے کمپیوٹر آن کر دیا ہے اور وہ چل رہا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "یہاں آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

"میں نے کافی بنائی ہے۔" کلارا نے کہا۔ "کیوں نہ ہم پہلے کافی پی لیں۔"

یہ کہہ کر وہ مڑی۔ اب وہ..... کرسی اور سائڈ ٹیبل کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں چاقو کا پھل چمک رہا تھا۔ اس نے ڈیوڈ کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کے کافی ٹیبل تک پہنچنے سے پہلے اسے اپنا کام کر دینا چاہیے ورنہ درمیان میں کافی ٹیبل کے آ جانے سے وہ اس تک نہیں پہنچ پائے گی۔

اس نے چاقو کے دستے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس بند ہو جائے گی۔ اس نے پیالی اٹھانے اور اسے واپس ٹرے میں رکھنے کی آواز سنی پھر دوبارہ قالین پر اس کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اب وہ اس کے بالکل پیچھے آ گیا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اس کی سانسوں کو محسوس کر سکتی تھی۔

اس نے ایک سے دس تک گنتی شروع کی اور آنے والے لمحات کا تصور کیا۔ اس نے عالم خیال میں چاقو کے پھل کو اس کے پیٹ سے اوپر دل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے پیچھے کی جانب گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے یوں لگا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے لیکن وہ اس بارے میں نہیں جانتی تھی۔

وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ اس نے چاقو اوپر اٹھانے کے بعد ڈیوڈ کو نشانے پر لیا۔ چاقو کا پھل روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے چشم تصور سے ڈیوڈ کے جسم سے خون بہتے اور اسے موت کے منہ میں جاتے دیکھا پھر بازی پلٹ گئی۔ اس نے ڈیوڈ کے ہاتھ میں گن دیکھی اور دوسرے ہی لمحے اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ ڈیوڈ اس سے زیادہ تیز نکلا اور اس..... نے پہل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

Digitized by Google

❁ حنظلہ.....لاہور

پت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے
جس نے تجھے کھو کر پایا ہو

❁ محمد شہباز اکرم نوئی.....ڈھیئی، پاک پتن شریف

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہاں سے محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کو اپنا بنانا ہنر ہی سہی
کسی کا بن کے رہنا کمال ہوتا ہے

❁ نبیل علی.....اوکاڑہ

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

❁ عبدالجبار رومی انصاری.....بورے والا

جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گل و گلزار دیکھنا
پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اک بار دیکھنا

❁ آمنہ رشید سیال.....دوہڑی، ضلع سکھر

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا

❁ وزیر محمد خان.....بل ہزارہ

حال کہنے بڑی شان سے آئے تھے خمار
اب جو سننے کو وہ بیٹھے ہیں تو کچھ یاد نہیں

❁ عاصم خان.....کراچی

پتا نہیں وہ اب کس مقام پر ہوگا
سنا ہے لوگ صداؤں سے تیز چلتے ہیں

❁ لیلیٰ منصور.....ٹنڈو الہ یار

ہاتھ آئے گا روشنی کا پتا
کاش! مل جائے اسی گلی کا پتا
کون جانے ہرے ہوں کب یہ شجر
کب پرندوں کی واپسی کا پتا

❁ کہکشاں فردوس.....سکھر

نہ مروت نہ محبت نہ خلوص ہے محسن
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انسان ہو کر

❁ جنید احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

صاف کہہ دو اگر گلہ ہے کوئی
فیصلہ فاصلے سے بہتر ہے

❁ راحیل احمد.....میر پور خاص

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

شام ہے دل اداس سی ہے بہت
یہ اداسی کہ راس بھی ہے بہت
تم مجھے درد دینے آئے ہو؟
درد تو میرے پاس بھی ہے بہت

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

یہ سمجھ کے مانا ہے سچ تمہاری باتوں کو
اتنے خوبصورت لب جھوٹ کیسے بولیں گے

❁ منیر شگفتہ.....وہاڑی

کیا تراشے کوئی چہروں سے حقیقت کے نقوش
لوگ افسانوی کردار نظر آتے ہیں

❁ اسلم علی.....نواب شاہ

عمر کا لمحہ لمحہ ہم نے بانٹ دیا
تیری خاطر بس اک شام بچالی ہے
غم کی بارش کیسے ٹوٹ کے برسی ہے
دل کے دشت میں ہر جانب ہریالی ہے

❁ وردہ ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

اگرچہ وہ اگلا سا التفات نہیں
میں شکوہ سنج نہیں، تو خدا کی ذات نہیں
مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کناں
یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں

❁ عمران شیروانی.....حیدرآباد

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

❁ بریرہ.....کراچی

اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سناٹے
سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں
ہوائیں تیز ہیں جل جل کے بجھتے ہیں چراغ اپنے
ارادے تند ہیں، ہم شمع نو بھڑکانے آئے ہیں

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں
کلیاں کس دور کے تصور میں
خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

❁ وزیر احمد.....جامشورو

اک روز وہی دیتے ہیں دنیا کو سہارا
جن کا کوئی دنیا میں سہارا نہیں ہوتا

❁ محمد یعقوب.....رحیم یار خان

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تعلق کا حوصلہ بھی نہیں

❁ غلام حسین اختر.....سرگودھا

بستر کی ہر شکن سے پوچھ اس کی بیقراری
کاٹی ہو رات جس نے کروٹ بدل بدل کر

❁ صبا سحر.....کراچی

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں
خدا کا شکر، احساسِ زمیں مرنے نہیں پایا
ستارے چننے نکلا تھا، شرارے چن رہا ہوں میں

❁ احسن آفریدی.....میانوالی

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

❁ تبسم ناز.....سکھر

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں
نہیں جانتا دعا کیا ہے

❁ زرین آفریدی.....حیدرآباد، سندھ

وسعتِ عشق میں تنگ دلی کا یہ عالم
اک چاہنا، فقط اسی کو چاہنا پھر کچھ نہ چاہنا

❁ ہادیہ ایمان.....فورٹ عباس

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

❁ ہاہا ایمان.....فورٹ عباس

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

❁ امتیاز احمد.....منڈی بہاؤالدین

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

❁ عدنان حسن شاذل.....فورٹ عباس

وہ جب قریب سے گزرے تو یہ ہوا محسوس
گزر رہی ہے زندگی دبے پاؤں جیسے

❁ محمد آریز ملک.....گلستان جوہر، کراچی
سمندر کے سفر رکھے ہوئے ہیں
مرے اندر بھنور رکھے ہوئے ہیں

❁ فیاض ملک.....کوئٹہ
ہم تو اس کی گلی کی خاک ہوئے
کس طرف کو گیا نہ جانے دل

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
خواب میں سر کو پھوڑتا تھا کوئی
خون میں تر بتر جبیں کیوں ہے

❁ زینب خواجہ.....ناظم آباد، کراچی
رقص کرتے میں دیکھتا ہوں اسے
وہ جو شعلہ سا ہے خلاؤں میں

❁ محمد اعظم.....شورکوٹ
پھر ہوا سوگھتی ہے دروازے
پھر کوئی بات ہونے والی ہے

❁ عاصمہ حسین.....سرگودھا
تمہارے ہاتھ سے لکھے ہوئے دکھ
مرے سینے میں چاقو ڈھونڈتے ہیں

❁ عنبرین حسین.....فیصل آباد
چاند چمکا نہ مرے ساتھ سویرا نکلا
رات کی اوٹ سے بیمار اندھیرا نکلا

❁ نذرت ناصر.....کوئٹہ
دھوپ سائے بچھائے بیٹھی تھی
میں ہی دیوار تک نہیں پہنچا

❁ ثمرین خان.....فیصل آباد
اداسی کرکے اب تاریک مجھ کو
تری آنکھوں کا کاجل ہوگئی ہے

❁ ارم کاشف.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
جس کے ہونے میں کچھ نہ اچھا ہوا
پھر وہی واقعہ نہ پوچھ ابھی

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد
آپ آئے ہیں شہر میں جب سے
لوٹ آیا سکون دل کی طرف

❁ طارق قدیر.....نواب شاہ
اُڑتا پھرتا ہوں اب غبار سا میں
خود کو سمجھا تھا آسماں ہوں میں

❁ اسما خان.....خانیوال
گرم رکھتا ہے لہو کو خواہشوں کا سلسلہ
دھوپ کے صحرا سے لے کر سایۂ اشجار تک

❁ سلیم خان.....پنڈی
ہم دیکھتے ہیں ہنستے بکھرتے ہوئے منظر
سب علم ہے جانا ہے کہاں خاک سے آگے

❁ پرویز احمد.....سیالکوٹ
رہنا ہے دیر تک مجھے دنیا کے سنگ بھی
آیا ہوا ہوں میں اسی دنیا سے تنگ بھی

❁ محمد زبیر.....ملتان
خدا کے کام جو آئے، خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

❁ وسیم علی.....بہاولنگر
کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج توفیق ہے رنگ تمہارا
کل تم مجھ سے شرماتے تھے، آج آئینے سے شرماؤ

❁ میمونہ عزیز.....لاہور
شکایت اپنے توکل سے ہے، خدا سے نہیں
کہ میرا دامنِ امید ہی دریدہ رہا

❁ ثاقب کمال.....کراچی
یہیں سے رنگِ رُخِ روزگار بدلے گا
کھٹائیں دل کی بالآخر لبوں تک آئی تو ہیں

❁ فیروز خان.....لیہ
مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہوگی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رخی کا جواز

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2018

نام: _____

پتا: _____

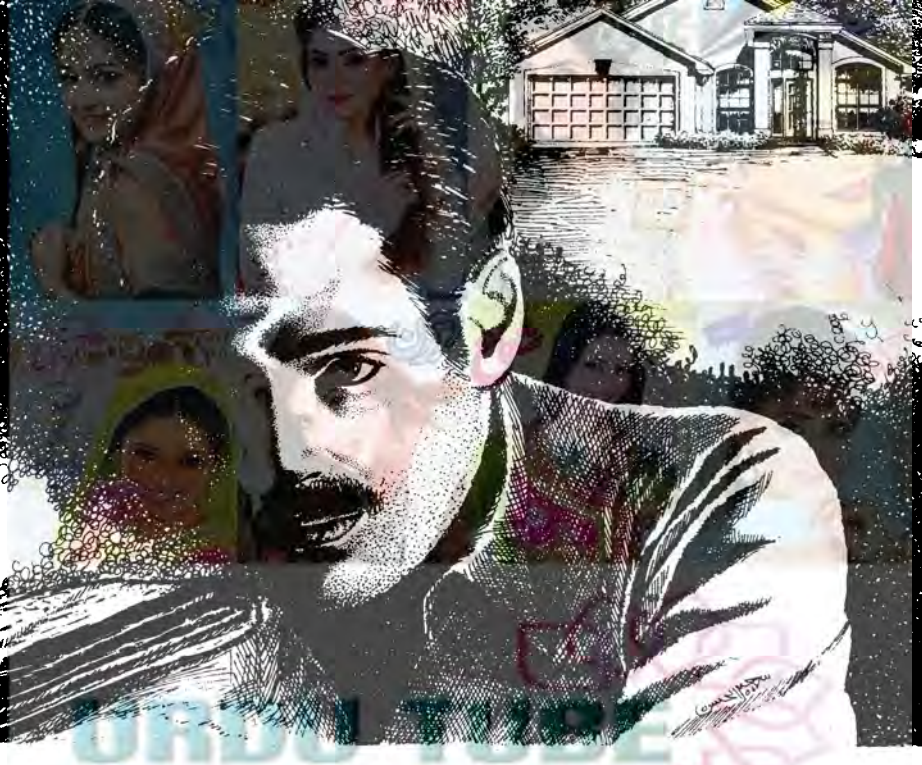

کمبل

ڈاکٹر شیر شاہ سید

پاکستان یوں تو اکثر و بیشتر قدرتی آفات کا شکار رہا ہے جس میں اکتوبر کا زلزلہ سب سے بڑی آفت لایا اور اس میں جہاں بے شمار لوگوں نے پر ممکن امداد سے نیکیاں کمائیں وہاں کچھ شیطان صفت مردہ ضمیر لوگوں نے دوزخ بھی کمالی لیکن... نادانستگی میں سرزد ہونے والی خطا کا جب انہیں احساس ہوا تو انہوں نے توبہ کی راہ بھی اختیار کرلی اور... یہ توفیق ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔

مردہ ضمیروں کو جھنجوڑتی ایک پر فکر اور عبرت اثر کہانی

پاکستان میں زلزلے کی خبر مجھے اس وقت ملی جب جہاز ممباسہ سے نکل چکا تھا اور کھلے پانیوں میں سمندر چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ زلزلے کی خبر ہر چینل پر تھی۔ اسلام آباد میں مرگلہ ٹاور گر گیا ہے اور کچھ عمارتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ بعد میں خبر آئی کہ زلزلہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں آیا ہے پھر خبر ملی کہ مظفر آباد اور ہندوستانی کشمیر کے علاقوں میں زلزلے کی شدت زیادہ ہے۔ پھر پتا لگا کہ بالا کوٹ اور باغ تو مکمل تباہ ہو گئے ہیں۔

پورے کے پورے شہر زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ آبادی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہے۔

ہر خبر کے ساتھ میری حالت غیر ہوتی جاتی تھی، یہ تو میرا علاقہ تھا۔ میرا گھر چشہ بٹہ میں تھا۔ ماں باپ، گھر، بچے، دوست، احباب، رشتے دار سب چشہ بٹہ میں تھے۔

جہاز کے ٹی وی والے کمرے میں صبح سے شام تک، جب بھی فرصت ملتی میں بیٹھا خبریں دیکھتا اور سنتا رہا۔ بی بی سی ریڈیو کے اردو پروگرام کی خبروں سے صحیح معنوں میں اندازہ ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ خبریں بہت سی تھیں۔ زخمیوں کی خبریں، دنیا بھر سے آنے والی امداد کی خبریں، نقصانات کی خبریں، کام کا مزہ ختم ہو چکا تھا۔

کراچی پہنچتے پہنچتے خبر مل گئی تھی کہ چشہ بٹہ میں تباہی ہوئی ہے۔ اکثر مکان گر چکے ہیں، مال مویشی کا نقصان بھی ہوا ہے۔ لوگ بھی مرے ہیں مگر میرا گھر محفوظ تھا۔ میرے گھر میں کوئی مرا بھی نہیں تھا۔ میں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ شکرانے کی نماز پڑھی۔ دیر تک اوپر والے کے آگے سجدے میں گر کے، سر جھکا کر دعا مانگی تھی، رویا تھا۔ جتنا بھی شکر کرتا کم تھا۔ میرے مولا کی شان، میرے گھر والوں کو بچالیا، میرے رشتے داروں کو بچالیا۔

مانسہرہ سے نکل کر مظفر آباد کے راستے پر آگے بڑھیں تو پہاڑوں کے درمیان چشہ بٹہ آتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرا بچپن یہیں گزرا، یہیں میں بڑا ہوا تھا۔ گاؤں کے اسکول سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور میٹرک کے بعد کراچی آگیا تھا۔ کراچی آکر میں نے مختلف کام کیے تھے۔ پہلے ایک اسپتال کی لیبارٹری میں چائے بنانے اور ڈاکٹروں کو چائے پلانے کی نوکری کی پھر ایک این جی او کے آفس میں چائے کے ساتھ ساتھ بھاگ دوڑ کے کام کا انچارج بھی ہوگیا۔ یہاں چائے پلاتے پلاتے مجھے کھانا پکانا بھی آگیا۔ تھوڑے دن میں نے ٹیلی فون آپریٹر کا کام بھی کیا پھر کراچی میں کینٹ اسٹیشن کے سامنے ماہ روز ہوٹل میں نوکری مل گئی تھی۔

یہاں میرے کئی کام تھے۔ آنے والے مہمانوں کو کمرا الاٹ کرنا، ان سے ہوٹل کے کرائے میں کمی بیشی کے سلسلے میں بات چیت کرنا، ٹھنڈے گرم پانی کے نظام کو بحال رکھنا، کھانے پینے کی چیزوں کا خیال رکھنا، ایک طرح سے میں منیجر کا اسسٹنٹ بھی تھا اور وقت پڑنے پر کھانا بھی پکا دیتا اور رات کو منیجر بھی بن جاتا تھا۔ شروع میں مجھے یہ نوکری اچھی لگی تھی۔

اس نوکری کے دوران ہی چشہ بٹہ میں میری شادی آسیہ سے ہوگئی تھی۔ آسیہ ہمارے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے تو صرف اس کے خواب دیکھے تھے اور سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میری زندگی میں آجائے گی مگر کراچی میں تین سال کی محنت سے بھیجا ہوا پیسا، پھر کراچی کے ایک ہوٹل میں منیجر ہونا، چشہ بٹہ میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

شادی کے بعد پہلے دو برسوں میں میرے دو بیٹے پیدا ہوگئے تھے۔ کینٹ اسٹیشن کے قریب ہی ریلوے لائن کے ساتھ بنی ہوئی کچی آبادی کے پکے مکانوں میں سے ایک مکان کرائے پر لے کر میں آسیہ کو کراچی لے آیا تھا۔

اسے کراچی بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ دو چھوٹے کمرے، چھوٹا سا باورچی خانہ، غسل خانہ اور گھر کے دوسرے لوازمات بڑے ہی غیر تسلی بخش تھے۔ کہاں اونچے نیچے پہاڑوں کے درمیان کی زندگی، کھلی فضائیں، اونچے اونچے لانبے لانبے درخت، صاف ہوا، چشمے کا میٹھا گنگناتا ٹھنڈا گرم پانی اور گاؤں دیہات کے سیدھے سادے لوگ۔ لوگ ایسے کہ جن کے پاس دولت کی کمی تو ہے پر وقت اور خلوص کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہاں کے لوگ کراچی کے لوگوں کی طرح چاپلوس اور دھوکے باز نہیں تھے، محنت کرنے والے اور محبت سے گزارہ کرنے والے بھولے بھالے لوگ۔ جو دل میں وہی منہ پر۔

یہاں کے تو ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد ٹرین کی گھن گرج، ٹریفک کی چیخم دھاڑ، گندے پانی کی نالیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے گندے بچے۔ نہ جانے چار سال کیسے گزار دیے تھے اس نے۔

بڑی مشکل سے میں راضی ہوا تھا کہ کراچی چھوڑ کر واپس مانسہرہ چلتے ہیں۔ چشہ بٹہ میں رہیں گے۔ کچھ کاشت کاری کریں گے، کچھ جانور پالیں گے۔ زندگی کھلی

فضا میں، آزاد ہواؤں میں سکون سے گزرے گی۔ سارے پلان بن گئے تھے۔ سارا منصوبہ مکمل تھا۔ میں ہوٹل سے استعفا دینے ہی والا تھا کہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے کیمبل پور کے محمد افضل سے باتیں ہوئیں، ملاقاتیں ہوئیں پھر دوستی ہوگئی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ میں پانی کے جہاز میں کیوں کام نہیں کرتا۔ نوکری دلانا اس کی ذمے داری۔ ''چند برسوں میں اتنا کمالو گے کہ پٹہ بٹہ خرید لو گے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

پھر نہ جانے کیسے کیا ہوا، شاید قسمت کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں سنگاپور کی ایک جہاز کمپنی میں ملازم ہوگیا۔ بیوی بچے واپس پٹہ بٹہ پہنچ گئے۔ میں سمندروں کے طویل سفر پر روانہ ہوگیا۔ کام بڑا اچھا تھا، کبھی تین مہینا چار مہینا غائب اور پھر تین تین چار چار مہینوں کی چھٹی بھی ملتی تھی، تنخواہ اتنی کہ کراچی میں جو سال بھر میں کماتا تھا، وہ یہاں ایک مہینے کی آمدنی تھی۔

میرے ساتھ اچھا ہوگیا، قسمت کا یہ بدلاؤ بہت دلکش تھا۔ بیوی بچے پٹہ بٹہ میں میرے ماں باپ کے پاس خوش تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے پکا گھر بنالیا تھا۔ گھر میں پانی کا کنکشن لگ گیا تھا۔ انگریزی غسل خانہ، باورچی خانہ، بڑا سا صحن۔ بچے بھی خوش تھے، دنیا جہان کے کھلونے ان کے پاس تھے، گھر میں ہر قسم کی خوشحالی بھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو حج بھی کرادیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم لوگ پٹہ بٹہ کے معزز لوگ بن گئے تھے۔ یہ سب پیسے کا کمال تھا۔

شروع میں سوچا تھا کہ تین سال میں نوکری چھوڑ دوں گا مگر سال گزرتے گئے، تنخواہ بڑھتی گئی اور میں نوکری نہیں چھوڑ سکا۔

بچے پٹہ بٹہ میں ہی پڑھ رہے تھے۔ اب تو وہاں اچھے خاصے اسکول کھل گئے تھے۔ ہمارا زمانہ نہیں تھا کہ ایک سرکاری اسکول کے علاوہ کوئی اور اسکول تھا ہی نہیں۔ بچے میرے ذہین تھے اور اسکول میں اچھا ہی پڑھ رہے تھے۔

ایسی پرسکون زندگی میں یہ زلزلہ بھونچال لے آیا تھا۔ ممباسہ سے جہاز کی روانگی کے بعد کھلے سمندر میں سفر کے دوران میں پٹہ بٹہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان لوگوں کے بارے میں جو میرے پیارے تھے۔ جن کے ساتھ میں نے زندگی گزاری تھی۔ میرے رشتے دار،

فارمولا

مشہور ریاضی دان البرٹ آئن اسٹائن جب کسی کالج یا یونیورسٹی میں لیکچر دینے جاتے تو ان کا ڈرائیور ہال کے آخر میں بیٹھا لیکچر سنتا رہتا۔ ایک مرتبہ کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے روانہ ہوتے وقت گاڑی میں بیٹھے تو ڈرائیور نے کہا۔ ''جناب عالی! میں آپ کے لیکچر سن سن کر تنگ آگیا ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کے تمام لیکچر زبانی یاد ہوگئے ہیں۔'' یہ سن کر آئن اسٹائن نے کہا۔ ''ایسا کرو کہ آج جس یونیورسٹی میں میرا لیکچر ہے، وہ لوگ مجھے نہیں جانتے۔ اس لیے میں ڈرائیور بن کر گاڑی چلاتا ہوں اور تم میری جگہ لیکچر دو گے۔'' تھوڑی بحث کے بعد ڈرائیور مان گیا اور یوں ڈرائیور آئن اسٹائن اور آئن اسٹائن ڈرائیور بن بیٹھا۔ ڈرائیور نے یونیورسٹی میں بہت ہی عمدہ طریقے سے لیکچر دیا۔ جب لیکچر ختم ہوا تو ایک شخص کھڑے ہوکر بولا۔

''سر! آپ نے اپنے لیکچر میں ریاضی کا جو فلاں فارمولا بنایا ہے، وہ مجھے صحیح طریقے سے سمجھ نہیں آیا لہٰذا ذرا وضاحت فرمادیں۔''

یہ سن کر نقلی آئن اسٹائن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ فارمولا تو اتنا آسان ہے کہ میرا ڈرائیور بھی آپ کو سمجھا سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور (اصلی آئن اسٹائن) کو آواز دے کر کہا۔ ''ڈرائیور! ذرا ان صاحب کو ان کا مطلوبہ فارمولا سمجھا دو.....''

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

رسم دنیا

آنگن میں جب تک درخت پھلن دیتا رہا مالکن باقاعدگی سے پانی دیتی رہی لیکن گزشتہ سال سے وہ سوکھتا ہی جارہا تھا اور سایہ بھی بس برائے نام رہ گیا تھا۔ مالکن بیرونِ ملک سے لوٹی تو ہفتہ بعد ہی اس نے حکم صادر کردیا۔ ''کسی کو بلوا کر یہ درخت کٹوا دینا، بہت جگہ گھیرتا ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

Digitized by Google

دوست، میرے بچپن کے ساتھی، ہماری مسجد کے مولوی صاحب، مؤذن، میرے اسکول کے استاد، شہر کے دوکاندار وہ تمام لوگ..... نہ جانے ان کے ساتھ کیا ہوگیا ہوگا۔ کون کون بچا، کون کہاں گیا، کیسے بکھرے ہوں گے لوگ۔ اتنا بڑا زلزلہ تو پہلے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اور پروالے نے کس جرم کی سزا دی ہم لوگوں کو؟ پھر اچھی خبریں بھی آئی تھیں، پتا لگا میرے گھر والے سب محفوظ ہیں۔ شہر زیادہ برباد نہیں ہوا ہے۔ کچھ زخمی ضرور ہیں مگر مرنے سے بچ گئے ہیں۔ کراچی پہنچتے پہنچتے یہ پتا لگ گیا تھا کہ چشہ بٹہ بڑی تباہی سے بچ گیا ہے۔ بالاکوٹ، مظفر آباد، گڑھی حبیب اللہ اور باغ تباہ ہوگئے ہیں۔ اگی، کالا ڈھاکہ، اپر چھٹا میں تباہی آئی ہے۔ چشہ بٹہ میں کچھ نقصان تو ہوا ہے مگر جانیں بچ گئی ہیں۔

میرے لیے تو یہی خوشی کی بات تھی۔ مال، دولت، مویشی، گھر، مکان سب کچھ ہوجائے گا۔ سب کچھ دوبارہ بن جائے گا، جان چلی گئی تو کچھ نہیں ہوسکتا۔

کراچی پہنچتے ہی میں نے کوشش کی تھی کہ پنڈی کا ٹکٹ مل جائے مگر ساری فلائٹیں بھری ہوئی تھیں پھر مجھے ساڑھے چار بجے کی پرواز میں جگہ ملی۔ جہاز کو نکلنے میں دیر ہوئی۔ جہاز پانچ بجے اڑا تو سات بجے پہنچا۔ ساڑھے سات بجے باہر نکل کر میں نے گاڑی کی اور رات گئے دیر سے گیارہ بجے اپنے گھر کے سامنے پہنچا۔ میرا گھر محفوظ تھا۔ رات کی تاریکی میں ہزارہ، حویلیاں، ایبٹ آباد، مانسہرہ سے گزرتے ہوئے چشہ بٹہ تک کوئی خاص تباہی نظر نہیں آئی۔ سڑک کے دونوں اطراف سفید، نیلے اور ملے جلے رنگوں کے بے شمار خیمے ضرور نظر آئے تھے۔

یہ پتا ہونے کے باوجود کہ گھر میں سب کچھ محفوظ ہے، چشہ بٹہ میں کوئی عزیز دوست رشتے دار مرا بھی نہیں ہے..... نہ جانے کیوں بے شمار اندیشے تھے کہ خود بخود دماغ میں چلے آتے تھے۔ ایک انجانا سا خوف، بے قراری بے چینی سی تھی۔

آسیہ مجھے دیکھ کر جیسے کھل اٹھی۔ چودہ سالہ اسماعیل، بارہ سالہ رفیق اور آٹھ سالہ نازیہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے تھے۔ سب سے مل کر میں نے نظر دوڑائی تو اباجی اور اماں جی نظر نہیں آئے۔ میرے دل میں بے شمار وسوسے جاگ اٹھے۔

''آسیہ! اباجی اماں جی کہاں ہیں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ تو کیمپ میں ہیں۔ سڑک کے ساتھ۔ اب تو سو رہے ہوں گے، صبح آجائیں گے۔''

میں تھکا ہوا تھا، کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ شاید کچھ زخمی ہوں گے تو کیمپ میں ہوں گے۔

میں نے کہا بھی کہ انہیں دیکھ کر آتے ہیں مگر آسیہ نے کہا کہ اب سو گئے ہوں گے لہٰذا بہتر ہے کہ وہاں صبح چلیں۔

گرما گرم پانی سے نہایا، آسیہ کے بنائے ہوئے کھانے کھا کر کچھ غنودگی کے ساتھ مجھے سردی سی لگی تو میں نے اسماعیل سے کہا کہ مجھے کمبل لا کر دے۔ اس نے مجھے لال اور نیلی لائنوں والا کمبل دیتے ہوئے کہا۔ ''ابا! یہ اوڑھیں، یہ ترکی کا کمبل ہے، بہت ہی گرم۔''

کمبل واقعی بہت ہی اچھا، ملائم اور بہترین قسم کا تھا۔ میں اس کمبل میں لپٹا ہوا گہری نیند سو گیا کہ نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا لگا جیسے سخت گرمی ہوگئی ہے یا شاید کمبل میرے چہرے پر چبھ رہا تھا۔ میں کمبل کو ہٹا کر اپنا پرانا لحاف تلاش کررہا تھا کہ آسیہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے لیے میرا سبز اور سرخ رنگوں میں بنا ہوا نرم روئی کا لحاف لے آئی۔

''یہ کمبل کہاں سے آیا ہے آسیہ؟'' میں نے نیند میں پوچھا۔

''یہ امدادی سامان کا کمبل ہے۔ بہت سارا سامان آیا ہے، بہت سارے کمبل آئے ہیں ناں، ملکوں ملکوں کے۔ اسماعیل لایا تھا..... بہت سارا سامان جمع کیا ہے اس نے۔''

میں غنودگی کے عالم میں یہ سوچتا ہوا سو گیا کہ ہمارے گھر کو امدادی سامان کی کیا ضرورت ہے؟ مضبوط بنا ہوا گھر محفوظ تھا، یہاں تک دراڑیں بھی نہیں پڑی تھیں۔ پانی اور بجلی کا نظام بھی ٹھیک تھا۔ دیکھا جائے تو چشہ بٹہ میں کوئی خاص نقصان ہوا بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ میں عادت کے مطابق صبح اٹھ کر چشہ بٹہ سے گزرتی ہوئی بڑی سڑک پر چلا آیا۔ سڑک کے ساتھ ہی کھلی زمین پر فوجیوں نے امدادی کیمپ لگایا ہوا تھا، سامنے لائن لگی ہوئی تھی، مجھے پتا لگا کہ نو بجے یہاں سے سامان بٹنا شروع ہوتا ہے

۔لائن میں مجھے چشہ بڈ کے بہت سے لوگ نظر آئے جن کے بارے میں مجھے آسیہ نے بتایا تھا کہ ان کے گھر بھی محفوظ ہیں۔ جانی نقصان بھی نہیں ہوا ہے۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اس امدادی سامان کے لیے کیوں لائن میں کھڑے ہیں؟ میں نے سڑک کے ساتھ پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر نیچے وادی کی طرف نظر ڈالی ہی تھی کہ اچانک شور سا سنائی دیا۔ سامنے سے ایک ٹرک دھیرے دھیرے چلا آرہا تھا جس میں تین آدمی کھڑے تھے اور مختلف سامان پھینکتے ہوئے جارہے تھے۔ چشہ بڈ کے بہت سارے لوگ، نوجوان، بچے ٹرک کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ میں ابھی سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ ان دوڑنے والوں میں مجھے اسماعیل بھی نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں چیزیں تھیں اور وہ روڈ پر پڑی ہوئی چنوں کی تھیلی اٹھا رہا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ میری نظر دوسری طرف بیٹھے ہوئے رفیق پر پڑی۔ وہ بہت سارے سامان کے ساتھ سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا تھا جیسے ان کی حفاظت کررہا ہو۔

''یہ کیا ہے اسماعیل؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ آج سامان جمع کیا ہے ہم دونوں نے اور اب اسے گھر لے جائیں گے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''مگر یہ سامان تو امدادی ہے غریبوں کے لیے..... تو غریب کب سے ہوگیا؟'' میں نے اسے ڈانٹ کر پوچھا تھا۔

''جی سبھی جمع کررہے..... تھے میں بھی کررہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں اسماعیل اور رفیق کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گھر لایا تھا۔ انہوں نے کہا بھی کہ یہ سامان اٹھالیں مگر میرے غصے کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئے تھے۔

گھر پہنچا ہی تھا کہ ابا جی گھر میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں گھی کا ڈبا اور اماں کے ہاتھوں میں دودھ کے پیکٹ تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھے۔ سامان بستر پر ڈال کر انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ میری ماں نے میرے ماتھے کو چوما۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھر گیا تھا۔

مگر میں اپنے اندر کے غصے کو نہیں چھپا پارہا تھا۔ وہ لوگ بیٹھے بھی نہیں تھے کہ میں نے غصے سے پوچھا۔

''ابا جی یہ سامان کہاں سے لائے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ادھر کیمپ میں رہ رہا ہوں۔ ادھر ہی سامان دے جاتے ہیں تو پھر اسے ہم لوگ گھر لے آتے ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ پہلی دفعہ میں نے اپنے باپ کو جھکی نگاہوں سے بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں حیران رہ گیا۔ یہ میرے چشہ بڈ کے ابا جان جنہوں نے ساری زندگی مجھے محنت کرنا سکھایا، جنہوں نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا، جنہوں نے ہمیشہ دیا، آج ان کو کیا ہوگیا ہے؟ ان کا پوتا سڑکوں پر ٹرکوں کے پیچھے امدادی سامان لوٹ رہا ہے۔ وہ خود اس بڑھاپے میں کسی کیمپ میں پڑے ہوئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ امدادی سامان جمع کرسکیں۔ پورا شہر اگر بھکاری ہوجائے گا تو کیا یہ بھی بھکاری ہوجائیں گے؟ شہر میں تو ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جن کا گھر گر گیا ہے۔ سامان دب گیا ہے لیکن ان لوگوں نے امداد ٹھکرادی ہے۔

مجھے ایسا لگا جیسے بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے لیے اجنبی بھی ہوگئے ہیں۔ یہ زلزلہ جس نے لاکھ سے اوپر آدمی ماردیے اور پانچ لاکھ سے اوپر زخمی کردیے، پہاڑوں کو ہلادیا، بلڈنگوں کو گرادیا، ندی نالوں کے راستے بدل دیے، یہ سب تو مالی جانی نقصان تھے، یہ تو ہوتا ہی ہے، یہ تو ہوتا ہی رہے گا مگر یہ زلزلہ میرے ابا جان کو بھکاری بنادے گا، میرے بچوں کو فقیر کردے گا، میری بیوی، میری ماں امدادی سامان کا انبار لاکر گھر میں ذخیرہ کریں گے۔ میں صرف سوچتا رہا اور جلتا رہا۔ نہ جانے کب تک اپنے گھر میں خود بھی مجرم بنا رہا، خود ہی وکالت بھی کی اور خود ہی فیصلہ بھی دیا۔

اس دن چشہ بڈ کے لوگوں نے دیکھ لیا کہ میں نے اپنے گھر کے سامنے ترکی کا کمبل بچھا کر اس پر یو این او کے تیل کے ڈبے، لندن کے سویٹر، ملتان کی چادر، کراچی کے بسکٹ، لاہور کے دودھ کے ڈبے، جرمنی کے ٹینٹ، ایک کے اوپر ایک رکھ کر آگ لگادی تھی۔ پورے چشہ بڈ کے لوگوں کے سامنے۔ آگ شام تک جلتی رہی تھی۔

اس دن افطار کے بعد میرا باپ، میری ماں گھر میں سوئے تھے۔ مجھے اپنے پرانے لحاف میں گہری نیند آئی تھی۔

قسط نمبر: 20

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی رینا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت رینا اپنی اکلوتی بیٹی فضیٰ کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازم رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیسیوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے بسمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ہیوسٹن میں واقع "سرکل اے" نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے "سرکل اے" میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ "ونی لاؤنج" نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار دھاڑ میں کوایک امیر و کبیر اسٹیشن ایجنٹ ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی..... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیٹے اسٹورز سے گروسری خرید نے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈ تا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے ہیوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو پیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال..... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پرسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک بارو رخ لاؤ اور بیما اپیل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی "اسکل اینڈ بونز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے "اسکل اینڈ بونز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹس سے بے بسی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ

فیصلہ کیا گیا کہ علی کوفی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے ویزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کرکے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔ علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت پینا کو بھی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کرکے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کرکے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور پینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جارہا تھا۔ اس کے در پردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ کسی بھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے پولیس کو پیچھے لگادیا تھا جو بڑی شدومد سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کرکے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذر آتش کردیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کرلیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچادیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ علی کایا کے ساتھ آئی لینڈ کی سیر کے لیے نکلا کہ اچانک کایا کا پیر برف میں دھنس گیا۔ علی، کایا کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو وہ بھی برف میں دھنستا چلا گیا۔ اسے لگا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے اور وہ برف کے نیچے خ بستہ پانی میں گر گیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ علی کو ہوش آیا تو اس نے خود کو کچھ لوگوں کے نرغے میں پایا۔ اچانک کایا نمودار ہوئی اور اس نے فائر کیا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ ہٹ میں پیڈرو نامی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چنگیز خان ہے۔ علی نے اسے اذیت ناک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ کایا نے علی کو اشارہ دیا کہ وہ بھی اپنے دشمن کو اسی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتی ہے۔ علی کے اس استفسار پر اس نے بتایا کہ سوسائٹی کے ممبر آسکر نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے اور وہ اس سے بھیانک انتقام لینا چاہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق جب آسکر کایا کو لینے آیا تو علی کی مدد سے اسے قابو کرلیا گیا اور کایا نے اسے بھیانک موت دی۔ علی نے آسکر کا روپ دھارلیا اور کایا اور وہ بذریعہ جہاز کرائسٹ چرچ ائرپورٹ پر لینڈ کرگئے۔ ایک کاؤنٹر پر علی نے اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ مگر آفیسر نے اسٹیپ لگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ایک فون کال پر وہ رک گیا۔ وہ شک بھری نظر سے علی کو دیکھنے لگا۔ علی سناٹے میں آ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آفیسر کی نگاہ مجھ پر اور دھیان فون پر لگا ہوا تھا۔ مجھے مسلسل گھورتے ہوئے وہ دوسری جانب بولنے والے کی بات کے جواب میں، دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”یس سر..... اوکے سر..... میں دیکھ لوں گا.....!“

یہ بڑے غیر یقینی اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ میں ایک دم الرٹ اور ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگیا تھا۔ اگر آپ کڑی محنت اور جان ماری کے بعد کسی ون ڈے کرکٹ میچ کو اس سچ پر لے آئیں کہ جیت کو یقینی بنانے کے لیے آخری بال پر پانچ رنز درکار ہوں اور یہ میچ کے آخری اوور کی آخری بال آپ کو کھیلنا ہو تو پھر آپ کے پاس اٹھا کر اونچا شاٹ مارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ہم نے بھی اپنے حالات کے پیش نظر کچھ ایسا ہی کیا تھا۔

ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ ہماری لگائی ہوئی ہٹ بال کو باؤنڈری لائن کے باہر پہنچادے گی لیکن یکا یک بال کے باؤنڈری لائن پر کیچ ہوجانے کا امکان پیدا ہوگیا تھا گویا ہماری جیت، ہار میں بدلنے والی تھی۔

میں بدترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتا۔ ان نازک لمحات میں میرے دل و دماغ کی جو کیفیت تھی، میں نے اسے یکسر نظر انداز کرکے اپنی فیلنگز کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور فوراً سے پیشتر میں نے آفیسر کو دیکھتے ہوئے اپنے دل پر توجہ مرکوز کردی۔ اس وقت میرے من میں صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ آفیسر کسی بھی وجہ سے مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔

میں اپنے محسوسات کی طاقت کو پہلے بھی کئی بار آزما چکا تھا۔ یہ خیالات کی بہ نسبت زیادہ قوی اور موثر ثابت ہوئے تھے۔ اس مرتبہ بھی میرے محسوسات نے فوری اور مثبت رزلٹ دیا۔ چند سیکنڈ کی توجہ کے بعد آفیسر نے ریسیور کریڈل کیا اور میرے پاسپورٹ پر ''انٹری'' کا ٹھپا مارنے کے بعد شائستہ لہجے میں بولا۔

''ویلکم ہوم سر.....!''

میں نے ''تھینک یو'' کہتے ہوئے اپنا پاسپورٹ اٹھایا اور پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے ایگزٹ لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ پھر میں نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آنے کے بعد ہی دم لیا۔ میرے لگائے ہوئے اونچے شاٹ نے کام کر دکھایا تھا۔

میں نہیں جانتا، آفیسر نے اس وقت کس سے بات کی تھی اور کیا بات کی تھی۔ اس کے ''یس سر اور او کے سر'' سے تو یہی لگتا تھا کہ دوسری جانب اس کا کوئی سینئر ہوگا۔ سربدست تو میں مختلف نوعیت کے اندازے ہی قائم کرسکتا تھا جیسا کہ ممکن ہے، کسی نے فون کر کے اسے میرے بارے میں بتایا ہو جبھی وہ اسٹیمپ کو چھوڑ کر مجھے شک زدہ نظر سے گھورنے لگا تھا۔ ریسیور رکھنے کے بعد مجھے انٹری دینے کا مطلب یہی تھا کہ اسے میرے حوالے سے کسی نے کلیئرنس دی تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ مذکورہ فون کال کا میری ذات سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ الغرض، سبب کوئی بھی رہا ہو، کام کی بات یہ تھی کہ آسکر براؤننگ یعنی میں کرائسٹ چرچ ائرپورٹ سے بہ خیر و عافیت باہر نکل آیا تھا۔ شاید یہ میری فیلنگز کا کوئی کرشمہ تھا۔

میں نے اپنے مالک کا شکر ادا کیا اور بس ٹرمنل کی جانب بڑھ گیا۔ کایا کی بتائی ہوئی تمام تر تفصیلات میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ کرائسٹ چرچ کے انٹرنیشنل ائرپورٹ سے بذریعہ بس نیو برائٹن پہنچنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نیو برائٹن لائبریری دوسو تیرہ میرین پریڈ پر واقع تھی اور کایا کا بتایا ہوا ولا چار سو انیس میرین پریڈ پر۔ ان دونوں مقامات کے بیچ میں لگ بھگ ساڑھے تین کلومیٹر کا فاصلہ تھا جو کسی کار میں سات منٹ میں طے کیا جاسکتا تھا لیکن کایا کی ہدایت کے مطابق مجھے میرین پریڈ کے کنارے پیدل مارچ کرتے ہوئے اپنی منزل کی سمت بڑھنا تھا۔ سو، میں اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔

موسم بڑا خوش گوار تھا۔ میں نے اپنی سوئس رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ سہ پہر کے ساڑھے چار کا وقت تھا اور درجۂ حرارت آٹھ ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ میں نے پچھلا ایک ہفتہ جس سرد خانے میں گزارا تھا اس کے مقابلے میں نیوزی لینڈ کی فضا کو جنتِ نظیر کہا جاسکتا تھا۔

میں خراماں خراماں میرین پریڈ کے کنارے شمال سے جنوب کی سمت گامزن تھا کہ سلور کلر کی ایک مزدا۔ سی ایکس فائیو کار میرے نزدیک آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں نے کایا کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ کایا نے سی ایکس فائیو کا شیشہ گرایا اور میری جانب گردن موڑتے ہوئے بولی۔

''گیٹ ان!''

میں پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول کر کایا کے پہلو میں آبیٹھا۔ اس نے بڑی مہارت سے نیو برانڈ جاپان اسمبلڈ مزدا کو آگے بڑھا دیا۔ چمچماتی ہوئی سلور کار میرین پریڈ پر اس طرح رواں دواں ہوگئی جیسے سمندر کے اندر سبک خرامی سے شارک تیرتی ہے۔

''سب ٹھیک رہا نا.....؟'' کایا نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''بالکل۔'' میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسی لیے تو ٹھیک ٹھاک تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں۔''

''میرا مطلب تھا، ائرپورٹ پر تو کوئی ایشو نہیں ہوا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی پھر اسے آفیسر والا واقعہ سنا دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ اس کے کسی سینئر کا فون ہوگا جسے اٹینڈ کرنے کے لیے وہ تمہاری طرف سے غافل ہوگیا ہوگا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ورنہ اگر اسے تم پر کوئی شک ہوگیا ہوتا تو اتنی آسانی سے انٹری نہیں دیتا۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم جو کام نمٹانے گئی تھیں وہ سب ہوگیا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا پھر قدرے الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''تم نے آفیسر کو پیر آف وزٹ کے ذیل میں ''جینک انجینئرنگ'' کا ذکر کیا۔ یہ خاصا پیچیدہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اگر آفیسر کوئی سوال کرلیتا تو.....؟''

''تو کرلیتا!'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''میری اس ٹاپک پر اتنی اسٹڈی ہے کہ میں اسے ہرگز مایوس نہ کرتا۔''

مزدا۔ CX5 تیز رفتاری سے نارتھ نیو برائٹن سے ساؤتھ نیو برائٹن کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں میرین پریڈ کے دو طرفہ مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم ساؤتھ

پرانٹن سرف لائف سیونگ کلب کے پاس سے گزرے تو کایا نے تاسفانہ انداز میں کہا۔

''کتنی عجیب بات ہے نا..... تم سوسائٹی کا حصہ نہیں ہو لیکن سوسائٹی کے بہت سے اندرونی معاملات پر تم نے خاصی اسٹڈی کر رکھی تھی۔''

''کیا تمہارا اشارہ جینٹک انجینئرنگ کی طرف ہے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا سوسائٹی کے اندر ایسا کوئی کام چل رہا ہے؟''

''جینٹک نارکنگ پر خفیہ تحقیقاتی کام جاری ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''سوسائٹی کے تجربہ کار ڈاکٹرز اور سائنس داں انسان کے ڈی این اے پر مختلف تجربات کر رہے ہیں جو بی ہیویر ماڈیفیکیشن کہلاتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے ڈی این اے میں مخصوص تبدیلیاں کر کے انسان کے رویے اور اس کے مختلف اعضا کی کارکردگی کو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کیا جاسکتا ہے۔ میں چونکہ میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہوں اس لیے اس قسم کی معلومات رکھنا میرے پیشے کا تقاضا ہے مگر تم.....''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

''اگر تم نرس ہو تو میں بھی کسی ڈاکٹر سے کم نہیں کایا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ راس آئی لینڈ والے ہٹ پر میں نے مسٹر پیڈرو کے پیٹ کا کیسا شاندار آپریشن کیا تھا۔ وہ میرے شافی ٹریٹمنٹ کے بعد ہر غم جاناں اور غم دوراں سے بے نیاز ہو گیا تھا.....''

''علی! تمہاری یہ خوبی مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ شدید ترین دباؤ کی صورتِ حال میں بھی تم حوصلہ نہیں ہارتے۔'' وہ برج اسٹریٹ سے آگے نکلتے ہوئے بولی۔ ''ان اعصاب شکن لمحات میں اگر ہنسی مذاق کا کوئی موقع پیدا ہو جائے تو تم برمحل فقرے بازی سے نہیں چوکتے۔''

''میرے نزدیک مایوسی گناہ ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مایوس انسان اپنے خالق کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے اور پھر..... زحمت اس کے ہم رکاب ہو جاتی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو علی۔'' وہ اسٹرڈی اسٹریٹ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''لیکن پتا نہیں کیوں، میں ایسی سچوئیشنز میں نروس ہو جاتی ہوں۔''

''کالی مرچیں زیادہ کھایا کرو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا یہ کوئی مذاق ہے؟''

''نہیں..... میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم جو خوراک کھاتے ہیں اس میں غذائیت کے علاوہ بعض ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جو ہاضمے کا عمل مکمل ہونے کے بعد زہریلے مادے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انہی میں سے ایک زہریلا مادہ انسان کے اعصاب کو کمزور کر کے اس کی ہمت اور حوصلے کو پست کر دیتا ہے۔ کالی مرچ اس زہریلے مادے کی خطرناکی کو زائل کر دیتی ہے۔''

''فنٹاسٹک!'' اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا پھر سی ایکس فائیو کو دائیں جانب بیٹی اسٹریٹ پر موڑ لیا۔ ''کبھی فرصت ملی تو اس موضوع پر تفصیلی بات کریں گے۔''

''شیور.....!'' میں نے کہا۔

اسٹرڈی اسٹریٹ اور بیٹی اسٹریٹ کے درمیان چند گلیاں تھیں جن میں بڑی ترتیب کے ساتھ لگژری کنٹری ہاؤس اور عالی شان ولا بنے ہوئے تھے۔ کایا نے فورون نائن میرین پریڈ کے ایک ولا کے سامنے گاڑی روک دی اور ایک چابی میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

''علی! تم گاڑی کو پارک کرنے میں میری مدد کرو گے۔''

کایا کار سے باہر نہیں نکلی۔ میں سمجھ گیا کہ اس چابی کی مدد سے مجھے گیراج کو کھولنا ہے تاکہ گاڑی کو اندر پارک کیا جاسکے۔

وہ ایک خوب صورت ولا تھا جس پر ہلکا نارنجی اور سلیٹی رنگ کیا گیا تھا۔ رنگوں کا یہ امتزاج صاحب خانہ کے اہلِ ذوق ہونے کو ظاہر کرتا تھا۔ کایا نے مجھے بتایا تھا کہ مذکورہ ولا اس کی کسی دوست کی ملکیت ہے جو نارتھ آئی لینڈ شفٹ ہو چکی تھی اور اب یہ ولا ''برائے فروخت'' تھا۔ میں نے لاک کھولنے کے بعد گیراج کا گرے شٹر اوپر کو اٹھا دیا۔ اس شٹر کے اوپر ایک گرے کلر کا چھوٹا سا روشن دان بھی بنا ہوا تھا۔ گیراج کے پہلو میں ایک لیٹر بکس بھی استادہ تھا۔

کایا نے گاڑی گیراج میں لگائی تو حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے شٹر دوبارہ گرا دیا۔ کایا گاڑی میں اپنے ساتھ ایک سیاہ سوٹ کیس بھی لائی تھی جو میں نے اس کے کہنے پر گاڑی سے نکال لیا تھا۔ میں مذکورہ سوٹ کیس کو اٹھا کر کایا کے ساتھ چل پڑا۔

ولا کا داخلی دروازہ تھوڑے فاصلے پر تھا اور یہ چند گز کا فاصلہ ایک کشادہ گلی کی صورت تھا جس کی ایک طرف گیراج اور دوسری جانب ایک پتھریلی دیوار تھی۔ اس دیوار کی دوسری طرف ایک لگژری کنٹری ہاؤس کی عمارت تھی۔ شہر

کے ہنگاموں سے الگ تھلگ یہ علاقہ بڑا پُرسکون تھا۔ چند لمحات کی واکنگ کے بعد ہم ولا کے رہائشی حصے میں داخل ہوگئے۔ دراصل یہ ایک دومنزلہ ولا تھا۔

''اس ولا کی بالائی اور زیریں دونوں منازل پر رہائش کا بندوبست ہے۔'' کایا نے کہا۔ ''تم جہاں کہو گے، ہم وہیں قیام کریں گے۔ ویسے یہ بتا دوں کہ کچن صرف بالائی منزل پر ہے۔''

''میں پہلے اوپر نیچے ولا کا تنقیدی جائزہ لوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

آئندہ دس منٹ کے اندر میں نے بالائی منزل پر ڈیرا ڈال دیا تھا۔ کچن اور دیگر سہولیات کے علاوہ اس منزل کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی ایک کھڑکی میں سے ولا کے باہر کا منظر بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اس کھڑکی کے عین نیچے وہ راہداری تھی جس پر چل کر ہم ولا کے اندرونی حصے تک پہنچے تھے۔ مذکورہ کھڑکی میں کھڑے ہوکر تمام تر راہداری، لیٹر بکس اور سامنے والی سڑک کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا یعنی اگر کوئی شخص اس ولا کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا تو وہ ہماری نگاہ سے ہرگز نہیں بچ سکتا تھا۔

میں ایک دیوار کے پاس کھڑا اس دیوار پر آویزاں ریمنگٹن رائفل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا تو کایا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''یہ شارلٹ کے پاپا کی ہے۔''

شارلٹ، کایا کی اسی دوست کا نام تھا، یہ ولا جس کی ملکیت تھا۔ میں نے تعریفی نظر سے رائفل کو دیکھا اور کہا۔

''ریمنگٹن۔ سیون ڈبل زیرو وی ٹی آر بڑی زبردست رائفل ہے۔ بڑے جانوروں کا شکار کرنے والے شکاری اس گن پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔''

''شارلٹ کے پاپا ایڈگر کو بھی شکار کا بہت شوق تھا۔'' کایا نے بتایا۔ ''اب ایڈگر انکل اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''جب شارلٹ یہاں سے شفٹ ہوگئی ہے تو وہ اپنے پاپا کی نشانی اس رائفل کو ساتھ کیوں نہیں لے کر گئی؟''

''شارلٹ کافی کھسکے ہوئے دماغ کی لڑکی ہے۔'' کایا میرے نزدیک آتے ہوئے بولی۔ ''وہ کہتی ہے کہ ایڈگر کی رائفل ہمیشہ اسی دیوار پر ٹنگی رہے گی اور یہ ڈیسک.....'' اس نے رائفل کے عین نیچے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چوبی ڈیسک کو تھپتھپایا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔''

''کیوں!'' میں نے حیرت بھری نظر سے کایا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا اس ڈیسک کے اندر کوئی خاص چیز رکھی ہے؟''

''رائفل کی بلٹس۔'' وہ ڈیسک کی ایک دراز کھولتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو۔''

میں نے دیکھا، مذکورہ دراز میں 250-22 کیلیبر گولیوں کے کئی پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ٹیلی اسکوپ اور خالی میگزین بھی دکھائی دیے۔ اس رائفل کے اندر چار گولیاں بھری جاسکتی ہیں اور ایکسٹرا میگزین منسلک کرنے کا آپشن بھی ہے۔ 700VTR بولٹ ایکشن ریمنگٹن گن کی طرح اس کی گولیاں بھی بڑی خطرناک دکھائی دیتی تھیں۔

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ شارلٹ اس ولا کو فروخت کرنا چاہتی ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔ ''پھر ایسی کڑی شرائط کا کیا مقصد ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، شارلٹ بہت سنکی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی انہی حرکتوں کے سبب تو ولا ابھی تک فروخت نہیں ہوسکا۔ جو شخص لاکھوں ڈالرز مالیت کے اس ولا کو خریدے گا وہ اس بات کا خیال تھوڑی رکھے گا کہ اس کے سابق مالک کی کسی جذباتی وابستگی کا بہرحال میں احترام کرنا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو کایا۔'' میں نے اس دبنگ ریمنگٹن رائفل کو دیوار سے اتارا پھر یہ اطمینان کرلینے کے بعد کہ گن لوڈ نہیں ہے، میں نے لیور کو آگے پیچھے گھما کر اس کے بولٹ ایکشن کو چیک کیا اور کہا۔ ''یہ رائفل اے ون ورکنگ کنڈیشن میں ہے۔''

اس کے بعد ہم نے شاور لیا پھر پیٹ پوجا کرنے کے بعد آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کایا پہلے تم مجھے اپنی پلاننگ کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ پھر ہم مختلف زاویوں سے اس پر بحث کریں گے۔''

''میرا پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ ہم چند روز تک اسی ولا پر قیام کریں گے۔'' وہ سوٹ کیس کو کھولتے ہوئے بولی۔ ''لیکن پھر میں نے اپنا منصوبہ تبدیل کردیا۔ اب ہم صرف آج کی رات یہاں گزاریں گے اور صبح ہم پینتالیس منٹ کی فلائٹ لے کر ریمنگٹن کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔

نیوزی لینڈ کے کیپٹل سٹی ویلنگٹن کے کسی ہوٹل میں ہمیں چند گھنٹے گزارنا ہوں گے۔ یہ وقت ہم ائرپورٹ پر بھی گزار سکتے ہیں کیونکہ ٹھیک دو بجے ویلنگٹن ائرپورٹ سے ہوبارٹ کے لیے ہماری فلائٹ ہے۔ لگ بھگ ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم شام چھ بجے ہوبارٹ کے ایک ہوٹل میں چیک ان کریں گے۔''

''ہوبارٹ تو تزمینیا کا صدر مقام ہے۔'' وہ ذرا دیر کے لیے رکی تو میں نے کہا۔ ''کیا ہم نیوزی لینڈ سے تزمینیا جارہے ہیں؟''

''فی الحال.....!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہوبارٹ میں بھی ہمیں صرف ایک رات ہی بسر کرنا ہے۔ اگلی صبح یعنی دو اگست کو ہم صبح ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ پکڑ کر ہوبارٹ سے میلبورن کے لیے پرواز کر جائیں گے اور ٹھیک دس بجے صبح ہم آسٹریلیا کے ہر دلعزیز شہر میلبورن میں ہوں گے..... وہی میلبورن جہاں پر تمہاری دوست بینا کو رکھا گیا ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کہو..... میرا آئیڈیا کیسا لگا؟''

''آئیڈیا تو زبردست ہے لیکن یہ سب کچھ تم اتنی آسانی سے اس طرح کہہ رہی ہو جیسے تم نے اس جرنی کے کنفرم ٹکٹ بھی خرید رکھے ہوں؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولی پھر سوٹ کیس کے اندر سے مذکورہ ٹکٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لو، تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

میں نے بہ غور ٹکٹ کا جائزہ لیا۔ وہ تمام ٹکٹ ''کوانٹس ائرویز'' کے تھے اور کایا کے بیان کردہ ٹریولنگ ایجنٹ کے عین مطابق تھے۔ میں نے مذکورہ ٹکٹ واپس اسی کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا زگ زیگ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کرائسٹ چرچ سے ڈائریکٹ میلبورن کوئی فلائٹ نہیں ہے یا پھر کوانٹس ائرویز والوں کے ساتھ تمہارا کوئی کمیشن وغیرہ طے ہے؟''

آخری جملہ میں نے مذاق کے رنگ میں ادا کیا تھا۔ وہ میرے مذاق سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''میں نہ تو کوانٹس ائرویز کی ملازم ہوں اور نہ ہی ان کے لیے کمیشن پر کام کرتی ہوں۔ یہ سارا کھٹ راگ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر پھیلایا ہے۔ اگر کسی شخص کو نیوزی لینڈ سے آسٹریلیا جانا ہوتا ہے تو اس کے لیے روٹینہ درجنوں فلائٹس موجود ہیں۔ میں دانستہ یہ راستہ ہوبارٹ جانا چاہتی ہوں تاکہ کسی کو ہماری سرگرمیوں کی بھنک نہ پڑے۔ تزمینیا دراصل نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے بیچ بحرِ زمین میں واقع ایک جزیرہ ہے اور اس جزیرے پر آسٹریلیا ہی کی عمل داری ہے یعنی یہ آسٹریلیا کی ملکیت ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی طرح یہ بھی ایک برٹش کالونی ہے۔ علی.....'' اس نے ذرا دیر کو رک کر میری آنکھوں میں دیکھا پھر پُرعزم انداز میں بولی۔

''میں تمہاری سچی دوست ہوں اور تمہیں، تمہاری کھوئی ہوئی دوست بینا کے قریب پہنچانے کے لیے یہ پاپڑ بیل رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ذرا سی بھی کوتاہی ہماری راہ کھوٹی کردے.....''

ان لمحات میں اس پاکٹ سائز نیوزی لینڈر دوشیزہ پر مجھے بہت پیار آیا۔ وہ بینا سے حسد کرنے کے بجائے مجھے اس سے ملوانے کے لیے کوشاں تھی۔ یہ اس کا خالص خلوص اور جذبۂ ایثار تھا۔ اس عزم سے وہ اپنے نام کا عکس دکھائی دیتی تھی۔ بہادر ..... مضبوط، خالص اور صدائے بازگشت۔

میں چند لمحات تک جذب کے عالم میں اسے تکتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میرے ہاتھ کی گرفت سے نکلتے ہوئے بڑی ادا سے بولی۔

''ابھی نہیں..... پہلے تم اپنا گفٹ دیکھ لو۔''

''گفٹ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ دوبارہ سوٹ کیس کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ مذکورہ سوٹ کیس کے اندر زیادہ تر میرے اور کایا کے ناپ کے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کپڑوں کے نیچے ہاتھ گھماتے ہوئے بولی۔

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم گنز کو بہت پسند کرتے ہو۔ ادھر راس آئی لینڈ کے ہٹ کے اسٹور روم میں بھی میں نے کئی گنز اور ان کے راؤنڈز رکھے دیکھے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں تحفے میں ایک گن پیش کرتی ہوں.....'' بات کے اختتام پر اس نے کھکھوڑ کر سوٹ کیس کے اندر سے ایک گن برآمد کی پھر اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے یقین ہے، یہ تمہیں پسند آئے گا.....!''

یہ درست ہے کہ گنز کے بارے میں میری معلومات

Digitized by Google

کافی وسیع تھیں اور میں مختلف گھر چلانا جانتا بھی تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھے گن کیری کرنے کا شوق ہو مگر کایا نے جو گن تھمائی میری طرف بڑھائی تھی اسے دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''آئی لوٹ.....!''

وہ ''سگ سوئر'' پی ٹو ٹو فائیو پسٹل تھا۔ نائن ایم ایم کیلیبر کا یہ سیمی آٹومیٹک پسٹل ڈی اے..... مطلب، ڈبل ایکشن کہلاتا ہے یعنی اسے کاک کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی' ٹریگر دبتے ہی یہ کاکنگ اینڈ فائرنگ ایک ساتھ کرتا ہے۔

مجھے گہری دلچسپی سے گن کا معائنہ کرتے دیکھ کر وہ توانا لہجے میں بولی۔ ''کیسا لگا یہ گفٹ؟''

''زبردست!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ذاتی طور پر SIG-SAUER P225 بہت پسند ہے لیکن میں نے کبھی اپنے پاس کوئی گن نہیں رکھی۔ شاید اس لیے کہ کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

''اب تم اسے میرا تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''اور جہاں تک ضرورت کی بات ہے تو تم اپنی دوست بینا کو ایسے لوگوں کی کسٹڈی سے نکالنے جا رہے ہو جو بے پناہ طاقت اور اختیار کے مالک ہیں۔ تمہیں قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

کایا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے سات سو چالیس گرام وزنی نائن ایم ایم سگ سوئر کو ایک طرف صوفے پر ڈال دیا پھر کایا کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس نے میری کوشش کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ وہ آمادگی اور خودسپردگی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میری گود میں آگری۔

اس کے بعد کسی سوال وجواب کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ہم نے تیس اور اکتیس جولائی کا پورا دن اعصاب شکنی کی کیفیت میں گزارا تھا۔ آسکر براؤننگ کا قصہ تمام کر کے اس کی جگہ لینا، ہٹ سے بذریعہ آٹو سلیج اسکاٹ بیس پہنچنا اور پھر میکر ڈواسٹیشن سے کرائسٹ چرچ تک کے سفر کے دوران میں ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کچھ الٹا نہ ہو جائے حتیٰ کہ اس ولا کے اندر قیام پذیر ہونے تک دل ودماغ کو نوع بہ نوع اندیشے اور خدشے لاحق تھے لیکن اب ہم ہر لحاظ سے کیئر فری ہو چکے تھے لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ فری ہونے میں ہم نے کسی تکلف یا کنجوسی سے کام نہیں لیا۔

☆☆☆

یکم اگست کی صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے پیکنگ کر لی۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ اب ہمیں ویلنگٹن کے لیے روانہ ہونا تھا کیونکہ ٹھیک دو بجے ویلنگٹن سے ہوبارٹ کے لیے ہماری فلائٹ تھی۔ ہم ولا کو چھوڑنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''لینڈ لائن فون پر اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' کایا نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں۔''

''ہو سکتا ہے، تمہاری دوست شارلٹ کا فون ہو۔'' میں نے اس کے سوال کے جواب میں اندازہ قائم کیا۔

''ایک وہی تو جانتی ہے کہ اس وقت تم اس کے ولا میں ٹھہری ہوئی ہو۔''

اس دوران میں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور کایا الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی ٹیلی فون سیٹ کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ میں نے زور دے کر کہا۔

''کایا! کال اٹینڈ کرو۔''

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ہیلو؟''

دوسری جانب جو کوئی بھی تھا اس نے کایا کے ہوش اڑا دیے۔ میں نے دیکھا، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں ادھر بولنے والے کو تو نہیں سن سکتا تھا مگر کایا کے چہرے کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

میں نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''رابرٹ.....'' ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اس نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''رابرٹ سوسائٹی کا ایک سینئر ممبر ہے۔ کرائسٹ چرچ پہنچنے کے بعد میں نے رابرٹ کو رپورٹ پیش کرنا تھی۔''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اسپیکر فون کو آن کر دو اور رابرٹ سے نارمل انداز میں بات کرو۔ ویسے بھی ہم یہاں سے نکلنے ہی والے ہیں۔''

کایا نے فی الفور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اسپیکر فون آن کر دیا۔ اگلے ہی لمحے رابرٹ کی آواز میری سماعت تک پہنچنے لگی۔ اس آواز میں ایک خاص قسم کا رعب اور دبدبہ پایا جاتا تھا۔

''تم نے کرائسٹ چرچ پہنچتے ہی مجھے تفصیلی رپورٹ دینا تھی مگر کل دوپہر سے تمہارا سیل فون آف جا رہا ہے۔''

''سر! میرا سیل فون پانی میں گر گیا تھا۔'' کایا نے ایک معروف بہانہ بنایا۔ ''اس لیے وہ ڈیڈ ہو گیا ہے۔''

''بکواس کرتی ہو.....!'' وہ بڑے خطرناک انداز میں غرایا۔ ''تمہارا انجام رائن سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔

سوسائٹی کے علم میں لائے بغیر تم کرائسٹ چرچ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی ہو۔ پھر ہوبارٹ اور میلبورن کے ٹکٹ کیا معنی رکھتے ہیں.....؟''

کایا نے ایک بار پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور پریشانی بھرے انداز میں بولی۔ ''علی! انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے اور ہمارے منصوبے سے بھی آگاہ ہوگئے ہیں۔ اب کیا ہوگا.....!''

''تم خاموش کیوں ہو؟'' رابرٹ کی دہاڑ سے مشابہ آواز اسپیکر فون پر ابھری۔ ''کیا تمہیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ سوسائٹی کی آنکھ سے کچھ بھی اوجھل نہیں رہتا۔ فون علی کو دو.....!''

رابرٹ کے آخری جملے میں تحکم پایا جاتا تھا۔ کایا نے اپنے بچاؤ کے لیے اور میرے چھپاؤ کے لیے ایک موہوم سی کوشش کی۔ ''سر! علی تو ادھر راس آئی لینڈ پر ہے۔''

''اگر علی کو تم راس آئی لینڈ کے ہٹ پر چھوڑ آئی ہو تو پھر آسکر کہاں ہے؟'' رابرٹ نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں نے تمہاری بک بک بہت سن لی۔ علی تمہارے نزدیک ہی موجود ہے۔ یہ فون ٹیپ ہو رہا ہے اور اس کا اسپیکر فون بھی آن ہے۔ ہمارے بیچ ہونے والی گفتگو علی بھی سن رہا ہے۔''

اب میرا براہِ راست رابرٹ سے بات کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ میں نے کایا کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگالیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیلو رابرٹ! میں اسد علی بات کر رہا ہوں۔''

''علی! فون کا اسپیکر آف کردو۔'' وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً اس کی فرمائش پوری کردی۔

''گڈ!'' اس کی گونج دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''علی! مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری بات مانتے ہوئے فون کا اسپیکر آف کردیا ہے۔''

''مسٹر رابرٹ! تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''میں تمہاری بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔''

''علی! تم نے راس آئی لینڈ پر جو کچھ بھی کیا، ہم اسے نظر انداز کردیں گے۔'' وہ گمبھیر انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ہمیں جتنا بھی نقصان پہنچایا، ہم اسے برداشت کرلیں گے۔ اس ولا کے سامنے ایک بلیک ڈاج کھڑی ہے۔ تم فوری طور پر ولا سے نکلو اور بلیک ڈاج میں آکر بیٹھ جاؤ۔ یہ مستعد عالیشان گاڑی تمہیں مجھ..... تک پہنچادے گی۔ باقی باتیں آمنے سامنے بیٹھ کر ہوں گی۔''

اسپیکر فون آف ہوجانے کے بعد رابرٹ کی آواز کایا تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دوسری طرف رابرٹ کیا کہہ رہا ہے اور یہی لاعلمی خوف بن کر اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

''میں کایا کو یہاں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا مسٹر رابرٹ!'' میں نے فیصلہ کن حتمی لہجے میں کہا۔

''علی! کایا کو بھول جاؤ۔'' وہ سفاکی سے بولا۔ ''اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوچکا ہے۔ اس نے سوسائٹی سے غداری کی ہے۔ اس کی زندگی کے آخری پانچ منٹ بچے ہیں۔ اس کے بعد یہ ولا ایک خوفناک دھماکے سے اڑ کر ملبے کے ڈھیر میں بدل جائے گا۔ ہاں، ملبے کی صورت اس ولا کی باقیات پر کایا کے چیتھڑے ضرور چپکے ہوئے دیکھے جاسکیں گے.....'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''علی! میں نے تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کردیا ہے۔ تمہیں ایک منٹ کے اندر فیصلہ کرنا ہے اور تین منٹ سے پہلے بلیک ڈاج میں آکر بیٹھنا ہے.....اوکے!''

میں نے ''اوکے'' کہتے ہوئے ریسیور کریڈل کردیا۔

''وہ کیا کہہ رہا تھا؟'' کایا نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''انہوں نے تمہیں ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' میں نے دیوار پر سے ریمنگٹن سیون ڈبل زیرو وی ٹی آر رائفل اتارتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے پاس صرف تین منٹ ہیں۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے، اسی مہلت کے اندر رہ کر کرنا ہے۔''

پھر میں نے چوبی ڈیسک کی دراز کھول کر ریمنگٹن کے چار راؤنڈز نکال کر بولٹ ایکشن لانگ رینج ہنٹنگ گن کو لوڈ کرلیا۔ اس کے بعد طاقتور ٹیلی اسکوپ رائفل کے اوپر نصب کردی۔

''تم کیا کرنے جارہے ہو؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

''تمہیں ختم کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کو ایک یادگار تحفہ دینے جارہا ہوں۔'' میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''دوستی کے عملی مظاہرے کا وقت آگیا ہے.....''

پھر میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر ولا کے بیرونی حصے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ رابرٹ نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ ولا کے عین سامنے بلیک ڈاج کا نیا ماڈل ''چیلنجر'' کھڑی

تھی۔ یہ ڈاج چیلنجر میرا انتظار کر رہی تھی اور مجھے رابرٹ کے پاس لے کر جانے والی تھی۔ رابرٹ نے مجھے سوچنے کے لیے ایک منٹ کی مہلت دی تھی اور میں ایک سیکنڈ میں انتہائی ہنگامی فیصلہ کر چکا تھا اور وہ فیصلہ تھا..... تنگ آمد، بہ جنگ آمد!

میں کھڑکی کی طرف سے واپس پلٹا۔ ریمنگٹن رائفل ریڈی پوزیشن میں میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سگ سوئر پسٹل کایا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اٹل انداز میں کہا۔

''میری بات دھیان سے سنو۔ تم اس پسٹل کے ساتھ ولا کے داخلی دروازے تک پہنچو۔ یہ وزن میں اپنا کونڈا میگنم ریوالور سے تقریباً آدھا ہے۔ بوقتِ ضرورت تم اسے بہ آسانی استعمال کر سکتی ہو۔''

''اور تم.....؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''میں تمہارے بعد یہاں سے نکلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور سوٹ کیس میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔''

''میں تمہیں اکیلے چھوڑ کر نیچے نہیں جاؤں گی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''کایا! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ چار منٹ کے بعد یہ ولا تمہارے مقبرے میں بدلنے والا ہے.....''

وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔

''تم جلدی سے ولا کی زیریں منزل پر پہنچو۔ میں ولا کے باہر کھڑی بلیک ڈاج کو اڑا رہا ہوں۔ تمہیں جیسے ہی دھماکے کی آواز سنائی دے، تم دوڑ کر گیراج کی عقبی دیوار کی طرف چلی جانا اور وہاں موجود درختوں میں پناہ لے لینا۔ اس دوران میں جو بھی بندہ بشر تمہیں ولا کی جانب بڑھتا دکھائی دے، تم اسے بے دریغ بھون ڈالنا..... یو گاٹ مائی پوائنٹ؟''

''گاٹ اِٹ!'' وہ پُرعزم انداز میں بولی۔

''شاباش!'' میں نے اس کے شانوں پر تھپکی دی اور کہا۔ ''ہمیں دو منٹ میں اس ولا سے روانہ ہو جانا ہے اور اس رخصت کے لیے ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اس بلیک ڈاج سے نمٹنا از حد ضروری ہے۔ آر یو ریڈی؟''

''یس..... آف کورس۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے کایا کے ہونٹوں کے راستے حوصلے کا ایک ہیوی ڈوز دے کر اسے نیچے بھیج دیا اور ریمنگٹن کی خوف ناک ٹرائی اینگر نال کو کھڑکی سے باہر نکال کر ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگا دی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بلیک ڈاج چیلنجر ٹنٹڈ گلاس والی ایک لگژری گاڑی تھی۔ میں نے گاڑی کے انجن کو ٹارگٹ کر کے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے۔

اگلے ہی لمحے بیٹی اسٹریٹ اور میرین پریڈ کے سنگم کی فضا دلدوز دھماکوں سے گونج اٹھی..... بلکہ لرز اٹھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس بلیک ڈاج کو اڑانے کے لیے وارمنٹ ٹارگٹ رائفل کا ایک فائر ہی کافی تھا۔ میری چلائی ہوئی تین گولیوں نے لگژری گاڑی اور اس کے اندر موجود افراد کے پرخچے اڑا دیے۔ میں نے ریمنگٹن سیون ہنڈرڈ ڈی ٹی آر اور سوٹ کیس کے ساتھ باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

کایا کی طرف سے کسی فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس ولا کی طرف آنے والے لوگ بلیک ڈاج تک ہی محدود تھے اور میں نے..... بلکہ ریمنگٹن کی خطرناک بلٹس نے بلیک ڈاج کی حدود میں داخل ہو کر ان سب کا کام تمام کر دیا تھا۔

وہ لوگ کایا کو ختم کرنے اور مجھے لینے آئے تھے۔ میں اور کایا سلامت تھے اور اجل انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زندگی اور موت کا کھیل بھی بڑا نرالا ہے۔ موت ہر لمحہ زندگی کے تعاقب میں رہتی ہے اور جن حالات سے اس وقت ہم دوچار تھے اس میں کہنا پڑتا ہے..... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے!

☆☆☆

سلور کلر مزدا کار میرین پریڈ پر ساؤتھ نیو برائٹن سے نارتھ نیو برائٹن کی سمت تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔ اب کی بار کار کا اسٹیئرنگ میرے قبضے میں تھا اور کایا میرے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ریمنگٹن رائفل عقبی نشست کے فرش پر پڑی تھی جبکہ کایا کا سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھا تھا۔ اگر ہمیں ولا میں سے نکلنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پھر... آج یہ داستان مزید آگے نہ بڑھتی۔ ہماری گاڑی جیسے ہی بیٹی اسٹریٹ سے نکل کر میرین پریڈ پر چڑھی، ہمیں اپنے عقب میں ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔ شارلٹ کے ولا کو کسی طاقت ور ٹائم بم سے اڑا دیا گیا تھا۔

''او مائی گاش.....'' کایا نے سراسیمہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''جیہووا نے مجھے بچا لیا ورنہ آج ولا کے اندر میرا قیمہ بن جاتا۔''

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ رابرٹ نے شاید دھمکانے کے لیے ولا کو اڑانے والی بات کی تھی۔'' میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن اب یہی محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے یا پھر رات میں کسی وقت ان لوگوں نے ولا کی بنیاد میں کہیں طاقت ور بم نصب کر دیے تھے جنہیں کسی ریموٹ سے کنٹرول کر کے اڑایا گیا ہے جبھی رابرٹ کی ٹائمنگ میں کوئی ایرر نہیں تھا۔ اس نے تمہاری زندگی کی مہلت پانچ منٹ بتائی تھی اور ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہی ولا میں ہولناک دھماکا ہوا ہے۔''

''میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ انہیں اس ٹھکانے کا پتا کیسے چلا۔'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے اسی لیے اپنا سیل فون آف کر رکھا تھا کہ وہ لوگ مجھے ٹریک نہ کر سکیں اور تمہارے پاس تو سیل فون ہے ہی نہیں پھر.....؟''

کایا نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انہوں نے ہماری ٹریکنگ کے لیے جو بھی طریقہ اختیار کیا ہو اس کے بارے میں سوچ کر تم اپنا ذہن نہ تھکاؤ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم دونوں زندہ اور سلامت ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو علی!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم نے بلیک ڈاج کو اڑا کر سوسائٹی کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تمہارے اس فعل کو آسانی سے فراموش نہیں کریں گے۔ مجھ سے دوستی تمہیں خاصی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔''

میری رابرٹ سے جو مختصر سی بات ہوئی تھی، کایا اس سے واقف نہیں تھی۔

''کایا.....!'' میں نے اس کے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے تم سے دوستی کی ہے، کوئی بزنس نہیں کیا جو مہنگائی اور سستائی کا حساب کرنے بیٹھ جاؤں۔ دوستی کا رشتہ سود و زیاں سے بالاتر ہے۔ اگر تمہاری جان بچانے کے لیے مجھے کسی کی جان بھی لینا پڑے تو میں ضرور لوں گا اور میں نے بلیک ڈاج کو اڑا کر ایسا ہی کیا ہے۔''

''علی!'' وہ بے حد تحیر بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا.....؟''

''میں نے سوسائٹی سے غداری کی ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔ ''سوسائٹی میں غداری کی صرف ایک ہی سزا ہے..... موت!'' اس نے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آج تو میں تمہاری وجہ سے بچ گئی ہوں لیکن وہ لوگ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوں.....''

''میری وجہ سے کیوں پریشان ہو؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''میں نے ایسا کیا کر دیا؟''

''سوری.....'' وہ جلدی سے تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ ''دراصل، میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ..... میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔ تم میرا ساتھ دے رہے ہو اور تمہاری دو دوست سوسائٹی کی تحویل میں ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کایا کی پریشانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ ''کایا.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''میرا یہ ایمان ہے کہ زندگی اور موت دینے کا اختیار سوسائٹی کے پاس نہیں بلکہ میرے رب، میرے پروردگار کے پاس ہے۔ یہ لوگ چاہے لاکھ خود کو زمینی خدا کہتے رہیں مگر یہ شیطان کے پیروکار ہیں لہٰذا مالکِ حقیقی کے سامنے یہ بے بس اور لاچار ہیں۔ جب تک میرے رب کو میرا، تمہارا، ہمارا اور شارو کا زندہ رہنا منظور ہے، سوسائٹی چاہے کچھ بھی کر لے، ہم سب زندہ ہی رہیں گے۔ تازہ ترین مثال تمہارے سامنے ہے۔ جب رابرٹ سے میری بات ہوئی، اس نے تمہاری زندگی کی مہلت کو پانچ منٹ پر سیٹ کر کے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا تھا۔ ان کی طاقت، اختیار اور پلاننگ میں کوئی کمی نہیں تھی لیکن میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کایا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اور اسی بچانے والے کو اپنا معبود سمجھنا چاہیے۔''

''تمہاری باتوں سے بہت حوصلہ ملتا ہے علی!'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے الفاظ بجھتے ہوئے دل و دماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیتے ہیں۔''

''اور جہاں تک میرا اور ''اسکل اینڈ بونز'' کا معاملہ ہے تو مجھے ان کے برادر ہڈ کا حصہ بننے کا کوئی شوق نہیں۔'' میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''وہ خود ہی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں کوئی دودھ دینے والی گائے ہوں۔ اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو جلد یا بدیر، وہ اپنے اس خیال کو ذہن سے نکال کر مجھ سے لاتعلق ہو جائیں گے اور.....''

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ لوگ کبھی تمہارا پیچھا چھوڑیں گے۔''

''تو پھر.....'' میں نے اپنی ادھوری بات کو ڈرامائی انداز میں مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں گاہے بہ گاہے اس گائے کی لات کھانا پڑے گی اور وہ بھی دودھ دیے بغیر.....!''

''تمہاری باتیں پہلی نظر میں خاصی مشکل دکھتی ہیں۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن ذرا غور کرو تو سمجھ میں آجاتی ہیں۔''

ہم ''ساؤتھ برائٹن سرف لائف سیونگ کلب'' کے نزدیک پہنچے تو کایا نے میری راہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ ''بائی ایفٹ لے لو۔''

میں نے مزدا CX5 کو برج اسٹریٹ پر موڑ لیا پھر پوچھا۔ ''تم نے نیوزی لینڈ سے ترمینیا اور ترمینیا سے آسٹریلیا جانے کا جو پروگرام بنایا تھا، سوسائٹی اس سے پوری طرح آگاہ ہو چکی ہے۔ اس پروگرام پر عمل کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ قسمت نے اگر ہمیں ان کے چنگل سے نکالا ہے تو اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں جلد از جلد کہیں روپوش ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں تو اس سرزمین پر اجنبی ہوں۔ یہ تمہارا ملک ہے۔ تم ہی بتاؤ، ہمیں ایک محفوظ پناہ گاہ کہاں مل سکتی ہے؟''

''اب ہم پلان بی پر عمل کریں گے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ اگر پلان اے ناکام ہوگیا، تب ہم کیا کریں گے اور.....'' اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''پلان اے بری طرح فلاپ ہو چکا.....!''

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''پلان بی کیا ہے؟''

''اب ہم کرائسٹ چرچ سے اسی کار میں پکٹن جائیں گے۔'' وہ مجھے اپنے منصوبہ نمبر دو سے آگاہ کرنے لگی۔ ''پکٹن ساؤتھ آئی لینڈ کا ایک خوب صورت شہر ہے اور پکٹن تک پہنچنے کے لیے ہمیں برج اسٹریٹ سے اسٹیٹ ہائی وے چوبیس پر جانا ہوگا۔''

''تمہاری باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ پکٹن ہماری نئی منزل ہے۔'' میں نے پائن ایونیو کو کراس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! وہ ہماری منزل نہیں۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''پکٹن اور ویلنگٹن کے بیچ فیری چلتی ہے۔ ہم دونوں اور یہ کار ''بلیو برج'' نامی ایک شاندار فیری پر سوار ہو کر کک اسٹریٹ کو عبور کریں گے اور ساڑھے تین گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد ساؤتھ آئی لینڈ سے نارتھ آئی لینڈ کے شہر ویلنگٹن پہنچ جائیں گے۔''

آبنائے کک (Cook Strait) نیوزی لینڈ کے دونوں جزیروں نارتھ آئی لینڈ اور ساؤتھ آئی لینڈ کو ملاتی ہے اور اس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس مقام پر بحر تزمین اور بحرالکاہل آپس میں گلے ملتے ہیں۔

''چلو ہم پکٹن سے ویلنگٹن پہنچ گئے۔'' میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد.....؟''

کایا نے کول مول سا جواب دیا۔ ''اس کے بعد کی بعد میں سوچیں گے، جب آرام سے کہیں بیٹھ کر غور و فکر کا موقع ملے گا تو آئندہ کا لائحہ عمل بھی ترتیب دے لیں گے۔''

ویسے کایا کہہ تو ٹھیک ہی رہی تھی۔ جاندار منصوبہ بندی کرنے کے لیے ہمارا حالتِ سکون میں ہونا ضروری تھا۔ اس وقت ہم جس نوعیت کے ہنگامی حالات سے گزر رہے تھے ان میں پہلی ترجیح جان کی سلامتی تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔

میں نے جیسے ہی ایسٹوری روڈ کراس کی، بیک ویو مرر میں مجھے ایک سرخ رنگ کی فورڈ جیپ دکھائی دی۔ بیک ویو میں کسی گاڑی کا نظر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن وہ سرخ جیپ جتنی تیزی سے ہماری جانب بڑھ رہی تھی اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ مجھے ایک طاقتور ٹیل آئی۔ ''یہ سرخ جیپ کسی خاص مقصد سے ہمارا تعاقب کر رہی ہے.....''

میں اپنے محسوسات کے انتباہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ چھٹی حس کی پکار تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کایا سے استفسار کیا۔

''سگ سوئر کہاں ہے؟''

''ڈیش بورڈ میں رکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پسٹل کو ڈیش بورڈ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھو۔'' میں نے بہ دستور بیک ویو میں سرخ فورڈ جیپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی بھی وقت اس کے استعمال کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

''اوہ.....!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے نائن ایم ایم ڈبل ایکشن پسٹل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر پوچھا۔ ''تم کس قسم کا خطرہ محسوس کر رہے ہو؟''

''ایک ریڈ کلر کی فورڈ جیپ ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس ریڈ فورڈ کا تعلق ہمارے کسی دشمن سے ہے اور اس وقت ہم دونوں ''اسکل اینڈ بونز'' کے نشانے پر ہیں۔''

کایا نے بھی گردن موڑ کر مذکورہ جیپ کو دیکھ لیا تھا۔

اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تمہیں کس بنا پر یہ یقین ہے کہ سرخ جیپ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے؟''

''وہ بنیاد ہے میرے محسوسات۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میری فیلنگز مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتیں۔ تم تیار ہو؟''

''ایک دم تیار!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''بتاؤ، کیا کرنا ہے؟''

''میں رفتار کم کرکے اس جیپ کو آگے نکلنے کا موقع دوں گا۔'' میں نے کروے ایونیو کراس کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ چونکہ ہمارے تعاقب میں ہے اس لیے ہمیں اوورٹیک نہیں کرے گی۔''

''پھر.....؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''پھر.....پھر!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے، یہ برج اسٹریٹ میدانِ کارزار بننے والی ہے۔ اگر جیپ کے اندر سے ہمارے خلاف کوئی معاندانہ کارروائی ہو تو تم اس کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''اوکے..... میں سمجھ گئی۔'' وہ سگ سوئر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں ریڈی ہوں مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی.....!''

''کون سی بات؟'' میں نے سلور مزدا اور ریڈ فورڈ کے درمیانی فاصلے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتے ہوئے کایا سے پوچھا۔

''اگر اس جیپ میں واقعی سوسائٹی کے لوگ ہیں تو انہوں نے کس طرح ہمارا سراغ لگایا۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''جب تم میرین پریڈ سے برج اسٹریٹ پر مڑے تھے تو یہ جیپ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔''

''مجھے بھی یہ ایسٹوری روڈ کراس کرنے کے بعد ہی دکھائی دی ہے۔ یہ ولا سے ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔'' میں نے ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، یہ پائن ایونیو اور ایسٹوری روڈ کے بیچ کسی مقام پر ہمارے پیچھے لگی ہے۔ اس نے کس طرح ہمارا سراغ لگایا، یہ ابھی پتا کر لیتے ہیں.....''

بات کے اختتام پر میں نے رفتار کم کرنے کے بجائے اچانک بریک لگا دیے۔ ریڈ فورڈ اور سلور مزدا کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میری تقلید میں اس جیپ نے بھی بریک لگا کر اس بات کی تصدیق کردی کہ وہ لوگ ''غیر متعلقہ'' ہرگز نہیں تھے۔

دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو رکی ہوئی تھیں۔ ریڈ فورڈ کے اندر مجھے دو افراد نظر آئے۔ ایک نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور اس کے برابر میں پسنجر سیٹ پر موجود شخص کے ہاتھ میں مجھے ایک گن نظر آئی جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔

''علی! گن والا بندہ رابرٹ ہے۔'' کایا کی گھبرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تو دیر کس بات کی ہے۔'' میں نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''یہ سگ سوئر کیا کھیلنے کے لیے ہے۔ اڑا دو اس شیطان کے عبادت گزار کو تاکہ اسے پتا چل جائے کہ وہ موت کا فرشتہ نہیں، گندی نالی کا ایک حقیر کیڑا ہے.....''

میرے الفاظ سے سفاکی ٹپکتی دیکھی تو کایا بھی یکلخت بے رحم ہوگئی۔ اس دوران میں تیکھے نقوش والے دراز قامت رابرٹ نے کایا کے عزائم کو بھانپ لیا تھا، میں نے دیکھا، اس نے سائیلنسر لگی گن کا رخ کایا کی جانب موڑ دیا تھا۔

یہ بڑے نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ میں نے مائیکرو سیکنڈ میں ایک ہنگامی فیصلہ کیا اور گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ اسی لمحے فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی ایک دھیمی سی ''ٹھک'' بھی ابھری جو سائیلنسر لگی گن کے فائر کی مخصوص آواز تھی۔ اگر مجھے گاڑی کو وہاں سے ہٹانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو کایا کی زندگی کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ میرے اچانک حرکت میں آجانے کے سبب رابرٹ کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور کایا کی چلائی ہوئی گولی بھی اپنے ٹارگٹ پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

ہماری دیکھا دیکھی ریڈ فورڈ کے ڈرائیور نے بھی جیپ کو آگے بڑھا دیا تھا۔ اب ہمارے درمیان باقاعدہ ایک ریس کا آغاز ہو گیا تھا۔ ہم آگے اور وہ ہمارے تعاقب میں تھے۔ دونوں گاڑیوں کے بیچ زیادہ فاصلہ نہیں تھا مگر تیز رفتاری کے باعث رابرٹ اور کایا ایک دوسرے کو نشانہ نہیں بنا پا رہے تھے۔ میں نے حوصلہ بڑھانے کی غرض سے کایا سے کہا۔

''کایا! سگ سوئر پسٹل کی شوٹنگ رینج پچاس میٹر ہے اور رابرٹ تم سے پانچ میٹر کے فاصلے پر بھی نہیں پھر اسے جہنم واصل کیوں نہیں کر پا رہی ہو؟ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ بھون ڈالو انہیں..... بعد میں جو بھی ہوگا، بھگت لیں گے۔''

''یہ بات میں سمجھ رہی ہوں اور میری شدید خواہش بھی یہی ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ''لیکن تم جس طرح

گاڑی کو لہرا کر ڈرائیو کر رہے ہو اس میں مجھے نشانہ لینے میں کافی مشکل پیش آرہی ہے۔ میں رابرٹ کو ٹارگٹ نہیں کر پا رہی۔ میں کوئی ماہر شوٹر نہیں ہوں۔''

''اگر میں گاڑی کو لہرا کر نہیں چلاؤں تو یہ شیطان کی اولاد رابرٹ تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔'' میں نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''تم رابرٹ پر لعنت بھیجو اور جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔ ہمیں ہر حال میں انہیں آگے بڑھنے سے روکنا ہے۔'' میں نے بیک ویو مرر میں ریڈ فورڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کر لوگی نا.....؟''

''ہاں، میں کر رہی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

ادھر کایا کی بات ختم ہوئی ادھر سلور مزدا کے اندر ایک بھونچال سا آگیا۔ ریڈ فورڈ نے عقب سے ہماری گاڑی کو ایک زوردار ٹکر ماری تھی۔ ہم گاڑی کے اندر بل کر رہ گئے تھے۔ اگر ہم نے سیٹ بیلٹس نہیں لگائے ہوتے تو اس وقت ہمارے چہرے ڈیش بورڈ سے ٹکرا کر لہولہان ہو چکے ہوتے۔ میں نے اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''کایا! لیور کا بٹن دبا کر اپنی سیٹ کو پیچھے کرو اور فوراً سے پیشتر خود کو سیٹ اور ڈیش بورڈ کے بیچ والے خلا میں چھپا لو تاکہ رابرٹ کی چلائی ہوئی بے آواز گولی تم تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔''

کایا کا پاکٹ سائز پورٹیبل بدن بہ آسانی اس گیپ میں فٹ ہو سکتا تھا۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی سیٹ کو پیچھے کی جانب سلائڈ کیا۔ باقی کا کام ریڈ فورڈ نے کر دیا۔

ہماری گاڑی کی پشت پر سرخ جیپ نے ایک دھواں دھار ٹکر رسید کی اور اس جھٹکے کے موومنٹم نے کایا کو سیٹ سے اٹھا کر مذکورہ گیپ کے اندر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کراہ بھی بلند ہوئی۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس کی آواز آئی۔ ''میں ٹھیک ہوں علی۔''

''وہیں پر چپ چاپ دبکی رہو۔'' میں نے زگ زیگ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا سا بھی گردن کو اوپر اٹھانے کی کوشش نہیں کرنا۔ میں ان خنزیروں سے نمٹتا ہوں۔''

''اپنا خیال رکھنا علی۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ''میں جیسوا سے تمہارے لیے پرے کر رہی ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا.....''

''انشاءاللہ.....!'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اسی لمحے ریڈ فورڈ نے تھوڑا سا آگے آکر ہماری گاڑی کے پہلو میں ہٹ کیا تو مجبوراً مجھے بھی اسٹیئرنگ کو گھما کر اس ٹکر کا جواب دینا پڑا پھر ہمارے بیچ باقاعدہ بل فائٹنگ جیسی ''ٹکرنگ'' کا آغاز ہو گیا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ رابرٹ نے یا جیپ کے ڈرائیور نے ایک بار بھی مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا ٹارگٹ کایا تھی اور وہ کسی طرح ہماری گاڑی کو روک کر کایا کی زندگی کا چراغ گل کرنا چاہتے تھے۔ کایا نے سوسائٹی سے غداری کی تھی اور اس سنگین جرم کی سزا صرف اور صرف موت ہی تھی۔ وہ نادان ابن شیطان یہ نہیں جانتے تھے کہ کایا اس وقت ایک ایسے شخص کی پناہ میں تھی جس کی خاطر اس نے سوسائٹی کے کالے منہ پر جوتا مارا تھا۔ اس شخص نے تو اپنی جان پر کھیل کر کایا کی جان بچانا تھی اور وہ شخص CX5 کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا یہی تو کر رہا تھا.....

دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے ہوئے رواں دواں تھیں۔ ان لمحات میں مجھ پر ایک جنون سا سوار تھا، کایا کو جہنمی بلاؤں سے محفوظ رکھنے کا جنون اور وہ دوزخ مکافی شیطان کے چیلے ہر قیمت پر کایا کی جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے تیز رفتار زگ زیگ ڈرائیونگ کے باوجود بھی اسٹیئرنگ کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔

ایک طوفانی ٹکر نے کایا کے صبر کا پیمانہ لب ریز کر دیا۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

''علی! ایک تو میں بڑی مشکل سے گھس کر یہاں بیٹھی ہوئی ہوں، اوپر سے یہ قیامت خیز جھٹکے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔''

''میں نے تمہیں اپنے کسی شوق کے لیے وہاں نہیں گھسا رکھا۔'' میں نے ریڈ فورڈ کو ایک زوردار ٹکر مار کر خود سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ حکمت عملی تمہاری حفاظت کی خاطر اختیار کی گئی ہے۔ بہر حال.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم تھوڑی سی زحمت اور برداشت کر لو۔ میں ان مردودوں سے پیچھا چھڑانے کا کوئی راستہ نکالتا ہوں۔''

''تمہیں جو بھی کرنا ہے، بس جلدی سے کر ڈالو۔'' وہ

بیزاری سے بولی۔

''تم میری گود میں آجاؤ، پھر کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے بٹن دبا کر ڈرائیونگ سیٹ کو ممکنہ حد تک پیچھے کھسکاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس سچویشن میں بھی مذاق کی سوجھ رہی ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور ان کتوں کی دھواں دھار ٹکروں نے میرے جسم کے سارے جوڑ کھول کر رکھ دیے ہیں۔''

''اور میں بہت سیریس ہوں۔ ان نازک اور سنگین لمحات میں، میں مذاق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ میں کچھ کروں تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اپنی گود کی جانب اشارہ کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آگے روڈ صاف ہے۔ میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھا رہا ہوں۔ متعاقب جیپ بہت پیچھے رہ جائے گی۔ تم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً یہاں آجاؤ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔''

میرے لہجے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی سُریلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''او کے۔ میں آرہی ہوں۔''

گاڑی اس وقت پچاس اور ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار کے بیچ برج اسٹریٹ پر دوڑ رہی تھی۔ وہ پاور اسٹیئرنگ والی ایک فل آٹومیٹک جدید کار تھی۔ میں نے نتائج اور حالات وواقعات کی پروا کیے بغیر مالک کو یاد کر کے ایکسلریٹر ..... پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

''ون.....!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ٹو.....''

میرے پاؤں کے دباؤ نے مزدا۔سی ایکس فائیو کو کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند فلائنگ ہارس بنا دیا تھا۔ ڈیجیٹل اسپیڈومیٹر پر فیگرز تیزی سے بڑھنے لگے۔ چند سیکنڈ میں جب ان فیگرز نے ون ففٹی کا نمبر ڈسپلے کیا تو میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''تھری.....!''

میرے ''تھری'' کہتے ہی کایا اس کھڈے سے نکل کر پہلو کے بل کھسکتے ہوئے میری گود میں آگئی۔

ریڈ فورڈ والے اس بات کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ میں اچانک اپنی گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دوں گا۔ اب دونوں گاڑیوں کے درمیان کم از کم سو گز کا فاصلہ قائم ہو چکا تھا اور یہ فاصلہ زیادہ دیر تک برقرار رہنے والا نہیں تھا۔ لامحالہ جیپ کو بھی اپنی رفتار بڑھا کر آناً فاناً مزدا کے سر پر پہنچنا تھا۔ جیسے میرے لیے روڈ خالی تھی، ایسے ہی یہ سہولت ''رابرٹ اینڈ کو'' کو بھی میسر تھی۔ ان لمحات میں وہ خود کو موت کا فرشتہ سمجھ رہا تھا۔

مجھے جو بھی کرنا تھا، چند سیکنڈ میں کرنا تھا۔ کایا میری گود اور اسٹیئرنگ کے درمیان اس طرح فٹ ہو گئی تھی کہ وہ میرے وجود ہی کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔

اگرچہ ان غیر یقینی اور سنگین لمحات میں موت زندگی کی ہم رکاب تھی لیکن پھر بھی کایا کے ریشمیں بدن کے لمس نے میرے رگ وپے میں ایک مقناطیسی کرنٹ سا دوڑا دیا تھا نیند اور رومینس جادو والی ہیں۔ رومینس اور نیند خود فراموشی کی کیفیات کے نام ہیں۔

میں نے کایا کی پشت پر ناک لگا کر اس کے بدن کی مخصوص مسحور کن مہک کو ایک طویل گہری سانس کے ذریعے اپنے اندر اتارا پھر اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی۔

''بڑی احتیاط کے ساتھ اسٹیئرنگ کو سنبھال لو اور پاؤں کو ریس اور بریک کے پیڈلز تک پہنچا دو۔ اب ڈرائیونگ تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہارے نیچے سے نکل رہا ہوں۔ او کے.....؟''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ کو تھام لیا پھر کسمسا کر اپنے پاؤں کو بریک اینڈ ریس کے مخصوص پیڈلز تک لے گئی اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔

''او کے..... آئی ایم ریڈی۔ اب تم نکل جاؤ۔''

میں بہ مشکل تمام کایا کے نیچے سے نکل آیا۔

''گاڑی کو اتنی رفتار سے آگے بڑھاتی رہو جس پر تم اسٹیئرنگ کو اپنے قابو میں رکھ سکتی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور عقبی نشست پر پہنچ کر ڈرائیونگ سیٹ کو واپس اس کی پہلے والی پوزیشن پر لانے کے بعد لانگ رینج ہنٹنگ رائفل کو اٹھا کر لوڈ کرنے لگا۔

رینگلٹن سیون ڈبل زیرو وی ٹی آر کے چند راؤنڈز میں نے ولا سے نکلتے وقت اپنی جیب میں رکھ لیے تھے تاکہ محفوظ رہیں اور یہ وقتِ ضرورت کام آئیں اور..... ان کے استعمال کا وقت آگیا تھا۔ ایسے ہی بہت سارے راؤنڈز سوٹ کیس کے اندر بھی موجود تھے۔

''تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' کایا نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''میرا شارلٹ کے پاپا ایڈگر کی روح کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا ارادہ ہے۔'' میں نے سفاکی سے کہا۔ ''جب

میں نے بلیک ڈاج کے پرخچے اڑائے تھے تو ایڈگر کی روح نے خوش ہوکر کلپنگ کی تھی اور "ڈس مور" کی فرمائشی صدا بھی بلند کی تھی....."

"ہم ان سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔" کایا کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "رابرٹ وغیرہ پر لعنت بھیج کر ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

ریڈ فورڈ کے ڈرائیور نے بھی جیپ کی رفتار بڑھا دی تھی اور وہ لوگ لحہ بہ لحہ ہمارے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ میں نے ٹرائی اینگلر بیرل والی ریمنگٹن رائفل کو ریڈ فورڈ کے ٹارگٹ پر آمادہ کار کرتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔

"کایا..... یہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیا نہیں ہوسکتا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

"ریڈ فورڈ کوئی تھکن کا بخار نہیں ہے جو پیناڈول وغیرہ سے اتر جائے گا۔" میں نے ٹیلی اسکوپ کے آئی پیس سے آنکھ لگا کر سرخ جیپ کے ٹائروں کو نشانے پر لاتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "یہ "اسکل اینڈ بونز" کے خطرناک انفیکشن کا فیور ہے لہٰذا اینٹی بائیوٹک کا استعمال ناگزیر ہے۔ میں ریڈ فورڈ کے پاؤں کو ناکارہ بنا کر اسے آگے بڑھنے سے روک رہا ہوں۔ آگے جو رابرٹ اور اس کے ڈرائیور کا نصیب.....!"

اپنی بات کے اختتام پر میں نے سانس روک کر یکے بعد دیگرے ریڈ فورڈ کے اگلے دونوں ٹائروں کے سینوں میں بولٹ ایکشن ریمنگٹن کی دو دو گولیاں اتار دیں۔

برج اسٹریٹ کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اگلے ہی لمحے اس آواز میں ریڈ فورڈ کے بری طرح لہرانے اور دوسری گاڑیوں سے ٹکرانے کی خوفناک صدائیں بھی شامل ہوگئیں۔ میں نے ہمنگ رائفل کو عقبی نشست کے نیچے چھپایا اور اچک کر پسنجر زسیٹ پر آ گیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"اطمینان سے ڈرائیونگ جاری رکھو۔ اب وہ ہمارے تعاقب میں آنے کے قابل نہیں رہے۔"

پھر میں نے گردن موڑ کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ ریڈ فورڈ کو گولیاں کھا کر قلابازیاں لگاتے ہوئے تو میں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھ لیا تھا۔ ٹائرز پھٹ جانے کے بعد ڈرائیور کا جیپ پر کنٹرول نہیں رہا تھا لہٰذا وہ الٹ گئی تھی اور برج اسٹریٹ پر پھسلتے ہوئے دوسری گاڑیوں سے جا ٹکرائی تھی۔ اب وہاں پر اتنا زیادہ ہجوم ہوگیا تھا کہ دونوں جانب کا ٹریفک جام ہوکر رہ گیا تھا تاہم ہمارے آگے بڑھنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے کایا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اب ایک فرلانگ کے فاصلے پر اس علاقے میں پولیس کی ہر پیٹرولنگ کار جہت چھاؤنی کی ہوگی لہٰذا ہمیں جلد از جلد زخم خوردہ مزدا کار سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا ورنہ کسی بھی جگہ پر دھر لیے جائیں گے۔"

کایا نے میری سنی، ان سنی کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ "علی! اپنی گھڑی مجھے دو۔"

"تم اس گھڑی کا کیا کرو گی؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم دو تو.....!" وہ اصراری انداز میں بولی۔

میں نے اپنی کلائی پر سے سوئس میڈ شاندار گھڑی اتار کر کایا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو..... اب تو بتا دو کہ تمہیں اچانک اس گھڑی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"مجھے ہرگز اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کار کو برج کے اندر داخل کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی۔

برج اسٹریٹ کا نام "برج اسٹریٹ" اس لیے تھا کہ وہ کرائسٹ چرچ کے دو علاقوں کو آپس میں "برج" کرتی تھی اور اس وقت ہم اسی برج کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس جنگلے دار پل کے نیچے دریائے ایون کا نیلا پانی مستی بھرے انداز میں رواں دواں تھا۔

کایا کے جذبات سے عاری لہجے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "جب تمہیں اس گھڑی کی ضرورت نہیں تو پھر لی کیوں۔ آخر اس سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"میرا مقصد جاننا چاہتے ہو.....؟" وہ گھڑی کو اپنی مٹھی میں دبوچ کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، بتاؤ؟"

"ابھی بتاتی ہوں....."

کایا کے پُراسرار انداز نے مجھے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کایا کی ذہنی کیفیت کو سمجھ پاتا، اس نے اپنی سائڈ کا شیشہ گرایا پھر میری گھڑی کو دریائے ایون کی نذر کر دیا۔

"اررے..... یہ تم کیا کر رہی ہو.....؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کر رہی نہیں..... بلکہ کر چکی ہوں۔" وہ بڑے

اطمینان سے بولی۔

''مگر..... تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے احتجاجی لہجے میں پوچھا۔

''بینا کا آئیڈیا بہت امپریسو تھا۔'' وہ گاڑی کو برج کے اندر سے نکال کر بہت تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بینا کہاں سے آگئی.....'' میری الجھن میں اور بھی شامل ہوگئی، میں نے پوچھا۔ ''تم اس کے کون سے آئیڈیا کی بات کررہی ہو؟''

''وہی آئیڈیا جس میں بینا نے تمہارے پاسپورٹ کو جلا کر اس کی راکھ کو فلش کردیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بینا کو ڈر تھا کہ میڈم ڈیلفینا تمہارے ای۔ پاسپورٹ میں لگی چپ کی بدولت تمہیں ٹریک کرلے گی اور مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہوچکا ہے کہ تمہاری اس گھڑی کے اندر کوئی حساس ٹریکنگ ڈیوائس نصب ہے جو لمحہ بہ لمحہ سوسائٹی والوں کو تمہاری لوکیشن سے آگاہ کرتی رہتی ہے ورنہ میرین پریڈ والے ولاتک ان کی رسائی ممکن نہیں تھی۔''

میں نے توصیفی نظر سے کایا کو دیکھا اور کہا۔ ''تم بہت دور کی کوڑی لائی ہو۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔''

''بینا تو اپنے آئیڈیا پر عمل کرنے کے باوجود بھی تمہیں میڈم ڈیلفینا سے بچا نہیں سکی تھی۔'' وہ پُرغرور انداز میں بولی۔ ''لیکن میرا آئیڈیا ہم دونوں کو سوسائٹی والوں کی نگاہوں سے اوجھل کردے گا۔ انہیں ایون ریور کی تہ میں سے تمہاری موجودگی کے سگنلز تو ملیں گے لیکن ان کے ماہر ترین غوطہ خوروں کو بھی اس دریا کے چپے چپے کا پانی چھاننے کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔''

میں نے دل ہی دل میں اس پاکٹ سائز نیوزی لینڈر کی ذہانت کو داد دی کیونکہ عملی خراج تحسین پیش کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس نے بینا کے مقابلے میں خود کو کامیاب ثابت کرنے کے لیے جس غرور سے بات کی تھی، کایا کا وہ انداز مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ایون ریور پر اگلا برج کتنی دور ہے؟''

''کیوں.....؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''میرے ذہن میں بھی ایک آئیڈیا آیا ہے۔''

''کیسا آئیڈیا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''اگر سوسائٹی کے ٹریکنگ سسٹم پر ایون ریور میں میری لوکیشن ظاہر ہورہی ہے تو اس گاڑی کو بھی ایون ریور کے گہرے پانیوں ہی میں پایا جانا چاہیے۔ وہ یہی سمجھیں کہ رابرٹ اور اس کی ریڈفورڈ جیپ کو ناکوں چنے چبوانے کے بعد ہماری یہ گاڑی بھی دریائے ایون میں جا گری تھی۔ اس طرح ہمیں ایک نئی زندگی شروع کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔''

''گڈ آئیڈیا.....'' وہ گاڑی کو اگلے راؤنڈ اباؤٹ سے ایون ریک ڈرائیو پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''لیکن سوسائٹی والے جب تک اپنی آنکھوں سے ہماری لاشیں دیکھ کر ہماری موت کی تصدیق نہیں کرلیں گے، وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''

''دنیا کے ہر دریا میں مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''جن میں بعض بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ جب ہزار کوشش کے باوجود بھی انہیں ہماری لاشیں نہیں ملیں گی تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ ہم خوں خوار مچھلیوں کی خوراک بن چکے ہیں.....'' ذرا دیر کو رک کر میں نے گہری نظر سے کایا کو دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ چانس لینے میں کوئی حرج تو نہیں.....!''

''کوئی حرج نہیں۔'' وہ گاڑی کو ایون زیک (Anzac) ڈرائیو پر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی گاڑی کی جو حالت ہوگئی ہے، اسے ہم اپنے ساتھ لیے گھوم نہیں سکتے تو بہتر ہے، تمہارے آئیڈیا میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ہم اسے سپردِ آب کردیں..... اور اس کے لیے ہمیں کسی پل پر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم کسی بھی مقام سے گاڑی کو دریا کے اندر دھکیل سکتے ہیں۔''

''اس طرح مزہ نہیں آئے گا۔'' میں نے کایا کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر سوسائٹی والوں کو ٹریکنگ ڈیوائس والی گھڑی گہرے پانی سے ملے گی تو یہ گاڑی دریا کے کسی کنارے سے پانی میں دھکیلی ہوئی بازیاب نہیں ہونا چاہیے۔ تم میری بات کو سمجھ رہی ہو نا.....؟''

''بالکل سمجھ گئی۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ہم برج اسٹریٹ کے اختتام پر راؤنڈ اباؤٹ سے ایون زیک ڈرائیو پر گھوم گئے تھے۔ آگے چل کر یہی روڈ اسٹیٹ ہائی وے چوہتر میں بدل گئی تھی۔ دراصل ڈائزر روڈ اور ایون زیک ڈرائیو SH74 ہی کا حصہ ہیں۔ اس ہائی وے پر ہم ہیکسلے گیرج تک آئے پھر شاپنگ ایکسپریس مال سے ہم نے رائٹ ہینڈ پر پیجز روڈ لے لی۔ پیجز (Pages) روڈ نے ہمیں ایون ریور کے برج تک پہنچا دیا تھا۔

CX5 مزدا کو دریا برد کرنے کے بعد ہم نے پکٹن

جانے کے لیے ایک ٹاؤن کار ہائر کرلی جو پیچز روڈ سے SH74 اور SH74 سے SH1 پر سفر کرتے ہوئے شام پانچ بجے پکٹن (Picton) پہنچ گئی۔

☆☆☆

ہائی اسٹریٹ پر واقع فور اسٹار موٹل ''براڈوے'' کو ہم نے اپنی شب بسری کے لیے منتخب کیا۔ جب ملایشیا نیلنے کے بعد کابانے مجھے اپنے پلان بی کے بارے میں بتایا تھا تو میں پکٹن پر رکنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس منصوبے کے مطابق ہم لگ بھگ چار بجے سلور مزد میں پکٹن پہنچتے اور پھر شام سات بجے اپنی گاڑی سمیت بلیو برج (Bluebridge) فیری پر سوار ہوکر ہم ویلنگٹن کے لیے روانہ ہوجاتے جو ہمیں ساڑھے دس بجے رات ہماری منزل ویلنگٹن تک پہنچا دیتی لیکن اب ہمارا پکٹن میں رات گزارنے کا پروگرام بن گیا تھا اور اس کی ٹیکنیکل وجوہات تھیں۔

بلیو برج فیری کے روزانہ پکٹن سے ویلنگٹن تک تین ٹرپ لگتے تھے۔ پہلا ٹرپ صبح آٹھ بجے، دوسرا دوپہر دو بجے اور تیسرا شام سات بجے۔ خاص بات یہ تھی کہ ہفتے کے روز صبح آٹھ بجے والا ٹرپ ''آف'' ہوتا تھا۔ پکٹن سے ویلنگٹن تک پینسٹھ کلومیٹر کا سمندری راستہ تھا جس میں لک اسٹریٹ بھی شامل تھا۔

ہم جب پکٹن پہنچے تو پتا چلا کہ سات بجے والے ٹرپ پر کوئی سیٹ خالی نہیں ہے لہٰذا آج کی رات پکٹن میں گزارنا ہماری مجبوری بن گئی تھی۔ اگلے روز یعنی دو اگست کو ہفتے کا دن تھا لہٰذا صبح آٹھ بجے والا ٹرپ ''آف'' تھا۔ ناچار ہمیں دوپہر دو بجے والے ٹرپ میں جگہ مل سکی تھی۔

''براڈوے موٹل'' اپنی لوکیشن اور سروس کے لحاظ سے ایک شاندار ہوٹل تھا۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ اس موٹل میں قیام ہمارے لیے یہ آسانی بھی فراہم کرتا تھا کہ یہاں سے فیری کا ٹرمنل بہت نزدیک تھا یعنی موٹل سے محض گیارہ منٹ کی واک پر پکٹن کا فیری ٹرمنل واقع تھا۔

ہم جس قسم کے حالات سے گزر کر آئے تھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ ادھر ادھر گھومنے سے پرہیز کریں اور زیادہ وقت اپنے کمرے کے اندر ہی گزاریں لہٰذا چیک ان ہونے سے پہلے ہم نے باہر کے تمام ضروری کام نمٹا لیے تھے اور اب اگلے روز دوپہر ہی میں ہمارا موٹل سے نکلنے کا ارادہ تھا۔

ڈنر کے بعد ہمارے بیچ حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے ٹی وی کو آن کر رکھا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ آج دن میں جو کچھ برج اسٹریٹ پر پیش آیا اس کی کوریج

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
1200
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
9,000
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
0301-2454188
0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

دیکھی جائے لیکن اس بات سے مجھے شدید حیرت ہوئی کہ مختلف نیوز چینلز پر جو نیوز بلیٹن چل رہے تھے ان میں سے کسی نے بھی اس واقعے پر سیر حاصل نیوز نہیں دی تھی۔ بعض چینلز نے تو اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ میں جھلا اٹھا۔ آہستہ انداز میں چینل پر چینل بدلتا چلا گیا۔

''تم جو کچھ تلاش کر رہے ہو، وہ ملے گا نہیں۔'' کایا نے میری جستجو کو دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

میں بخوبی سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ''اس کا سبب کیا ہے؟ کیا نیوزی لینڈ کے نیوز چینلز ایسے واقعات کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتے؟''

''ایسی بات نہیں ہے علی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اصل میں ولا والے دھماکے، بلیک ڈاج کے پرخچے اڑ جانے والے واقعے اور برج اسٹریٹ والے سانحے کو اس لیے زیادہ نہیں اچھالا گیا کہ ان تمام واقعات میں سوسائٹی براہِ راست ملوث ہے اسی لیے بلیک ڈاج اور ولا والے معاملے کو ایک دوسرے کے ساتھ نتھی کر کے ایک اتفاقی حادثے کا نام دے دیا گیا ہے اور برج اسٹریٹ پر جو کچھ پیش آیا اسے روڈ ایکسیڈنٹ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ کہیں پر بھی رابرٹ یا ''اسکل اینڈ بونز'' کا ذکر نہیں آیا۔''

میں نے توجہ سے کایا کی بات سنی پھر اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے پریسٹن بالو والے بنگلے پر سوسائٹی کی سورس کا عملی مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہے جب انہوں نے مجھے مکمل کے ایکویریس سے اس طرح نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے بال کو کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔''

''سوسائٹی والے ہمیشہ تم پر مہربان رہے ہیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن شاید آج والے واقعات کے بعد وہ اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی کر لیں۔''

''کایا! میں نے کبھی ''اسکل اینڈ بونز'' اور اس کے معاملات کو توجہ کے لائق نہیں جانا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ لوگ مجھ پر مہربان ہیں یا قہربان۔ میں تو ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر انہیں میری ضرورت ہے تو یہ ان کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے مجھے چنگیز خان کا تحفہ دیا، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ کبھی موقع ملا تو میں ان کا یہ احسان اتار کر حساب بے باق کر دوں گا۔''

کایا سے بات چیت کے دوران میں، میں ٹی وی کے مختلف چینل بھی بدلتا جا رہا تھا۔ ایک چینل نے میری توجہ کو پکڑ لیا۔ وہ کوئی مووی چینل تھا اور وہاں پر اس وقت ''سیونگ پرائیویٹ رائن'' کا اینڈ چل رہا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہاٹ آ گریٹ مووی!''

''یہ مووی رائن کو بھی بہت پسند تھی۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاید اس کے نام کی وجہ سے.....''

رائن، کایا کے بڑے بھائی کا نام تھا جس کی المناک موت آسکر کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ کایا نے راس آئی لینڈ والے ہٹ پر آسکر کو بھیانک موت سے ہمکنار کر کے اپنے بھائی رائن کی موت کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس مشن میں، میں نے بھی کایا کی تھوڑی بہت مدد کی تھی۔ بھائی کی یاد نے کایا کو قدرے مغموم کر دیا تھا۔ میں نے اس کی افسردگی کو دور کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''کایا! کیا تم نے ''سیونگ پرائیویٹ رائن'' دیکھی ہے؟''

''میں نے یہ مووی نہیں دیکھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی تعریف بہت سنی ہے۔''

دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں یہ ایک ایسی ماں کی کہانی ہے جس کے تین بیٹے آگ اور بارود کی نذر ہو چکے ہوتے ہیں اور چوتھا بیٹا میتھیو ڈیمن لاپتا۔ یہ میتھیو ڈیمن (رائن) کو تلاش کرنے اور بچانے کی جدوجہد ہے۔''

''ویری گڈ!'' کایا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں یہ مووی ضرور دیکھوں گی۔''

رات کو گیارہ بجے ہم نے لباس تبدیل کیا اور سونے کے لیے بیڈ پر آ گئے۔ ہم پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے کہ کایا نے کہا۔

''علی! تم نے ایک بات نوٹ کی.....!''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟''

''بارہ گھنٹے سے زیادہ گزر گئے۔'' اس نے کہا۔ ''سوسائٹی کی طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ برج اسٹریٹ والے واقعے کے بعد سے ابھی تک کسی نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ ہماری تلاش کے سلسلے میں ان کا ٹریکنگ سسٹم کام نہیں کر رہا۔''

''تم نے برج اسٹریٹ والے واقعے کا اچھا حوالہ دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''واقعی جب سے تم نے میری گھڑی کو دریائے ایون کی نذر کیا ہے، ہم سوسائٹی کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، برج اسٹریٹ پر آج دن میں سب سے اہم واقعہ یہی پیش آیا ہے

کہ تم نے میری گھڑی کو زیرِ آب پہنچا دیا۔"

"یہ بہت ضروری تھا ورنہ وہ لوگ ہمارا پیچھا نہ چھوڑتے۔" وہ میری طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔ "ویسے تم نے شارلٹ کے پاپا کی رائفل کی مدد سے جس طرح ریڈ فورڈ کے ٹائروں کو بے کار کیا وہ بھی کوئی کم اہم واقعہ نہیں ہے۔"

"میری سوئس گھڑی کی طرح وہ امریکن رائفل بھی دریا برد ہوگئی۔" میں نے کہا۔ "اور جاپانی مزدا بھی....."

ہم نے کار کو بیچز روڈ والے برج سے دریا کے حوالے کیا تھا اور ریمنگٹن رائفل اور اس کے تمام راؤنڈز کو میں نے گاڑی کے اندر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے صرف سوٹ کیس اپنے ساتھ رکھا تھا یا پھر سگ سوئر۔ پی ٹو فائیو پسٹل۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم وقتی طور پر سوسائٹی کی آنکھ سے اوجھل ہوگئے ہیں۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ "لیکن ہمیں بہت زیادہ احتیاط کرنا ہوگی۔ جب تک ہم کسی نامعلوم محفوظ ٹھکانے پر نہیں پہنچ جاتے۔ سوسائٹی والے اتنی آسانی سے ہمت نہیں ہاریں گے۔ جب تک انہیں ہماری موت کے ٹھوس شواہد نہیں مل جاتے وہ ہماری کھوج جاری رکھیں گے۔"

میں نے اس کے سر کے اوپر اپنا بازو دراز کیا پھر اس کے بوب کٹ ڈارک براؤن بالوں سے کھیلتے ہوئے بڑے دلار سے پوچھا۔ "کایا! کیا تم خوف زدہ ہو؟"

"نہیں!" اس نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔ "علی! میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہے۔ میرے دل سے سارا ڈر خوف نکل گیا ہے۔" پھر اچک کر اس نے اپنا سر میرے بازو کے اوپر رکھ لیا اور خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اگر تمہاری بانہوں میں موت بھی آجائے تو مجھے پروا نہیں ہے۔"

"میری بانہوں کے حلقے میں تمہیں ہمیشہ زندگی ملے گی کایا۔" میں نے اس کی گردن کے نیچے دبے ہوئے اپنے ہاتھ کو گھما کر اسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ "اس سے زیادہ محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ تمہیں اور کہیں نہیں ملے گی۔"

"جانتی ہوں..... اور صبح سے اپنی آنکھوں سے دیکھتی بھی آرہی ہوں۔" وہ اپنے منہ کو میرے پہلو میں گھساتے ہوئے بولی۔ "تم نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان کی حفاظت کی ہے۔"

عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور جب بھی اسے کسی مرد کی قربت میسر آتی ہے، یہ اپنی جنم بھومی ہی کا رخ کرتی ہے اور اس کا یہ عمل بے ساختہ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "تم تو کسی شیپ کی طرح گھسی چلی آرہی ہو اور وہ بھی کوئی صدائے احتجاج بلند کیے بغیر....."

"ایرا پاوا اسی طرح گھسا کرتے ہیں۔ ایرا پاوا (Arapawa) شیپ اینڈ رِیم (بھیڑ اور مینڈھے) کی ایک خاص نسل ہے۔" وہ اپنے منہ کو میری پسلی پر رگڑتے ہوئے خمار آلود آواز میں بولی۔

اس نے مزید کہا۔ "ساؤتھ آئی لینڈ کے آخری کنارے پر ایک خوب صورت اور سرسبز و شاداب جزیرہ ہے جو "ایرا پاوا آئی لینڈ" کہلاتا ہے۔ اس جزیرے پر ایرا پاوا شیپ اینڈ رِیم کی بہتات ہے اور باقاعدہ ان جانوروں کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔"

اچانک وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

کایا کی ہنسی کی کھنک میں کوئی جادو تھا۔ میں اس مقناطیسی کھنک کے زیر اثر کسی سحر زدہ انسان کی طرح کھنچتا چلا گیا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا کر بے اختیاری اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس نے کوئی احتراز، کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی خود سپردگی اور آمادگی نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں تادیر اسے سیراب کرتے ہوئے اپنی تشنگی کو مٹاتا چلا گیا۔ آج کا پورا دن ہم نے کڑی مشقت کی تھی اور ہمارا کئی بار موت سے بھی سامنا ہوا تھا۔ زندگی نے موت کو تو شکست دے دی تھی۔ ہمارا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ آج دوپہر دو بجے ہمیں پکٹن کو الوداع کہہ کر بلیو برج فیری کے ذریعے ویلنگٹن کے لیے روانہ ہوجانا تھا۔ جب سے ہم نے براڈوے موٹل میں چیک ان کیا تھا، ہوٹل کی حدود سے باہر نہیں گئے تھے۔ موٹل کے عقب میں واقع پہاڑی سلسلہ دیکھنے والی آنکھوں کو ایک دلکش اور دل فریب نظارہ دیتا تھا۔ ہم ناشتے کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

اسی وقت ایک فربہ اندام عورت ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی پھر وہ سیدھی ہماری ٹیبل کی جانب بڑھتی چلی آئی۔ اس موٹی عورت کو دیکھ کر میرے حواس یکایک ریڈ الرٹ ہوگئے۔ اس عورت کی پیش قدمی کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ہمیں جانتی ہو۔ میں تو نیوزی لینڈ میں بالکل اجنبی تھا۔

میں نے کایا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم اس موٹی عورت کو پہچانتی ہو؟''

ساتھ ہی میں نے مذکورہ عورت کی طرف اشارہ بھی کردیا تھا۔ کایا نے گردن موڑ کر میری بتائی ہوئی سمت میں دیکھا اور اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھر آئے۔

''ارے..... یہ تو اسٹیلا ہے۔'' وہ اضطرابی لہجے میں بولی۔

اس دوران میں اسٹیلا نامی وہ موٹی عورت ہمارے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ کایا کی بات سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسٹیلا سے اس کی گہری شناسائی ہے۔ کایا نے رسمی علیک سلیک کے بعد اسے اپنے نزدیک ہی ایک کرسی پر بٹھالیا اور مجھ سے متعارف کراتے ہوئے بولی۔

''کچھ عرصہ پہلے تک اسٹیلا بھی ہل مورٹن اسپتال میں ہوا کرتی تھی اور یہ بھی میری طرح ایک نرس ہے۔ پھر یہ ساؤتھ آئی لینڈ سے نارتھ آئی لینڈ چلی گئی تھی۔ اس لیے ہمارے بیچ رابطہ نہیں رہا۔''

''تمہاری دوست ساؤتھ سے نارتھ کیوں شفٹ ہوتی چلی جارہی ہیں؟'' میں نے کایا سے پوچھا۔

''اوہ..... یہ ہینڈسم کہیں شارلٹ کی بات تو نہیں کررہا.....!'' اسٹیلا نے مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کایا سے پوچھا۔ ''تم نے اس کا تعارف نہیں کرایا؟''

موٹی اسٹیلا کا وزن تو اس کے قابو میں نہیں تھا لیکن بات چیت میں وہ خاصی خوش مزاج اور شائستہ تھی۔ اس کی آنکھوں کو اسائکنگ آئیز کہا جاسکتا تھا۔ فربہ اندامی سے قطع نظر وہ ایک خوش شکل عورت تھی۔

''یہ میرا دوست علی ہے۔'' کایا نے میرا تعارف کراتے ہوئے اسٹیلا کو بتایا۔ ''اور ہاں..... اس کا اشارہ شارلٹ ہی کی جانب ہے۔''

یہ تو ظاہر ہوگیا تھا کہ اسٹیلا شارلٹ کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ مجھے اس بات کی فکر لگ گئی کہ کہیں وہ شارلٹ کے ولا کی تباہی کا قصہ لے کر نہ بیٹھ جائے اور کایا کے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ پھسل جائے جو آگے چل کر ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی کردے لیکن میرا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا اور اس بے فکری اسٹیلا نے شارلٹ کا ذکر گول کرکے ساری توجہ مجھ ہی پر مرکوز کردی۔

''صرف بوائے فرینڈ یا.....؟'' اس نے کایا سے پوچھا۔

''یا کیا؟'' کایا الجھ کر رہ گئی۔

''مطلب، میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے شادی کرلی ہے۔'' وہ کایا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ اسمارٹ گائے تمہارا ہسبینڈ ہے اور تم لوگ بھی ہماری طرح ہنی مون ٹرپ پر ہو.....!''

''اوہ..... تو کیا تم نے شادی کرلی؟'' کایا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم تو کرائسٹ چرچ سے ویلنگٹن شفٹ ہوگئی تھیں پھر ہمارے بیچ رابطہ نہیں رہا۔''

''میں اب بھی ویلنگٹن ہی میں ہوں۔'' اسٹیلا نے بتایا۔ ''اور ہاں، میں نے شادی کرلی ہے۔ میں اور ڈیوڈ ہنی مون انجوائے کرنے پکٹن آئے ہیں اور اسی موٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ فرصت کے لمحات کو رنگین اور سنگین بنانے کے لیے پکٹن ایک پُرسکون، فرحت بخش اور بے حد رومینٹک پلیس ہے۔ کیا کہتی ہو؟''

اسٹیلا نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ کایا نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ میں بھی شادی کے بعد اپنا ہنی مون پکٹن ہی میں گزاروں گی۔''

''اور جب تک شادی نہیں ہوجاتی.....'' اسٹیلا نے بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھا پھر کایا سے کہا۔ ''اس وقت تک بھی انجوائے کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ کمپلی کیٹڈ ریلیشن بھی بڑے مزے کی چیز ہے۔ اس کے روئیس کا چارم بالکل الگ ہوتا ہے۔''

میرے اور کایا کے بیچ گہری دوستی کا رشتہ قائم ہوچکا تھا اور ہم روز و شب ایک دوسرے کے قرب میں گزار رہے تھے۔ ٹیکنیکل اعتبار سے کسی مرد اور عورت کے اس بے تکلف رشتے کو کمپلی کیٹڈ ریلیشن کہا جاتا ہے۔

اسٹیلا نے ہمیں بتایا کہ وہ لوگ دو روز پہلے ''انٹر آئی لینڈر'' فیری کے ذریعے ویلنگٹن سے پکٹن آئے تھے اور ابھی کافی دن یہاں قیام کا ارادہ تھا۔

''آج میں کسی وقت تمہیں اپنے ہسبینڈ سے ملواؤں گی۔'' اسٹیلا نے کایا سے کہا۔ ''ابھی تو ڈیوڈ موٹل کے کمرے میں سو رہا ہے۔''

ہم نے اسٹیلا کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم دوپہر دو بجے والی ''بلیو برج'' پر سوار ہوکر ویلنگٹن کے لیے روانہ ہوجائیں گے اور اس اللہ کی موٹی تازی بندی نے بھی ہمارے، براڈوے موٹل میں قیام کے حوالے سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

''ڈیوڈ اگر کمرے میں سو رہا ہے تو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' کایا نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں تو اس کے پاس ہونا چاہیے۔ آخر کو تم لوگ ہنی مون ٹرپ پر ہو.....!''

''میں ڈیوڈ کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔'' اسٹیلا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں موٹل سے نکل کر فلورل شاپ کی طرف جا رہی تھی تو تم ڈائننگ ہال میں نظر آگئیں اور میں تمہاری طرف چلی آئی۔''

''تم اپنے ہسبینڈ کو کس قسم کا سرپرائز دینا چاہتی ہو؟'' کایا نے پوچھا۔

''آج ڈیوڈ کا برتھ ڈے ہے۔'' اسٹیلا نے بتایا۔ ''میں اسے وش کرنے کے لیے فلورل شاپ سے ایک بکے لینے جا رہی تھی۔'' پھر اس نے ٹیبل پر پھیلے ہوئے خالی برتنوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ناشتا تو ختم ہو چکا۔ آؤ، ایک ساتھ چلتے ہیں۔ دس منٹ میں واپس آجائیں گے۔''

کایا نے متذبذب نظر سے میری طرف دیکھا۔ اسٹیلا نے اس کی ہچکچاہٹ کو فوراً محسوس کرلیا، جلدی سے بولی۔

''ایل این آر فلورل شاپ یہاں سے چھ سات منٹ کی واک پر لیگون روڈ پر واقع ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں واپس آجائیں گے۔ باقی اسٹریٹ اور لیگون روڈ میں چند گز ہی کا تو فاصلہ ہے اور اگر.....'' اسٹیلا نے ایک معنی خیز نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اگر اپنے پیارے فرینڈ کو چھوڑ کر تم مجھے دس پندرہ منٹ بھی نہیں دے سکتی ہو تو اس اسمارٹ گائے کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' کایا نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

اسٹیلا اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''تو پھر چلیں۔ اگر ڈیوڈ میری واپسی سے پہلے جاگ گیا تو میرے سرپرائز کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔''

کایا نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ کایا کو اسٹیلا کے ساتھ جانے سے روکنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ ایک دوسرے کی دیرینہ شناسا اور کولیگ تھیں اور پھر اسٹیلا اپنے شوہر کے ساتھ براڈوے موٹل ہی میں رکی ہوئی تھی۔

''کایا! تم اسٹیلا کے ساتھ جاؤ۔'' میں نے کایا کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ''ایل این آر'' فلورل شاپ سے ایک بکے میری طرف سے، اپنے لیے بھی لے لینا۔''

''لی اینڈ روز (ایل این آر) فلورل شاپ کے بکے (Bouquet) لاجواب ہوتے ہیں۔'' اسٹیلا نے بتایا۔ ''یہ لیگون روڈ کی سب سے بیسٹ شاپ ہے۔''

''علی! تم کمرے میں جا رہے ہو یا ادھر ڈائننگ ہال میں ہی بیٹھ کر میرا انتظار کرو گے؟'' کایا نے مجھ سے پوچھا۔

''میں یہیں بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بس، تم جلدی سے واپس آجاؤ۔''

اسٹیلا نے باری باری ہم دونوں کو بھرپور نظر سے دیکھا پھر اس کی زبان سے ایک ایسا جملہ خارج ہوا جس کا سادہ الفاظ میں یہ مفہوم نکلتا تھا۔

''جوڑی سلامت رہے۔ چشم بددور.....!''

وہ دونوں ڈائننگ ہال سے نکلیں تو ایک بے نام سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا۔ میں اس اضطرابی کیفیت کو فوری طور پر کوئی نام نہ دے سکا۔ یہ گٹ فلینگ (Gut Feeling) یعنی کوئی وجدانی احساس تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے اپنے دل پر توجہ مرکوز کی اور موجودہ حالات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے یہ اسٹرانگ فیل آئی۔ ''مجھے کایا کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے موٹل کے ریسیپشن کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ریسپشنسٹ سے صرف دو سوال کیے۔ میرا پہلا سوال کچھ اس طرح تھا۔

''مسٹر ڈیوڈ اور ان کی وائف اسٹیلا دو روز سے آپ کے موٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیا آپ مجھے ان کے روم کا نمبر بتا سکتی ہیں؟''

''ایک منٹ سر۔'' ریسپشنسٹ نے شائستہ اور مستعد لہجے میں کہا۔

اسٹیلا کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اس کے بے انتہا موٹا ہونے کا اشارہ بھی دے دیا تھا تاکہ ریسپشنسٹ کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ اس نے اپنے کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد بتایا۔

''سوری سر۔ اس نام سے کوئی مہمان ہمارے موٹل میں قیام پذیر نہیں ہے۔'' پھر اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کہیں اس موٹی عورت کی بات تو نہیں کر رہے جو ابھی آپ کی ساتھی کے ساتھ موٹل سے نکلی ہے؟''

''ہاں وہی.....'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

''کیا آپ موٹی اسٹیلا کو جانتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ آپ کی گیسٹ ہے اسی لیے میں نے اسے ڈائننگ ہال کی طرف بھیج دیا تھا کیونکہ میں نے آپ کو ہال میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔''

''ایل این آر فلورل شاپ یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''سوری.....'' اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہو۔

''لِلی اینڈ روز فلورل شاپ۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جو لیگون روڈ پر ہے.....''

''آئی ایم سوری سر۔'' وہ بے حد معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''لیگون روڈ پر ایسی کوئی بھی پھولوں کی دکان نہیں ہے بلکہ میری معلومات کے مطابق پورے پکٹن میں اس نام کی کوئی شاپ نہیں ہے۔''

''او مائی گاڈ.....!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

ریسپشنسٹ نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''سر! کوئی پرابلم ہے؟''

''نو ایشو!'' میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اٹس اوکے..... ہوسکتا ہے مجھے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ اسٹیلا نے فلورل شاپ کا کوئی اور نام بتایا ہو۔ اپنی ہاؤ، میں دیکھتا ہوں، وہ دونوں کہاں گئی ہیں۔''

میرے ''اٹس اوکے'' کہنے سے ریسپشنسٹ کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کسی گڑبڑ کو محسوس کر چکی ہے تاہم اس نے میرے ذاتی معاملے میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی اور سرسری لہجے میں بولی۔

''یہاں قریب ترین فلورل شاپ ڈبلن اسٹریٹ پر ہے۔ ''مارننگ گلوری'' کے نام سے۔ آپ اسے بھی چیک کرلیجیے گا۔''

''تھینک یو۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ اس وقت ہم دونوں کے پاس سیل فون نہیں تھے ورنہ میں ابھی کال کرکے کایا کی خیریت اور لوکیشن دریافت کرلیتا۔ اگرچہ کایا اسٹیلا پر بھروسا کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن میں نے ابھی ریسپشنسٹ سے جو گفتگو کی تھی اس کی روشنی میں اسٹیلا جھوٹی درجۂ اول تھی۔ وہ کایا کی دیرینہ شناسا اور کولیگ رہی ہوگی لیکن اس وقت اس کے ارادے نیک نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ دھوکے سے کایا کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہم جس نوعیت کے سنگین غیر یقینی حالات سے گزر رہے تھے ان میں میرا ذہن بار بار سوسائٹی کی طرف جارہا تھا۔ ایسا سوچا جاسکتا تھا کہ کایا کو شکار کرنے کے لیے سوسائٹی نے اسٹیلا کو استعمال کیا ہو اور عین ممکن تھا کہ اسٹیلا بھی سوسائٹی کے پے رول پر ہو.....

میں نے موٹل کے کمرے سے صرف ایک چیز اٹھائی اور وہ تھا سگ سوئر..... میں نے اس نائن ایم ایم پسٹل کے میگزین میں آٹھ راؤنڈز کو لوڈ کرنے کے بعد اسے اپنی کمر پر پتلون کی بیلٹ میں اڑسا پھر اوپر سے گرم جیکٹ پہن کر موٹل سے باہر نکل آیا۔

اس وقت میری پہلی ترجیح کایا کی تلاش تھی اور ذہن میں یہ خطرناک سوال کسی زہریلے ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا تھا کہ اگر واقعی اسٹیلا سوسائٹی کے پے رول پر تھی تو پھر ان لوگوں کو یہ کیسے پتا چلا کہ ہم پکٹن کے ایک موٹل میں قیام پذیر ہیں؟ کایا کے مطابق میری گھڑی کے اندر کوئی ٹریکنگ ڈیوائس لگی ہوئی تھی مگر اب تو وہ قیمتی گھڑی دریائے ایون کے گہرے پانی میں سکونت اختیار کرچکی تھی پھر..... پھر کے بعد کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے موٹل سے باہر نکل کر دور تک نگاہ دوڑائی۔ تاحدِ نگاہ ہائی اسٹریٹ پر مجھے کایا یا اسٹیلا کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ اگر اسٹیلا کی بات کو چند لمحات کے لیے درست بھی مان لیا جاتا تو انہیں لیگون روڈ تک پہنچنے کے لیے ہائی اسٹریٹ کے چوراہے ''ویسٹ پیک'' سے نکل کر لیفٹ سائیڈ ڈبلن اسٹریٹ پر مڑنا پڑتا جو انہیں ''مارل بروساؤنڈز'' سے سیدھا لیگون روڈ پر لے جاتی مگر ''ایل این آر'' فلورل شاپ والی کہانی تو بوگس ثابت ہوچکی تھی لہٰذا میں نے ڈبلن اسٹریٹ کو ذہن میں رکھ لیا۔ شاید اس لیے کہ موٹل کی ریسپشنسٹ نے اس اسٹریٹ پر ایک فلورل شاپ ''مارننگ گلوری'' کی نوید سنائی تھی۔

میں ہائی اسٹریٹ پر جنوب سے شمال کی سمت پیدل ہی آگے بڑھ رہا تھا کہ ''پکٹن فائر اسٹیشن'' کے نزدیک مجھے ایک آئیڈیا سوجھا۔ میں نے فائر اسٹیشن کے باہر کسی کور یئر کمپنی کے ایک رائیڈر کو اپنی بائیک پارک کرتے دیکھا۔ شاید وہ رائیڈر بہت جلدی میں تھا یا یہ اس کی غلطی تھی۔ وہ چابی کو بائیک کے اندر ہی لگا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ اس کا ہیلمٹ

Digitized by Google

بھی بائیک کے ہینڈل ہی میں ٹنگا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک فوری احساس پیدا ہوا کہ مجھے اس موقع غنیمت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگلے ہی لمحے میں ہیلمٹ پہن کر رائیڈر کی بائیک پر سوار ہو چکا تھا۔

یہ بائیک اس وقت ہائی اسٹریٹ پر دوڑ رہی تھی مگر اس کا رخ بدل گیا تھا۔ مطلب اب میں شمال سے جنوب کی سمت محوِ سفر تھا اور میرے عمل میں یہ انقلابی تبدیلی بالکل غیر ارادی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی راہنما سسٹم آن ہو گیا تھا۔ میں کسی غیر مرئی قوت کے زیرِ اثر جی پی .... ہنڈریڈ کو ہائی اسٹریٹ پر بھگاتا چلا جا رہا تھا۔

جب سے جی ایم سر نے مجھے محسوسات کو استعمال کرنے کی تکنیک سکھائی تھی، میں گاہے بہ گاہے اس کی پریکٹس کرتا رہتا تھا۔ اور میری فیلنگز نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا تھا اور اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میں جیسے ہی براڈوے مونٹل کے سامنے سے گزر کر مین براڈوے پر پہنچا تو اپنی دائیں جانب مجھے وہ دونوں براڈوے کے کنارے پر چلتی ہوئی نظر آئیں۔ ان کا رخ آک لینڈ اسٹریٹ کی جانب تھا۔ ہائی اسٹریٹ دراصل ویلنگٹن اسٹریٹ اور آک لینڈ اسٹریٹ کے درمیان واقع تھی اور یہ تینوں اسٹریٹ مین براڈوے کو کراس کرتے ہوئے نکلتی تھیں۔ آک لینڈ اسٹریٹ، براڈوے کو کراس کرنے کے بعد اسٹیٹ ہائی وے ون میں شامل ہو جاتی تھی۔ میں نے کاواساکی ٹریل کو براڈوے میں ڈال کر اسپیڈ کو بڑھا دیا۔

میرے اور ان دونوں کے بیچ بہ مشکل سو گز کا فاصلہ ہوگا۔ چند سیکنڈ میں ان کے قریب میں نے بائیک کو روک دیا۔ تیز رفتاری کے بعد اچانک بریک لگانے کی ہیبت ناک آواز نے فضا کا سینہ چیر ڈالا۔

اس افتاد نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے چہرے کے سامنے سے ہیلمٹ کا ہڈ ہٹایا اور کایا کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔

''کایا! بائیک پر بیٹھ جاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اسٹیلا تمہیں دھوکا دے کر کسی مصیبت میں پھنسانے لے جا رہی ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کی آلہ کار ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟'' وہ حیرت بھری نظر سے اسٹیلا کی طرف دیکھنے لگی۔

اسٹیلا کے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا لہٰذا اس موٹی بہ ظاہر سست الوجود عورت نے بجلی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک لیڈی پسٹل نکال لیا پھر بڑی مہارت سے اس نے کایا کو اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ اسی لمحے سائیڈ اسٹریٹ سے ایک گاڑی تیز رفتاری سے نکل کر براڈوے پر چڑھی اور رفتار کم کیے بغیر وہ ہم پر چڑھ دوڑی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اسٹیلا کے ساتھی تھے۔ مذکورہ گاڑی کو دیکھ کر اسٹیلا کے چہرے پر اطمینان چمک اٹھا تھا۔ اسٹیلا نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اب یہاں سے ان گاڑی والوں کا کام شروع ہونا تھا۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں ایک انقلابی فیصلہ کر لیا۔ اس تیز رفتار گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ نے میکانکی انداز میں حرکت کی۔ اگلے ہی لمحے میں نائن ایم ایم سگ سوئر سے اسٹیلا کے ہاتھ کو نشانہ بنا چکا تھا۔ وہی ہاتھ جس میں اس نے پسٹل پکڑ رکھا تھا۔

اسٹیلا کی دلدوز چیخ، گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ میں گم ہو کر رہ گئی۔ میں نے آن واحد میں کایا کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''مجھے مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ جاؤ..... ہری اپ!''

وہ صورتِ حال کو بھانپ چکی تھی۔ مجھے جیسے ہی اپنی پشت پر کایا کا مانوس لمس محسوس ہوا، میں نے ایک جھٹکے سے جی پی ہنڈریڈ کو آگے بڑھا دیا۔ کاواساکی ٹریل توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند رواں ہو گئی۔ میں نے بائیک کے بیک ویو مرر میں جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔

اسٹیلا تکلیف کی شدت سے اپنے زخمی ہاتھ کو جھٹک رہی تھی اور وہ گاڑی اس کے نزدیک رک چکی تھی۔ میں نے دیکھا، مذکورہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور زخمی اسٹیلا گاڑی کے اندر بیٹھ گئی پھر وہ گاڑی دھواں دھار انداز میں ہمارے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے سگ سوئر کایا کو تھماتے ہوئے کہا۔

''ہم اگرچہ ان کی شوٹنگ رینج سے نکل آئے ہیں لیکن وہ کسی بھی قیمت پر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میں ڈرائیونگ سنبھال رہا ہوں۔ تم گاڑی والوں پر نظر رکھو۔ وہ ہتھنی اسٹیلا بھی گاڑی کے اندر ہے۔''

''سمجھ گئی۔'' اس نے ایک بازو کی گرفت کو میری کمر پر برقرار رکھا اور دوسرے ہاتھ میں سگ سوئر کو تھامتے ہوئے بڑے عزم سے بولی۔ ''آج جو بھی ہمارے نزدیک آئے

Digitized by Google

گا، سینے پر گولی کھائے گا۔"

"جیوشیر کی بچی!" میں نے دل کی گہرائی سے اسے داد دی۔

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر آک لینڈ اسٹریٹ میں سے ایک فورٹی وہیلر ٹریلر نکل کر براڈوے پر چڑھا اور اسٹیٹ ہائی وے ون کی جانب مڑنے کے بجائے وہ سیدھا براڈوے پر اس طرح آن کھڑا ہوا کہ میرے آگے بڑھنے کی راہ مسدود ہو کر رہ گئی۔ ٹریلر کے اوپر کنٹینرز لدے ہوئے تھے جن کی اونچائی کافی اوپر تک تھی۔ ہمارے بیچ میں بہ مشکل پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ اگر اس ہائی اسپیڈ پر اچانک میں بریک لگاتا تو ٹریل الٹ جاتی اور اگر بریک نہیں لگاتا تو سیدھا جا کر ٹریلر سے ٹکراتا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی ہنگامی فیصلہ کرتا، ایک سفاک منظر نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

ٹریلر پر لدے ہوئے کنٹینرز کے اوپر میں نے ایک اسنائپر کو دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا.....!

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ اس امر میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ موت زندگی کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں زخمی اسٹیلا والی متعاقب گاڑی بھی ہمارے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ منحوس ٹریلر پہلے ہی ہمارے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کھڑا تھا۔ ٹریلر نے براڈوے اور آک لینڈ اسٹریٹ کو کچھ اس انداز میں کور کر رکھا تھا کہ اس کے پہلو میں سڑک پر صرف دو فٹ کی ایک لمبی سی پٹی خالی تھی۔ ہمارے لیے آگے، پیچھے اور دائیں جانے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر لیفٹ کٹ مارا اور ٹریل کو آک لینڈ اسٹریٹ پر ڈال دیا۔

میرا یہ فیصلہ انتہائی خطرناک تھا۔ اگر اس قدر زیادہ رفتار کے ساتھ کٹ مارتے ہوئے میرا ہاتھ ذرا سا بھی بہک جاتا تو ٹریل کا توازن برقرار رکھنا ممکن نہ رہتا۔ نتیجتاً ٹریل سیدھی ٹریلر میں جا گھستی مگر ان سنگین لمحات میں مجھے نتائج کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔

جی پی ہنڈرڈ گولی کی رفتار کے ساتھ ٹریلر کے پہلو میں دو فٹ چوڑی پٹی کے اوپر سے بہ حفاظت گزر گئی۔ اب ہم آک لینڈ اسٹریٹ پر تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور فل تھروٹل دے کر ٹریل کو فلائنگ ہارس بنا دیا۔

اگلے ہی لمحے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری کمر پر کایا کے بازو کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور اسی وقت ٹریل کی بیک سیٹ کایا کے وجود سے خالی ہو گئی۔ میں نے یکبارگی بریک لگا دیے۔

ٹائروں کی خوف ناک چرچراہٹ کے ساتھ آک لینڈ اسٹریٹ پر ٹریل بری طرح لہرائی پھر ایک جھٹکا لے کر رک گئی اور میں..... نیوٹن کے قانونِ حرکت کے مطابق ٹریل کی سابق رفتار سے پرواز کرتے ہوئے آک لینڈ اسٹریٹ پر گرا پھر دور تک گھسٹتا چلا گیا۔

اس بے رحم صورتِ حال میں بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور فوراً سے پیش تر میں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور گردن اٹھا کر سچویشن کا جائزہ لیا۔ وہ مالِ مسروقہ جی پی ہنڈرڈ ٹریل آک لینڈ اسٹریٹ کے بیچوں بیچ کسی نئی نویلی دلہن کے اجڑے ہوئے سہاگ کے مانند پڑی تھی اور اس سے آگے تھوڑے فاصلے پر کایا کا بدن کسمپرسی کی حالت میں چاروں خانے چت پڑا جھٹکے لے رہا تھا۔ سگ سوئر پسٹل اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ٹریلر پر لدے ہوئے کنٹینرز کے اوپر سے کایا کو اسنائپر شوٹ کیا گیا تھا۔ میں نے چند لمحے پہلے کنٹینرز کی بلندی پر ایک اسنائپر کو نشست جمائے دیکھا تھا۔ گولی یقیناً کایا کی پشت میں گھسی تھی جبھی وہ لڑھک کر ٹریل سے نیچے جا گرا تھا۔

"کایا! حوصلہ رکھو....." میں نے بہ مشکل تمام خود کو سڑک پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں..... تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"چلے جاؤ....." وہ شکستہ مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "علی..... میں نہیں بچوں گی..... یہاں سے دور چلے جاؤ..... پلیز....."

کایا کی خرخراتی ہوئی آواز نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچ کر مسل ڈالا۔ بلاشبہ اس وقت وہ جان کنی کے عالم میں تھی۔ میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"کایا! تمہیں کچھ نہیں ہوگا.....!"

مجھے اپنے الفاظ کھوکھلے سے محسوس ہوئے۔ کایا نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے اسنائپر کی دوسری گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ کایا کے جسم نے آخری جاں لیوا جھٹکا لیا پھر وہ ساکت ہو گئی۔

موت اپنی چال چل گئی تھی۔ زندگی اس کے سامنے ہار گئی تھی۔ کایا کا وقت پورا ہو چکا تھا اس لیے وہ میرے ساتھ مزید ایک قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ میں نے لہولہو جگر کے ساتھ نگاہ اٹھا کر نفرت بھرے انداز میں ٹریلر کی طرف دیکھا۔

موت کا پیامبر وہ قاتل ٹریلر بہ آہستگی براڈوے پر سیدھا ہو چکا تھا اور اس کا رخ اسٹیٹ ہائی وے ون کی جانب تھا۔ ٹریلر پر لدے ہوئے کنٹینرز کے اوپر اب مجھے کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دیا۔ اسنائپر اپنا کام کر کے منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ ٹریلر کے سیدھا ہوتے ہی اس گاڑی کی راستہ صاف ہو گیا تھا جو ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی۔ مذکورہ گاڑی اور ٹریلر آگے پیچھے اسٹیٹ ہائی وے ون کی سمت روانہ ہو گئے۔

وہ دونوں گاڑیاں مجھ سے اتنی دوری پر تھیں کہ میں دوڑ کر ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگر ان لمحات میں سگ سوئر میرے ہاتھ میں ہوتا، تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس پسٹل کی شوٹنگ رینج پچاس میٹر ہے اور میرے دشمن مجھ سے کم از کم دو سو میٹر کے فاصلے پر تھے۔

میں گھائل جگر اور بوجھل قدموں کے ساتھ کایا کی لاش کی جانب چل پڑا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ زندگی سے معمور میرے عقب میں بیٹھی اس عزم کا اظہار کر رہی تھی..... آج جو بھی ہمارے نزدیک آئے گا، سینے پر گولی کھائے گا۔ ابھی سات بندے پھڑکانے کی گنجائش ہے اس پسٹل میں!

اور اب وہ خود پھڑک چکی تھی۔ اسنائپر کی دو گولیوں نے اس کی ہنستی مسکراتی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا، اس کے عزم مصمم کو چکنا چور کر دیا تھا اور مجھے ایک ناقابلِ بیان اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر کایا کے زندگی سے خالی چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کا سینہ اپنے ہی لہو میں تر بہ تر ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی بے نور بادامی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا۔ مجھے ہر جانب موت کا سناٹا سنائی دیا اور ہر طرف قبرستان کی ویرانی دکھائی دی۔ میں نے اس کی محوِ انتظار آنکھوں کو اپنی ہتھیلی کے دباؤ سے بہ آہستگی بند کر دیا پھر گردن جھکا کر یکے بعد دیگرے دونوں بند آنکھوں پر ایک ایک بوسہ دیا۔ اب وہ مجھے داغِ مفارقت دے کر ایک ایسی جگہ چلی گئی تھی جہاں سے کوئی اسے واپس نہیں لا سکتا تھا..... کوئی نہیں!

کایا کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گئی تھیں اور مجھے ہر حال میں اس سرمائے کی حفاظت کرنا تھی۔ میں باوجود کوشش کے بھی اپنی جان پر کھیل کر کایا کو نہیں بچا سکا تھا۔ میری تمام تر کوشش ''اسکل اینڈ بونز'' کی شیطانی طاقت کے سامنے ریت کی ایک دیوار ثابت ہوئی تھی اور..... سوسائٹی کے ہاتھوں یہ میری پہلی شکست تھی اور..... میری یہ شکست ایک کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ کی شروعات تھی۔

میں نے بے ساختہ کایا کے بے جان جسم کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا پھر عالم وارفتگی میں اس کے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھ پر ایک جنون، ایک عجیب دیوانگی سی سوار ہو گئی تھی۔

''کایا! تمہارا خون رائگاں نہیں جائے گا۔'' میں نے بے جان کایا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''رابرٹ کا انجام آسکر اور چنگیز خان سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔ تمہیں سزائے موت دینا رابرٹ کا مشن تھا اور اسے یہ مشن سوسائٹی کی طرف سے سونپا گیا تھا۔ برج اسٹریٹ پر ہم نے رابرٹ کو شکستِ فاش سے ہمکنار کیا تھا۔ اس سے پہلے شارلٹ کے ولا کے سامنے میں نے اسے بلیک ڈاج کے پرخچوں کا تحفہ دیا تھا۔ وہ ابنِ شیطان یہ سمجھتا ہے کہ تمہیں قتل کروا کے اس نے اپنی ہزیمت بھری ناکامی کا بدلہ لے لیا اور سوسائٹی کی نظر میں اس نے سرخ روئی حاصل کر لی..... نہیں کایا..... نہیں.....'' میں نے بہ آہستگی اس کے ہونٹوں پر الوداعی بوسہ دیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں رابرٹ کو بتاؤں گا کہ بدلہ کیا ہوتا ہے اور اسکل اینڈ بونز کو بھی اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ دوستی اور دشمنی کے بیچ مہین سے لائن کی کتنی اہمیت ہے۔ میں اس شیطانی سوسائٹی کو جڑ سے اکھاڑ ڈالوں گا.....''

میں پتا نہیں کب تک اور معلوم نہیں کیا کیا بول کر اپنے من کا غبار نکالتا رہتا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی مہربان ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک مشفقانہ سرگوشی سنی۔

''کرکٹ میچ دیکھیں گے.....؟''

یہ آواز مجھے جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے یکبارگی گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

''سر! آپ یہاں.....؟''

☆☆☆

ویسٹ پیک اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں اور جی ایم سر آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ون ڈے سیریز کا پہلا میچ تھا۔ نیوزی لینڈ کے مقامی وقت کے مطابق سہ پہر ہو چکی تھی۔ پاکستانی ٹیم کے کپتان اور کیوی کپتان کے بیچ ٹاس ہوا۔ نیوزی لینڈ نے ٹاس جیت کر فیلڈنگ کا فیصلہ کیا۔

جی ایم سر اور میں چپ چاپ اسٹیڈیم کے میدان پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے آخری مرتبہ کراچی میں جی ایم سر سے ملاقات کی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ بہت جلد وہ پاکستان سے چین چلے جائیں گے اور باقی کی عمر وہ چین ہی میں گزاریں گے لیکن اچانک انہیں نیوزی لینڈ میں دیکھ کر مجھے ایک استعجابی جھٹکا لگا تھا اور وہ بھی ایک بار پہلے موقع پر جب میں کایا کی لہولہو لاش کو اپنے بازوؤں میں سنبھالے اس کی ابدی جدائی پر نوحہ خواں تھا۔ یہ ایسے دل خراش لمحات تھے کہ میں جی ایم سر سے کوئی سوال، کوئی استفسار نہیں کر سکا تھا۔ بس، کسی فرماں بردار بچے کے مانند ان کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے چلا آیا تھا۔

اسٹیڈیم کے اندر جی ایم سر کے پہلو میں براجمان ہونے کے بعد میرے حواس نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ تنویمی کیفیت سے باہر آنے کے بعد میرے رگ وپے میں اضطراب بھر گیا تھا۔ کایا کی موت کا خونی .... منظر میرے تصور میں اجاگر ہوا تو مجھے اپنے اعصاب میں ناقابلِ بیان تناؤ محسوس ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا، میرے رگ، ریشے اور پٹھے سوکھی لکڑی کے مانند اکڑ کر مجھے اور میرے جسم وجاں کو تڑخا ڈالیں گے۔ کایا کے حسرت ناک انجام نے میری ہستی کے طول وعرض کو ایک خوفناک ویرانے میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

میچ کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میچ میں میرا ذرا سا بھی دھیان نہیں تھا۔ میرے دماغ کا ایک ایک سیل کایا کی المناک جدائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''اپنے دھیان کو کھیل میں لگانے کی کوشش کریں۔'' جی ایم سر نے میری جانب دیکھے بغیر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

یقیناً انہوں نے میری سوچ کو پڑھ لیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر انہوں نے میری قلبی حالت کو بھانپ لیا تھا۔ ذریعہ کوئی بھی رہا ہو، مقصد کی بات یہ تھی کہ وہ میری اندرونی کیفیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں ان لمحات میں کس درجے کے ذہنی اور روحانی عذاب سے گزر رہا ہوں۔ میں ان کی ہدایت کے مطابق میچ کی جانب متوجہ ہو گیا مگر..... انتہائی بددلی کے ساتھ۔

''جو بھی کھلاڑی میدان میں بیٹنگ کرنے آتا ہے اسے آؤٹ بھی ہونا پڑتا ہے۔'' جی ایم سر مسلسل گراؤنڈ پر نگاہ جمائے مجھ سے مخاطب ہو کر نہایت ہی دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''اسی طرح جو انسان اس دنیا میں آیا ہے، ایک دن اسے واپس بھی لوٹ کر جانا ہے۔ جس کا وقت پورا ہو جاتا ہے، اسے جانا ہی پڑتا ہے۔ تمہاری ساتھی کایا کا وقت بھی پورا ہو گیا تھا۔ تم دونوں کی بس اتنی ہی رفاقت تھی.....''

بات کے اختتام پر انہوں نے میرے ہاتھ کے اوپر یہ آہستگی اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ان لمحات میں جی ایم سر کا ہاتھ مجھے خاصا گرم لگا۔ پھر اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ کی حرارت، میرے ہاتھ کے راستے پورے وجود میں پھیلتی چلی جا رہی ہو۔ مجھے اپنے اندر ایک نئی توانائی اور ایک نئے حوصلے کا احساس ہوا۔

''میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کایا کو بھول جائیں۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ ''ہاں، یہ ضرور تجویز کروں گا کہ جانے والی کی یادوں کو اپنے حواس پر طاری ہونے کا موقع فراہم نہ کریں کیونکہ آپ کے سامنے ایک طویل اور کٹھن سفر کی راہ گزر بچھ چکی ہے۔ آپ کو کسی بھی حال میں اور کسی بھی قیمت پر اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا۔''

''جی سر..... میں سمجھ گیا۔'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''میں آپ کی نصیحت پر لازمی عمل کروں گا۔ آپ میرے گرو ہیں۔ آپ کی بات ماننے ہی میں میری بھلائی ہے۔''

''یہ آپ کا بڑپن ہے جو میرے لیے ''گرو'' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔'' جی ایم سر کی مخصوص سرگوشی نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ ''ورنہ میں نہ تو آپ کا گرو ہوں اور نہ ہی آپ میرے چیلے ہیں۔ ہاں، اس امر میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔''

''آپ کی ذات سے جڑنے والا ہر تعلق مجھے عزیز ہے سر۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔ ''آپ نے میری زندگی کو ایک نئے ڈھب پر ڈال دیا ہے مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....''

''کون سی بات؟''

''آپ نے ادھر کراچی میں بتایا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ آپ بہت جلد پاکستان کو خیر باد کہہ کر چین چلے جائیں گے اور زندگی کا باقی حصہ چین ہی میں گزاریں گے لیکن آپ تو اس وقت نیوزی لینڈ میں ہیں اور ہماری ملاقات بھی جاری ہے۔''

''ایک انسان کا اختیار ہے اور ایک مالک کا اختیار ہے۔'' جی ایم کھلاڑی کی دھواں دھار بیٹنگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے مجھے بتانے لگے۔ ''یہ میری خواہش تھی کہ میں

اپنی عمر کا آخری حصہ چین میں گزاروں مگر مالک نے میرے لیے کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا اور شاید آپ سے دوبارہ ملاقات کا سبب بھی یہی ہے اسی لیے میں اپنی زندگی کے آخری دن چین کے بجائے نیوزی لینڈ میں پورے کرنے والا ہوں اور یہ دن بھی گنے چنے رہ گئے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر....." میں نے تاسف سے ساختہ تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ بہ دستور سنسنی خیز میچ سے محظوظ ہوتے ہوئے بے حد سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "میرے پاس چند دن کی مہلت باقی ہے اور اسی مختصر سی مدت میں مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا اور بہت کچھ سمجھانا ہے۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو جائے گا..... اور میں بھی!"

"سر! پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔" میں نے دزدیدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ "دعا ہے کہ میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔"

ان کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا۔ میں سردست اس تاثر کو کوئی نام نہ دے سکا کیونکہ اس تاثر کے اندر غم اور خوشی ایک دوسرے کے اندر مدغم دکھائی دیتے تھے۔ میں دکھی دل کے ساتھ یک ٹک انہیں دیکھتا چلا گیا۔

"اسد علی!" ان کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "سب کی اپنی اپنی زندگی ہے اور کسی کی عمر کسی کو نہیں لگتی۔ انسان کو خواہش کرنے کا اختیار حاصل ہے مگر اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا اختیار صرف مالک کے پاس ہے۔ اوہ، یہ کیا ہو گیا.....!"

انہوں نے آخری جملہ بالکل بدلے ہوئے انداز میں ادا کیا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کیا ہو گیا سر؟"

"اس کا مطلب ہے، آپ کی توجہ میچ پر بالکل بھی نہیں ہے۔" انہوں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ان سے سوال وجواب کے دوران میں میچ پر سے میری توجہ واقعتاً ہٹ گئی تھی۔ اب جب میں نے میدان کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کا جائزہ لیا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں جی ایم سرکی اس کھلاڑی کی بیٹنگ میں دلچسپی کو خاص طور پر نوٹ کر چکا تھا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے سر۔" میں نے ندامت بھرے انداز میں کہا۔ "میری تمام تر توجہ آپ کی باتوں پر لگی ہوئی تھی۔"

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

فون آن 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

''اس میں بھی مالک کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔''
وہ خواب ناک لہجے میں بولے۔
میں چپ چاپ انہیں دیکھتا چلا گیا۔
انہوں نے جیب کے اندر سے ٹوکن نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس میچ کے ٹکٹ کا ٹوکن ہے ہم ادھورا چھوڑ کر جارہے ہیں۔ آپ انہیں اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیں۔''

بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی تقلید میں، میں نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ انہوں نے ان ٹکٹ کو ''سنبھال کر رکھنے'' کی بات کی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی حوالے سے ان ٹکٹ کو کوئی خاص اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور گردن جھکا کر خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆

رات نے اپنے سفر کا آغاز کردیا تھا۔ ماحول میں ایک خاص نوعیت کا سناٹا پایا جاتا تھا۔ میں اس وقت جی ایم سر کے ساتھ ایک ساحلی ہٹ میں موجود تھا۔ یہ ڈیفنس کا مضافاتی علاقہ تھا۔ یہاں پر بڑا سکون اور خاموشی تھی۔ ہمارے قرب وجوار میں کافی فاصلے تک کوئی دوسرا ہٹ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارا ہٹ اس ساحلی حصے میں بالکل الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ اسٹیڈیم سے نکلنے کے بعد ہم.....

نے ایک پرائیویٹ کار پکڑی تھی اور خاصی طویل ڈرائیو کے بعد اس رہائش گاہ تک پہنچے تھے۔

ہٹ کے اندر ضروریاتِ زندگی کی انتہائی لازمی اشیا موجود تھیں۔ میں نے گھوم پھر کر ہٹ کا جائزہ لیا تو جی ایم سر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ہماری آخری ملاقات کے لیے یہ جگہ خاصی موزوں ثابت ہوگی۔ یہاں پر دو افراد کے لیے کم از کم دس دن کی خوراک موجود ہے حالانکہ ہمیں تو یہاں پر دو چار روز ہی گزارنا ہیں۔''

جی ایم سر کے لہجے میں ایک خاص نوعیت کی معنی خیزی پائی جاتی تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں مجھے باور کرا چکے تھے کہ ان کی زندگی کے چند روز ہی باقی بچے ہیں۔ اس ہولناک خبر نے مجھے ملول کردیا تھا مگر ان کے چہرے پر بلا کا سکون نظر آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، انہیں اس دنیا سے رخصت ہونے کا اطمینان حاصل تھا۔ شاید یہ مالک سے ملاقات کی خوشی کا عکس تھا..... یہ یقین کہ وہ خالقِ حقیقی سے ملنے والے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا، کس لمحے میرا بلاوا آجائے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''ہاں، یہ مجھے اندازہ ہے کہ بس دو چار روز ہی کی انگلز باقی بچی ہے اور اس قلیل مدت میں، میں اپنے حصے کا کام لازمی مکمل کردوں گا۔ آپ نے میری ایک ایک بات کو توجہ سے سننا ہے۔ کچھ چیزیں میں زبان سے بیان کروں گا۔ انہیں آپ نے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا ہے۔ باقی کے معاملات میں مخصوص روحانی عمل سے پایۂ تکمیل تک پہنچادوں گا۔ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور کام ہوجائے گا۔''

''سر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا اشارہ کن معاملات کی طرف ہے؟'' میں نے نہایت ہی ادب سے پوچھا۔

''آپ مجھ سے ہر نوعیت کا سوال کرسکتے ہیں۔'' وہ چہرے پر..... مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولے۔ ''ہمارے بیچ ایک استاد اور شاگرد کا رشتہ ہے۔ میں باقی نہیں رہوں گا، تب بھی یہ رشتہ برقرار رہے گا۔ آپ کو کچھ محسوس ہوا؟''

بات کے اختتام پر انہوں نے استفسار کیا تو میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''مجھے کیا محسوس کرنا تھا سر؟''

''اس کا مطلب ہے، کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولے۔ ''میں نے کہا تھا نا، آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور کام ہوجائے گا.....!''

''آپ کا اشارہ کسی روحانی عمل کی طرف ہے سر؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے اسد علی!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولے۔ ''میں نے ابھی ابھی آپ کے اندر مالک کے حکم سے لوکیشن فائنڈر انسٹال کردیا ہے۔ آپ جب بھی اپنے دل پر توجہ مرکوز کرکے کسی بھی انسان کا تصور کریں گے تو آپ کو مذکورہ شخص کی لوکیشن اور اس کے ماحول سے شناسائی حاصل ہوجائے گی۔ آپ جس بھی مسئلے کے حوالے سے غور وفکر کریں گے، تھوڑی ہی دیر میں اس مسئلے کا حل مل جائے گا۔''

''اوہ..... یہ تو کمال ہوگیا۔'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''واقعی مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔''

''روحانی معاملات میں اسی طرح عطا کیا جاتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''ایسے کاموں میں وقت نہیں لگتا۔ روحانی معاملات وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ زمان ومکاں بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ سائنس کی ریسرچ کے مطابق اس کائنات میں سفر کرنے والی سب سے تیز رفتار چیز روشنی ہے جو تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور روح.....'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''روح کی رفتار، روشنی کی بہ نسبت ناقابلِ تصور گنا زیادہ ہے۔ کسی مردِ حق کی ایک نگاہ انسان کی دنیا پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کہیں آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے.....؟''

''نہیں سر..... بالکل نہیں۔'' میں نے بڑی سرعت سے گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میرے لیے ایک بیش بہا اور گراں قدر سرمایہ ہے۔ ان لمحات میں، میں خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت لکی ہیں۔'' وہ مجھے جاذب نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے آپ کے اندر جس روحانی شعبے کا بیج بویا ہے اس کی آبیاری آپ ہی کو کرنا ہوگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی صلاحیتوں میں نکھار آتا جائے گا۔ بس اپنی لگن کو کم نہیں ہونے دینا۔ لگن کے بغیر روحانی دنیا میں کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا..... لگن اس نگری کا پہلا دروازہ ہے۔''

''میں آپ کی باتوں کی گہرائی کو سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں آپ کی نصیحت پر من وعن عمل کروں گا۔''

''انسان کے پاس پانچ ظاہرہ حواس ہیں جنہیں حواسِ خمسہ بھی کہا جاتا ہے۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''ان حواس کو انسان کا دماغ کنٹرول کرتا ہے اور ان کا تعلق انسان کی مادی زندگی سے ہے جبکہ انسان کے پاس گیارہ حواسِ باطنہ یا حواسِ روحی بھی ہیں جنہیں انسان کی روح آپریٹ کرتی ہے اور یہ ہماری روحانی زندگی سے متعلق ہیں اور..... روح کا گھر انسان کا دل ہے اسی لیے..... اسی لیے میں دل کو مرکزِ توجہ بنانے پر زور دیتا ہوں۔''

''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں سر.....'' میں نے کہا۔

''بینا کو پروٹیم خطل کر دیا گیا ہے۔'' وہ اچانک گفتگو کا اسٹیئرنگ ''اسکل اینڈ بونز'' کی طرف موڑتے ہوئے بولے۔ ''سوسائٹی جان گئی تھی کہ آپ کایا کے ساتھ، بینا کی تلاش میں مملیورن جانے کا ارادہ رکھتے ہو اس لیے انہوں نے بینا کا مقام بدل دیا ہے.....''

''اور شارو.....؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ استفسار کیا۔

''شارو ابھی تک بویریا ہی میں ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اسے سوسائٹی والوں نے میوخ کے اندر بڑی کڑی نگرانی میں رکھا ہوا ہے کیونکہ میوخ سوسائٹی کی نظر میں ان کا ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے جہاں ان کی مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا مگر آپ کے اندر ایسا کر گزرنے کی صلاحیت، ہمت اور ولولہ موجود ہے۔ آپ اگر چاہیں تو سوسائٹی والوں کی خوش فہمی کے غبارے سے ہوا نکال سکتے ہیں اور میرے خیال میں آپ کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔''

''سر! میں سمجھ گیا۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ کا مشورہ یہ ہے کہ فی الحال مجھے بینا کو بھول کر شارو کے حصول پر توجہ دینا چاہیے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''بینا آپ کے عشق کے بخار میں مبتلا ہے۔ وہ خود ہی کسی نہ کسی طرح آپ کو تلاش کر لے گی۔ آپ کو شارو کے حصول پر فوکس کرنا ہوگا۔ کایا کی موت کا حساب بھی تو چکانا ہے آپ کو..... ناقابلِ تسخیر قلعے میوخ میں سیندھ لگا کر دشمن کے دانت کھٹے کیے جاسکتے ہیں۔ دوست ہو یا دشمن، قرض کی ادائی میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی اسد صاحب!''

''ہوں.....'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''میں آپ کے اندر کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ گہری نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مستفسر ہوئے۔ ''کیا پریشانی ہے؟''

''پریشانی تو نہیں، ایک الجھن ہے سر.....'' میں نے کہا۔

انہوں نے پوچھا۔ ''کیسی الجھن؟''

جواب میں، میں نے انہیں تفصیلاً بتایا کہ کس طرح سوسائٹی والے میری لوکیشن کے بارے میں جان جاتے ہیں۔ میں نے انہیں بیش قیمت سوئس گھڑی کے حوالے سے بھی آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔

''میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا کہ وہ کس ذریعے سے مجھے

Digitized by Google

ٹریک کر لیتے ہیں۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو میں شارو تک کیسے پہنچ پاؤں گا.....؟"

"نمبر ایک۔ یہ صورتِ حال برقرار نہیں رہے گی لہٰذا آپ شارو تک لازمی پہنچ جائیں گے۔" انہوں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "نمبر دو۔ وہ لوگ کس ذریعے سے آپ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اس پر ہم، نمبر تین پر بات کرنے کے بعد گفتگو کریں گے۔"

"اور نمبر تین کیا ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"نمبر تین ایک دلچسپ سوال ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔ "پہلے آپ اس سوال کا جواب دیں پھر ہم آگے بڑھیں گے۔"

"جی ضرور..... آپ پوچھیں۔" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

انہوں نے پوچھا۔ "کایا کی موت سے اب تک کتنا وقت گزر چکا ہے؟"

"کم و بیش بارہ گھنٹے۔" میں نے کہا۔

"کیا ان بارہ گھنٹوں میں سوسائٹی والوں نے آپ کو ٹریک کرنے میں ایک بار بھی کامیابی حاصل کی؟" انہوں نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دریافت کیا۔

"نن..... نہیں....." میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیا آپ جانتے ہیں، ایسا کیوں ہوا؟"

"بالکل نہیں جانتا سر.....!"

"آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ آج کون سا دن اور کون سی تاریخ ہے؟" وہ مجھے گہری نظر سے تکتے ہوئے بولے۔

"آج ہفتے کا دن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور تاریخ ہے، دو اگست۔"

"اور سال.....؟"

"دو ہزار چودہ۔" میں نے بتایا۔

"آپ نے صرف دن کا درست اندازہ لگایا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ "باقی تاریخ، مہینا اور سال سب کچھ غلط بتایا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر.....؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"میں تو یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آج ہفتے کا دن اور تاریخ اکتیس جنوری، دو ہزار پندرہ ہے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر....." میری الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ "آپ تو سیدھا سیدھا چھ ماہ آگے کا احوال بیان کر رہے ہیں۔"

"میں نے وہی کہا جو حقیقت ہے۔" ان کے ہونٹوں پر دکھائی دینے والی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "اور میں اپنی کہی ہوئی بات کو سچ بھی ثابت کر سکتا ہوں۔"

"ممکن....." میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکی۔ "یہ نہیں ہو سکتا سر۔ آپ مجھے ثابت کر کے دکھائیں....."

آخری جملہ میں نے قدرے ضدی لہجے میں ادا کیا تھا۔ وہ متحمل انداز میں بولے۔

"ثبوت تو آپ نے اپنی جیب میں چھپا رکھا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں سر!" میری آواز سے حد درجہ حیرانی ٹپکتی تھی۔

"میں نے آپ کو میچ کے ٹکٹ سنبھال کر رکھنے کو کہا تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ "کہا تھا یا نہیں.....؟"

"بالکل کہا تھا سر۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "مذکورہ دونوں ٹکٹ اس وقت بھی میری جیب میں موجود ہیں۔"

"تو انہیں نکال کر چیک کریں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "ثبوت آپ کو مل جائے گا۔"

پھر انہوں نے دھیمی آواز میں ٹی وی آن کر دیا اور دوبارہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ اس دوران میں، میں نے اپنی جیب میں سے وہ دونوں ٹکٹ نکال لیے تھے۔ جب میں نے ان ٹکٹ پر درج تاریخ دیکھی تو میں چکرا کر رہ گیا۔ جی ایم سر کے بیان کے عین مطابق آج اکتیس جنوری، دو ہزار پندرہ تھی۔ میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا اور سٹپٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیسے ہو گیا سر.....؟"

انہوں نے انگلی سے ٹی وی کی جانب اشارہ کیا اور بولے۔ "ڈیٹ کی کنفرمیشن کے لیے آپ اس نیوز چینل کے زیریں چھوٹے سے مستطیل باکس کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے میکانکی انداز میں ٹی وی اسکرین کا جائزہ لیا تو جی ایم سر کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ میں بیٹھے بٹھائے چھ ماہ آگے پہنچ گیا تھا۔ اس نوعیت کے عجوبہ واقعات "ٹائم مشین" نامی فکشن ناولز اور موویز میں تو نظر آتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں، میں پہلی بار اس قسم کے سنسنی خیز تجربے سے گزر رہا تھا۔

"اس راز سے پردہ اٹھائیں سر۔" میں نے بے حد

بیجانی انداز میں کہا۔ ''کیا میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا.....؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ پوری توجہ سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے بھی ٹی وی اسکرین پر نگاہ جمادی۔ اس نیوز چینل پر اسپیس لیس کے حوالے سے ایک اہم نیوز چل رہی تھی۔ انتہائی مختصر الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جی ایم سر کے اندازے کے مطابق پاکستان یہ میچ ہار گیا تھا۔

''اس راز کا تعلق ''ٹائم اینڈ اسپیس'' سے ہے۔'' وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''اس کی تفصیل میں آپ کو کل اس وقت بتاؤں گا جب آپ ایک بھرپور نیند لینے کے بعد، ایک دم فریش ہو چکے ہوں گے۔ سردست آپ کی ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے مختصراً بتا دیتا ہوں۔''

اس کے بعد انہوں نے ٹی وی کو آف کردیا پھر دوبارہ میری جانب متوجہ ہوگئے۔ میں اپنی سماعت کی تمام تر توانائی کے ساتھ انہیں سن رہا تھا۔ وہ بولے۔

''ٹائم اینڈ اسپیس کا معاملہ اس کائنات کے اسراروں میں سے ایک ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی روحانی قوت کے طفیل ٹائم یعنی وقت پر قدرت حاصل کرلے تو اسپیس یعنی فاصلے بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ آپ دن یا رات میں کسی وقت تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش بیٹھا کریں۔ اس سے انسان کی باطنی قوتیں متحرک ہوجاتی ہیں۔''

''ضرور.....سر! میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔'' میں نے اطاعت مندی سے کہا۔

''ایک بات نوٹ کرلیں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولے۔ ''خاموشی سے بڑی کوئی عبادت نہیں۔ خاموشی انسان کا ایک ایسا عمل ہے فرشتہ جسے لکھ نہیں سکتا، شیطان اسے بگاڑ نہیں سکتا اور اللہ کے سوا کوئی اسے جان نہیں سکتا۔ خاموشی اختیار کرنے والا شخص مالک کے قریب ہوجاتا ہے۔ گہری خاموشی کے بطن سے تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔''

''میں نے نوٹ کرلیا سر۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''آپ ایک خوش قسمت انسان ہیں کہ میرے توسط سے مالک نے آپ کو چھ ماہ کی مہلت عنایت کردی۔ اس عرصے کے دوران میں آپ نے خود کو اندر اور باہر سے مزید مضبوط بنانا ہے۔ اس کے بعد ایک جامع منصوبے کے ساتھ شاروکی جانب پیش قدمی کرنا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے، ان چھ ماہ میں سوسائٹی کی جانب سے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''وہ لوگ آپ سے چھ ماہ پیچھے سانس لے رہے ہیں۔'' جی ایم سر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ یہ چھ ماہ کا عرصہ آپ کو ایک بونس کے طور پر ملا ہے۔ اس دوران میں آپ نے کس نوعیت کی تیاری کرنا ہے اس کی تفصیل بھی میں آپ کو کل ہی بتاؤں گا۔''

''میں یہ بات جانتا ہوں کہ سوسائٹی کے کرتا دھرتا قدیم اور جدید دونوں اقسام کے علوم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ لوگ میری تلاش میں ''ٹائم اینڈ اسپیس'' والی سائنس کا استعمال نہیں کرسکتے؟ کیا وہ چھ ماہ آگے آکر مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے.....؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ دو ٹوک انداز میں بولے۔ ''یہ وصف صرف پاکیزہ روحوں ہی کو عطا کیا جاتا ہے۔ ایسے انسان مالک جن سے خوش ہوتا ہے، جنہیں اپنا دوست رکھتا ہے جبکہ.....'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''جبکہ اسکل اینڈ بونز ہو یا ایلومیناتی ہو یا کوئی اور ڈارک سیکرٹ سوسائٹی ہو..... یہ سب شیطان کے پجاری ہیں۔ ان کے مطابق اس کائنات کا خالق و مالک ابلیس ہے اسی لیے یہ اس کی پرستش کرتے ہیں لہٰذا اس کی عطا کردہ شیطانی قوت کے طفیل یہ انسانی سوچ کو مسخر کرکے ان کے ذہنوں پر قابض ہوجاتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس وقت دنیا کے ننانوے فیصد میڈیا ہاؤسز بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی سوسائٹیز کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ جو شخص میڈیا سے جتنا دور ہے، اس کی زندگی میں اتنا ہی زیادہ سکون ہے۔''

''سر! کیا شیطان کے ان پیروکاروں کا خواب پورا ہوجائے گا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''مطلب یہ کہ کیا یہ پوری دنیا کے حاکم بن کر زمینی خدا کہلانے کے قابل ہوجائیں گے؟''

''کبھی نہیں!'' انہوں نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ ''اس دنیا اور اس دنیا کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چاہے قبالہ ہی کیوں نہ ہو، جادو کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں مگر اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔''

''یہ قبالہ کیا بلا ہے سر؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''قبالہ (Qabbalah) ایک قدیم مصری جادو

ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''فری میسن یہودی اس کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسی جادو کے زور پر لاکھوں من وزنی پتھروں کی مدد سے اہرامِ مصر تعمیر کیے تھے اور آج کل اس جادو کے ذریعے انسانوں کے ذہن کو تسخیر کرنے کا عمل جاری ہے۔''

''سر! آپ کی باتوں نے میرا ذہن صاف کر دیا ہے۔'' میں نے بصد احترام کہا۔ ''میں سوسائٹی کی اصلیت کی تہ میں اتر گیا ہوں۔''

''آپ کا دل تو پہلے ہی صاف تھا۔ اچھا ہوا جو ذہن بھی صاف ہو گیا۔'' انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''جب انسان کا ذہن صاف ہو جائے تو وہ بہت سکون محسوس کرتا ہے۔ پھر اسے نیند آنے لگتی ہے۔ آپ بھی سو جائیں، باقی باتیں کل کریں گے۔''

میں بلا چون و چرا جی ایم سر کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی روشن اور سہانی تھی اور موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ساحلی پٹی پر بنا ہوا یہ الگ تھلگ ہٹ بہت پُرسکون اور فرحت بخش تھا۔ میں نے جی ایم سر سے اس ہٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ ہمارے درمیان اتنے سنسنی خیز معاملات ڈسکس ہو رہے تھے کہ ان چھوٹی موٹی باتوں کی جانب میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ مجھے لے کر بیٹھ گئے۔ آج پرانے حساب کے مطابق تو تین اگست، دو ہزار چودہ ہونا چاہیے تھی مگر اب میری زندگی کا نیا کھاتا کھل چکا تھا لہٰذا نئے حساب کی روشنی میں آج یکم فروری، دو ہزار پندرہ تھی اور یہ چمتکار جس شخص کے توسط سے ہوا تھا اس کا نام تھا غلام مصطفیٰ المعروف بہ جی ایم سر.....!

میں اس نادرِ روزگار شخص کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا کہ انہوں نے بولنا شروع کیا۔

''موت ایک اٹل حقیقت ہے اور کوئی بھی ذی روح اس سے بچ نہیں سکتا مگر اس ذیل میں ایک نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ موت کا تعلق انسان کے مادی جسم سے ہے۔ انسان کا جسم مرتا ہے، روح نہیں بلکہ وہ کہیں نہ کہیں مصروفِ عمل بھی رہتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کے فلسفے کو سمجھنا ضروری ہے.....''

اس کے بعد انہوں نے ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کے موضوع پر ایک طویل لیکچر دیا جس میں ٹیکنیکل نوعیت کی چیزیں زیادہ تھیں۔

جی ایم سر ایک بیگ اٹھا لائے۔ وہ ایک سوٹ کیس ٹائپ کا بیگ تھا جسے کھولتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔

''میں نے ظاہری اور باطنی طور پر آپ کو جو کچھ سکھا دیا ہے اس سبق کو ہمیشہ یاد رکھنا ہے۔ رفتہ رفتہ آپ کو اپنی فیلنگز سے کام لینے میں مہارت حاصل ہو جائے گی پھر بہت سی مشکلات خود بخود آسانی میں بدل جائیں گی۔ آپ کو جو چھ ماہ کی مہلت میسر کی گئی ہے اس میں آپ نے خود کو ری بورن کرنا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟''

لمحاتی توقف کر کے انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

''اور یہ کام آپ نے اسپین کے شہر بارسلونا میں کرنا ہے۔''

''بارسلونا.....'' میں نے تعجب خیز نظر سے انہیں دیکھا۔ ''لیکن میں تو اس وقت نیوزی لینڈ کے شہر ویلنگٹن میں بیٹھا ہوں!''

''یہاں پر آپ کا قیام دو تین روز کا ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولے۔ ''پھر آپ کو اسپین روانہ ہو جانا ہے۔'' پھر انہوں نے سوٹ کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سفر اور بارسلونا میں قیام کا مکمل بندوبست اس کے اندر موجود ہے۔''

اس کے بعد وہ بیگ کے اندر رکھی چیزوں سے مجھے آگاہی دینے لگے۔ مذکورہ سوٹ کیس میں چند جوڑی کپڑوں کے علاوہ بہت اہم دستاویزات بھی موجود تھیں جن میں میرا آئی ڈی کارڈ، پاسپورٹ، ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر انتہائی ضروری کاغذات تھے جن کے مطابق میں بارسلونا کا رہائشی تھا اور پیشے کے اعتبار سے میں ایک بینک ماہرِ نفسیات تھا۔ میری عمر پچیس سال تھی اور میں ابھی تک بیچلر تھا۔ میں نے بارسلونا کے ایک اسپتال میں آن لائن اپلائی کیا تھا جس کا جواب مثبت آیا تھا یعنی بارسلونا پہنچتے ہی مجھے اسپتال جوائن کرنا تھا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!

میں نے ان ٹھوس معلومات کے جواب میں سوالیہ نظر سے جی ایم سر کی طرف دیکھا تو انہوں نے پوچھا۔ ''آپ یہ رول کر لیں گے نا؟''

''ضرور کر لوں گا سر!'' میں نے پورے تیقن سے

جواب دیا۔ ''اسپینش میں لکھ، بول اور سمجھ لیتا ہوں، سائیکالوجی میرا شعبہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کردار بہ آسانی نبھالوں گا۔ بس، ہیئر اسٹائل تبدیل کرنا ہوگا۔''

''ہیئر اسٹائل انسان کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ آپ کو اپنی آئی ڈی کے مطابق صرف ہیئر اسٹائل میں تھوڑی تبدیلی لانا ہوگی البتہ کلر تاڈھر نیوزی لینڈ ہی میں کرنا ہوگا۔ آپ کسی بھی سیلون میں جاکر اپنے بالوں کو کرلی (گھنگرالے) کروا سکتے ہیں۔ گھنگرالے بالوں کے ساتھ آپ کی شخصیت میں نمایاں فرق محسوس ہوگا اور اپنی عمر سے تین چار سال بڑے بھی لگنے لگیں گے اور یہی آپ کی دستاویزات کا تقاضا بھی ہے۔ ان ڈاکیومینٹس کے مطابق آپ پچیس سال کے ایک ماہر نفسیات ہیں۔''

''جی سر! میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''انشاءاللہ! میں اس نئے کردار کو بڑے بھرپور انداز میں نبھاؤں گا۔''

''مالک آپ کو ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔'' انہوں نے صدقِ دل سے مجھے دعا دی۔ ''میں آپ کی کامیابی کا تمنائی ہوں۔''

بات کے اختتام پر وہ کچھ اداس ہوگئے۔ ممکن ہے، یہ میرا وہم ہو۔ ہوسکتا ہے، مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو لیکن میں نے ان کے چہرے پر ایک حزنی رنگ آتا دیکھا تھا جیسے ان کے اندر کوئی روشن چراغ پھڑ پھڑا کر بجھ گیا ہو۔ شاید یہ مجھ سے جدائی کا کوئی انداز تھا۔

''آپ کا تعلق اسپین کی مڈل کلاس سے ہے۔'' وہ بوجھل آواز میں بتانے لگے۔ ''اسی تکنے کو مدنظر رکھتے ہوئے بارسلونا میں آپ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے کردار کو نبھاتے ہوئے ان تمام امور کا خیال رکھنا ہے۔''

''میں معاملے کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا اور کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''شاباش!'' انہوں نے سراہنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ''اس وقت پوری دنیا سی سی ٹی وی کیمروں پر ہے اور یورپ تو کچھ زیادہ ہی..... اس لیے بھی آپ کو پھونک پھونک کر بڑی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا ہے۔ جب تک یہ چھ ماہ مکمل نہیں ہوجاتے، آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی احتیاط کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔''

''سی سی ٹی وی کیمرز کے سسٹم بلکہ ان کے نیٹ ورک کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں سر۔'' میں نے کہا۔ ''یہ چوبیس گھنٹے ریکارڈنگ پر رہتے ہیں۔ کسی بھی شہر کے مختلف حصوں کی ریکارڈنگ کنٹرول روم میں محفوظ ہوتی ہے۔''

''پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ خود کو جتنا کم الجھائیں گے، کامیابی کے امکانات اتنے ہی زیادہ روشن ہوں گے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ذہن کو ادھر ادھر بھٹکانے کے بجائے صرف اور صرف اپنے مقصد پر نظر رکھوں گا۔''

''گڈ!'' انہوں نے ستائشی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ ''مجھے آپ سے ایسی ہی توقع ہے۔ میری نظر میں آپ مالک کے سپاہی ہیں جو شیطانی لشکر کی صفوں میں گھس کر انہیں تہس نہس کر ڈالے گا۔ جو لوگ مالک کی راہ میں نکلتے ہیں، مالک ان کی نصرت کا ضامن بن جاتا ہے۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔''

پھر وہ مجھے ان چھ ماہ میں میری ذمے داریوں کے بارے میں بتانے لگے۔ میں پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جس وقت وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے پوچھ لیا۔

''سر! آپ مجھے چھ ماہ آگے لے آئے ہیں اور آپ کے کہنے کے مطابق باقی دنیا اس وقت مجھ سے چھ ماہ پیچھے ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ جب میں بارسلونا میں رہائش اختیار کروں گا اور وہاں کے ایک اسپتال میں ماہر نفسیات کی حیثیت سے کام کروں گا تو کیا اسپین اس وقت دو ہزار پندرہ میں ہوگا یا باقی دنیا کے ساتھ دو ہزار چودہ میں؟''

''آپ نے بہت ہی اہم سوال کیا ہے اور میں آپ سے ایسے سوال کی توقع بھی کر رہا تھا۔'' انہوں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ ''یہ بہت ہی حساس اور نازک معاملہ ہے۔ اسے نہایت ہی توجہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے وہ مجھے سوچتی ہوئی نظر سے دیکھتے رہے پھر سمجھانے والے انداز میں بولے۔

''باقی تمام دنیا بشمول اسپین اس وقت اگست دو ہزار چودہ ہی میں ہے۔ صرف آپ کو ایک خاص روحانی عمل سے چھ ماہ آگے لایا گیا ہے۔ جو کرکٹ میچ آپ نے دیکھا وہ بھی

Digitized by Google

چھ ماہ کے بعد ویسٹ پیک اسٹیڈیم میں ہونا ہے۔ آپ چھ ماہ تک بارسلونا میں ماہر نفسیات کا جو کردار کریں گے وہ بھی چھ ماہ بعد کا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کسی ڈرامے کا بعد والا اپی سوڈ پہلے شوٹ کیا جارہا ہے۔ آپ کا یہ کردار واقعتاً چھ ماہ کے بعد بارسلونا کے اس اسپتال میں ایک نیورو ماہر نفسیات سے اُلجھ رہا ہے گا۔ نہایت ہی آسان الفاظ میں یہ سمجھ لیں کہ آپ کے احساس کو چھ ماہ کے لیے آنے والی دنیا میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں آپ تو سب کو دیکھیں گے اور محسوس کریں گے۔ دوسرے بھی آپ کو دیکھیں اور محسوس کریں گے مگر وہ چھ ماہ بعد کا زمانہ ہوگا۔ جیسے ہم اپنی نیند کے دوران میں کسی خواب کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن آنکھ کھلنے کے بعد ہم اپنے ماحول اپنے زمانے میں واپس آجاتے ہیں۔ آپ بھی جیتی جاگتی آنکھوں کے ساتھ چھ ماہ بعد کے زمانے کا ایک خواب دیکھیں گے۔ وہاں سب کچھ آپ کے لیے نیا ہوگا۔ جب یہ مدت پوری ہوگی تو آپ کا خواب بھی اختتام پذیر ہوجائے گا۔ آپ زمانے کے ہم رکاب ہوجائیں گے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چھ ماہ کے بعد جب میں موجودہ زمانے کا حصہ بن جاؤں گا تو میں بارسلونا کے مذکورہ اسپتال میں جاکر اس اصلی نیورو ماہر نفسیات سے ملاقات کرسکتا ہوں جس کا کردار مجھے کرنا ہے؟'' میں نے جی ایم سر سے پوچھا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''اگر آپ ایسا چاہیں گے تو یقیناً اور..... اگر آپ اکتیس جنوری دو ہزار پندرہ والا ون ڈے کرکٹ میچ دوبارہ دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو یہ بھی ممکن ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو ویلنگٹن کے ویسٹ پیک اسٹیڈیم تک جانے کی زحمت گوارا کرنا ہوگی۔ ایک لحاظ سے یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے لیکن اگر آپ ڈرامے کی مثال پر غور کریں گے تو سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ آپ فرض کرلیں کہ کسی ڈراما سیریل کے لاتعداد اپی سوڈ ہیں اور اس ڈرامے کا چھ ماہ بعد چلنے والا اپی سوڈ آپ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور آپ اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اس اپی سوڈ میں آپ کا ایک کردار بھی ہے۔ آپ چھ ماہ بعد چلنے والے اپی سوڈ کی کہانی سے قبل از وقت نہ صرف واقف ہوجاتے ہیں بلکہ اس میں اپنے حصے کا کردار بھی نبھا آتے ہیں۔''

''سر.....'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔''

''جس بھی شے پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے اس کی چولیں لازمی ہل جاتی ہیں۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آپ اپنے دماغ پر اتنا زیادہ دباؤ ڈالتے ہی کیوں ہیں۔ جب دل ہے تو پھر دماغ کا بے دریغ استعمال کیوں.....؟''

یہ بات وہ متعدد بار مجھے سمجھا چکے تھے کہ مجھے دماغ کے بجائے دل سے زیادہ کام لینا چاہیے۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔

''سر! آپ نے ابھی تک میرے ایک سوال کا جواب نہیں دیا۔''

کون سا سوال؟'' انہوں نے استفسار یہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''نمبر دو کا جواب..... یعنی سوسائٹی کے لوگ کس طرح اب تک مجھے ٹریک کرتے رہے ہیں۔ آپ نے کہا تھا، اس پر ہم نمبر تین کے بعد گفتگو کریں گے۔ نمبر تین کا سلسلہ تو ختم ہوچکا۔ اب آپ نمبر دو کا جواب دیں.....!''

قبل اس کے کہ جی ایم سر میرے سوال کے جواب میں کچھ کہتے، ہٹ کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر سر کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر مجھے اطمینان اور سکون نظر آیا۔

''یہ کون ہوسکتا ہے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''میرے خیال میں سرجن آگیا ہے۔''

''سرجن.....؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کسی سرجن کا اس ہٹ میں کیا کام.....!''

جی ایم سر کے الفاظ نے میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ انہوں نے میرے استفسار کا جواب نہیں دیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ ہٹ کے بیرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔

میں حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ آناً فاناً میں وہ مجھے سخت اضطراب کر گئے تھے۔

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

ہلاکت

انجم فاروق ساحلی

اکثر دیکھنے میں آیا ہے دوستی کا جذبہ غلط سمت چلنے والے مسافروں کے درمیان جب پنپتا ہے تو بڑی دیر تک جڑیں مضبوطی سے پھیلاتا ہے اور چاہے جو بھی ہو جائے یہ دوست اپنی وفاداری کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ بھی اگرچہ جرائم کی دنیا میں بہت بدنام تھے مگر آپس میں مخلص دوست بھی تھے اور ان کی وفاداری ایک دوسرے کی پردہ داری سے مشروط تھی۔

ایک خونی واردات کا حساب لینے والے بے لوث

دوست کی جی داری

ہینک کی تدفین کا بندوبست میں نے کیا تھا۔ لاشعوری طور پر میں ان کوتاہیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا جو اس کی زندگی میں مجھ سے سرزد ہو چکی تھیں۔ ہینک مخلص اور بہترین دوست تھا۔

میں نے اس کی تدفین کے لیے شہر کے بہترین گورکن کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ایک شاندار تابوت خریدا تھا۔ جس پر سفید دھاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنی پوری پھولوں کی دکان اس پر نچھاور کر دی تھی۔ ماتمی گیت کے لیے شہر کے مشہور ترین طائفے کا بندوبست کیا اور آخری رسومات ادا کرنے کے لیے ایک ایسے پادری کو بلوایا جو آکسفورڈ لہجے میں وعظ کہنے پر قادر تھا۔

میں نے اس خاص تقریب کے لیے ایک نیلا سوٹ

خرید لیا حالانکہ میں بھورے رنگ کا لباس پسند کرتا تھا۔ یہ حادثہ جانکاہ تھا۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ میں خشک آنکھیں لیے ماتمی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوٹ کے نیچے بغل میں دبا ہوا میرا پستول پسلیوں میں چبھ رہا تھا مگر دل میں دوست کی جدائی کے غم کی چبھن اس سے کہیں زیادہ تھی۔ میں سخت دل واقع ہوا ہوں یا نہیں لیکن میری زندگی کا ایک بڑا عرصہ میدانِ جنگ میں گزرا ہے، جہاں مارنا یا مرجانا کھیل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، مگر جب گرجا گھر میں ماتمی موسیقی کی مدھم آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں سوز و گداز اور رقت و یاس کا سمندر موجزن ہو گیا ہو۔ ہینک کے دوسرے دوست قطار بنائے ایک ایک کر کے اس کے تابوت کے پاس سے گزرنے لگے

وہاں وائی کنگ کی طرح دراز قد، سنہرے بالوں والا..... ڈیڈرکسن تھا اور ہیمی پریسیو بھی، خدا اسے غارت کرے۔ وہ نفیس تراش کے سوٹ میں ملبوس، چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔ ان میں دلال اور جواری تھے، مکار آنکھوں اور خوفناک چہروں والے بدمعاش تھے اور میک اپ سے لتھڑے چہروں والی نرم و نازک عورتیں تھیں۔ یہ مختلف طبقوں کے وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ جنگ سے واپس آنے کے بعد ہینک نے اپنی زندگی گزاری تھی۔

پھولوں سے ڈھکے ہوئے جنازے کے لیے مخصوص چبوترے کے قریب ایسے بھی لوگ تھے جنہیں آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سارا منظر بڑا غیر حقیقی سا لگ رہا تھا، بالکل اس خیال کی طرح کہ ہینک کے کھلکھلاتے ہوئے قہقہے ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو گئے ہیں پھر میری نظر ایک دبلی پتلی بھوری آنکھوں والی حسین سی لڑکی پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس ٹھہراؤ کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ ان لوگوں سے اور اس ماحول سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔

وہ تابوت کے قریب رک گئی۔ بھورے کپڑے کے کوٹ میں وہ بے حد جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے سر پر تنکوں کا ایک نازک سا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں سے آتی ہوئی روشنی میں اس کے ہیٹ سے جھانکتے ہوئے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک نازک سا رومال دبا ہوا تھا۔ جب اس نے سر جھکا کر تابوت میں لیٹے ہینک کا آخری دیدار کیا تو رومال پر اس کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا پھر دو آنسو پلکوں کی دیوار توڑتے ہوئے اس کے سلگتے ہوئے رخساروں پر لڑھک گئے۔

میں بینچ سے اٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے گزری، میں نے دھیرے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور ہم باغ میں آ گئے جہاں نرم نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور فضا میں موسم گرما کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔

''ہینک! میرا بہت اچھا دوست تھا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''میرا نام ٹیری پاؤل ہے۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ کیا تم بھی اس کی دوست تھیں؟'' وہ چند لمحے خاموش رہی۔ میں اس کے ہونٹوں پر اتر آنے والی مسکراہٹ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ ایسی ہی بے ساختہ اور غم میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی، جبکہ اس کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔

''دوست سے ذرا زیادہ، میں اس کی بیوی تھی۔''

ہینک کی بہت سی باتیں تھیں جن سے میں بے خبر تھا۔ ''اس کی بیوی..... مگر کب سے؟''

''کافی عرصے سے، مگر اب تو یوں لگتا ہے، جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔'' اس کا مدھم لہجہ حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''آپ میری طرف سے متفکر نہ ہوں مسٹر پاؤل۔ ہم دونوں میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی موت کی خبر پڑھی تھی پھر میں نے سوچا کہ اسے الوداع کہہ آؤں۔''

میں اس کو ساتھ لیے گرجا گھر کے باغ کے کونے میں پڑی پتھر کی بینچ پر بیٹھ گیا جس پر درختوں نے سایہ کر رکھا تھا، شہر کے ہنگاموں کے برخلاف یہاں انتہائی سکون اور خاموشی تھی۔ گرجا کی کھڑکی کے ایک شیشے سے سورج کی شعاعیں منعکس ہو کر اس کے چہرے پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ میرا پستول پہلو میں چبھنے لگا۔

مجھے اس نے اپنا نام ملڈرڈ بتایا۔

بالکل اسی کی طرح پیارا سا نفیس نام تھا۔ وہ گلوکارہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

''ہمیں شادی کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ صرف دو ماہ ہوئے تھے کہ ہم میں علیحدگی ہو گئی۔'' اس کی آواز میں سحر تھا۔ ''لیکن اپنے دوست کو الزام نہ دینا، وہ بہت اچھا آدمی تھا۔''

''میں اسے الزام نہیں دے رہا۔'' پستول اب بھی

میرے پہلو میں چبھ رہا تھا۔ ''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''میں بھی یہی جاننا چاہتی ہوں، کاش مجھے ہینک کے قاتل کا نام معلوم ہو جائے۔''

''میں نے کبھی عورتوں کے محرکات یا ان کے جذبات کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ بظاہر اس کی بات میں سچائی نظر آ رہی تھی۔

''تم نے آخری بار ہینک کو کب دیکھا تھا؟'' میں نے نرمی سے دریافت کیا۔

''تقریباً دو ہفتے پہلے، وہ اس جگہ آیا تھا جہاں میں کام کرتی ہوں۔ وہ..... وہاں کچھ رقم لینے آیا تھا۔'' وہ کھڑی ہو کر رومال مروڑنے لگی۔ ''میری دلی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں، مسٹر پاؤل، وہ تمہارے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے تم سے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ محبت ہے، اگر میں کسی کام آسکوں تو.....؟''

''نہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا اور باغ کے گیٹ تک اس کے ساتھ گیا۔ میرے خیال میں ہینک کی موت کے غم کو ہم دونوں یکساں طور پر محسوس کر رہے تھے۔ گیٹ پر پہنچ کر وہ مڑی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دستانوں کے باوجود میں اس کی انگلیوں سے نکلتی حدت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''شاید میں تم سے پھر ملوں، تم کہاں کام کرتی ہو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ایکویٹر کلب میں۔'' وہ بولی۔ ''خدا حافظ۔''

میں اسے سڑک پر جاتا دیکھتا رہا۔ اچانک جیسے میرے گلے میں کوئی شے پھنس گئی، ایکویٹر کلب..... یہی پریسینو' ایکویٹر کلب کا مالک تھا۔

☆☆☆

تدفین کے بعد ڈیڈرکسن میری پھولوں کی دکان پر آ گیا اور خالی ٹوکریاں دیکھنے لگا۔ ان ساری ٹوکریوں کے پھول ہینک کی قبر کی زینت بن چکے تھے۔ ڈیڈرکسن مسکرایا۔ ایک مدھم سی غمزدہ مسکراہٹ۔ ''بڑی اچھی رخصتی کی ہے تم نے اس کی ٹیری، اگر اس اہتمام کی کوئی اور اہمیت ہے تو یقیناً ہینک کو جنت میں ٹھکانا ملا ہوگا۔ ان سب چیزوں پر کتنا خرچ آیا ہوگا؟''

''اس معاملے میں ڈالروں کا پیمانہ استعمال نہیں ہوتا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کسی سے کوئی حصہ لینا قبول نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

میں کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے دھاگوں اور پھولوں سے الجھ گیا۔ شعبۂ قتل کا انچارج بھی میرے قریب آ کر فریج پر کہنی ٹکائے کھڑا ہو گیا۔ ڈیڈرکسن، ہینک اور میں..... ہم تینوں فرانس میں نیشنل گارڈ کے ایک ہی گروپ کے ارکان تھے۔ اس وقت کیپٹن ڈیڈرکسن ہمارا کمانڈر ہوا کرتا تھا۔ میں اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا اور ہینک..... وہ نچلے درجے کا ایک معمولی رکن تھا مگر ہمارا دوست تھا اور کوئی خصوصیت اس میں تھی یا نہیں اس کے قہقہے بڑے کھنکتے ہوئے اور جاندار ہوا کرتے تھے۔''

''وہ مر چکا ہے۔'' ڈیڈرکسن نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اس قدر غم کرنے سے کیا فائدہ ٹیری، شاید یہی اس کے لیے بہتر تھا۔''

''بہتر؟'' میں زخمی بلی کی طرح پلٹ کر چلایا۔ ''کیوں بہتر تھا ڈیڈرکسن؟ کیا اس لیے کہ وہ ایک دو غیر قانونی کاموں میں ملوث تھا اور کسی کے لیے پیداگیری کا کام کرتا تھا؟ اس نے پستول چلانا کہاں سے سیکھا تھا؟ اب تم ہمارے سیلوٹ کے مستحق نہیں رہے ہو، کیپٹن! یہ فرانس نہیں ہے۔''

وہ بے حد سکون سے میری تلخ نوائی برداشت کر گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ ''میں بھی اسے پسند کرتا تھا۔ ہر وقت اور ہر کام کے لیے تیار رہنے والا..... بے حد زندہ دل۔ اس کے قہقہے اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب سینٹ لو کے باہر ہم پر اچانک حملہ ہوا تھا اور ہینک ایک ہاتھ سے فائر کر رہا تھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے ایک زندہ سور کو دبوچ رکھا تھا جو نہ جانے کہاں سے پکڑ لایا تھا۔''

''مجھے یاد ہے۔'' میں نے اپنے ذہن میں ماضی کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔

''اب میں قانون کا ایک محافظ ہوں ٹیری۔'' وہ اسی سکون اور سادگی کے ساتھ بولا۔ ''ہم اپنے دوستوں کو نہیں بدل سکتے لیکن وہ غیر قانونی حرکتیں کر کے زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔''

''نہیں رہ سکتا تھا؟ تو پھر اس کا مر جانا ہی اچھا تھا لیکن یہی پریسینو کیوں نہیں مرا آج تک؟ وہ تو برسوں سے غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہے۔''

''اس کا وقت بھی آ جائے گا۔'' ڈیڈرکسن کے لہجے

میں نرمی تھی۔ ''اس کی توقع سے کہیں جلد۔ میں نے صبح تمہاری بغل کے نیچے ابھار دیکھا تھا، مجھے علم ہے کہ تمہارے پاس پستول کا پرمٹ ہے مگر..... تم ایسا مت کرنا۔ پریسینو کو تم ہمارے لیے چھوڑ دو، یہ پولیس کا کام ہے۔''

''کیا یہ حکم ہے؟''

''تم جانتے ہو کہ میں تمہیں حکم نہیں دے سکتا ٹیری۔ کاش میرے پاس کوئی ایسا اختیار ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے مگر اس سے تمہیں پریشانیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

گینگسٹو کے دوران میں پھولوں کا ہار بنا تا جا رہا تھا۔

اس کے لہجے میں پوشیدہ درد محسوس کر کے میں نے ہار کاؤنٹر پر رکھا اور مڑ کر اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ میرے ذہن میں ہینک سے وابستہ تمام تر یادوں کا سیلاب امڈ آیا۔ ساؤتھمپٹن جاتے ہوئے جہاز کی ریلنگ کے سہارے کھڑا، مسکراہٹ سے تابناک چہرہ..... نارمنڈی کے چند گانے سے پہلے ہماری آخری مشترکہ سگریٹ نوشی۔ بیسٹون کے یخ بستہ میدان میں مجھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اس کا گھسیٹنا حالانکہ خود اس حالا بدن ایٹی ایٹ شیل کے ٹکڑوں کی وجہ سے زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ یہ دل گداز اور جاں سوز یادیں میرے دماغ میں آگ سی لگا رہی تھیں۔ میرا خون کھول رہا تھا اور غصے کے مارے آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ ''پریسینو'' میں دانت پیستے ہوئے غرایا۔ ''اس شہر کے لوگوں نے برسوں سے اس درندے کو پولیس کے لیے چھوڑ رکھا ہے، وہ دندناتا پھر رہا ہے، اس کی غنڈا گردی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ اگر تم اسے چند ماہ یا چند ہفتے پہلے باندھ دیتے تو ہینک آج زندہ ہوتا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ ہینک کسی وقت بھی ان بدمعاشوں سے اپنا رابطہ منقطع کر لے گا اور ایک قانون پسند شہری بن کر زندگی بسر کرے گا۔ میں اس سے مایوس نہیں ہوا تھا مگر اسے ایک تاریک گلی میں گولی مار دی گئی۔''

''وہ اب مر چکا ہے ٹیری!'' ڈیڈرکسن دھیرے سے بولا۔ ''اور اب مجھے تمہاری فکر ہے۔''

''میری فکر مت کرو۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے مجھے بندوقوں سے کھیلنا سکھایا ہے۔ شاید میں نے بکتر بند کار میں بیٹھے پریسینو سے کہیں زیادہ گولیوں کا سامنا کیا ہے اور ان سے بچ نکلا ہوں۔ کون جانے اب موت کس کا مقدر ہے اور تمہارے پاس کیا سراغ ہے؟ تم کیسے ثابت کر سکتے ہو کہ ہینک کا قاتل پریسینو ہے۔''

''ہم جانتے ہیں ٹیری، پولیس اتنی احمق نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھتے ہو۔'' وہ مڑا اور کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں چند ثانیوں تک اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور دکان بند کر دی۔ اب صبح پھول آنے کے بعد ہی کاروبار چل سکتا تھا مگر ہینک کا معاملہ توجہ کا مستقاضی تھا۔

☆☆☆

شکاگو پر سیاہ رات کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی کار ویسٹ میڈیسن کی طرف موڑ دی۔ یہ ایک انتہائی غلیظ علاقہ تھا۔ میلے کچیلے بچے گندی روشوں پر دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف سستی اشیا کی دکانیں تھیں جن میں کھانے پینے کا سامان اور سیکنڈ ہینڈ چیزیں بھری ہوئی تھیں، کہیں کہیں سستے ریسٹورنٹ اور ہوٹل تھے۔ پورے ماحول میں غلاظت اور تعفن رچا ہوا تھا۔

لوکل ٹرینیں جب شور مچاتی ہوئی گزرتیں تو مکانوں اور دکانوں کے کھڑکی دروازوں پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مائک کا پول روم لوکل اسٹیشن کے قریب نیم تاریک گلی میں واقع تھا۔ اس جگہ پر دو چار جوئے خانے اور قحبہ گری کے اڈے تھے۔ ہینک نے مجھ سے اس جگہ کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے کار گلی سے باہر روکی اور اتر کر پیدل اندر کی طرف چل دیا۔ جگہ جگہ کچرا اگلتے ہوئے ڈبے اور لکڑی کی پیٹیوں کا ڈھیر تھا۔

میں ایک بڑی سی پیٹی کے قریب جا کر رک گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہینک کو گولی ماری گئی تھی۔ وہاں پڑے ردی اخبارات میں سے چند ایک پر اب بھی ہینک کے خون کے دھبے چمک رہے تھے۔ میں تصور میں اسے وہاں پڑا ہوا دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت اپنا جو سوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کا کوٹ الٹ کر شانوں تک آ گیا تھا اور پشت میں گولی کا بھیانک سوراخ تھا، پولیس کو وہ اس حالت میں ملا تھا۔ میں مڑا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا پول کی طرف بڑھا۔

پول روم کے عقبی دروازے پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ یہ ایک طویل القامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ گھنی بھوؤں کے نیچے اس کی سیاہ آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک تنگ سا سوٹ پہن رکھا تھا اور منہ میں ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ اس کے بھاری جبڑوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا۔ ''کون ہو تم؟'' وہ غرایا۔ ''ہم نے یہ دروازہ آوارہ گردوں کے لیے نہیں کھول رکھا ہے۔'' میں نے اسے

Google

ہٹا کر پول روم کے اندر داخل ہونا چاہا مگر اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

''اتنی تیزی کی ضرورت نہیں۔'' اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ''مائیک اپنے گاہکوں کے سلسلے میں بہت محتاط ہے۔ ویسے تم اس گلی میں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ایک چوہے کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنے سر کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میں تمہیں ہٹاؤں، خود میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

اس نے خشونت بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی پھر تلخی سے مسکرا دیا۔ اس کے دانتوں پر تمباکو کی زردی جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بیج نکالا اور میرے سامنے کر دیا پھر اپنی فولادی انگلیاں میری کلائی میں گاڑ دیں۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔

''غنڈا گردی کرتے ہو؟'' وہ مضحکہ خیز انداز میں گویا ہوا۔ ''میں تم جیسے غنڈوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور یہ اس کا ثبوت ہے۔'' اس کا اچانک گھونسا میرے پیٹ پر پڑا اور میں دہرا ہو گیا۔ درد کے مارے میری جان نکلنے لگی۔ میں نے سیدھا ہونے کی کوشش کی تو میرے منہ پر ہتھوڑا سا پڑا اور میں لڑکھڑا گیا۔ میرے ذہن میں سناٹا سا چھا رہا تھا اور زمین اوپر کی طرف اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر پھر پیٹیوں پر جا گرا۔ وہ میرے اوپر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں طیش کے عالم میں حلقوں سے باہر ابل رہی تھیں۔

''ریفرٹی نام ہے میرا۔'' وہ آواز دباتے ہوئے گرجا۔ ''مغربی علاقے کا ہر بدمعاش میرے نام سے واقف ہے۔ اٹھو نالی کے کیڑے۔''

اس نے اپنا پیر میری پسلیوں پر جماتے ہوئے مجھے الٹ دیا۔ میں ایک پیٹی کا سہارا لے کر اٹھنے لگا۔ میرے ہاتھ اور پیروں سے جیسے کسی نے جان نکال لی تھی۔ میں پھر زمین پر لڑھک گیا۔ میرے ہونٹوں پر نمکین خون کا ذائقہ رچا ہوا تھا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ میں جان گیا کہ ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑنے والے ہیں۔

اسی وقت ایک لوکل ٹرین گزری اور ذہن کو سب بھلا گئی۔ اچانک میرے بدن میں خوف کی لہریں مچلنے لگیں۔ ایسا خوف اور اتنی دہشت میں نے فراس میں بھی محسوس نہیں کی تھی۔

ریفرٹی نے جھک کر میری گردن پکڑی اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔ میں کسی مردہ بلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرا پستول نکالا اور پھر ایک گھونسا جڑ دیا۔ ''مسلح ہو؟'' اس کے حلق سے غراہٹ نما قہقہہ نکلا۔ اس نے دوبارہ گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر درمیان میں کسی نے اس کی کلائی تھام لی اور اسے مجھ سے دور دھکیل دیا۔ میں پھر پیٹیوں پر جا گرا۔ میں خود کو ہوشیار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔ آنکھوں کے سامنے تاریک بادل سے پھیلے ہوئے تھے پھر بتدریج میری بصارت واضح ہونے لگی۔

وہ میرے اور ریفرٹی کے بیچ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے ریفرٹی کو گریبان سے پکڑا تو اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ میں نے آج تک اسے اتنا غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غصے کی شدت سے وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔

''خدا تمہیں غارت کرے ریفرٹی۔'' وہ زخمی شیر کی طرح دہاڑا..... ''اس سے پہلے کہ میں یہ بھول جاؤں کہ تم بھی ایک پولیس افسر ہو اور تمہارا بھیجا بکھیر دوں، بہتر ہوگا کہ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ یہ آدمی میرا دوست ہے۔'' وہ ہونٹ کاٹ کر اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈیڈرکسن پر اس سے زیادہ پیار مجھے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کے لہجے کی تڑ بجلی نے ریفرٹی کو کرزا دیا تھا۔ وہ ہاتھ نیچا کر کے ایک قدم پیچھے ہٹا اور اپنے کوٹ کی کریز درست کرنے لگا پھر اس نے ڈیڈرکسن کو بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھا۔ آخرکار ایک نفرت بھری نظر مجھ پر ڈال کر وہ مڑا اور پول روم کے اندر گھس گیا۔

کونے کے بار میں لا کر اس نے میرے لیے ایک ڈبل شاٹ منگوایا اور مجھے مشروب کو حلق سے نیچے اتارتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ خاموش تھے مگر آنکھوں میں شکایت تھی۔ جام خالی کر کے میں نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم انتہائی احمق ہو ٹیری۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''اب تک وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ ''تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

''اس مسئلے پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تم یہ بتاؤ کہ ٹھیک وقت پر تم کیسے وہاں آ گئے تھے؟''

''میں تمہارے پیچھے ہی تھا۔ پھولوں کی دکان سے نکلتے ہی میں نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ شاید اس واقعے کے بعد تمہیں عقل آ گئی ہو۔ میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے ہینک کا کیس لے لیا ہے۔ میں اس کے

قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ یہ میرا کام ہے۔"

یہ اس کی فطرت تھی۔ فرانس میں بھی وہ اسی طرح ہر معاملے میں آگے رہا کرتا تھا۔ "تو پھر کیا ہوا؟" میں نے اپنے لہجے کی تلخی دباتے ہوئے کہا۔ "پولیس کا کام تو کوئی بھی آفیسر سرانجام دے سکتا ہے، ویسے یہ ریفرنس کون ہے؟"

"والٹس اسکواڈ، بڑا بدنام افسر ہے ٹیری، تم خوش قسمت ہو جو اس کے ہاتھ سے بچ گئے۔ اس نے تین چار بدمعاش محض گھونسے مار مار کر ہلاک کر دیے ہیں۔ پولیس بورڈ نے جواب طلبی بھی کی تھی مگر اس کا دعویٰ تھا کہ وہ لوگ گرفتاری میں مزاحمت کر رہے تھے چنانچہ مارے گئے۔" ڈیڈرکسن نے شانے اچکائے۔ "بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔"

"یہ پول روم کے عقبی دروازے پر کیا کر رہا تھا؟ ہینک نے مجھے بتایا تھا....."

"ہینک نے تمہیں جو کچھ بھی بتایا تھا اسے بھول جاؤ۔" اس نے بے تابی سے میری بات کاٹ دی۔ "جتنا کم تمہیں واقعات کے بارے میں علم ہوگا اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ وہ اس مقصد سے مائیک کے پول روم میں منڈلاتا رہتا ہے جس مقصد سے شہد کی مکھی پھولوں کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اسے یہاں گوشت والی ہڈی مل جاتی ہے۔ ٹیری، میں ہر وقت تو تمہاری نگرانی نہیں کر سکتا اور تمہیں خطرات سے نہیں بچا سکتا۔ یہ علاقہ بڑا خطرناک ہے اور وحشی لوگوں کا مسکن بھی ہے۔ اپنی پھولوں کی دکان سنبھالو اور یہ باتیں میرے لیے چھوڑ دو۔"

"نہیں۔" میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔ "تمہاری اس نصیحت اور ہمدردی کا شکریہ کیپٹن مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ میری اپنی لڑائی ہے اور بعض مقامات ایسے ہیں جو پولیس کی دسترس سے باہر ہیں۔ میری طرف سے وہ اس قدر محتاط نہیں ہو سکتے۔ شاید میں ان کے اندر تک پہنچ سکوں، بہرحال دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں پھر ٹھوڑی سہلائی اور میری صورت تکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ اور غصہ تھا۔ مجھے فرانس والا ڈیڈرکسن یاد آ گیا۔

"تم ایسا نہیں کرو گے....." اس کا انداز تحکمانہ تھا۔

"تم اس بھوری آنکھوں والی لڑکی سے گرجا کے باغ میں کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"پھولوں کے بارے میں۔" میں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "میں ایک گل فروش ہوں، وہ میرے انتظام پر میرے کام کو سراہ رہی تھی۔ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو؟" اس نے میرا پستول لوٹا دیا مگر پستول لوٹاتے وقت ہچکچا رہا تھا جیسے مجھے موت کے منہ میں دھکیل رہا ہو۔ میرے ہاتھ میں پستول کا دستہ بڑا ٹھوس اور سرد لگ رہا تھا۔ میں نے اسے کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر میں رکھ لیا اور کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا پھر میں نے ڈیڈرکسن کے شانے پر تھپکی دی۔

☆☆☆

میں نارتھ سائڈ ہوٹل میں رہتا تھا جو ٹرانس پورٹیشن کے قریب واقع تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا پرسکون سا ہوٹل تھا جس میں کلرک، سیکریٹریز اور دفاتر میں کام کرنے والے چھوٹے موٹے عہدے دار رہائش پذیر تھے۔ ہوٹل کا کلرک اپنی شیشے کی کھڑکی سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ لابی کے ایک کونے میں ہمہ وقت برج کا کھیل چلتا رہتا تھا۔

میں لفٹ کی طرف بڑھا تو میرے زخمی چہرے نے کئی لوگوں کو میری جانب متوجہ کر لیا۔ کمرے میں آ کر میں نے اپنے زخموں پر دوا لگائی اور صاف ستھرا لباس پہن لیا۔ ڈیڈرکسن نے یہاں تک میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ ولسن ایونیو میں ڈنر کر کے میں نے ٹیکسی لی اور طوا کی روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایکویٹر کلب کی شاندار عمارت برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ یہ کلب اپنے انتظامات اور تفریحات کی وجہ سے دولت مندوں کے لیے کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے اپنا ہیٹ اتار کر کلب کی ملازمہ لڑکی کے حوالے کیا اور ایک جام لینے کے لیے بار کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت ساڑھے نو بجے کا وقت ہوا تھا۔ تفریح کے متلاشی چند لوگ پام کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی میزوں پر بیٹھے تھے۔ پام کے درختوں پر چراغاں سا ہو رہا تھا۔ بارٹینڈر چمک دار بالوں والا ایک پھرتیلا سا نوجوان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"ٹھنڈا مشروب۔" میں نے آرڈر دیا۔ "پہلا فلور شو کتنے بجے شروع ہوگا؟"

"گیارہ بجے کے بعد۔" اس نے جام بنا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے دس دس ڈالر کے دو نوٹ بڑھا دیے۔ نوجوان کی آنکھوں میں لالچ کی چمک ابھری۔ "بقایا اپنے پاس ہی رکھو۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ "تم سلڈرڈ نامی لڑکی کے بارے میں، جو یہاں گاتی ہے، کیا جانتے ہو؟ آج کل وہ کس کے ساتھ ہے؟"

نوجوان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ وہ بار کی عقبی سمت مڑا اور سیل کی گھنٹی بجا دی پھر اس نے بڑی نفاست سے بقایا ڈالر میرے گلاس کے قریب رکھ دیے۔

''آپ سمجھ بھی جایا کریں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولا۔ ''مخبری کا کاؤنٹر بند ہو چکا ہے۔'' وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور میں آہستہ آہستہ مشروب کی چسکیاں لیتا رہا۔ گاہک اب اندر آتے جا رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ شام کے لباس میں ملبوس تھے۔ ہمی نے اپنے کلب کو واقعی جنت نظیر بنا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں آہستہ آہستہ قبر میں اترتا بینک کا تابوت گھوم گیا۔ اسے بھی یقیناً رنگ و نور کی یہ دنیا بے حد پسند ہوگی۔

میں نے مشروب ختم کر کے گلاس رکھا ہی تھا کہ ایک آدمی میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی موٹی گردن میں سفید ٹائی اس طرح بندھی ہوئی تھی جیسے کسی بھینسے کے گلے میں رسی پڑی ہو۔ سیاہ بالوں کا گچھا اس کی پیشانی پر جھول رہا تھا۔ اس کی سبزی مائل زرد آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔

''تم کس کی تلاش میں ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔''

''ہاں شاید۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی سانس میں شراب کی بو رچی ہوئی تھی۔ ''میں ملڈرڈ نامی ایک لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ یہاں گیت گاتی ہے۔'' اچانک اس نے اپنا ہاتھ میرے کوٹ کے اندر ڈالا اور میرا ریوالور نکال لیا۔ پستول اپنی جیب میں رکھ کر اس نے مجھے اسٹول پر سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''مسلح ہو، شاید تمہارا تعلق شہر میں آنے والے آوارہ گردغنڈوں سے ہے؟'' اسے میرے بارے میں شاید بار ٹینڈر نے ہی اطلاع دی تھی۔ یہ آدمی بھاری بھرکم ہونے کے باوجود خاصا ہوشیار بھی تھا، اس کی تیز آنکھوں نے میری بغل کے نیچے ابھار دیکھ لیا تھا۔

''ہم کسی جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' وہ بولا۔ میں اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک دروازے کے سامنے آ گیا۔ دروازے کی پیشانی پر پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ موٹی گردن والے نے مخصوص انداز میں دستک دی پھر ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

یہ ایک عالیشان دفتر تھا۔ کمرے میں بیش قیمت پردوں کے رنگ کا انتہائی نفیس فرنیچر تھا۔ موٹے شیشے کی سطح والی ایک کشادہ میز کے عقب میں ایک بارعب شخص بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ہمی پریسینو تھا۔

اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ سر پر ایک خوشنما ہیٹ تھا۔ اس کا چہرہ گردن کے مقابلے میں خاصا بھاری اور چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کی انگوٹھی میں ایک بڑا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی مچھلی کی سی بھوری آنکھوں سے استفسارانہ انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کھولنے لگا۔

''یہ ملڈرڈ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' موٹی گردن والے نے بتایا۔ ''یہ مسلح تھا اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے آپ کے پاس لے آؤں۔''

''ملڈرڈ سے تمہیں کیا کام ہے؟'' پریسینو نے بھاری مگر پرسکون آواز میں سوال کیا۔ اس کی آواز سن کر میرے گلے میں پھنسی کوئی چیز خود بخود صاف ہو گئی۔

''میں اس کے بدن پر گڑے ہوئے نقش و نگار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔'' میرا لہجہ واضح طور پر طنزیہ تھا۔ ''میں نسوانی حسن کے متعلق ایک امریکن لیگ کا نمائندہ ہوں۔''

''بہت زبان دراز آدمی ہے۔'' موٹی گردن والا پھنکارا۔ ''کیا میں اسے ہاتھ دکھاؤں باس؟''

ہمی نے اپنا بھاری سر نفی میں ہلایا۔ ''اب مجھے یاد آ رہا ہے تم وہی آدمی ہو نا جس نے ہینک ڈیٹیل کی تدفین میں اتنی شان و شوکت کا اہتمام کیا تھا، میرے پھولوں کا کیا بنا؟''

''میں نے انہیں کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔'' میں نے بدستور تلخی سے کہا۔ ''ہینک کے جنازے میں شرکت کر کے تم نے بڑی مکاری کا مظاہرہ کیا تھا پریسینو۔'' اس کے لٹکے ہوئے ہونٹوں سے ایک ناگوار سی ہنسی نکلی۔

''ہم دوست تھے۔'' وہ بولا۔ ''ایک دوست، دوسرے دوست کے لیے اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ تم اس سے کس قدر واقف تھے؟''

''میں، بہت اچھی طرح واقف تھا مرحوم ہینک سے۔'' غصے کے مارے میری آواز کپکپانے لگی۔ سارے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا۔ ''اتنا زیادہ کہ اب میں اس چوہے کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے اسے قتل کیا ہے۔''

ہمی کی بھویں تن گئیں۔ اس نے موٹی گردن والے کو آنکھ ماری۔ ''سنا تم نے، نک؟ یہ موت کے چکر میں گھوم رہا ہے۔ اب یہ کسی آدمی کو بھی شوٹ کر سکتا ہے کیونکہ کسی نے اس کے دوست کو شوٹ کر دیا ہے۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے دوست۔ ہینک مر چکا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ نیند کی گولی کھا کر سو جاؤ اور اسے اپنی قبر میں آرام کرنے دو۔''

اس کی مسکراہٹ میں قتل کا اعتراف اور فرعونیت تھی۔ طاقت اور دولت کے نشے میں چور وہ ایک ایسے جابر حکمران

کی طرح نظر آرہا تھا جو اتنی سادگی سے کسی آدمی کے قتل کا حکم صادر کردیتا ہے جیسے کوئی عام آدمی، ڈنر کا آرڈر دے رہا ہو۔ ایک ثانیے کے لیے میں اس کی زہریلی مسکراہٹ سے لرز اٹھا مگر فوراً ہی میرے بدن میں نفرت و غضب کا لاوا کھول اٹھا۔ میں برق رفتاری سے اچھل کر اس کی کرسی کے قریب پہنچا اور جنونیوں کے سے انداز میں دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

وہ کرسی پر گھوم گیا اور پھر زمین پر گرا۔ میں نے اسے بری طرح جھنجوڑ دیا اور پوری قوت سے اپنی انگلیاں اس کی گردن میں گاڑ دیں۔ میں نے اسے سرفرش پر دے مارا۔ میں اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس کا بھیجا بکھیر دینے کے علاوہ اور کوئی خیال نہیں تھا۔ میری حالت اس زخمی شیر کی سی تھی جو ہر قیمت پر اپنے شکار کو چیر پھاڑ دینا چاہتا تھا پھر میں نے یونہی گردن سے پکڑے پکڑے اسے گھسیٹا اور اس کے سر کو دیوار سے ٹکرا دیا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا۔

موٹی گردن والے کے لیے میری یہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی اور حیران کن بھی مگر اسے اپنی حیرت پر قابو پانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے سر کی پشت پر ایک ہتھوڑا سا پڑا اور کمرے کی ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ہیمی کی گردن چھوٹتے ہی موٹی گردن والے نے مجھے گھمایا اور پھر میز پر دے مارا پھر اس کا ایک طاقتور گھونسا میرے جبڑے پر پڑا اور میں اندھوں کی طرح ہیمی کے قریب جا گرا۔

''تم نے اسے قتل کیا ہے۔'' میں ہیمی کی طرف اشارہ کرکے یا گلوں کی طرح چلایا۔ ''وہ تمہارے لیے کام کرتا تھا۔ شکاگو کا ہر طاقت ور آدمی تمہارا نوکر ہے۔ میں تم سے اس کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا پریسینو۔''

میں پھر اس کی طرف جھپٹا مگر میرے ہاتھوں میں دم نہیں رہا تھا۔ موٹی گردن والے نے میرا ہاتھ پکڑا اور اسے مروڑ کر میری کمر سے لگا دیا۔ پریسینو بڑی مشکل سے اٹھا اور دوبارہ کرسی میں دھنس گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے یونہی بیٹھا کھانس رہا تھا اور اکھڑی سانس لے رہا تھا پھر اس نے اپنا کالر درست کیا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی منحوس آنکھوں سے بھسم کردینے والی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

''تمہیں یہاں قتل نہیں کروں گا۔'' وہ الفاظ چبا چبا کر اپنے بھاری لہجے میں بولا۔ ''مگر اب سے اپنی زندگی کی گھڑیاں گننا شروع کردو، آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں جس نے ہیمی پر یسینو پر ہاتھ اٹھایا ہو اور یہ داستان دنیا کو سنانے کے لیے زندہ رہا ہو۔ مناسب وقت پر ہم تمہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔ جب باہر سڑک پر جلتی روشنیاں دیکھو تو یہ بات یاد کرلینا کہ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اب اسے باہر پھینک آؤ ٹنک۔''

میں اس کی چالاکی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ہیمی چاہتا تھا کہ میں خوف زدگی کی کیفیت میں مبتلا ہوکر روشن سڑکوں سے اجتناب کروں اور تاریک گلیوں میں عمارات کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کسی وقت بے بسی اور خاموشی سے موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ وہ اپنے شکار کو خوف زدہ کرکے بلی چوہے کا کھیل کھیلتے ہوئے ہلاک کردیا کرتا تھا۔

میں سڑک کے ایک گندے کنارے سے اٹھا اور ٹیکسی کے ذریعے اپنے ہوٹل میں آیا۔ لابی میں سے گزرتے وقت میرا ذہن طوفانی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میرا اصل کام تو اب شروع ہوا تھا۔

انہوں نے میرا پستول چھین لیا تھا مگر میرا ایک دوست تھا جم ڈین، اس کی اسلحے کی دکان تھی۔ میں اس سے دوسرا پستول لے سکتا تھا۔

رات کے کلرک نے میری طرف دیکھا۔ اس کے قریب دیوار پر لگے کلاک میں دس بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ میں لفٹ کی طرف بڑھا تو تاریک کونے میں پڑی کرسی پر سے ایک سایہ سا اٹھا۔ میرے اعصاب کشیدہ ہوگئے۔ میں ہر بات کے لیے تیار تھا۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ دبلی پتلی سنہرے بالوں والی، اس کی حسین آنکھوں میں گہری اداسیاں تھیں۔ وہ ملٹرڈ تھی۔

''مسٹر نیری! میں تمہاری منتظر تھی۔'' اس کی مترنم آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔ ''میرے پاس ایک بے حد اہم خبر ہے جو میں تمہیں دینا چاہتی ہوں۔''

غصہ ایک بار پھر میری رگوں میں مچلنے لگا اور میں نے خشونت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم اپنی توانائی ضائع مت کرو، مجھے پہلے سے ہی علم ہے، تم ہیمی پریسینو کے لیے کام کرتی ہو۔ میں سمجھتا تھا تمہارا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر میں غلطی پر تھا۔ تم ہیمی کی گرل فرینڈ بھی ہو نا؟''

ایک ثانیے کے لیے اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی پھر اس کی جگہ دکھ کے سائے ابھر آئے۔ ''میں کسی کی گرل فرینڈ نہیں ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''ایکویٹر کلب میں، میں محض ہینک کی مدد کرنے کی خاطر کام کر رہی تھی۔''

"کسی اور کو بدھو بنانا لڑکی۔" میرے لہجے میں بڑا واضح طنز تھا۔ "تم نے واقعی اس کی مدد کی..... ہیمی کی۔ یہ ایک اداکارانہ چال ہے۔ ایک حسین لڑکی کو اپنے متوقع شکار کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اسے اور بھڑکا سکے۔ کیا میں اب تمہاری محبت میں زندگی کی خواہش کروں جبکہ وہ میری موت کے لیے گولیوں کا انتخاب کر رہے ہیں؟"

میں ہکلایا ہوا سا جانے کے لیے مڑا مگر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "پلیز میری بات سنو! ہینک ہیمی کا قرض دار تھا، بہت بڑی رقم کا، یہی وجہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اس کے ریکٹ سے نہ نکل سکا۔ میں دل سے چاہتی تھی میری کہ وہ ہیمی کے جال سے نکل جائے۔ محض اس لیے میں نے ایکویٹر کلب میں ملازمت کی تھی اور اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ ہینک کو دیتی تھی تاکہ وہ اپنا قرض ادا کر سکے۔ میں اب تک اس کا قرض چکا رہی ہوں۔"

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز میں سچائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے شبہات دم توڑ گئے۔

"مجھے افسوس ہے ملڈرڈ۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "مگر ہینک کی موت کا حادثہ میرے لیے اعصاب شکن ثابت ہوا ہے۔ دنیا کے ہر شخص اور ہر بات سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا اچھا دوست اور کتنا پیارا آدمی تھا۔ دنیا میں ایسے زندہ دل لوگ کم ہوتے ہیں۔"

"مجھے کیا بتا رہے ہو ٹیری۔" اس کی درد بھری آواز نے میرا دل دہلا دیا۔ وہ اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ "میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس میں خوبیاں زیادہ اور خامیاں کم تھیں۔"

ایک بار پھر میرے دل میں سوز و گداز، رقت اور نرمی اتر آئی جو میں نے صبح کے وقت گرجا میں محسوس کی تھی۔ ملڈرڈ کی آواز میں پوشیدہ ترنم اور موسیقی مجھے ہواؤں کے دوش پر اچھال رہی تھی۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میری طرح غم سے نڈھال تھی مگر نہ جانے اس کا غم کتنا گہرا تھا۔ "اب تمہیں ایکویٹر کلب چھوڑ دینا چاہیے ملڈرڈ۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اپنے لیے کوئی بہتر ملازمت تلاش کرو، کچھ عرصے کے لیے گاؤں چلی جاؤ۔ شکاگو سے نکل جاؤ۔"

"نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی ٹیری، جب تک کہ ہینک کے قاتل کا پتا نہ چل جائے۔"

"ہینک کو ہیمی پریسیجو نے قتل کیا ہے۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ٹریگر اس نے نہیں دبایا تھا مگر گولی مارنے کا حکم ہیمی نے دیا تھا۔ وہ بہت مکار آدمی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ ہینک ہیمی کے لیے رقم جمع کرتے کرتے بے حال ہو رہا تھا کہ کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی مگر ہیمی کو اس کی کہانی پر یقین نہیں آیا، اس نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ہینک کے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی اور وہ اس رقم کو لے کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"میرے خیال میں یہ بکواس بھی ہیمی کے ہی آدمی نے کی ہوگی تاکہ ہیمی کو اسے قتل کرنے کا بہانہ ہاتھ آ سکے۔ بہرحال، تم اس کی ذرا فکر نہ کرو۔ ہر معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟" اس نے بڑی حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ٹیری، خدا کے لیے اپنی جان کو خطرات میں نہ ڈالو، وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

ہم روش پر آ کر ٹھہر گئے۔ موڑ پر ایک کار کھڑی تھی۔ اس کا انجن بیدار تھا۔ آدھے منٹ تک ملڈرڈ وہیں کھڑی میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی رعنائیاں، اپنی لطافتیں میرے دل میں منتقل کر رہی ہے۔ مگر کوئی سہانا موڑ، ہینک کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد ہی آ سکتا تھا۔

میں اس کے ساتھ کار تک آ گیا اور اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا "فلور شو" کے لیے کلب پہنچنا ضروری تھا۔ عقبی سیٹ پر مجھے ایک آدمی کی شبیہہ نظر آئی۔ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کے سڑک پر آ گیا۔ وہ پولیس کا وائس اسکواڈ ریفرنٹی تھا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اس کا بھرا بھرا چہرہ پیلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے موٹا سا سگار اپنے منہ سے نکالا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔

"آخر تم پھنس ہی گئے نا پاؤل۔" وہ ہنسی اڑانے کے سے انداز میں بولا۔ "چلو اندر۔"

اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے ایک خوفناک سی چمک لہرائی، اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کار کی طرف گھسیٹا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔ وہ یقیناً مجھے قتل کرنا چاہتا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ آخر کیوں؟ بلاشبہ وہ ایک فری پولیس مین کے طور پر مشہور تھا مگر وہ بہرحال اپنے افسران کے سامنے جوابدہ تھا۔

میرے پاس اب سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ مجھے دھکیل کر کار میں بٹھانا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں

اس کے پستول کی زد سے دور ہوگیا۔ اس کا بھاری بدن میرے اتنا قریب تھا کہ میں مکا استعمال نہیں کرسکتا تھا اس لیے میں نے اپنی کہنی پوری قوت سے اس کے گلے پر دے ماری۔ یہ دو بدو لڑائی کا ایک فوجی داؤ تھا، جو اس کی جان بھی لے سکتا تھا۔ اس کے منہ سے غراہٹ سی نکلی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ میں نے فوراً ہی جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے پشت کی طرف اس قدر مروڑا کہ اس کی ہڈی چیخ گئی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ اس کا پستول چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور میں نے فوراً جھک کر اسے اٹھالیا۔ ریفرٹی نشے میں چور کسی شرابی کی طرح جھوم رہا تھا۔

میں نہ جانے کب سے اس وقت کا منتظر تھا۔ میری نس نس میں خون کی جگہ شعلے بھڑک رہے تھے اور نفرت نے مجھے بالکل وحشی بنا دیا تھا۔ میں نے اس کے منحوس چہرے پر تابڑ توڑ مکوں کی بارش کردی۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا، نابیناؤں کی طرح فضا میں ہاتھ لہراتا، چیختا چلاتا ہوٹل کی دیوار سے جالگا اور پھر وہیں بے دم ہوکر بیٹھ گیا۔

میں اسے ذرا بھی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرے دل میں رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ میں کوئی ہلکا پھلکا آدمی نہیں تھا۔ میرے اس گھونسے میں ایک سو اسی پونڈ نفرت کی قوت پوشیدہ تھی۔ دوسرا گھونسا میں نے اس کی چپٹی ناک پر مارا۔ وہ بری طرح کراہا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ ایک بار پھر دیوار سے جالگا اور گھسٹتا ہوا کسی مُردہ چوہے کی طرح زمین پر پھیل گیا۔ میں اسے چھوڑ کر سڑک کی طرف مڑا۔

کار ملڈرڈ کو لے کر کب کی جا چکی تھی۔

میں بڑی دیر تک سڑک پر چلتا رہا یہاں تک کہ نارتھ سائڈ کے بلند و بالا مکانوں پر چاند نے اپنی نرم و شفیق کرنیں بکھیرنی شروع کردیں۔ میں چاندنی اور تاریکی سے بے نیاز، اندھوں کی طرح بڑھتا چلا جارہا تھا پھر آہستہ آہستہ لوکل ٹرینوں کا ہنگامہ اور ٹریفک کا زور ٹوٹ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ رات بہت گزر چکی تھی۔ میں کوشش کررہا تھا کہ ذہن میں کوئی خیال نہ آئے کیونکہ ملڈرڈ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔

میں سکسٹ پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ میرے کاندھوں پر تھکاوٹ کا منوں بوجھ سوار تھا۔ ملڈرڈ پر اعتماد کرکے میں نے انتہائی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ صرف ذرا ہی دیر پہلے تو میں نے وفا اور امید کی فرحت بخش روشنی کا مزہ چکھا تھا لیکن اب فریب کے اندھیرے نے مجھے ناامیدی میں مبتلا کردیا تھا۔ حسین زندگی کے خواب میرے دماغ کو زہریلے ناگوں کی طرح ڈس رہے تھے۔

خود غرضی کا صرف ایک ہی جواز ہوسکتا تھا کہ ریفرٹی کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے۔ مجھے مائک کے پول روم کی عقبی گلی میں جہاں ہینک کو مارا گیا تھا، ریفرٹی سے پہلی ملاقات یاد آگئی۔ آج رات وہ مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے شوٹ کرسکتا تھا کیونکہ میں گرفتاری میں مزاحمت کررہا تھا۔ یہ بڑا اچھا منصوبہ تھا۔ گواہ کے طور پر اس کے ساتھ ملڈرڈ اور ٹیکسی ڈرائیور تھے۔

میں نے کوٹ کی جیب سے ریفرٹی سے چھینا ہوا پستول نکالا اور اسے گھورنے لگا۔ میں اس وقت بالکل بھول گیا تھا کہ کسی وقت بھی پردوں کے پیچھے دبکا ہوا کوئی سایہ مجھ پر جھپٹ سکتا ہے اور میرا کام تمام کرسکتا ہے مگر اب میرے علاوہ کوئی اور بھی خوف زدہ تھا۔ جرم کسی اور کے بھی اعصاب چٹخا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہوٹل میں پیش آنے والا منظر گھوم گیا۔

میں جلدی سے اٹھا اور ہر ممکن تیز رفتاری سے اپنے اسلحہ فروش دوست جم کے گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے تعاقب میں ایک سیاہ پوش کی دو تین بار جھلک دیکھی لیکن مجھے گھورتا پاکر وہ کہیں ادھر ادھر کھسک گیا۔ اس کا مکان مغربی علاقے میں تھا۔ میں نے اسے جگایا اور پھر اسے ساتھ لیے اس کی اسلحے کی دکان پر آگیا۔ اندر آکر میں نے ریفرٹی کے پستول سے، ناکارہ تیل سے بھرے ہوئے ایک ڈرم میں فائر کیا پھر ہم نے وہ گولی نکالی۔ جم ڈین فوراً ہی اس گولی کو ہومی سائڈ کے ڈیڈرکسن کے پاس معائنے کے لیے لے جانے پر آمادہ ہوگیا۔

پھر ڈین نے مجھے اعشاریہ چار پانچ کا ایک آٹومیٹک پستول دیا اور میں ایک بار پھر رات کی تاریکی میں اتر گیا۔ میں ڈیڈرکسن کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بعد میں ان معاملات کا چارج لے سکتا تھا۔

☆☆☆

ایکویٹر کلب کے گھومنے والے دروازے کو میں نے دھکیلا تو اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ ہیٹ کی رکھوالی والی لڑکی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے یاد آگیا تھا کہ ابھی رات کے اگلے پہر مجھے بڑی بری حالت میں کلب سے نکالا گیا تھا۔ میں نے اپنا ہیٹ اسے دینے کی

زحمت نہیں کی۔

ہیٹ میں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ اس کے نیچے اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور چھپا ہوا تھا۔ میں اس کشادہ روش پر چل دیا جو ڈانسنگ روم کی طرف جاتی تھی۔ رقاص جوڑوں پر دھوئیں کے نیلے بادل چکرا رہے تھے اور پر ہجوم میزوں پر موم بتیاں روشن تھیں۔ یہ کلب کے شباب کا وقت تھا، بام کے درختوں کے جھنڈ میں سے آرکسٹرا کی مسحور کن موسیقی گونج رہی تھی اور وہیں ایک ڈائس پر مائیک کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ نیلی روشنی میں انتہائی ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آرہی تھی۔ اس کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کا سا سحر اور موسم بہار میں کوئل کے گیتوں کی سی تازگی تھی۔ اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں انتہائی سوز و گداز تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے۔ میں تلخی سے مسکرا دیا۔ میں اس جادوگرنی کی اصلیت سے واقف تھا۔ وہ قاتل نہیں تو ایک قاتل کی شریک کار ضرور تھی۔

میں نے نفرت سے منہ موڑ لیا اور بار کی طرف دیکھا۔ وہ میزوں سے بچتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تاثرات اس کے دلی جذبات کا مظہر تھے۔ میں بڑے سکون سے اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ میں ہیبی پریسینو کا متلاشی تھا، اس کے کرائے کے ٹٹوؤں سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

وہ میرے قریب آگیا اور پستول نکال کر میری پسلیوں سے لگا دیا۔ اس کے گالوں کے عضلات پھڑکے اور بڑے وحشیانہ انداز میں جبڑے بھنچ گئے۔ ”بہت خوب۔“ میں نے ناگ جیسی پھنکارتی آواز سنی۔ ”تو تم میں دوبارہ یہاں آنے کا بھی حوصلہ تھا۔ چلو ادھر چلو۔ باس تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔“

اس نے اتنی تیزی سے کور کر کے مجھے آگے کر لیا کہ لوگ محسوس تک نہیں کر سکے۔ اس نے میرے ہیٹ کے نیچے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اب وہ اتنا ذہین بھی نہیں تھا کہ ایسی باتوں کا دھیان رکھتا۔ اس نے مجھے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔ میں ذرا سی دیر بعد میں پھر ہیبی پریسینو کے شاندار دفتر میں موجود تھا۔ ہیبی نے اپنا کوٹ اتار رکھا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ جیسے ہی اس کے نمائندے نے مجھے اندر دھکیلا وہ رکا اور میری طرف گھوم گیا۔

اس کے پھولے ہوئے چہرے پر نفرتوں کی پھنکار برس رہی تھی۔

”تمہیں بھاگنے اور اپنی جان بچانے کا ایک موقع ملا تھا پاؤل۔“ اس کی آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ”مگر تم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تم ابھی تک اپنے دوست کی جنگ لڑنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے، اب تمہارا وقت تمام ہوا۔“

”بڑا بانک رہے ہو ہیبی۔“ میں نفرت سے مسکرایا۔ ”تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے نا لیکن یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے، میں بینک کا بدلہ ہر صورت میں لے کر رہوں گا۔ تم نے ایک جنوبی پولیس افسر کو خرید کر بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے مگر اب میرے خیال میں تمہارا ستارہ گردش میں آگیا ہے کیونکہ تمہارا کارندہ پولیس افسر ریفرٹی میرے ہاتھوں زخمی ہو کر کسی سردی کھائے ہوئے کتے کی طرح سکڑ رہا ہے۔“

ہیبی ہنہنایا ہوا میری طرف بڑھا اور اچانک میرے رخساروں پر برق رفتار سرعت کے ساتھ ایک تھپڑ جڑ دیا۔ چوٹ زوردار تھی مگر میں اسے برداشت کر گیا۔ میرے خون میں برق سی دوڑ گئی مگر مجھے ابھی ہیبی سے چند باتیں کرنا تھیں۔ اس کے بعد میری ترجمانی کے فرائض میرے ہیٹ کے نیچے ہاتھ میں دبے ہوئے آٹومیٹک ریوالور نے کرنی تھی۔

ہیبی کی میز کے پیچھے والا دروازہ کھلا اور ریفرٹی اندر آگیا۔ اس کے بھاری چہرے پر میرے گھونسوں کے نشانات چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد گوشت سوج کر نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے منہ پر دائیں جانب ایک ٹیپ چپکا ہوا تھا۔

اس نے اپنی کمر کے گرد بندھے ہولسٹر میں سے پستول کھینچا اور اس کی آنکھوں میں جلادوں کی سی سرخی اتر آئی۔

”یہاں نہیں۔“ ہیبی کا حکم بڑا واضح تھا۔ ”اسے باہر عقبی گلی میں لے جاؤ، تم کہہ سکتے ہو یہ گرفتاری میں مزاحمت کر رہا تھا پھر تم ہر الزام سے آزاد ہو گے۔“

”تم نے بہت دیر کر دی دوست۔“ میں نے ریفرٹی کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا پستول اور اس میں سے چلائی ہوئی ایک گولی ڈیڈ رکن تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھے قتل کرنے کا تمہارا منصوبہ تمہیں لے ڈوبا، ریفرٹی۔ مجھے قتل کرنے کی تمہارے پاس صرف ایک وجہ تھی کہ تم..... بینک کے قتل میں ملوث تھے اور میری وجہ سے تمہارے دل میں یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں تمہارا راز کھل نہ جائے۔“

”تم یہ بات کہنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔“ ریفرٹی غصے سے سر جھٹک کر بولا۔

میں ان باتوں سے اکتا چکا تھا۔ میں نے ہیٹ زمین پر گرایا اور فائر کر دیا۔ میری پہلی گولی ریفرٹی کے پیٹ میں لگی۔ وہ چیختا ہوا دہرا ہو گیا۔ یہ صرف ایک لمحے میں ہو گیا تھا

مگر لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے آٹومیٹک کی نال پر نیلے رنگ کے دھوئیں کا ایک مرغولہ چکرا رہا تھا اور کمرے میں ابھی تک فائر کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

میں نے ہیمی کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا۔ خوف نے اسے گویا منجمد سا کر دیا تھا۔ میں نے دوسری گولی چلائی، ریفرٹی نے فرش پر گر کر ایک پلٹی کھائی پھر ایک ٹانگ کے لیے اس کا جسم لرزا اور ساکت ہو گیا۔ میں جان گیا کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میں خود کو جلا دکھوس کر رہا تھا۔ میں اشتعال کے عالم میں ہیمی کی طرف مڑا اور وہ میز کے پیچھے کود کر دبک گیا۔ موٹی گردن والا بھی شاید ابھی ہوش میں آیا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ وہ کمرے میں موجود باقی تمام افراد سے زیادہ ذہین تھا، وہ میری طرف بڑھا۔ مجھے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ ہاتھ سیدھا کر کے اس پر فائر کر سکوں اس کا بھاری گھونسا میرے جبڑے پر پڑا اور میں زمین پر پھیل گیا۔ اس نے فوراً ٹھوکر مار کر میرے ہاتھ سے پستول دور کر دیا۔

دیوانوں کی طرح میں نے قالین میں انگلیاں گاڑ دیں اور پستول کی طرف کھسکا۔ مگر اس سے پہلے موٹی گردن والا مجھ پر جھکا اور میرا سر پکڑ کر قالین پر رگڑنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ جھٹکے مگر اس بار ہیمی بازی لے گیا۔ وہ چاروں ہاتھ پیر کے بل کسی گینڈے کی طرح کھسکتا ہوا میز کے نیچے سے نکلا اور پستول چھاپ لیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ میرے خیال میں موت کی اگر کوئی صورت ہوتی تو اس سے زیادہ بھیانک نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگی۔ اس آخری لمحے میں، جو صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی ریچ سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ پستول کا دھماکا گونجا۔ میری آنکھوں کے سامنے شعلہ سا لپکا مگر وہ ہیمی تھا جو فرش پر گر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت و استعجاب اور موت کا کرب پھیلتا جا رہا تھا۔

میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ڈیڈرکسن دروازے میں کھڑا تھا، کسمپرسی اور خاموش۔ اس کی نیلی آنکھوں میں فولاد کی سی سختی اور ٹھنڈک تھی۔ اس نے اپنی پستول کی نال موٹی گردن والے کے گلے سے لگا رکھی تھی۔

☆☆☆

''جم ڈین نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس طرف آئے ہو، احمق کی اولاد۔ میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا۔ فرض کرو تم مارے جاتے تو؟'' میں مسکرا دیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر نثار ہو رہی تھیں۔

''یہ بات تو تم نے پہلے بھی کہی تھی۔'' میں نے یاد دلایا۔ ''جس دن ہم نے اوماہا بیچ پر حملہ کیا تھا پھر دشمن کے ہوائی جہاز آ گئے تھے۔ اس دن بھی تم خندق سے سر نکال کر چلائے تھے..... کوئی باہر نہ نکلے ورنہ مارا جائے گا۔''

وہ ہنس دیا۔ ایک بے حد پیاری اور دوستانہ سی ہنسی۔ ''اوخدایا! کیا ہم ان یادوں کو کبھی فراموش کر سکیں گے؟ بہرحال تم ہر قسم کے الزامات سے بری ہو لڑکے۔ ڈین کے ہاتھ جو گولی تم نے بھیجی تھی، وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی ہینک کے جسم سے نکلی تھی۔ ہم شروع سے ہی ریفرٹی کی طرف سے مشکوک تھے۔ تاہم وہ ملڈرڈ ڈیئیل ہی تھی جس نے ہمیں یقین دلایا اور شواہد دیے کہ ریفرٹی ہیمی کے لیے کام کر رہا ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہینک کی بیوی۔''

میرے گلے میں درد سا ہونے لگا۔ ''ذرا دوبارہ کہنا۔''

''وہ باہر ہال میں کھڑی ہے یار۔'' ڈیڈرکسن پستول لہراتے ہوئے بولا۔ ''اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ بھی کوئی جگہ ہے بھلا۔'' میں فوراً ہال میں آ گیا۔ وہ ایک میز کے قریب کھڑی تھی۔ نرم و نازک، حسین معصوم سی گڑیا کے مانند۔

''اب جبکہ یہ کام ختم ہو چکا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہاری نصیحت مان لوں۔ میری ایک سہیلی کا گھر جنیوا میں ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے وہاں چلی جاتی ہوں۔ میں آرام کرنا اور ان تمام خوفناک باتوں کو ذہن سے نکال دینا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں بھی فرصت ملے تو مجھ سے ملنے آ جانا۔''

''تم..... تم وہاں سے کار میں بھاگ کیوں گئی تھیں؟''

''میں کیسے بھاگ سکتی تھی ٹیری۔ ڈرائیور نے کار کو لاک کر دیا تھا اور مجھے کلب میں لے آیا تھا۔ ہیمی نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی.....''

''بھول جاؤ ان باتوں کو۔'' میں نے کہا۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے آہستہ سے دبایا۔ شاید بعد میں جب یہ زخم مندمل ہو جائیں گے تو میں اس سے بہت کچھ کہہ سکوں گا۔ مجھے یقین ہے ہینک، ہمارے ملاپ کو دیکھ کر اپنی قبر میں آرام کی نیند سو سکے گا۔

یوشع بن نون نے اپنی حوصلہ مند فوج کو ساتھ لیا اور عوج کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ "یسن" کی فتح کی خبر اس وقت تک قریب کے کئی شہروں تک پہنچ چکی تھی لہٰذا حضرت یوشع جہاں پہنچے، معمولی سی مزاحمت کے بعد اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ہر شہر کی فتح کے بعد جب معلوم کیا جاتا تو یہی معلوم ہوتا کہ عوج اب تک اس شہر میں تھا لیکن اسرائیلیوں کے خوف سے کسی دوسرے شہر میں چلا گیا۔ حضرت یوشع اس شہر کی طرف چلے جاتے۔ آخر ایک شہر میں عوج کا سراغ مل گیا۔ اس نے چند ساتھیوں

گیارھواں حصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی "اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

کے ساتھ مقابلے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے اور وہ یوشع بن نون کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اس فتح کے بعد بنی اسرائیل کا حوصلہ ایسا بڑھا کہ جدھر بڑھتے تھے، اس علاقے کو پیروں تلے روندتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔ ان کے قدموں کے نیچے اموریوں کے شہر سسک رہے تھے۔ عوج بادشاہ کی حکمرانی میں ساٹھ شہر تھے۔ سب کے سب بلند فصیلوں سے گھرے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل آگے بڑھے اور تمام شہر مٹھی میں کر لیے۔ وہ بھی اس شان سے کہ عوج کے لشکری ایسے خوف زدہ ہوئے کہ کسی جگہ بھی مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

بنی اسرائیل نے ان شہروں کا بھی وہی حال کیا جو اس سے پہلے حسبون کا کر چکے تھے۔ گھروں کو آگ لگا دی۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔

یہ پورا ملک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جدیوں کو اور منسیوں کے آدھے قبیلے کو میراث کے طور پر دے دیا اور انہیں حکم دیا کہ مکانوں کی دوبارہ تعمیر کریں اور شہروں کو آباد کریں۔

بنی اسرائیل نے قریب ہی خیمے لگائے ہوئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ دیکھو اب حکم خداوندی کیا آتا ہے۔

پھر انہوں نے کوچ کیا اور دریائے یردن کے پار موآب کے میدانوں میں یریحو کے مقابل خیمے کھڑے کیے۔

یریحو، یردن کے مغرب میں پانچ میل اور بحیرۂ مردار کے شمال میں سات میل کے فاصلے پر سطح سمندر سے آٹھ سو فٹ نیچے واقع ایک ٹیلے پر تھا۔ مغرب کی طرف ایک راستہ یروشلم کو جاتا تھا۔ گویا اب بنی اسرائیل اپنی منزل کے قریب پہنچنے کو تھے۔ اس سے آگے اب وہ علاقے شروع ہو جاتے جو انہیں فلسطین لے جا سکتے تھے۔

بنی اسرائیل کی فتوحات کی گونج اب دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ایک پسماندہ اور گری ہوئی قوم اچانک اتنی سربلند ہو گئی تھی کہ قبائل میں کھلبلی مچ گئی۔

اب یہ قوم موآب میں تھی اور دہشت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ یہ آخری پڑاؤ تھا، اس کے بعد انہیں منزل سے ہمکنار ہونا تھا۔ موآبیوں کا بادشاہ بلق بن صفور ان کی تعداد سے سخت خوفزدہ تھا۔ بار بار اونچے ٹیلوں پر چڑھتا تھا اور میدانوں میں انسانی سمندر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

کئی دن ہو گئے تھے، وہ اپنے درباریوں سے مشورے کر رہا تھا کہ اگر یہ سمندر اس کی طرف بڑھ آیا تو اسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ سن چکا تھا کہ اموریوں کے بادشاہ سیحون کا ان لوگوں نے کیا حشر کیا ہے۔ حسبون کو کس طرح جلا کر خاک کر دیا اور بنی عنق جیسی طویل القامت نسل کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان سے جنگ کرے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں جنگ کا یارا ہی نہیں تھا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ اس وقت ان سے جو بھی لڑے گا منہ کی کھائے گا۔

جنگ نہ ہو تو پھر کیا ہو؟

اس کے سامنے طرح طرح کے مشورے آتے رہے اور وہ ایک ایک کر کے سب کو رد کرتا رہا۔ پھر ایک مشورے پر آ کر اس کی طبیعت ٹھہر گئی۔

''دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ایک شہر ''فتور'' آباد ہے۔ یہاں ایک شخص بلعام بن بعور رہتا ہے، وہ اسم اعظم جانتا ہے۔ جسے برکت دیتا ہے اسے برکت پہنچتی ہے جس کے حق میں لعنت کرتا ہے، اسے لعنت پہنچتی ہے۔ اے بادشاہ! تو اسے بلا اور بنی اسرائیل پر لعنت بھجوا۔ اسی طرح یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔''

موآبیوں کا بادشاہ بلق بن صفور لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اس لیے یہ مشورہ اسے صائب معلوم ہوا۔ اس نے موآبیوں کے چند بزرگوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا کہ وہ بلعام بن بعور کے پاس اس کا یہ پیغام لے کر جائیں۔

''ایک قوم مصر سے نکل کر آئی ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں ہے کہ زمین کی سطح چھپ گئی ہے۔ یہ ایسی جنگجو قوم ہے کہ اس نے اموریوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ تو آئے تو دیکھے گا کہ جہاں عالیشان شہر تھے، اب وہاں راکھ کے ڈھیر ہیں۔ میں ان سے لڑنے کا یارا نہیں رکھتا۔ اسی لیے تجھے اپنے پاس بلا رہا ہوں کہ میری خاطر یہاں آ کر ان لوگوں پر لعنت کر کیونکہ یہ مجھ سے بہت قوی ہیں۔ پھر ممکن ہے میں ان پر غالب جاؤں اور ہم سب مل کر ان کو ماریں اور یہاں سے نکال دیں کیونکہ میں جانتا ہوں جسے تو برکت دیتا ہے، اسے برکت ملتی ہے اور جسے تو لعنت کرتا ہے، وہ ملعون ہوتا ہے۔ میں تجھے اتنا انعام دوں گا جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

موآب کے ان بزرگوں نے بہت سی دولت ساتھ لی اور بادشاہ کا پیغام پہنچانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

وہ بلعام کے پاس پہنچے اور بلق (بادشاہ) کا پیغام اسے پہنچا دیا۔ بلعام نے اس پیغام کو سنا لیکن خلاف معمول فوراً ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوا بلکہ ان لوگوں سے کہا کہ وہ آج رات یہیں ٹھہریں۔ میں فال نکال کر بتاؤں گا کہ مجھے چلنا بھی ہے یا نہیں۔

موآبی بزرگ وہاں ٹھہر گئے اور بلعام ایک کمرے میں بند ہو گیا۔ صبح اس کا دروازہ کھلا تو اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

''خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ جاؤں اور ان لوگوں پر لعنت نہ کروں۔''

بلق کی طرف سے بھیجے ہوئے لوگ سخت مایوس ہوئے لیکن کیا کرتے، لوٹ آئے۔

بلق نے اس انکار کو سنا تو اسے بھی مایوسی ہوئی لیکن ضرورت ایسی تھی کہ اس نے ہمت نہ ہاری۔ ایک وفد اور مرتب کیا جس میں اپنے امیروں کو شامل کیا۔

''اب تم جاؤ۔ وہ تمہاری بات نہیں ٹال سکے گا۔''

ان لوگوں نے بلعام کے پاس جا کر کہا۔ ''تو میرے پاس جلدی چلا آ۔ میں تیرا کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ تو چلا آ پھر جو تو مانگے گا میں تجھے دوں گا اور عالی منصب پر تجھے ممتاز کروں گا۔ تو آ اور ان لوگوں پر لعنت کر۔''

اب معلوم نہیں اس کی فال میں کیا آیا کہ صبح اٹھ کر ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا البتہ یہ کہا کہ تم لوگ پہلے چلے جاؤ، میں بعد میں تنہا پہنچ جاؤں گا۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنی گدھی پر زین رکھی اور موآبیوں کی طرف چل دیا۔ جب وہ موآبیوں کے ملک کے نزدیک پہنچا تو گدھی نے عجیب حرکت کی۔ صاف راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ بلعام کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے گدھی کو مارنا شروع کر دیا۔ گدھی گھبرا کر پھر صاف راستے پر آ گئی۔ تھوڑی دور جا کر اس بری طرح دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی کہ بلعام کا پاؤں دیوار کی رگڑ سے زخمی ہو گیا۔ اب تو بلعام کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے پھر گدھی کو مارنا شروع کر دیا۔ بڑی مشکل سے گدھی دیوار سے الگ ہوئی اور مردہ چال چلنے لگی اور پھر چلنے سے انکار کر دیا۔ بلعام کو لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بلعام نے اندھا دھند اس پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ گدھی کے لیے اب یہ سب ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو بلعام پر یہ راز ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ گدھی کو زبان مل گئی۔

''میں نے تیرے ساتھ کیا برائی کی تھی کہ تو نے مجھے ایک بار نہیں، تین بار مارا اور بری طرح مارا۔''

بلعام گدھی کو بولتے ہوئے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

''کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں نے تجھے کیوں مارا؟ تو چلنے سے انکار کر رہی تھی۔ کبھی کھیتوں میں لے کر چلی جاتی تھی، کبھی دیوار سے لگ جاتی تھی اور آخر میں تو بیٹھ ہی گئی۔ میں تجھے مارتا نہیں تو اور کیا کرتا۔''

''یہ بھی تو پوچھ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی۔ میں تیرے پاس اتنے عرصے سے ہوں۔ اس سے پہلے کبھی ایسا کیا؟''

اسی وقت ایک آدمی بلعام کو نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ اس سے پہلے وہاں نہیں تھا یا بلعام کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بلعام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔ تو جب ان لوگوں کے بلاوے پر چلا آیا تو خدا کا غضب تجھ پر بھڑکا اور اس نے مجھے بھیجا۔ میں تجھے مار ہی دیتا اگر تیری گدھی تجھے بار بار نہ بچاتی اور تو اسی کو مارتا ہے۔''

بلعام یہ سنتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ خدا نے میرے جانے کو برا جانا ہے۔ میں لالچ میں آ گیا تھا۔ اب اگر تو کہے تو میں واپس اپنے شہر چلا جاؤں۔''

''نہیں، تو اب ان لوگوں میں جا لیکن وہی بات کہنا جو میں تجھ سے کہوں تاکہ اس کا فائدہ اس قوم کو پہنچے جو مبارک ہے۔''

بلق کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ بلعام آ رہا ہے، وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کے استقبال کے لیے ارنون کے دریا پر آیا۔ یہ دریا موریوں اور موآبیوں کے لیے سرحد کا کام دیتا تھا۔

''میں نے بڑی مشکل گھڑی میں بڑی امید کے ساتھ تجھے بلوایا تھا لیکن تو نے پہلی مرتبہ تو بالکل ہی انکار کر دیا۔ دوسری مرتبہ بھی بڑے کہنے سننے کے بعد آیا ہے۔ کیا تجھے یقین نہیں تھا کہ میں تجھے اعلیٰ مناصب سے نوازوں گا؟''

''اے بادشاہ! تو میری مجبوریوں کو نہیں جانتا۔ میں آ تو گیا ہوں لیکن وہی کہوں گا جو مجھ سے کوئی کہلوائے گا۔''

بلق اس بات کو ذرا بھی نہیں سمجھا۔ اسے لے کر دارالخلافہ قریوت یا قریت میں آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے بلعام کو ساتھ لیا اور ایک بلند مقام پر چڑھ گیا۔ بلعام نے یہاں سے دور دور تک پھیلے ہوئے اسرائیلیوں کو دیکھا۔

قربانی وغیرہ چڑھانے کے بعد بلعام نے کہنا شروع کیا۔

''بلق نے مجھے بلوایا
کہ آجا اور میری خاطر یعقوب پر لعنت کر
آ اسرائیل کو پھٹکار
میں اس پر لعنت کیسے کروں جس پر خدا نے لعنت نہیں کی
یعقوب کی گرد کے ذروں کو کون گن سکتا ہے
کاش میں صادقوں کی موت مروں
اور میری عاقبت بھی ان ہی کے مانند ہو''

بلق اس کی دعا سن کر چیخنے لگا۔

''میں نے تو تجھے اس لیے بلایا تھا کہ تو میرے دشمنوں پر لعنت کرے گا۔ تُو نے تو انہیں برکت ہی برکت دی۔ کیا یہی ہے میرے انعامات کا صلہ؟''

بلعام خود بھی حیران ہوا کہ اس کی زبان پر یہ کیا جاری ہو گیا۔

''میں کیا کروں۔ جو کچھ میری زبان پر خود بخود جاری ہو گیا، وہ میں نے کہہ دیا۔ تُو ایسا کر مجھے کسی دوسری جگہ لے چل۔ شاید وہاں میری زبان پر کچھ اور جاری ہو۔''

''میں تجھے ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں سے وہ لوگ تجھے پوری طرح نظر نہ آئیں اور تو ان سے مرعوب نہ ہو جائے۔ پھر تو وہاں ان پر میری خاطر لعنت کرنا۔ وہ اسے ایک پہاڑ پر لے گیا جس کا نام ''پسگہ'' تھا اور یہ بحیرۂ مردار کے شمالی کنارے پر تھا۔ یہ رخ ایسا تھا کہ یہاں سے بنی اسرائیل بہت کم تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی اس نے پہلے مقام کی طرح سات مذبحے بنائے اور ہر مذبح پر ایک بچھڑا اور ایک مینڈھا چڑھایا۔

قربانی وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد بلق نے اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل پر لعنت کرے۔ بلعام نے پڑھنا شروع کیا۔

''اٹھ اے بلق اور سن
اے صفور کے بیٹے میری باتوں پر کان لگا
خدا انسان نہیں کہ جھوٹ بولے
اور نہ وہ آدم زاد ہے کہ اپنا ارادہ بدلے
کیا جو کچھ اس نے کہا اسے نہ کرے
یا جو فرمایا ہے اسے پورا نہ کرے
دیکھ مجھے تو برکت دینے کا حکم ملا ہے
اس نے برکت دی ہے اور میں اسے پلٹ نہیں سکتا
وہ یعقوب میں بدی نہیں پاتا
اور نہ اسرائیل میں کوئی خرابی دیکھتا ہے
خداوند اس کا خدا اس کے ساتھ ہے
اور بادشاہ کی سی للکار ان لوگوں کے بیچ میں ہے
خدا ان کو مصر سے نکال کر لیے آ رہا ہے
ان میں جنگلی سانڈ کی سی طاقت ہے
یعقوب پر کوئی افسوں نہیں چلتا
اور نہ اسرائیل کے خلاف فال کوئی چیز ہے

Digitized by Google

وہ اب نہیں لیٹنے کے جب تک شکار نہ کھالے
اور مقتولوں کا خون نہ پی لے"
بلق پھر بولا۔ "تو نے نہ تو ان پر لعنت کی اور نہ ہی ان کو برکت ہی دی۔"
"خدا یہی چاہتا ہے کہ میں یہی کہوں۔ وہ میری زبان پر یہی جاری کرتا ہے۔"
"اچھا تو پھر میں تجھے ایک اور جگہ لے جاتا ہوں۔ شاید خدا کو وہ جگہ پسند آئے اور تیری زبان پر لعنت کے الفاظ جاری ہو جائیں۔"

وہ اسے فغور کی چوٹی پر لے گیا۔ یہ موآب کا وہ پہاڑ تھا جس کا نام ایک دیوتا بعل فغور کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہاں سات بیلوں اور سات مینڈھوں کی قربانی دی گئی پھر بیابان کی طرف دیکھا۔ بنی اسرائیل اپنے قبیلوں کی ترتیب سے مقیم تھے۔ وہ یہاں لعنت کرنے کا پختہ ارادہ لے کر آیا تھا لیکن اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

"اے یعقوب تیرے ڈیرے
اے اسرائیل تیرے خیمے کیسے خوش نما ہیں
وہ ایسے پھیلے ہوئے ہیں جیسے وادیاں
اور دریا کے کنارے باغ
اور خداوند کے لگائے ہوئے عود کے درخت
اور ندیوں کے کنارے دیودار کے درخت
اس کے چمسوں سے پانی بہے گا
اور سیراب کھیتوں میں اس کا بیج پڑے گا
جو تجھے برکت دے، وہ مبارک
اور جو تجھ پر لعنت کرے، وہ ملعون"

یہ سنتے ہی بلق کا غصہ بھڑک اٹھا۔ اس نے بلعام کے دونوں کندھے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔
"میں نے تجھے اس لیے نہیں بلایا تھا کہ تو میرے دشمنوں کو برکت دیتا پھرے۔ تو نے لعنت کے بجائے تین بار انہیں برکت دی۔ اگر میں نے تجھے خود نہ بلایا ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اس سے پہلے کہ میں تجھے مہمان سمجھنا بھلا دوں تو اپنے ملک کو بھاگ جا۔ میں نے تو سوچا تھا تجھے عالی منصب پر ممتاز کروں گا لیکن تیری قسمت میں یہ تھا ہی نہیں۔"

بلعام نے کہا۔ "میں نے بہت چاہا کہ لعنت کے الفاظ میرے منہ سے نکلیں لیکن نہ نکل سکے۔ میری فال تو یہ کہتی ہے کہ یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا اور اسرائیل میں سے ایک عصا اٹھے گا اور موآب کے نواح کو مار مار کر صاف کر دے گا اور یعقوب ہی کی نسل سے وہ فرماں روا اٹھے گا جو شہر کے باقی ماندہ لوگوں کو نابود کر ڈالے گا۔

"میری ہر ترکیب ناکارہ ہو گئی۔ اب تو ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے تو میرا مشورہ مان اور فاحشہ عورتوں کو مزین کر کے ان کے لشکروں میں بھیج۔ وہ انہیں اپنی طرف مائل کریں۔ شاید وہ بدکاری میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر ایک شخص نے بھی زنا کر لیا تو تیرا کام ہو گیا۔ وہ پھر معاف نہیں ہو سکتے۔ ان عورتوں سے کہو وہ انہیں اپنے دیوتا بعل فغور کی پرستش کی طرف بھی مائل کریں۔

یہ مشورہ دینے کے بعد بلعام اپنے ملک کی طرف واپس چلا گیا۔

بلق واپس گیا اور بلعام کے مشورے پر عمل کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے تمام خوب صورت عورتوں کو بلایا اور انہیں انعام کا لالچ دے کر اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ بنی اسرائیل کے لشکروں میں جائیں اور انہیں نہایت بے حیائی سے اپنی طرف مائل کریں اور ان میں حرام کاری کی عادت ڈال دیں اور جب وہ تمہارے اسیر ہو جائیں تو انہیں "بعل" کی پوجا کی طرف مائل کریں۔ اگر یہ دو کام انہوں نے کر لیے تو ان پر خدا کا غضب ضرور بھڑکے گا۔ جو کام بلعام نہ کر سکا، خدا خود کرے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے لعنتی ہو جائیں گے۔

لشکروں کی راہنمائی اس وقت یوشع کے ہاتھ میں تھی۔ موسیٰ علیہ السلام بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے حضرت یوشع کو یہ ذمے داری سونپ دی تھی کہ وہ اپنی قوم کو فلسطین تک لے کر جائیں۔ چالیس سال کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے خدا کی نافرمانی کی تھی، مر چکے تھے۔ خدا نے کہا تھا کہ یہ لوگ چالیس سال تک بھٹکتے رہیں گے۔ سزا کے یہ دن

پورے ہو گئے تھے لہٰذا اب انہیں پے در پے فتوحات مل رہی تھیں۔ اموریوں کے تمام شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کی عورتیں اور بچے ان شہروں میں آباد تھے۔ حضرت یوشع نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

اس وقت ان کا لشکر یردن کے مشرقی کنارے پر فلسطین کے قریبی شہر ''اریحا'' کے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں حضرت موسیٰؑ نے جاسوس بھیجے تھے۔ ان میں حضرت یوشع بھی شامل تھے۔ اب وہ چالیس سال کے بعد اسی شہر کے سامنے تھے اور خدا کے منتظر تھے کہ کب وہ انہیں فلسطین بھیجنے کا موقع دیتا ہے۔

بنی اسرائیل کی عورتیں اور بچے مفتوحہ شہروں میں تھے اور لڑنے کے قابل لوگ شطیم میں تھے جو اریحا کے مقابل تھا۔

بلق نے اپنے ملک کے کچھ تو ادرات دے کر ان عورتوں کو بنی اسرائیلیوں کی طرف بھیجا۔ وہ قریب کے شہروں میں گئیں، کچھ لشکر میں بھی گئیں۔ یہ عورتیں اس انداز سے گئی تھیں جیسے وہ یہ چیزیں فروخت کرنے آئی ہیں۔

شہروں میں زیادہ تر عورتیں تھیں لیکن وہ مرد بھی تھے جو بیس سال کی عمر سے کم تھے یا کسی وجہ سے لشکر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان نوعمر لڑکوں پر ان عورتوں کا زور چل گیا۔ یہ بھی بنی تھیں اور ایسی ادائیں دکھا رہی تھیں کہ ان لڑکوں کے دل ان کی طرف جھکنے لگے لیکن ڈرتے بھی تھے کہ یہ اگر جسم بیچنے والی ہوتیں تو ٹوکرے اٹھائے اپنے شہروں سے نکل کر چیزیں بیچنے کیوں آتیں۔ ایک دن ایک لڑکے نے ہمت کر کے ان میں سے ایک عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ عورت غصہ کرنے کے بجائے چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی اور بڑے انداز سے بولی۔

''یوں سر بازار ہاتھ کیوں پکڑتے ہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو خود بھی بدنام ہو گے، مجھے بھی بدنام کرو گے۔ اگر کوئی مقصد ہے تو کسی اکیلی جگہ لے چلو۔''

اس لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا ''میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔'' یہاں بھی کیا دیر تھی۔ اس لڑکی نے ٹوکرا اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دی۔ وہ لڑکا اسے ایک محفوظ مقام پر لے گیا۔

''تم ہی مجھ پر عاشق ہوئی ہو یا تمہاری قبیل کی تمام عورتیں یہی عاشقی کا کھیل کھیلتی ہیں؟''

''ہماری چیزیں کوئی روز روز تو خریدتا نہیں ہے۔ اگر تم جیسا کوئی بانکا جوان نظر آتا ہے تو ہم دوسری طرح بھی پیسے کما لیتے ہیں۔ تم جس عورت پر بھی ہاتھ رکھو گے تمہارے ساتھ چلی جائے گی۔ بس ہم بدنامی سے ڈرتے ہیں کیونکہ ہم عزت دار لوگ ہیں۔''

''فکر مت کرو۔ ہمیں یہاں دیکھنے کوئی نہیں آئے گا۔''

وہ عورت وہاں سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ اس کی جیب میں پیسے بھی آ گئے تھے اور اس نے وہ بیچ بھی بو دیا تھا جس کے لیے بادشاہ نے اسے بھیجا تھا۔

اس نے اپنی ساتھی عورتوں کو اپنا یہ کارنامہ سنایا تو انہوں نے بھی بتایا کہ ایسا کارنامہ وہ بھی انجام دے چکی ہیں۔ بہت سے مردوں کو انہوں نے خراب کر دیا ہے۔

لشکر میں بھی بڑی خاموشی سے ان عورتوں نے جال بچھا دیا۔ یہاں نگرانی سخت تھی اس لیے ان عورتوں کو احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ شہروں میں اس کے برعکس تھا لیکن جب لشکر کے مردوں کی اکثریت اس فعل میں مبتلا ہو گئی تو کسی کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ شہروں کا حال اس سے بھی برا تھا۔ یہاں قبیلوں کے سردار خود ان عورتوں کے فریب میں پھنس گئے تھے۔ ان کے بڑے بڑے مکانات ان عورتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ اتنے بے بس ہو گئے کہ ان کے دیوتاؤں کی قربانیوں میں جانے لگے اور ان عورتوں کی خوشنودی کے لیے ان کے دیوتاؤں کو سجدہ کرنے لگے۔

تھوڑی دیر کے لیے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ قوم وہی پہلی والی قوم بن چکی ہے جو خدا کی نافرمانی کرتی تھی۔ جب کسی قوم کے بڑے برائیوں میں مبتلا ہو جائیں تو اس قوم کا سدھرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہوتا پھر اس قوم کو خدا اپنے قہر کا نشانہ بناتا ہے۔

اسرائیلیوں کے بڑے بڑے سردار دیوتاؤں کی پرستش کرتے گئے اور ان عورتوں کے ہتھے چڑھ گئے اور عیش گاہوں میں داد عیش دینے لگے تو ان کے علاقوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ سیکڑوں آدمی روزانہ اس وبا کا شکار ہو کر مرنے لگے۔

اسرائیلیوں میں ہر طرف گریہ وزاری کا شور بلند ہونے لگا۔ کیا ہمارے اجداد اس لیے مصر سے نکلے تھے کہ وہ خود بھی بیابان میں مارے گئے اور اب ہمارے لیے بھی موت کے پیغام آ رہے ہیں۔

قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس خیمۂ اجتماع کے دروازے پر آتی تھی اور زار و قطار روتی تھی کہ وہ اس قہر سے

نجات دلائیں۔

ایک روز بنی اسرائیل کی ایک جماعت خیمۂ اجتماع کے دروازے پر رو رہی تھی کہ آل شمعون بن یعقوب کا سردار زمری بن شلوم ایسی ہی ایک فاحشہ عورت ''کسبی'' کو ساتھ لیے ہوئے ان لوگوں کے سامنے سے گزرا۔

''تم نے دیکھا، یہ بڑے بڑے سردار کس طرح دیدہ دلیری سے فاحشہ عورتیں لانے لگے ہیں۔ انہیں ہمارا ذرا بھی خوف نہیں۔ ہم پر خدا کا قہر انہی لوگوں کی وجہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ کیا ہم میں سے کسی میں بھی اتنی طاقت نہیں کہ ان سرداروں کو روک سکے۔''

ان لوگوں کے درمیان الیعزر کا بیٹا اور حضرت ہارون کا پوتا فیخاس بھی کھڑا تھا۔ اس نے یہ پکار سنی تو اس کی غیرت نے جوش مارا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں برچھا تھا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور زمری کے پیچھے چل دیا۔ زمری اس عورت کو لے کر اپنے خیمے میں گیا ہی تھا کہ فیخاس ان کے سروں پر پہنچ گیا۔

''زمری! تم کیا سمجھتے ہو، خدا نے ایسے لوگ پیدا ہی نہیں کیے جو تمہیں اس برائی سے روکیں؟''

''میں جو بھی کروں، اس سے دوسروں کو کیا مطلب؟''

''تم لوگوں کی وجہ ہی سے پوری قوم پر عذاب آیا ہوا ہے۔ دیکھتے نہیں طاعون پھیل گیا ہے۔''

''یہ تو ایک بیماری ہے۔ اس سے میری کسبی کا کیا تعلق۔'' اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی عورت کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

بس یہی موقع تھا جب فیخاس اپنی غیرت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کے برچھے نے زمری اور اس عورت کا پیٹ چیر دیا۔

اس نے زمری کی لاش کو اپنے برچھے میں لگایا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک دوسرے بنی اسرائیل بھی خیمے کے باہر جمع ہو چکے تھے۔

اس نے آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا۔ ''اے اللہ! جو تیری نافرمانی کرے، ہم اس کا ایسا ہی حال کرتے ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

''میں نے فیخاس بن الیعزر بن ہارون کا غصہ قبول کیا۔ اس کی غیرت پر مجھے پیار آیا۔ میری غیرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ میں بنی اسرائیل کو نابود کر دیتا لیکن فیخاس کی غیرت نے میرے قہر کو بنی اسرائیل پر سے ہٹا دیا۔ سو تو اس سے کہہ دے کہ میں نے اس سے اپنا صلح کا عہد باندھا اور وہ اس کے لیے اور اس کے بعد اس کی نسل کے لیے کہانت (کاہن) کا دائمی عہد ہوگا۔ کاہن کا عہدہ اس کی نسل میں چلتا رہے گا۔''

فیخاس کی غیرت نے بنی اسرائیل کے لیے کفارہ دیا۔

بنی اسرائیل پر سے وبا کا سایہ ہٹ گیا۔ اس وقت تک چوبیس ہزار سے زیادہ اسرائیلی مر چکے تھے۔

اس وبا کے ٹل جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسری مرتبہ مردم شماری کرائی۔ انہوں نے بیس برس اور اس سے اوپر اوپر کے آدمیوں کو اس طرح گنا جیسا کہ انہوں نے اس وقت گنا تھا جب وہ ملک مصر سے نکل کر آئے تھے۔

اس وقت یہ ظاہر ہو گیا کہ ان لوگوں میں سے اب کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا جنہیں دشت سینا میں گنا تھا۔ خداوند نے ان کے حق میں کہہ دیا تھا کہ وہ یقیناً بیابان میں مر جائیں گے۔ اس وقت کے صرف وہ بنی اسرائیل باقی بچے تھے جو دشت سینا میں پہلی مردم شماری کے وقت بیس سال سے کم عمر کے تھے یا پھر یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یوشع باقی بچے تھے۔ انہی لوگوں کا لشکر بنانا تھا اور انہیں یوشع کی نگرانی میں جانا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر اب ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ اسرائیلی یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نئی فتوحات کا انتظار نہیں کر رہے ہیں بلکہ جو ممالک فتح ہو چکے ہیں اس کے لیے قبائل کو وصیت کر رہے ہیں کہ کس کو کتنی زمین اور کون سا علاقہ ملے گا۔ اس سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں زیادہ دن زندہ رہنے والے نہیں۔ وہ اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے ہیں اور اب آئندہ جو کام بھی ہوں گے، وہ حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں گے۔

خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت کی۔

''جس زمین پر تم نے قبضہ کیا ہے، اسے مردم شماری کے مطابق ان لوگوں میں میراث کے طور پر بانٹ دو۔ جس قبیلے میں زیادہ آدمی ہوں، اسے زیادہ حصہ ملے اور جس میں کم ہوں، اسے کم حصہ ملے۔ ہر قبیلے کی میراث اس کے گنے ہوئے

آدمیوں کے شمار پر موقوف ہو۔ یہ سب زمین قرعہ اندازی سے تقسیم کی جائے۔ وہ اپنے آبائی قبیلوں کے ناموں کے مطابق میراث پائیں گے۔ خواہ زیادہ آدمیوں کا قبیلہ ہو یا کم آدمیوں کا، قرعہ سے ان کی میراث تقسیم کی جائے۔"

اس مرتبہ بنی اسرائیل خود نہیں بہکے تھے بلکہ انہیں بہکایا گیا تھا اور یہ بہکانے والی وہ عورتیں تھیں جنہیں بلعام کے مشورے سے بلق بادشاہ نے اسرائیلیوں کے درمیان بھیجا تھا لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اس سے پہلے کہ تم فلسطین میں داخل ہو، مدیانیوں سے بنی اسرائیل کا انتقام لو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے فرمایا۔ "یہی وہ قوم تھی جن کی عورتیں تم پر طاعون کی وبا لانے کا سبب بنی تھیں۔ تم اٹھو اور ان سے بدلہ لو۔ اپنے میں سے جنگ کے لیے آدمیوں کو مسلح کرو اور اسرائیل کے سب قبیلوں میں سے فی قبیلہ ایک ہزار آدمی لے کر جنگ کے لیے بھیجنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی کے مطابق بارہ قبیلوں میں سے بارہ ہزار کا لشکر تیار کیا اور انہیں مدیانیوں کی طرف بھیجا تاکہ ان سے جنگ کریں اور ان کے مردوں اور عورتوں کو قتل کریں۔

اس جنگ میں بھی بنی اسرائیل کو فتح ملی۔ وہاں کا بادشاہ بلق اور دوسرے بڑے بڑے سردار قتل ہوئے لیکن شاید بنی اسرائیل کے دل میں پھر کھوٹ آ گیا تھا کہ انہوں نے مردوں کو تو قتل کیا لیکن ان کی عورتوں کو اسیر بنا کر لے آئے۔

جب اس طرح قیدی عورتوں کو لے کر اس لشکر گاہ میں پہنچے جو "اریحا" کے مقابل یردن کے کنارے موآب کے میدان میں تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ قیدی عورتوں کو دیکھا تو غصے کا اظہار کیا۔

"کیا تم نے سب عورتیں بچا رکھی ہیں؟ کیا یہ وہی نہیں ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل سے خداوند کی حکم عدولی کرائی اور خداوند کی جماعت میں وبا پھیلی۔ اس لیے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں، ان کو قتل کر ڈالو لیکن ان لڑکیوں کو جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں، انہیں اپنے لیے زندہ رکھو۔"

ان لوگوں کو سات دن تک لشکر گاہ کے باہر ہی روکا گیا اور ساتویں دن ان سے کہا گیا کہ اب وہ خود کو پاک سمجھیں اور غسل کر کے اندر آئیں۔

جو لوٹ کا مال آیا تھا اسے شمار کیا گیا اور اس کا ایک حصہ ان مردوں کو دیا گیا جو لڑائی میں گئے تھے اور دوسرا حصہ عام بنی اسرائیل کو دیا گیا۔

غرض جو کچھ خدا نے پہلے ہی شریعت دیتے ہوئے بتا دیا تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم کس طرح ہوگی، اسی طرح کی گئی۔

خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ مدیانیوں سے بدلہ لینے کے بعد تیرا کام ختم ہو جائے گا اور تو اپنے لوگوں کے پاس جانے کی تیاری کرے گا جس طرح ہارون چلا گیا۔

حضرت یوشع بھی دیکھ اور سمجھ رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اب ان کے ساتھ زیادہ دن رہنے والے نہیں۔ وہ اس نتیجے پر اس لیے نہیں پہنچے تھے کہ عمر زیادہ ہو گئی تھی یا ضعف کا غلبہ تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے کاموں میں عدم دلچسپی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ اب یوشع بن نون سے جب بھی ملاقات کرتے تھے، یردن پار جانے کی تلقین کرتے تھے لیکن گفتگو سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس پار جائیں گے۔

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے دکھ سے کہہ رہے تھے۔ "یوشع! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں بہت جلد تجھ سے الگ ہو جاؤں گا اور تو میرے بعد اس قوم کی قیادت کرے گا اور خدا تیرے ہی ذریعے انہیں ارض موعود پر قابض اور حکمرانی کرے گا۔ تو جب تک زندہ رہے گا، اپنی قوم کی راہنمائی کرتا رہے گا۔"

اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غیب سے یہ آواز بھی سنی۔

"اے موسیٰ! بہت جلد تجھے اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا کیونکہ ہم تجھے اس شرمندگی سے بچانا چاہتے ہیں کہ بہت جلد بنی اسرائیل مجھے بھول جائیں گے اور اجنبی دیوتاؤں کی پرستش کریں گے۔ اس عہد کو توڑ دیں گے جو میں نے ان کے ساتھ باندھا ہے۔ اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں آئین و شریعت کی تمام باتیں کتاب میں لکھ کر خداوند کے صندوق میں رکھوا دے تاکہ یہ باتیں ان پر گواہ رہیں کیونکہ وہ بہت جلد ان باتوں سے پھر جائیں گے۔ تو ان کے سرداروں کو جمع کر کے یہ باتیں ان تک پہنچا دے جو کچھ میں تجھے بتاتا رہا ہوں۔ انہیں ان تک دوبارہ پہنچا دے اور انہیں فرمانبرداری کی برکتوں اور نافرمانی کی لعنتوں سے آگاہ کرتا رہ۔"

حضرت یوشع اردن کے اس پار جانے کے لیے تیاری مکمل کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

''جو کچھ تمہارے خدا نے ان دو بادشاہوں سے کیا، ایسا ہی اس پار ان سب سلطنتوں کا حال کرے گا جہاں تو جا رہا ہے۔ تم ہرگز نہ ڈرنا کیونکہ تمہاری طرف سے خدا جنگ کر رہا ہے۔''

حضرت یوشع کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اردن کے پار اس وقت جائیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ اس لیے ابھی وہ لشکر کو روانگی کا حکم نہیں دے رہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جیسے جیسے یہ احساس ہوتا جا رہا تھا کہ خدا انہیں اردن کے پار نہیں پہنچانا چاہتا، ویسے ویسے ان کے دکھ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چالیس سال سے اس قوم کے ساتھ تھے اور اب منزل پر پہنچنے کا وقت آ رہا تھا تو ان سے کہا جا رہا تھا کہ اب یوشع قوم کی راہنمائی کریں گے اور موسیٰ اردن پار نہیں جا سکتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اجداد کی زمین دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ کئی مرتبہ درخواست کر چکے تھے لیکن جواب یہی ملا تھا کہ تمہیں اس سرزمین میں جانا نصیب نہیں ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر نہایت عاجزی سے درخواست کی۔

''میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے پار جانے دے کہ میں بھی اس اچھے ملک کو جو اردن کے پار ہے اور اس خوش نما پہاڑ اور لبنان کو دیکھوں۔''

جواب یہی آیا۔ ''تو اس پار نہیں جا سکتا۔ ہاں اگر تو اس ملک کو دیکھنا ہی چاہتا ہے تو کوہ پسگہ کی چوٹی پر چڑھ جا اور مغرب اور شمال اور جنوب اور مشرق کی طرف نظر دوڑا کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام کو ساتھ لیا اور پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور پھر حضرت یوشع دیکھ رہے تھے کہ ایک سو بیس سال کی عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر بھی بالکل ٹھیک ہے اور پہاڑ پر یہ آسانی چڑھ بھی رہے ہیں۔

جب یہ دونوں پہاڑ پر چڑھ چکے اور اردن پار کے مناظر اچھی طرح دیکھ چکے تو خدا نے کلام کیا۔

''اس ملک کو جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے، اچھی طرح دیکھ لے کیونکہ اب تو بھی اپنے بھائی ہارون کی طرح اپنے لوگوں کو جا ملے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ''اے خدا! جب تو نے میری قوم کو وادی ''تیہ'' میں بھٹکنے کو چھوڑ دیا تھا تو میرے لیے بھی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ میں بھی قوم کے ساتھ ہی رہوں گا تاکہ ان میں وعظ و تلقین کرتا رہوں۔ اب جبکہ میں نہیں رہوں گا تو کسی آدمی کو مقرر کر دے تاکہ خداوند کی جماعت ان بھیڑوں کے مانند نہ رہے جن کا کوئی چرواہا نہیں۔''

''تو نون کے بیٹے یوشع کو اپنا جانشین مقرر کر۔ اسے لے کر العیزر کاہن کے سامنے جا اور ساری جماعت کے سامنے اسے وصیت کر۔ اسی کے کہنے سے بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے لوگ نکلا کریں اور اسی کے کہنے سے لوٹا کریں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اترے۔ خیمۂ اجتماع کے سامنے سب لوگوں کو جمع کیا۔ جب سب لوگ آ گئے تو حضرت یوشع کو طلب کر کے العیزر بن ہارون کاہن کے سامنے انہیں کھڑا کیا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔

''آج سے یوشع کا حکم میرا حکم ہوگا۔ تم اسی کے حکم سے جنگ کے لیے نکلا کرو گے اسی کے حکم سے لوٹا کرو گے اور جب اس ملک میں جاؤ گے تو جو مال غنیمت ملے گا، اسے یوشع کے حکم ہی سے تقسیم کیا جائے گا۔ اس میں ہرگز جھگڑا نہ کرنا۔''

حضرت یوشع بن نون کو جانشین مقرر کر دیا گیا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اب بھی وحی اتر رہی تھی۔ سلسلہ ٹوٹا نہیں تھا۔ اب اس کلام الٰہی کا تعلق زیادہ تر اردن پار کرنے کے بعد کے واقعات سے تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایات دی جا رہی تھیں کہ تو قوم کو بتا دو کہ اردن پار کرنے کے بعد انہیں کیا کرنا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت پابندی سے ان ہدایات کو قوم تک پہنچا رہے تھے۔

''جب تم اردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو خداوند کہتا ہے کہ تم اس ملک کے سب باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اور ان کے شبیہہ دار پتھروں کو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے سب اونچے مقاموں کو مسمار کر دینا اور تم اس ملک پر قبضہ کر کے اس میں بسنا کیونکہ میں نے وہ ملک تم کو دیا ہے اور تم قرعہ ڈال کر اس ملک کو اپنے گھرانوں میں میراث کے طور پر بانٹ لینا۔

''تم وہاں جا کر پناہ کے شہر مقرر کرنا تاکہ وہ خونی جس سے سہو اً خون ہو جائے، وہاں بھاگ کر جا سکے۔ ان شہروں میں تم کو انتقام لینے والے سے پناہ ملے گی تاکہ خونی جب تک فیصلے کے لیے جماعت کے آگے حاضر نہ ہو تب تک مارا نہ جائے۔

''جب خداوند تیرا ... تجھ کو اس ملک میں پہنچائے جسے تجھ کو دینے کی قسم اس نے تیرے باپ دادا سے کھائی۔ اچھے اچھے شہر، انگور کے باغ، زیتون کے درخت اور حوض عطا کرے تو اپنے اس خدا کو نہ بھول جانا جو تجھے مصر سے نکال کر لایا۔ تو اسی کی عبادت کرنا اور اسی کے نام کی قسم کھانا اور تم ان قوموں کے معبودوں کی جو تمہارے آس پاس نہیں ہیں، ہرگز پیروی نہ کرنا۔ خدا کے حکموں اور شہادتوں اور آئین کو جو اس نے تجھ کو فرمائے ہیں ماننا۔

''جب آئندہ زمانے میں تیرے بیٹے تجھ سے سوال کریں کہ جن شہادتوں اور آئین اور فرمان کے ماننے کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے ان کا مطلب کیا ہے تو اپنے بیٹوں کو یہ جواب دینا کہ جب ہم مصر میں فرعون کے غلام تھے تو خدا ہم کو مصر سے نکال لایا تاکہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے جس کے دینے کی قسم اس نے ہمارے باپ دادا سے کھائی تھی۔ اس کے حوالے میں خدا نے اپنے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ ہم کو زندہ رکھے۔

''جب خدا تجھے اس ملک میں پہنچا دے جس پر تو قبضہ کرنے جا رہا ہے اور تیرے آگے سے ان بہت سی قوموں کو تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں، نکال دے تو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا۔ تو ان سے کوئی عہد نہ باندھنا اور نہ ان پر رحم کرنا۔ تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا کیونکہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گی تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں۔ یوں خدا کا غضب تم پر بھڑکے گا اور وہ تم کو جلد ہلاک کر دے گا۔ ان سے تم یہ سلوک کرنا کہ ان کے مذبحوں کو ڈھا دینا۔ ان کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دینا۔''

کوہ سینا کی چوٹی سے اترنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دستور سا بن گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو نصیحت کریں۔ وہ قوم کو حرام حلال کی تمام تفصیل بتا چکے تھے لیکن اب لگتا تھا کہ شدومد سے ان تفصیلات کی یاددہانی کرا رہے ہیں۔ اب وہ اس کا بھی انتظار نہیں کر رہے تھے کہ لوگ ان کے پاس خود چل کر آئیں بلکہ وہ مختلف قبائل کے پاس خود چل کر جا رہے تھے، ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ پوری قوم کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ دنوں کے مہمان ہیں لہٰذا وہ بھی ان سے کرید کرید کر باتیں پوچھ رہے تھے۔

وہ مختلف خطابات میں بتا رہے تھے کہ ان کے لیے کن چیزوں کی ممانعت ہے اور کن چیزوں کی اجازت ہے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ انہیں نئے ملک میں جانے کے بعد کس طرح زندگی گزارنی ہے۔ یہ بتانا اس لیے ضروری تھا کہ نئے شہروں کا عیش و عشرت کا ماحول کہیں انہیں بھٹکا نہ دے۔

جو قبیلہ جس اخلاقی مرض میں مبتلا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قبیلے میں جا کر اسی کے مطابق تقریر کرتے۔ کوئی قبیلہ بت پرستی کی طرف مائل تھا۔ اس سے خطاب کرتے ہوئے اس مرض کی طرف توجہ دلاتے۔

''جب خداوند تیرے سامنے سے ان قوموں کو اس جگہ جہاں تو ان کا وارث ہونے کو جا رہا ہے، کاٹ ڈالے اور تو ان کا وارث ہو کر ان کے ملک میں بس جائے تو خبردار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا وارث ہو کر ان کی پیروی کرے اور ان کے دیوتاؤں کے بارے میں یہ دریافت کرے کہ یہ قومیں کس طرح سے اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتی تھیں، میں بھی ایسا کروں۔ نہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرنا اور نہ دوسروں کو کرنے دینا۔ اگر تجھے معلوم ہو کہ کچھ لوگ، لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں تو انہیں ہرگز جیتا نہ چھوڑنا۔ خدا کی غیرت یہ کبھی نہیں چاہے گی کہ تو اس کی ذات میں کسی اور کو شریک کرے۔ تو اس کی غیرت کو ہرگز آواز نہ دینا بلکہ اسے خوش رکھنا تاکہ وہ بھی تجھے پھلنے پھولنے دے اور تیری اولاد میں تجھے برکت دے۔''

کئی قبائل ایسے تھے جس میں حلال حرام جانوروں کی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

''چوپایوں میں سے تم جن چوپایوں کو کھا سکتے ہو، وہ یہ ہیں یعنی گائے، بیل، بھیڑ اور بکری اور ہرن، نیل گائے اور جنگلی بھیڑ۔ چوپایوں میں جس جس کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی بھی کرتا ہو تم اسے کھا سکتے ہو۔

ایک قبیلے میں خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''ہر سات سال کے بعد تو چھٹکارا دیا کرنا۔ چھٹکارا دینے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنے پڑوسی کو کچھ قرض دیا ہو تو وہ اسے چھوڑ دے اور اس کا مطالبہ نہ کرے۔ پردیسی سے تو اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

''تیرے درمیان کوئی کنگال نہ رہے کیونکہ خداوند تجھ کو اس ملک میں ضرور برکت بخشے گا۔ جو ملک تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے اگر اس میں کہیں تیرے بھائیوں میں سے کوئی مفلس ہو تو اپنے بھائیوں کی طرف سے نہ اپنا دل سخت کرنا اور نہ اپنی مٹھی بند کر لینا۔''

''جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو جائے اور گھوڑوں اور رتھوں اور اپنے سے بڑی فوج کو دیکھے تو ان سے ڈرنہ

Digitized by Google

جانا کیونکہ خدا جو تجھے مصر سے نکال لایا، تیرے ساتھ ہے۔

''جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا اور اگر وہ تجھ کو صلح کا پیغام دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں۔ اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو، تو اس کا محاصرہ کرنا۔

''جب تو کسی شہر کو فتح کرنے کے لیے اس سے جنگ کرے اور مدت تک اس کا محاصرہ کیے رہے تو اس کے درختوں کو کلہاڑی سے نہ کاٹ ڈالنا کیونکہ ان کا پھل تیرے کھانے کے کام آئے گا۔ جب تو شہر فتح کرلے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا لیکن عورتوں، بچوں، چوپایوں کو اپنے لیے رکھ لینا۔

''اگر لوٹ میں آئی ہوئی کسی عورت پر تو فریفتہ ہو جائے اور شادی کرنا چاہے تو ایک دم سے مت کرلینا بلکہ پہلے وہ عورت اپنا سر منڈوائے اور اپنے ناخن ترشوائے اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینے تک اپنے ماں باپ کے لیے ماتم کرے۔ اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر بننا۔ اگر وہ تجھ کو نہ بھائے تو وہ جہاں جائے اسے جانے دینا۔ اسے روپے کی خاطر ہرگز مت بیچنا۔

''جب تو اس ملک میں جسے تیرا خدا میراث کے طور پر دیتا ہے، پہنچے اور اس پر اچھی طرح قابض ہو جائے اور اس میں بس جائے اور اس زمین میں جو کاشت کرے، اس کے پہلے پھل کو اس جگہ لے جانا جسے تیرا خدا اپنے نام کے مسکن کے لیے چنے اور کاہن کے روبرو کہنا۔ خداوند قوی ہاتھ معجزوں کے ساتھ ہمیں مصر سے نکال لایا اور ایک ایسے ملک میں آباد کیا جس میں شہد اور دودھ بہتا ہے۔ سو اب جو زمین تو نے مجھے دی ہے اس کا پہلا پھل میں تیرے پاس لے آیا ہوں۔''

اس طرح کے کئی قواعد و ضوابط آپ نے قوم کے سامنے بیان کیے اور پھر انہیں حکم دیا۔

''جتنے حکم میں تم کو دیتا ہوں، ان سب کو ماننا اور جس دن تم اردن پار کر کے اس ملک میں پہنچو تو بڑے بڑے پتھر کھڑے کر کے ان پر چونے کی استرکاری کرنا اور اس شریعت کی ساری باتیں ان پر لکھنا۔ بے تراشے پتھروں سے وہیں ایک مذبح بنوانا اور سوختنی قربانی دینا۔

''اور جب اردن کے اس پار چلے جاؤ تو ان پر لعنت بھیجنا جو خدا کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ لعنت کے الفاظ یہ کہہ کر ادا کرنا۔

''لعنت اس آدمی پر جو کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔

اور سب لوگ جواب دیں اور کہیں آمین۔

لعنت اس پر جو اپنے پڑوسی کی حد کے نشان کو مٹائے۔

سب لوگ کہیں آمین۔

لعنت اس پر جو اندھے کو راستے سے گمراہ کرے۔

سب لوگ کہیں آمین۔

لعنت اس پر جو پردیسی اور بیوہ اور یتیم کے مقدمے کو بگاڑے۔

لعنت اس پر جو بے گناہ کو قتل کرنے کے لیے انعام لے۔

لعنت اس پر جو اپنے ہمسائے کو پوشیدگی میں مارے۔

لعنت اس پر جو ان شریعت کی باتوں پر قائم نہ رہے۔

اور سب لوگ ان پر آمین کہتے جائیں۔

''اور اگر تو شریعت کی ان باتوں پر عمل کرے گا تو خداوند یا کی سب قوموں میں تجھ کو سرفراز کرے گا۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے چوپایوں کے بچے یعنی گائے بیل اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے مبارک ہوں گے۔ خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں، تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ خداوند تیرے انبار خانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے برکت کا حکم دے گا۔ تو پست نہیں سرفراز ہوگا بشرطیکہ جو حکم میں تجھے دیتا ہوں اسے سنے اور عمل کرے۔ ان میں سے کسی سے داہنے یا بائیں مڑ کر اور معبودوں کی پیروی اور عبادت نہ کرے۔

''اے بنی اسرائیل! اگر تم نے خدا کے احکام پر عمل نہ کیا تو اس کے نتائج سنگین ہوں گے۔ جس سرزمین پر تم جا رہے ہو تم وہاں اکیلے ہوگے۔ میں وہاں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ اس لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا

ہوں کہ اگر تم نے وہاں جا کر من مانی کی تو تم پر لعنتیں نازل ہوں گی۔ تیری اولاد، تیری زمین کی پیداوار، تیرے چوپایوں کے بچے، سب لعنتی ہوں گے۔ تو اندر آتے بھی لعنتی ہوگا اور باہر جاتے بھی۔ جس کام میں تو ہاتھ ڈالے گا، لعنت اور پھٹکار ہی تجھے ملے گی جب تک کہ تو نیست و نابود نہ ہو جائے۔ خداوند تجھ کو تپ دق اور بخار اور سوزش اور شدید حرارت اور تلوار اور بادِ سموم سے مارے گا۔ تیری زمین پیتل کی اور آسمان لوہے کا ہو جائے گا۔ تیری زمین پر بارش کی جگہ خاک اور دھول برسے گی۔

''اگر تو نے نافرمانی کی تو خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک راستے سے جائے گا لیکن سات سات راستوں سے ہو کر بھاگے گا۔ دنیا کی تمام سلطنتوں میں تم مارے مارے پھرو گے۔ کوئی تمہاری لاشوں کو دفن کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ تمہاری لاشیں درندوں اور پرندوں کی خوراک ہوں گی۔

''میں تجھے صاف لفظوں میں بتاتا ہوں کہ خداوند تجھ کو مصر کے پھوڑوں اور بواسیر اور مچلی اور خارش میں ایسا مبتلا کرے گا کہ تو کبھی اچھا نہ ہوگا اور جیسے اندھا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے، ویسے ہی تو دوپہر دن کو ٹٹولتا پھرے گا اور تو اپنے سب دھندوں میں ناکام رہے گا اور تجھ پر ہمیشہ ظلم ہی ہوگا اور کوئی نہ ہوگا جو تجھ کو بچائے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام تنبیہہ کر رہے تھے۔

''عورت سے منگنی، تو کرے گا لیکن اس سے مباشرت کوئی اور کرے گا۔ گھر تو بنائے گا، رہے گا کوئی اور۔ درخت لگائے گا لیکن اس کے پھل استعمال نہ کر سکے گا۔ تیرا بیل تیرے سامنے ذبح کیا جائے گا لیکن تو اس کا گوشت نہ کھا سکے گا۔ تیرا گدھا تجھ سے جبراً چھین لیا جائے گا۔ تیری بھیڑیں تیرے دشمن کے ہاتھ لگیں گی۔

''تیری آنکھوں کے سامنے تیری بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی۔ تیری زمین کی پیداوار ایک ایسی قوم کھائے گی جس سے تو واقف نہیں ہوگا اور تو سدا مظلوم اور دبا ہوا ہی رہے گا۔ خداوند تیرے گھٹنوں اور ٹانگوں میں ایسے برے پھوڑے پیدا کرے گا کہ ان سے تو پاؤں کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک شفا نہ پا سکے گا۔

''خداوند تجھ کو اور تیرے بادشاہ کو جسے تو اپنے اوپر مقرر کرے گا ایک ایسی قوم کے بیچ لے جائے گا جسے تو اور تیرے باپ دادا جانتے بھی نہیں اور وہاں تو اور معبودوں کی جو محض لکڑی اور پتھر ہیں، عبادت کرے گا۔ تو کھیت میں بہت سا بیج لے جائے گا لیکن تھوڑا سا جمع کرے گا کیونکہ ٹڈی اسے چاٹ لے گی۔ تو تاکستان لگائے گا اور ان پر محنت کرے گا لیکن نہ تو مے (شراب) پینے اور نہ انگور جمع کرنے پائے گا کیونکہ ان کو کیڑے کھا جائیں گے۔ تو زیتون کے درخت لگائے گا ضرور لیکن اس کے پھل جھڑ جائیں گے۔ تیرے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوں گے لیکن وہ تیرے نہیں رہیں گے کیونکہ وہ اسیر ہو کر چلے جائیں گے۔ پردیسی جو تیرے درمیان ہوگا، وہ سرفراز ہوگا اور تو پست سے پست ہوتا جائے گا۔ وہ تجھ کو قرض دے گا پر تو اسے قرض نہ دے سکے گا۔ تو خدا کی بات نہیں سنے گا اس لیے یہ سب آفتیں تجھ پر آئیں گی اور تیرے پیچھے پڑی رہیں گی۔ تو خوش دلی سے اپنے خدا کی عبادت نہیں کرے گا اس لیے بھوکا اور پیاسا اور ننگا رہے گا اور محتاج ہو کر اپنے دشمنوں کی خدمت کرے گا۔ خداوند دور سے بلکہ زمین کے کنارے سے ایک قوم تجھ پر چڑھا لائے گا جیسے عقاب ٹوٹ کر آتا ہے۔ اس قوم کی زبان کو تو نہیں سمجھے گا۔ اس قوم کے لوگ نہ بوڑھوں کا لحاظ کریں گے نہ جوانوں پر رحم کھائیں گے۔ وہ تیرے چوپایوں اور تیری زمین کی پیداوار کو کھاتے رہیں گے جب تک تیرا ناس نہ ہو جائے اور وہ تیرے تمام ملک میں تیرا محاصرہ تیری ہی بستیوں میں کیے رہیں گے۔ جب تک تیری اونچی اونچی فصیلیں جن پر تیرا بھروسا ہوگا، گر نہ جائیں۔ تب اس محاصرے سے تنگ آ کر تو اپنے ہی جسم کے پھل کو یعنی اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کا گوشت جس کو تیرے خدا نے تجھ کو عطا کیا ہوگا، کھائے گا۔ وہ شخص جو تم میں ناز پروردہ اور نازک بدن ہوگا اس کی بھی اپنے بھائی اور اپنی ہم آغوش بیوی اور اپنے باقی ماندہ بچوں کی طرف بری نظر ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے ہی بچوں کے گوشت میں سے جن کو وہ خود کھائے گا، کچھ نہیں دے گا۔ وہ عورت بھی جو تمہارے درمیان ایسی ناز پروردہ اور نازک بدن ہوگی کہ نرمی و نزاکت کے سبب سے اپنے پاؤں کا تلوا بھی زمین سے لگانے کی جرأت نہ کرتی ہو اس کی بھی اپنے پہلو کے شوہر اور اپنی ہی بیٹی بیٹے کی طرف بری نظر ہوگی کیونکہ وہ تمام چیزوں کی قلت کے سبب سے ان ہی کو چھپ چھپ کر کھائے گی۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت..... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

رات کی بڑھتی تاریکی، پودوں سے جاری خنکی اور دھند کے باوجود پارٹی کی گہما گہمی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مشروب کے آتشیں سیال سے بھرے بلوری جام کھنکھنائے جا رہے تھے۔ مصنوعی، ذومعنی قہقہے دائیں بائیں سے امڈ امڈ کر پھیل رہے تھے اور خوشبوئیں آپس میں خلط ملط ہو رہی تھیں جن میں عورتوں کے کاسمیٹک اور بدنوں کی خوشبوئیں بھی شامل تھیں۔ سب چھوٹی بڑی ٹولیوں میں بٹے، اپنے الگ الگ گروہ بنائے خود کو باتوں میں مصروف کرنے کی کوششوں میں مگن تھے۔ صرف ایک لیڈی ایمنڈا تھیں جو اپنے گرد ایک بہت بڑی جماعت کو گھیرے بیٹھی تھیں اور اتنی بڑی جماعت کو گھیر لینے کی طاقت صرف ان میں ہی تھی۔

''وہ پہاڑی لڑکی کہاں جانتی تھی کہ جس کنویں سے وہ روز پانی بھرنے جاتی ہے ایک دن اس کا باپ اس کے عاشق کے ساتھ اسے پکڑ لینے کے بعد اسے مار کر اسی کنویں میں پھینک دے گا۔'' ڈنشین لہجے میں بولتی وہ بات کو بڑے طمطراق سے آگے بڑھا رہی تھیں۔ سارا مجمع جو دم سادھے سن

ایک سچی کہانی کار کی جھوٹی انا اور دوہری شخصیت کا زہریلا کھیل

کچھ لوگ تخیّلاتی قوت سے فرضی کہانیاں تخلیق کرلیتے ہیں مگر... چند ایک لکھاری اتنے خطرناک دماغی خلل میں مبتلا ہوتے ہیں کہ پہلے مطلوبہ کردار تلاش کرکے حقیقی واقعات میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر انہیں داستان کی صورت سنانے کے لیے محفل سجا کر پورے مجمع کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں... وہ بھی خود پرستی کے مرض کا شکار تھی اور اسی زعم میں کتنی ہی زندگیوں سے کھیل گئی تھی۔

کہانی کار

ایمل رضا

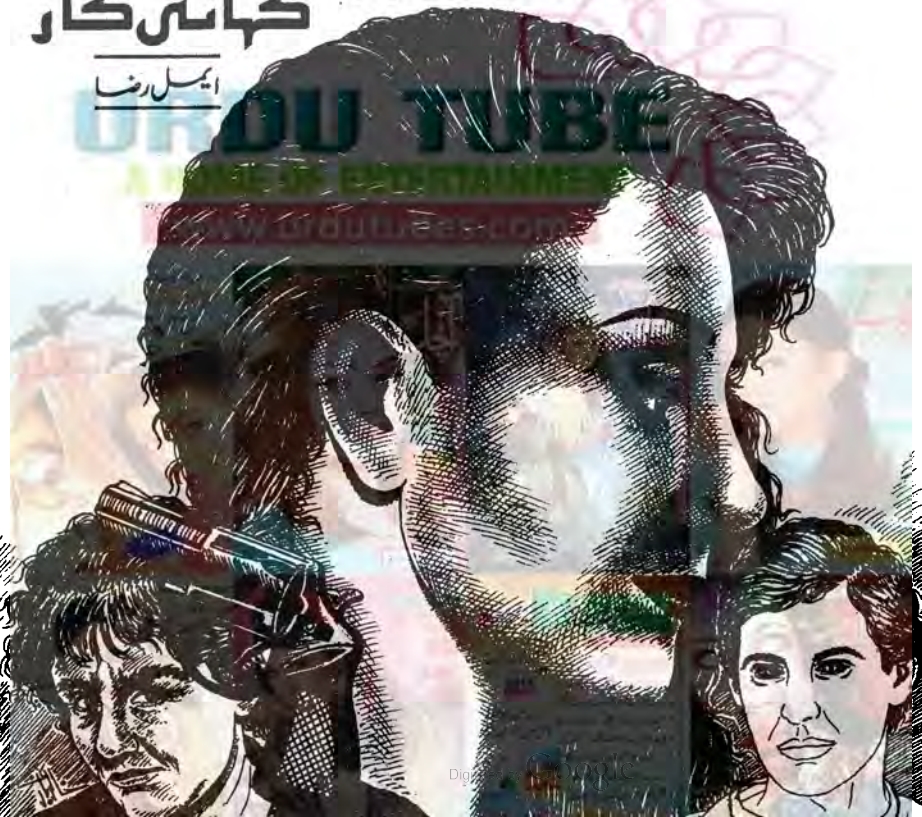

URDU TUBE
A ZONE OF ENTERTAINMENT
WWW.URDUTUBE.COM

رہا تھا..... لڑکی کے اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر افسوس اور دکھ سے بے چین ہو گیا تھا۔

لیڈی ایمنڈا کی یہی خاصیت تھی کہ کہانی کے پُرمزاح موڑ پر وہ بڑی مہارت سے خود کو ہنساتی تھیں اور غمناک موڑ پر ان کی شکل دیکھ کر لگتا تھا جیسے انہیں ان کرداروں پر اس سے بھی زیادہ دکھ ہے جتنا خود ان کرداروں کو بھی نہیں ہوگا۔

''پھر اس کے عاشق کا کیا بنا.....؟'' کسی نے پوچھا۔

''سنا ہے وہ سودائی ہو گیا تھا۔ ابھی تک مارا مارا پھرتا ہے اور ان پہاڑوں میں ایلی، ایلی پکارتا رہتا ہے۔'' یہ بات انہوں نے کچھ ایسی دلکشی سے کہی تھی کہ کہانی کے غمناک کلائمیکس کے باوجود بہت سے مردوں نے اپنے دل تھام لیے..... اور دل ہی دل میں لیڈی ایمنڈا کے پیچھے مارے مارے پھرنے کی قسمیں کھالیں۔

''پاگل عورت .....'' مارگریٹ نے ایک لمبا سپ بھرنے کے بعد لیڈی ایمنڈا کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی ڈیانا اور ہیلن سے کہا تھا۔ یہ گروہ لیڈی ایمنڈا کے مجمعے سے دور بیٹھا تھا۔ جو حقیقتاً تو لیڈی کی باتیں نہیں سن رہا تھا لیکن درحقیقت سن بھی رہا تھا۔

''نجانے کیا ملتا ہے اسے اس طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں سناسنا کر..... جب دیکھو ہر وقت پٹ پٹ کرتی رہتی ہے۔ اتنے افسانے یہ کیسے گھڑ لیتی ہے۔'' ہیلن کو لیڈی کی اداؤں، اس کے لباس، اس کے میک اپ، اس کے مردوں کو گھیر کر بیٹھ جانے سے بہت چڑ تھی۔

''مردوں کو لبھانے کے طریقے ہیں یہ سب.....'' ڈیانا نے کہا..... جبکہ وہ دیکھ سکتی تھی کہ لیڈی ایمنڈا کے گروہ میں جتنے مرد ہیں، اتنی ہی عورتیں بھی ہیں۔ اس کی بات میں سقم تھا۔

لیڈی ایمنڈا اپنی کہانی ختم کر چکی تھیں اور اس کے لومڑی صفت کانوں نے مارگریٹ، ہیلن اور ڈیانا کے جملے بھی سن لیے تھے۔ ڈرنک لینے کا بہانہ کر کے وہ اپنی کرسی سے اٹھیں۔ لباس کی شکنوں کو درست کیا اور ایک بار پھر سے چیک کیا کہ ان کا جوڑا نما ہیئر اسٹائل خراب تو نہیں ہو گیا۔ ان کی لٹوں کی لہریں کچھ زیادہ تو نہیں کھل گئیں۔ تسلی ہونے کے بعد وہ مارگریٹ کے پاس آئیں۔

''ہائے مارگریٹ ..... کیسی ہو میری جان!'' وہ مارگریٹ کی کرسی پر اس کے کندھے تک جھک کر بولیں۔ ''تم نے نہیں سنی میری کہانی..... جو میں ابھی ابھی ایک پہاڑی لڑکی ''ایلی'' کی سنا رہی تھی۔''

''مجھے کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی مارگریٹ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''لگتا ہے تمہیں کہانیاں سنانا بہت اچھا لگتا ہے؟'' ہیسلن نے پوچھا۔

''سنانے کا تو پتا نہیں..... لیکن جو مزہ کہانی بننے میں ہے نا میری پیاری..... وہ میں چاہ کر بھی بیان نہیں کر سکتی.....'' لیڈی نے کہا اور اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپک کر بجھ گیا۔

☆☆☆

''تم آ گئے نائجل (Nigel).....'' لیڈی ایمنڈا پارٹی سے واپس گھر آئی تو سامنے ہی جہازی سائز کے صوفے پر جس کا کپڑا اس طرح سے رنگا گیا تھا کہ اس کی پشت آسٹریلین گائے کی کھال دکھتی تھی، نائجل بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''جی آنٹی..... میں رات ہونے سے پہلے یہاں موجود تھا۔'' نائجل ان کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا..... لیڈی نے بغور نائجل کو دیکھا۔ انہیں نائجل کی یہ ادا اچھی لگی تھی۔ کمزور سے بادامی طرز کے چہرے پر چندھی چندھی آنکھوں والا نائجل انہیں پسند آیا تھا۔ ایک خوبرو نوجوان جو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ تمیز دار بھی تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں..... تم آئے تو میں یہاں موجود نہیں تھی۔ جبکہ یہ بات میرے اصولوں کے خلاف ہے کہ میرے گھر میں کوئی مہمان آئے اور میں گھر سے باہر ہوں۔'' لیڈی ایمنڈا اپنے ہاتھوں کے سنہری دستانے اتارتے ہوئے بولیں۔ ''لیکن ..... پارٹی میں جانا بھی ضروری تھا۔ تم تو سمجھ سکتے ہو کہ آج کے دور میں سوشل ہونا کتنا ضروری ہو گیا ہے۔ پھر وہاں لوگوں نے فرمائش کر دی کہ میں انہیں کوئی کہانی سناؤں..... سب کو معلوم جو ہے کہ میرے پاس بہت سی کہانیاں ہوتی ہیں۔'' لیڈی ایمنڈا کہہ کر خود ہی دل کھول کر ہنسیں..... نائجل نے بھی پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کا ساتھ دیا تھا۔

''بس اسی میں اتنی دیر ہو گئی..... ویسے میں نے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں لیٹ ہو جاؤں تو وہ تمہارا خیال رکھے..... لیکن تم نے تو..... میرے خیال سے لباس بھی نہیں تبدیل کیا اور شاید تم ابھی تک کمرے میں بھی نہیں گئے۔'' انہوں نے نائجل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اب وہ اپنے جوڑے کی پن کھول چکی تھیں اور سنہری دھاگوں جیسے بال ان کے کندھوں پر لہرانے لگے تھے۔

''جی ملازم نے تو کہا تھا..... لیکن میں نے کہا کہ میں

آنٹی کا انتظار کروں گا۔" نائجیل نے مؤدب انداز سے سر جھکا کر کہا۔ لیڈی کو پھر تعریفی نظروں سے نائجیل کی طرف دیکھنا پڑا۔

"تم بالکل اپنی ماں پر گئے ہو نائجیل..... ایلیوشا پر..... اس کا پیار کرنے کا انداز بھی ایسا ہی تھا۔ پُرخلوص محبت کرتی تھی وہ سب سے..... جسے آج کے دور میں بے وقوفی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔" ایمنڈا نے دکھ سے ایلیوشا کا ذکر کیا، ماں کا نام سن کر نائجیل بھی آبدیدہ ہوگیا۔

"افسوس..... کسے پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ خدا کے کاموں میں آج تک بول ہی کون سکا ہے۔" لیڈی ایمنڈا نے ہنکارا سا بھر کر خود کو تسلی دی اور نارمل کیا۔ "خیر تم اس گھر کو بالکل اپنا ہی گھر سمجھو..... دل لگا کر اپنی پڑھائی کرو۔ کچھ بن جاؤ گے تو میں سمجھوں گی کہ بزرخ میں ایلیوشا کی روح کو میری طرف سے پھول پیش کیے گئے ہیں۔"

نائجیل لیڈی ایمنڈا کے منہ سے اپنی ماں کے بارے میں اتنے نیک خیالات سن کر بہت مسرور ہوا اور پھر لیڈی کے کہنے پر اوپر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ ٹرین کے سات گھنٹوں کی تھکن اس کے اعصاب پر سوار تھی پھر اوپر سے وہ پچھلے ایک گھنٹے سے لیڈی ایمنڈا کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ اس کا تھکن اتارنے کے لیے نہانے کا ارادہ تھا لیکن نیند اس پر کچھ اس طرح سوار تھی کہ وہ جیکٹ اور شرٹ اتار کر دھم سے بیڈ پر گر کر سونے کے لیے لیٹ گیا..... حتیٰ کہ لائٹ بند کرنا بھی بھول گیا۔

صبح ملازم کے دروازے پر زور زور سے دستک دینے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے ٹائم پیس میں ٹائم دیکھا تو صبح کے دس بج چکے تھے۔ وہ گیارہ گھنٹے کی نیند لے چکا تھا پھر بھی اس کے اعصاب ابھی تک تھکے ہوئے تھے۔ نہا کر وہ کچھ فریش ہوا..... پھر نیچے آیا تو لیڈی ایمنڈا اس کا ناشتے پر انتظار کر رہی تھیں۔

"تم کچھ زیادہ ہی سو لیے..... اس لیے مجھے ملازم کو بھیجنا پڑا۔ مجھے ذرا مارکیٹ کے لیے نکلنا تھا اور میں چاہتی تھی کہ اس گھر میں پہلا ناشتا تمہارے ساتھ کروں....."

"آپ کا شکریہ آنٹی....." وہ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تمہیں رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی؟" لیڈی ایمنڈا نے نائجیل کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کمرا آرام دہ نہیں تھا.....؟ جبکہ میں نے ملازم کو خاص تاکید کی تھی کہ وہ کمرے کو ٹھیک رکھے..... تمہیں اتنی سردی کی عادت نہیں ہے نا۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں..... کمرا ہر طرح سے آرام دہ تھا..... لیکن..... کچھ آوازیں مجھے رات بھر تنگ کرتی رہی ہیں۔ میرے خیال سے شاید آپ کے پڑوس میں کوئی رات گئے تک مسلسل جھگڑتا رہا ہے۔"

"اوہ..... اچھا..... میں سمجھ گئی۔ وہ شارلٹ ہوگی اور اس کا شوہر گیبریل..... دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا آئے روز کا ڈراما ہے۔ جب وہ لڑتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا میں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی رہتا ہے۔ شارلٹ تو زیادہ تر خاموش ہی رہتی ہے۔ میں نے ہمیشہ گیبریل کی ہی آوازیں سنی ہیں۔ لڑتے وقت اس کی آواز ایسی کرخت ہو جاتی ہے جیسے جنگل میں شیر کسی آہنی پھندے میں آجائے لیکن جب بھی شارلٹ کا ضبط جواب دے جاتا ہے تو پھر وہ بھی بادلی بلی کی طرح چنگھاڑنے لگتی ہے۔ میں صرف خدا ترسی کی وجہ سے پولیس کو ان دونوں کی شکایت نہیں کر رہی..... ورنہ یہ دونوں سوسائٹی میں نظر نہ آئیں۔" لیڈی نے توس پر چیری کے سرخ جیم کی ایک موٹی تہ لگا کر نائجیل کی طرف بڑھایا۔ نائجیل نے خلوص سے ان کو دیکھتے ہوئے توس پکڑ لیا۔ ایک عرصے بعد اسے کسی نے اس طرح سے توس پیش کیا تھا۔

"جب دو لوگ آپس میں خوش نہیں ہیں تو پھر وہ الگ کیوں نہیں ہو جاتے۔" جیم سے بھرا توس کھاتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

"دراصل شارلٹ کے باپ نے کسی زمانے میں گیبریل سے دس لاکھ ڈالرز کا قرض لیا تھا۔ مرتے وقت اس کے باپ کے پاس قرض لوٹانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ گیبریل نے شارلٹ کے باپ سے شارلٹ کا ہاتھ مانگ لیا..... اور اس طرح دونوں کی شادی ہوگئی۔ اب اگر شارلٹ، گیبریل سے طلاق لیتی ہے تو اسے دس لاکھ ڈالرز گیبریل کو واپس کرنے ہوں گے۔ یہ بات وہ جانتی ہے اسی لیے گیبریل جیسے آدمی کے ساتھ رہ رہی ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو..... اگر ان لوگوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو مجھے مجبوراً ان کی شکایت کرنا ہو گی۔" لیڈی ایمنڈا نے اس کے آرام اور پڑھائی کے خیال میں خلل کا سوچتے ہوئے کہا۔

"جی یہ ہی بہتر ہے..... ورنہ تو یہ لوگ مجھے روز رات کو سونے نہیں دیں گے۔"

لیکن اس رات شارلٹ کے گھر میں سکون رہا۔ کسی طرح کے لڑائی جھگڑے کی آوازیں نہیں آئی تھیں۔ صبح وہ

جمائیاں لیتا ہوا اپنی کھڑکی تک آیا تو اس نے شارلٹ کو اپنے گھر کے باغ کی گھاس برابر کرتے دیکھا۔ شارلٹ نے اس وقت سفید نائٹی پہن رکھی تھی جس میں اس کا جسم ڈھکا ہوا ہونے کے باوجود بھی بے لباس لگ رہا تھا۔

وہ نجانے کتنی دیر تک وہاں کھڑا رہا تھا۔ اچانک شارلٹ نے بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ نائجل اس اچانک حملے سے گھبرا گیا تھا۔ لیکن شارلٹ نے جب اس کی طرف صبح کی خیر مقدمی سی مسکراہٹ اچھالی تو اس کی ساری تھکن جاتی رہی، وہ وہیں جم کر کھڑکی میں کھڑا رہا اور بدلے میں خود بھی دل کھول کر مسکرایا۔

اگلے پورے ہفتے تک شارلٹ کے گھر میں سکون رہا۔ اپنے کمرے میں پڑھائی کرتے کرتے جب وہ تھکن محسوس کرتا تو کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ جہاں سے اسے اکثر و بیشتر شارلٹ نظر آ جاتی تھی۔ کپڑے دھو کر سکھانے کے لیے باہر ڈالتی ہوئی، صفائی کرتی ہوئی، گھر کے لیے سامان لاتی ہوئی..... جب جب دونوں کی نظریں ملتی تھیں شارلٹ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دیتی..... اس کی مسکراہٹ بڑی زہر آلود، بڑی زخم خوردہ سی ہوتی تھی۔ خوشیوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی مسکراہٹ..... ایسے لمحوں میں نائجل کو شارلٹ کو دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔

ایک ہفتے کے سکون کے بعد اچانک رات گئے پھر نائجل کا سکون غارت ہو گیا۔ خاموشی میں جیسے بھیڑیوں کی چیخ و پکار سنائی پڑتی تھی۔ یہ ایک ہفتے کا سکون بھی اس لیے تھا کہ شارلٹ کا شوہر گیبریل کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور اب وہ آتے ہی ایک ہفتے کی غیر حاضری کی کسر پوری کر رہا تھا جس کے باعث سوتے میں نائجل کی آنکھ کھل گئی تھی۔

ذہنی خلفشار یا ایک چھپے ہوئے تجسس کے تحت نائجل نے کھڑکی کھول کر دیکھا کہ سامنے والے گھر میں کیا ہو رہا ہے..... لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ شاید گیبریل اب لڑ کر سونے کے لیے چلا گیا تھا اور اب کمرے میں بس شارلٹ بیٹھی تھی..... سفید اجلے لباس میں نفیس سا میک اپ کیے..... وہ شاید اپنے شوہر گیبریل کے لیے ہی اتنا تیار ہوئی تھی، اور اس اندھے نے اس پر بالکل بھی توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ نارنجی رنگوں سی بھرپور آنکھیں لیے وہ ایسے رو رہی تھی جیسے کوئی پری..... کا روپ دھار کر رو رہا ہو۔ کھڑکی کا پردہ ترچھا کیے شارلٹ کو دیکھتے ہوئے نائجل کے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ اس کے دل میں گیبریل کے خلاف نفرت کے جذبات سر اٹھانے لگے۔

''خبیث..... بیچاری معصوم لڑکی پر ظلم کرتا ہے۔ اندھا..... یہ تک نہیں دیکھتا کہ وہ اس کے لیے کیا اہتمام کر کے بیٹھی تھی۔''

شارلٹ نے بھی عین اسی وقت نائجل کی طرف دیکھا اور وہ ایک دم سے سٹپٹا گئی۔ وہ بیچارگی کی حد تک بے بس نظر آ رہی تھی اور نائجل کے اس طرح دیکھنے پر اپنی ہتک محسوس کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب پھیلنے لگا۔ نائجل کھڑکی سے پرے ہو گیا۔

''مجھے لگتا ہے کل رات وہ دونوں پھر لڑتے رہے ہیں۔ میں آج ہی ان کی شکایت کرتی ہوں۔'' لیڈی ایمنڈا نے اگلے روز صبح ناشتے کی ٹیبل پر خیال پیش کیا تھا۔

''نہیں آنٹی..... آپ ایسا مت کیجیے گا۔'' اس نے جلدی سے لیڈی ایمنڈا کے اس خیال کو مسترد کر دیا۔

''لیکن کیوں.....؟'' لیڈی ایمنڈا نائجل کی اس مداخلت پر حیران ہوئی تھیں۔

''کل رات ان دونوں کی لڑائی کے بعد، میں نے شارلٹ کو دیکھا تھا۔ وہ بہت بے بس نظر آ رہی تھی اور دکھ سے ٹوٹی ہوئی بھی..... میں نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی میں ہم مزید مشکلات پیدا کریں۔ وہ پہلے ہی بہت تکلیف دہ زندگی گزار رہی ہے۔'' نائجل نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔ لیڈی ایمنڈا بارعب طریقے سے سر ہلانے لگیں۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے..... وہ نہ صرف ایک معصوم لڑکی ہے بلکہ خوبصورت بھی ہے..... نجانے کیسے اس بھیڑیے کے ساتھ جا پھنسی..... میرا اکثر دل کرتا ہے کہ میں اس سے ملوں..... اسے گھر پر بلاؤں..... اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں..... لیکن اس کا شوہر مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اور وہ شارلٹ کو گھر سے باہر بھی نہیں نکلنے دیتا۔''

نائجل خاموش رہا تھا۔ وہ اسے بیچ میں ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایمنڈا شارلٹ کے بارے میں مزید بات کرتی رہے۔

''کیا تم اس کے گھر جانا پسند کرو گے نائجل؟'' ایمنڈا نے ایک دم سے نائجل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ نائجل کی جیسے چوری پکڑی گئی تھی۔

''میں.....؟'' اس کی آواز ہکلانے لگی۔

''میرے گھر سے کبھی کرسمس، ایسٹر پر بھی شارلٹ کے گھر کچھ نہیں گیا..... اگر تم..... تمہارے پاس وقت ہو تو

شارلٹ کو آج کیک دے آؤ..... اب اس کا شوہر جا چکا ہو گا..... اسے میرے ہاتھ کے بنے کیک بہت پسند ہیں۔ بہت پہلے..... ایک بار اس نے تعریف کی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے، اس نے بہت خوش ہو کر اسی وقت کیک کا سارا ٹکڑا کھا لیا تھا۔ میں خود چلی جاتی لیکن میرے خیال سے وہ اپنے ہم عمر کے ساتھ چند باتیں کر کے خود کو زیادہ ہلکا محسوس کرے گی۔"

"جی آنٹی..... اگر آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔" نائجل کچھ سوچ کر بولا..... شارلٹ کا سفید لباس میں سراپا اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا جس میں وہ بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔

لیڈی ایمنڈا نے اسے ایک کرسٹل ڈش میں کیک نکال دیا تھا۔ نائجل کیک لے کر وہاں پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔

"میرا نام نائجل ہے۔ میں آنٹی ایمنڈا کے گھر سے آیا ہوں۔" اس نے دروازہ کھلنے پر بتایا اور پھر اشارہ کر کے لیڈی ایمنڈا کے گھر کا بھی بتایا۔ شارلٹ نے اس گھبرائے ہوئے لڑکے کو بغور دیکھا اور اس کے اس طرح وضاحت دینے پر ذرا مسکرائی..... ایسی مسکراہٹ جو ہنسی کو چھوتی ہو۔ وہ اس وقت نیلی کسی ہوئی جینز پر سرخ کھلی ڈلی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ جس کے دائیں طرف پیلے رنگ کے پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایسے لبادے میں وہ خود بھی بہار کا ایک پھول لگ رہی تھی۔

"اندر آجاؤ..... تمہاری آنٹی کیک بھی بنا لیتی ہیں۔"

"انہوں نے تو کہا تھا کہ تمہیں ان کے ہاتھ کا کیک بہت پسند ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا....."

"اچھا..... مجھے یاد نہیں اب....." شارلٹ نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بڑی منتشر لگ رہی تھی۔

'بیچاری اپنے شوہر کی وجہ سے کس قدر بے ترتیب ہو چکی ہے.....' نائجل سوچ کر رہ گیا۔

"تم کیا لینا پسند کرو گے..... ڈرنک لو گے؟"

"ہاں..... کیوں نہیں....." اس نے ایسے کہا جیسے وہ روز شارلٹ کے گھر میں آتا ہو۔ دراصل شارلٹ کی بے تکلفی نے ہی اسے یہ خود اعتمادی فراہم کی تھی۔

"یہ لو....." شارلٹ نے اسے ڈرنک پیش کی۔

"شکریہ....."

"شکریہ تمہارا..... تم اس سال میرے گھر میں آنے والے واحد مہمان ہو..... ورنہ سوسائٹی کے سارے لوگ ہمیں چھوڑ چکے ہیں۔"

"شاید اس کی وجہ تمہارا رویہ ہو..... میرا مطلب ہے کہ تمہارا اور تمہارے شوہر کا۔" نائجل کے منہ سے ایک دم سے نکلا لیکن پھر حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے فوراً بات کو سنبھال لیا۔

"میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔" شارلٹ لاچاری سے بولی۔ "خیر اپنی آنٹی کو شکریہ کہنا..... ان کی یہ نوازش مجھے اچھی لگی۔" شارلٹ نے خوش دلی سے کہا۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ تمہارا جانا اسے اچھا لگے گا۔" رات کے کھانے پر لیڈی ایمنڈا نے ساری بات سن کر تبصرہ کیا۔ "انسان ہمیشہ اپنے ہم عمر سے بات کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔" وہ جیسے اسے سمجھا رہی تھیں۔ "خیر، تم اب دو ایک روز کے وقفے سے اسے کچھ دے آیا کرنا..... اسے اچھا لگے گا۔"

"جی آنٹی....." نائجل نے بڑی خوش دلی سے رضامندی دی۔ لیڈی ایمنڈا کا اقدام اور ارادہ اسے بھایا تھا۔ اس کے باوجود سارا دن اس سے نہ تو پڑھائی ہو سکی اور نہ ہی رات بھر نیند آ سکی تھی۔ رہ رہ کر شارلٹ کی صورت اس کی نظروں کے سامنے گھومتی رہی تھی۔

رات میں جب شارلٹ کے گھر میں پھر سے لڑائی شروع ہوئی تو وہ چلانگ مار کر کھڑکی تک گیا۔

"تم ایک جاہل لڑکی ہو..... تمہارے ساتھ شادی کر کے میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔"

"مجھے معاف کر دو گیبریل..... پتا نہیں کیا بات ہے میں جو بھی تمہاری پسند کا کام کرتی ہوں نجانے وہ کیسے خراب ہو جاتا ہے۔" شارلٹ اپنی طرف سے وضاحت دے رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد گیبریل حسب معمول گھن گھرج کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا اور شارلٹ وہیں بیٹھی رہی تھی۔

نائجل نے پردہ پیچھے کر کے شارلٹ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک اسٹول پر اپنی گود میں ہاتھ رکھے مُردہ دلی سے بیٹھی تھی۔ نہ جانے نائجل کے دل میں کیا بات آئی کہ وہ نیچے آ کر فون کے پاس پڑی ڈائری میں سے شارلٹ کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی اسے نمبر مل گیا۔ رات کے بارہ بجے اس نے شارلٹ کو کال کی۔

"تم پریشان تو نہیں ہو شارلٹ....." نائجل نے اس کے ہیلو کہتے ہی پوچھ لیا۔

"نہیں..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم نے تمہیں پریشان کر دیا ہے۔ ہمارے شور نے تمہیں نیند سے جگا دیا ہے۔" شارلٹ بولی..... پریشانی اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میں جاگ ہی رہا تھا۔" اس نے جھوٹ بولا۔ "دراصل میں نے تمہیں تسلی دینے کے لیے فون کیا ہے شارلٹ..... ایک دوست ہونے کے ناتے....." نائجیل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ دونوں پورے پندرہ منٹ بات کرتے رہے۔ زیادہ تو نائجیل ہی بولتا رہا تھا اور شارلٹ آگے سے بس ہوں ہاں کرتی رہی تھی پھر شاید اپنے شوہر کے ڈر کی وجہ سے اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا تم رات دیر تک جاگتے رہے ہو؟" اگلے دن لیڈی ایمنڈا نے اس سے پوچھا۔ نائجیل نہ چاہتے ہوئے بھی گڑبڑا گیا۔

"میں نے تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی ہے۔"

"جی..... دراصل وہ پھر سے لڑ رہے تھے۔"

"اور تم ان کو سن رہے تھے..... یہ بُری بات ہے بچے!"

"نہیں....." نائجیل نے فوراً نفی کی۔ "میں صرف شارلٹ کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کال بھی کی..... جس سے میرے خیال سے اسے کافی سکون ملا۔"

"دراصل تم اس کے لیے حساس ہو رہے ہو میری جان..... ٹھیک ہے۔ تمہاری عمر میں لڑکے ایسی ہی سوچ رکھتے ہیں۔ تمہیں حساس ہونا بھی چاہیے۔ تمہارے سامنے ایک پیاری سی لڑکی پر اتنا ظلم جو ہو رہا ہے۔"

"شکریہ آنٹی..... کہ آپ نے مجھے غلط نہیں سمجھا....."

"میں تمہیں غلط کیوں سمجھوں گی میری جان..... کیا میں جانتی نہیں کہ تم ایلیوشا کے بیٹے ہو..... جو دوسروں کے لیے جان تک..... دینے سے گریز نہیں کرتی تھی....." لیڈی ایمنڈا نے توقف کیا۔ "بلکہ میں تو چاہوں گی کہ اگر تم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو ضرور کرو....."

"مثلاً..... اس کے قرض کی رقم کا انتظام.....؟"

"نہیں نہیں..... میرا وہ مطلب نہیں..... اور وہ رقم بہت زیادہ ہے۔ تم اس کا انتظام کر بھی نہیں سکتے..... میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ اگر تم شارلٹ کو کہیں گھما پھرا لاؤ..... اسے زندگی کو قریب سے دکھاؤ..... تو وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ نہ جانے کب سے وہ اس گھر میں قید ہے۔ اس کا شوہر اسے کہیں باہر بھی نہیں جانے دیتا۔"

"کیا وہ راضی ہو جائے گی؟"

"کیوں نہیں..... اگر تم کہتے ہو تو میں اس سے جا کر بات کرتی ہوں۔" لیڈی ایمنڈا نے مشورہ دیا اور پھر نائجیل کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے شارلٹ کے گھر چلی گئیں۔

"وہ راضی ہو گئی ہے۔" لیڈی ایمنڈا نے گھر واپس آ کر خوشی سے کہا۔

"کیا سچ میں.....؟ آپ نے یہ کر دکھایا..... آپ بہت اچھی ہیں آنٹی۔"

"اس لڑکی کو کسی پارک میں لے جاؤ..... یا سنیما..... میں چاہتی ہوں کہ وہ آج ایک بھی پورا دن گزارے....." لیڈی ایمنڈا نے نائجیل کو کچھ رقم بھی دی اور اس کا پروگرام بنا کر خود تیار ہو کر کہیں باہر چلی گئیں۔ نائجیل شارلٹ کو لے کر ایک پارک میں آ گیا۔

"تمہاری آنٹی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے کوئی ضروری کام ہے۔ اس لیے کہیں ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو..... لیکن تم تو مجھے اس پارک میں لے آئے ہو۔" شارلٹ نے کہا۔ نائجیل سوچ میں پڑ گیا پھر اسے لگا کہ آنٹی کو شارلٹ کو راضی کرنے کا یہ ہی مناسب طریقہ نظر آیا ہوگا۔

"ہاں..... مجھے تم سے ایک کام تھا شارلٹ..... دراصل مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور..... اب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اسے اپنے جذبات سے کیسے آگاہ کروں۔"

"کیا.....؟" شارلٹ نے ایک جان دار قہقہہ لگایا۔ "تم لڑکے بھی نا کتنے عجیب ہوتے ہو۔" وہ بڑی دیر تک ہنستی رہی اور نائجیل اس ہنسی کے جھرنے میں بہتا رہا۔

"بہت سادہ سی بات ہے۔ کوئی اچھے سے پھول خریدو..... بلکہ میرے خیال سے گلابی پھول خریدو..... یہ لڑکیوں کو بہت پسند ہوتے ہیں۔ گھٹنوں کے بل جھک کر اسے پیش کرو اور پھر زور سے کہہ دو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔" شارلٹ کہتے ہوئے خود بھی چلانے لگی پھر ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ "خود گیبریل نے بھی....." اچانک سے جیسے اس کے منہ سے نکلا تھا۔ پھر وہ اداس ہو گئی اور جیسے ماضی میں بھٹکنے لگی۔

"تب گیبریل مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا....." شارلٹ نائجیل کو بتا رہی تھی اور اداس ہو رہی تھی اور نائجیل آج اسے اس خول سے ہی تو باہر نکالنا چاہتا تھا۔ پارک کے بعد وہ شارلٹ کو ایک سنیما میں لے گیا۔ وہاں سے باہر نکل کر گھر کی طرف آتے ہوئے دونوں نے آئس کریم کھائی۔ نائجیل نے شرارت سے آئس کریم شارلٹ کی ناک پر بھی لگا دی تھی۔ جس پر شارلٹ بہت ہنسی تھی۔

"تم مجھے جوکر بنا رہے ہو کیا.....؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ نائجیل یک ٹک اس کو دیکھنے لگا۔

"تم ہنستے ہوئے کتنی اچھی لگتی ہو....." نائجیل نے کہا تو شارلٹ ایک دم سے چپ ہو گئی اور اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجنے لگی۔ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی

چال سست ہوگئی تھی۔

''شارلٹ.....'' نائجل نے شارلٹ کو کندھوں سے تھام لیا۔ شارلٹ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''تم اس شخص کے ساتھ کیوں ہو.....؟''

''کیونکہ وہ میرا شوہر ہے.....'' شارلٹ نے ایسے کہا جیسے کوئی اپنی تقدیر پر بنا آواز کے رو رہا ہو۔

''تم اسے چھوڑ نہیں سکتیں.....ہم اس کے قرض کو.....''

''کونسا قرض.....؟'' شارلٹ نے حیرت سے نائجل کو دیکھا۔ نائجل خاموش ہوگیا اور اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ آنٹی نے شارلٹ کا ایک ذاتی راز نائجل کو بتایا تھا اور اسے شارلٹ کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے اس راز کو اس کے سامنے آشکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ گھر واپسی کے باقی سارے سفر پر شارلٹ نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

رات میں اس نے لیڈی ایمنڈا کو دن بھر کی تفصیل سنائی۔

''دراصل وہ تمہیں ساری بات کبھی بھی نہیں بتائے گی پیارے نائجل..... یہ ایک عورت کی انا کے خلاف ہے۔ تم یہ بات کبھی بھی نہیں سمجھ سکتے میری جان..... وہ قرض کے بارے میں تمہیں بتائے۔'' لیڈی ایمنڈا کی بات سن کر نائجل کو خود پر غصہ آیا۔ وہ اس شہری زندگی کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ اسے واقعی شارلٹ سے قرض کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

''پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے آنٹی؟''

''اگر شارلٹ تمہارا ساتھ دے تب..... لیکن اس سے پہلے تم اسے اپنی چاہت کا یقین دلاؤ..... اسے اعتماد میں لو..... تو اس مسئلے کے بہت سے حل نکل سکتے ہیں۔''

نائجل نے بہت دن سوچ بچار میں لگائے تھے۔ اسے شارلٹ سے محبت ہوگئی تھی اور پھر ایک دن جب موسم بہت سہانا تھا اُس نے مارکیٹ جا کر گلابی پھول خریدے اور شارلٹ سے اظہارِ محبت کر دیا۔

''وہ لڑکی تم ہی ہو جس سے میں محبت کرتا ہوں شارلٹ.....'' نائجل نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ شارلٹ نے نائجل کی شکل دیکھی... اور پھر کھینچ کر ایک تھپڑ نائجل کے منہ پر دے مارا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی..... میں شادی شدہ ہوں۔ میرا شوہر مجھ پر شک کرتا ہے یا مجھ پر ظلم کرتا ہے تو یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں..... مجھے اپنے شوہر سے شدید محبت ہے۔ میں اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے..... دوبارہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔'' شارلٹ نے دہاڑتے ہوئے کہا تو نائجل شارلٹ کا یہ روپ دیکھ کر دم بخود ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ پتھر کی سی حالت میں وہ واپس گھر آیا۔ لیڈی ایمنڈا کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ یہ دن اس نے عجب پاگل پن میں گزارے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جو اس کے ساتھ ہوا ہے، وہ کس کو بتائے، کس سے حل طلب کرے؟

شارلٹ نے اپنے گھر کی نائجل کے کمرے کے سامنے والی کھڑکی کے پردے اور پٹ اب مستقل بند کر دیے تھے۔ اوپر سے شارلٹ کا شوہر گیبریل آتے جاتے نائجل کو گھورنے لگا تھا۔ جس سے نائجل بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ گیبریل کی آنکھوں میں نائجل کو قتل کر دینے کی دھمکی ہوتی تھی۔ نائجل نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ ہفتے بھر بعد لیڈی ایمنڈا واپس آئیں تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''اس نے مجھے دھتکار دیا ہے آنٹی..... وہ تو اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اسے مجھ سے بالکل بھی انسیت نہیں ہے..... اس نے کہا ہے کہ میں دوبارہ اسے کبھی اپنی شکل مت دکھاؤں.....'' نائجل کے منہ سے سب سن کر لیڈی ایمنڈا ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

''مجھے ساری بات بتاؤ..... کیا ہوا؟'' لیڈی ایمنڈا کے استفسار پر نائجل نے انہیں ساری بات بتا دی۔

''میری جان! تم نے غلطی کی..... تمہیں مجھ سے پوچھ کر جانا چاہیے تھا۔ شارلٹ نے تو ایسا کرنا ہی تھا۔ اس کے شوہر نے گھر میں ریکارڈنگ سسٹم نصب کروایا ہوا ہے۔ وہ شارلٹ پر اتنا شک کرتا ہے کہ روز رات کو آ کر چیک کرتا ہے کہ وہ سارا دن کس کس سے ملتی رہی ہے اور کس کس سے بات کرتی رہی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں شارلٹ نے تو تمہیں دھتکارنا ہی تھا۔ ورنہ اس کے شوہر نے تمہیں اور اسے جان سے مار دینے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنی تھی۔ تمہیں اسے گھر پر پرپوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کھڑکی کے آگے پردے بھی یقیناً گیبریل نے ہی ڈالے ہوں گے۔''

''اسی لیے وہ مجھے آتے جاتے اب گھورنے بھی لگا ہے۔''

''ہاں..... یہی وجہ ہے..... اب شارلٹ پر اور پابندیاں لگ جائیں گی۔ گھر سے نکلنا بالکل ہی بند ہو جائے گا۔ افسوس..... تم اس کا بھلا سوچتے سوچتے اس کا مزید نقصان کر بیٹھے ہو.....''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی..... مجھ سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔'' نائجل افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔ ''لیکن اب اس غلطی کا مداوا کیسے کروں؟'' نائجل نے بیچارگی سے لیڈی ایمنڈا کو دیکھا۔

''اگر تم واقعی شارلٹ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو میں چاہوں گی کہ تم شارلٹ کو کہیں بہت دور لے جاؤ..... جہاں وہ بیچاری کھل کر سانس لے سکے۔''

''کہاں.....؟''

''اس کے ظالم شوہر سے دور..... میری ایک دوست کا گھر ہے کنگلی میں..... تم شارلٹ کو وہاں لے جاسکتے ہو۔ وہاں سے ہی ہم مل کر شارلٹ کے شوہر پر مقدمہ چلائیں گے۔ شارلٹ طلاق لے لے گی اور پھر اس طرح تم شارلٹ سے شادی کر سکتے ہو۔''

''کیا واقعی آنٹی.....؟'' نائجل خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا۔

''ہاں میرے بچے..... اگر تم رضامندی دیتے ہو تو میں اپنی دوست کو کنگلی فون کر دیتی ہوں۔ وہاں تک جانے کے لیے میں گاڑی کا انتظام بھی کروا دیتی ہوں۔ مجھے شارلٹ کے دکھ کا بھی احساس ہے۔ میں اس کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں اور تمہارے لیے بھی۔''

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں آپ کا شکریہ کس طرح سے ادا کروں لیکن میں اب شارلٹ سے ملوں کیسے..... اس نے تو گھر سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا ہے۔''

''پاگل لڑکے..... کس دنیا میں ہو تم..... وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ پورا ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک ایک لمحہ تمہارے انتظار میں ہے کہ اس کا چاہنے والا اس کی خوشیوں کے لیے کچھ کرے.....''

''تو وہ کوئی اشارہ تو دیتی اس بات کا..... کوئی پیغام..... یا کچھ بھی اور.....''

''ہاں..... وہ اشارہ دیتی تم کچھ کر نہ سکتے..... اور اس کا شوہر گھر آکر اسے جان سے مار دیتا۔'' لیڈی ایمنڈا نے اس کی بے وقوفی پر سرزنش کی تو نائجل نے سر جھکا لیا۔

''پھر اب میں کیا کروں.....؟''

''تم آج رات اس کے گھر جاؤ..... اس کے شوہر کے آنے سے پہلے پہلے..... اسے ساری بات بتاؤ..... جو جو میں نے تم سے کہا ہے وہ سب..... گیبریل رات کو گھر واپس آنے پر ہی ریکارڈنگ سنتا ہے نا..... تو رات ہونے سے پہلے ہی تم دونوں کنگلی کے لیے نکل چکے ہو گے۔'' لیڈی ایمنڈا نے سارا منصوبہ نائجل کو سمجھایا، نائجل نے فرط جذبات سے لیڈی ایمنڈا کے ہاتھ چوم لیے۔

''شریر لڑکے.....'' لیڈی ایمنڈا دل کھول کر ہنسیں۔

''جاؤ اب تیاری کرو، سامان پیک کرو اپنا..... شام کو تم نے شارلٹ کے گھر جانا ہے۔ اس کے کمرے کا راستہ میں تمہیں دکھاؤں گی، چھت سے.....''

نائجل جلدی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنے سارے کپڑے اور ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں ڈالا پھر وہ شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ لیڈی ایمنڈا تب تک اپنی دوست کو کنگلی فون کر چکی تھیں کہ وہ ایک جوڑے کو ان کے پاس بھیج رہی ہیں۔ وہ ان کا خیال رکھے۔ ''جوڑے'' کا لفظ انہوں نائجل کو دیکھتے ہوئے بہت ذومعنی انداز سے بولا تھا۔ شام تک لیڈی ایمنڈا نائجل اور شارلٹ کے لیے گاڑی کا انتظام بھی کر چکی تھیں۔

''یہ لو.....'' جس وقت نائجل چھت کے ذریعے شارلٹ کے گھر جانے لگا، لیڈی ایمنڈا نے اسے ایک پستول دیا۔

''یہ کیا ہے؟ اور کیوں.....؟'' نائجل پستول دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

''اس میں اس وقت چھ گولیاں ہیں۔ یہ احتیاطاً دے رہی ہوں..... اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو اس کا استعمال کرنا ورنہ ہرگز نہیں.....'' لیڈی نے پستول زبردستی نائجل کی پینٹ میں اڑس دیا اور نائجل چھت پھلانگ گیا۔

''شارلٹ..... شارلٹ.....'' شارلٹ کے کمرے میں جا کر نائجل نے شارلٹ کو پکارا۔

''تم.....؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟'' شارلٹ نہا کر نکلی تھی۔ ایک ٹاول اس کے گرد اور ایک اس کے بالوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس حالت میں وہ اپنے سامنے نائجل کو پا کر حیران ہوئی تھی اور غصہ بھی.....

''آنٹی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں سب جان گیا ہوں..... سب..... اور اب میں آگیا ہوں تمہیں لینے میری جان.....''

اس نے شارلٹ کو گلے سے لگانا چاہا۔ شارلٹ نے اسے دھکا دیا۔

''دور ہو جاؤ مجھ سے جاہل لڑکے.....''

''ڈرو نہیں..... گیبریل تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ سب انتظامات ہو چکے ہیں۔ کنگلی میں..... رہائش کا بھی اور گاڑی کا بھی.....''

''تم کیا کہے جا رہے ہو خبیث انسان.....؟''

''تمہیں ڈر ہے کہ گیبریل آکر ساری ریکارڈنگ سن لے گا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی شہر سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔'' نائجل نے جلدی جلدی شارلٹ کو سارے منصوبے سے آگاہ کیا۔ شارلٹ

حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''کون سی ریکارڈنگ.....؟ کیا کہہ رہے ہو تم.....؟''

''چلو دیر نہ کرو..... میں تمہیں راستے میں سب سمجھا دوں گا۔ جلدی سے اپنا ضروری سامان باندھو بس.....'' وہ شارلٹ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا الماری تک لایا تاکہ وہ اپنا سامان پیک کرلے..... اور تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور جو سامنے سے نمودار ہوا اُسے دیکھ کر شارلٹ اور نائجل دونوں کی لمحے بھر کے لیے جان نکل گئی۔ دروازے پر گیبریل کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں آگ جل رہی تھی۔

''میں نے اسے نہیں بلایا گیبریل..... میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھاتی ہوں۔'' شارلٹ نے روتے ہوئے گیبریل سے کہا۔

''تمہیں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے شارلٹ..... میں تمہیں اس آدمی سے آزاد کروانے ہی آیا ہوں۔'' نائجل نے نفرت سے گیبریل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گیبریل نائجل کی گردن دبوچنے کے لیے آگے بڑھا اور تب ہی نائجل نے جلدی سے اپنی ہپ پاکٹ میں اڑسا ہوا پستول نکالا۔ اسے آنٹی کی حاضر دماغی کی داد دینی پڑی تھی۔

''میرے اور شارلٹ کے قریب بھی مت آنا..... ورنہ میں اسے چلانے میں ایک لمحہ بھی نہیں سوچوں گا۔'' نائجل نے گیبریل سے کہا لیکن گیبریل نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ قدم بہ قدم نائجل کی طرف بڑھنے لگا۔

شارلٹ دور کھڑی رونے لگی تھی اور بس یہی بات کہتی جا رہی تھی۔ ''گیبریل! مجھے سے جس طرح کی مرضی قسم لے لو..... میں نے اس لڑکے کو گھر پر نہیں بلایا۔''

''میں کہہ رہا ہوں میرے قریب مت آؤ۔'' نائجل نے آخری وارننگ دی۔ گیبریل کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ نائجل نے ٹریگر پر ہاتھ رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ ہوا میں ہلکا سا شور اٹھا تھا۔ کلک کی آواز تو آئی تھی لیکن فائر نہیں ہوا تھا۔ نائجل نے جلدی سے دوسری بار ٹریگر دبایا۔ اب بھی کلک کی آواز آئی لیکن فائر نہیں ہوا۔ وحشت سے نائجل نے چار بار اور ٹریگر دبایا۔

گیبریل غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''جب کسی لڑکی کو بھگانا ہو یا دریغلانا ہو تو کام اتنی عجلت میں نہیں کرنا چاہیے ننھے لڑکے..... سب طرف سے اطمینان کر کے قدم اٹھانا چاہیے ورنہ جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ جیسے اب تمہاری جان کو ہے۔'' گیبریل نے کہا اور پھر اپنا پستول نکال کر ٹریگر دبانے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی..... فائر کی آواز کے ساتھ ہی نائجل کی چیخ نے خاموش فضا کو چیر دیا اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

لیڈی ایمنڈا اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی فیشن میگزین پڑھ رہی تھیں۔ نائجل کی چیخ پر لمحے بھر کو ان کا دھیان سطروں سے ہٹا اور پھر وہ دوبارہ بڑے اطمینان سے میگزین پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

''دراصل اس کا شوہر اس پر شک بہت کرتا تھا اور ہر وقت اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکی اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی۔ آپ تو سمجھ ہی سکتے ہیں کہ محبت کیسے محبوب کے عیبوں پر سے نظریں پھیر لیتی ہے۔ پھر ان کے پڑوس میں ایک لڑکا آ کر رہنے لگا۔ بادامی چہرے پر چندھی چندھی آنکھوں والا..... نام تھا اس کا..... نائجل.....''

حسب عادت لیڈی ایمنڈا آج بھی سب کو گھیرے ہوئے تھیں۔ لیڈی کی فسوں خیزی کے باعث تجسس سے ان سب کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔

''عین وقت پر نہ جانے کس نے گیبریل کو کال کر دی کہ اس کا پڑوسی اس کے گھر میں گھس کر اس کی بیوی کو ورغلا رہا ہے۔''

لیڈی ایمنڈا کلائمیکس پر پہنچیں.....

''پاگل عورت..... ہر وقت بکتی رہتی ہے۔'' دور بیٹھی مارگریٹ نے ہیلن اور ڈیانا سے کہا۔

''بیچارہ نائجل..... فضول میں مارا گیا۔ چچ چچ..... گیبریل کچھ دن جیل میں رہا پھر رہا ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد اب دونوں میاں بیوی خوش رہتے ہیں۔''

''پتا نہیں یہ اتنے افسانے کیسے گھڑ لیتی ہے۔ ہر بار نئی فضولیات..... حد ہے بھئی.....'' ڈیانا جام سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

حسب عادت آج بھی لیڈی ایمنڈا کہانی ختم کرنے کے بعد ان کے پاس آئی تھیں۔

''ہائے مارگریٹ، ڈیانا اور ہیلن..... تم نے آج بھی میری کہانی نہیں سنی..... ایک بیچارے معصوم لڑکے کی..... جو غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھا۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہانیاں سننے میں..... اور تمہاری جھوٹی کہانیوں میں تو بالکل بھی نہیں۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ میری کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ حقیقی کردار ہوتے ہیں میری جان..... کیونکہ..... میں انہیں خود بنتی ہوں۔'' سرگوشی کے انداز میں لیڈی نے جیسے کائنات کا کوئی اہم راز فاش کیا تھا۔

معاشرے کے سب سے خطرناک اور پُرفکر پہلو کو اجاگر کرنے والی تحریر..... تنگ آمد بجنگ آمد کی عملی تفسیر

دوسرا اور آخری حصہ

بجنگ آمد

طاہر جاوید مغل

مشرق ہو یا مغرب... انسانی معاشرہ اگر حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو... انسانیت اور حیوانیت میں فرق مٹ جاتا ہے... گویا قدرت نے جس کی جو حد مقرر کردی اسے اس تک محدود رہنا چاہیے مگر... کیا کیا جائے جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور برداشت اپنی حد سے باہر ہو جائے تو انتقام کی چنگاری رفتہ رفتہ حالات کی تیز ہوا سے بھڑک کر ایک دن شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حال اس بدحال کا ہوا جو جوانی اور دولت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح سرشار بڑھتا چلا جارہا تھا کہ ایک دن اس مظلوم کی برداشت نے جواب دے دیا... اس کے بعد قدرت نے ایسا طوفان اٹھایا کہ بھڑکتے شعلوں کے رقص نے معاشرے میں بلند مقام پانے والے ظالموں کے نشیمن کو جلا کر راکھ کردیا... وہ بچیاں جو معصومیت کا پیکر... دلوں کا سکون... گھروں کی رونق تھیں... ان درندہ صفت بھیڑیوں کے خونیں جبڑوں سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عزتوں کے جنازہ نکالنے کے لیے ہی شاید دھرتی کا بوجھ بنتے ہیں۔

گھر آ کر حریم بند کمرے میں دیر تک بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک عمر کے وہ الفاظ گونج رہے تھے۔ جو اس نے نہ جانے کس طرح، بند آنکھوں کے ساتھ کہہ ڈالے تھے۔ ''حریم! مجھے تنہا نہ چھوڑیئے گا۔ آپ کے بغیر مجھ سے جیا نہیں جائے گا۔''

وہ سسک اٹھی۔ وہ ایک اجڑی پجڑی ہستی تھی۔ اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے تھا ہی کیا؟ وہ دل و جان سے عمر کی عزت کرتی تھی۔ اس کے دل میں اس کا ایک اہم مقام بن گیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ خود کس مقام پر کھڑی ہے۔ وہ بے ساختہ سوچنے لگی۔ اگر عمر کی اس خاموش محبت کو ماضی کے شب و روز میں گویائی مل گئی ہوتی تو زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو شاید..... وہ شخص بھی اس کی زندگی میں نہ آتا جس کا نام آصف تھا۔ جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی اور جو اس کو سمجھے بغیر اس کے حالات دیکھ کر یوں بھاگا تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ پچھلے ہی دنوں حریم اور عروبہ کو خبر ملی تھی کہ اس کا نکاح ہو گیا ہے اور رخصتی دو ماہ بعد متوقع ہے۔

اس نے اپنا چہرہ تکیے میں گھسیڑا..... اور دل ہی دل میں کربناک انداز میں کہا۔ ''عمر! مجھے معاف کر دینا۔ میرے اور آپ کے راستے نہیں مل سکتے۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں وہ گریز دیکھ لیا ہے جس کے لیے وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ وہ لاکھوں میں ایک ہیں لیکن ان کی جگہ کوئی بھی ماں ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کے لیے میرے جیسی شریکِ حیات لانے کا نہ سوچتی۔''

وہ دیر تک روتی رہی اور اپنی بربادی پر خون کے آنسو بہاتی رہی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ شاید اس نے اور اس کی ماما نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا جو فیصلہ کیا، وہ دانش مندانہ نہیں تھا۔ انہوں نے ہر طرح کی بدنامی مول لے لی تھی، صعوبتیں برداشت کی تھیں لیکن ابھی تک وہیں کھڑے تھے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا بلکہ اب تو یوں لگتا تھا کہ اس حوالے سے ان کی معکوس پیش رفت ہوئی ہے۔ جن کو چھپنا چاہیے تھا، وہ دندنا رہے تھے اور جو مدعی تھے وہ چھپتے پھر رہے تھے۔ باریال جو ہمیشہ سے بڑا سوشل تھا، اب الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ ماہین مستقل طور پر کوئٹہ شفٹ ہو چکی تھی اور وہاں بھی ڈری سہمی ہی رہتی تھی۔ حریم خود بھی بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو چکی تھی۔ خالو یاور حیات کی ہمت بھی ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے اپنے کچھ ذاتی مسائل بھی تھے اور اب حریم کو یوں لگ رہا تھا کہ ان کو اپنے اہم ترین سہارے کو بھی خود سے دور کرنا پڑے گا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اور یقیناً اس کی ماما بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی وجہ سے عمر خدانخواستہ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو۔ وہیں بستر پر لیٹے لیٹے اور تکیے میں منہ گھسیڑ کر آنسو بہاتے بہاتے حریم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دل پر پتھر رکھ کر عمر سے بتدریج اپنا فاصلہ بڑھا لے گی۔ یہی سب کے حق میں بہتر تھا۔

☆☆☆

یہ عجیب سے شب و روز تھے۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ اب ان میں ایک طرح کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ حریم جانتی تھی اور باقی اہلِ خانہ بھی جانتے تھے کہ عادی ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے لیکن اس روز کی لڑائی کے بعد وہ پھر سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی ابھی تک اس نے کسی اور طریقے سے رابطہ کیا تھا۔ بہرحال ایک دھڑکا سا ہر وقت حریم کے دل میں موجود رہتا تھا۔

میڈیا اب بھی حریم اور اس کے اہلِ خانہ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایک روز ڈور بیل ہوئی۔ ماما سو رہی تھیں۔ حریم نے دروازے پر جا کر پوچھا۔ ''کون؟''

باہر ایک چینل کی لیڈی رپورٹر اپنے کیمرا مین کے ساتھ موجود تھی۔ ''مس حریم! آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔ آپ کی والدہ سے تھوڑا سا انٹائم چاہیے ہمیں۔ تھوڑی سی ڈسکشن کرنی ہے۔''

حریم دروازہ کھولے بغیر روکھے لہجے میں بولی۔ ''والدہ کے سر میں درد ہے، وہ گولی کھا کر سو رہی ہیں..... اور آصفہ صاحبہ! پلیز فی الحال ہمیں اس معاملے میں ڈسٹرب نہ کریں۔ ہم نے جو کچھ بتانا تھا وہ آپ لوگوں کو بتا چکے ہیں۔ اب بتانے کو کچھ نہیں ہے۔''

لیڈی رپورٹر ملائمت سے بولی۔ ''دیکھیں، آپ کا معاملہ کورٹ میں ہے اور.....''

وہ ایک دم چڑ سی گئی، رپورٹر کی بات کاٹ کر بولی۔ ''ہمیں معلوم ہے ہمارا معاملہ کورٹ میں ہے اور کورٹ میں ہی رہے گا۔ آپ کو بھی بس اپنا کاروبار چمکانا ہوتا ہے۔ آپ بس تازہ خبروں کی بو سونگھتے ہیں اور پرانی خبروں کو مردار سمجھتے ہیں۔ پلیز..... ابھی ہم اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔''

اس نے بمشکل چینل والوں کو ٹالا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ ماہین کافی دنوں بعد کوئٹہ سے آئی تھی اور کافی کمزور نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت بکھری بکھری سی بھی تھی۔ اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ دو تین ہفتے پہلے اس خبیث عادی اور عمر بھائی کے درمیان گھر کے سامنے مار ماری ہوئی ہے۔

ماہین، جویریہ کو مشورہ دے رہی تھی کہ یا تو وہ لوگ اب مکان دوبارہ تبدیل کرلیں یا پھر کوئنہ ہی منتقل ہوجائیں۔

جویریہ اور ماہین کے درمیان بات ہو رہی تھی جب حریم کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین دیکھی یہ عمر کی کال تھی۔ کل سے وہ پانچ چھ مرتبہ اسے کال کر چکا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اہم بات ہی کرنا چاہتا ہوگا کیونکہ اس نے کبھی غیر ضروری فون نہیں کیا تھا لیکن حریم کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے سخت امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا مگر وہ یہ امتحان دے رہی تھی۔ کال کے سگنل ختم ہوئے تو حریم نے فون ہی آف کردیا۔

ماہین نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''آپی! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ ایسا تو غیروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عمر بھائی تو اپنے ہیں۔ اپنوں سے بڑھ کر اپنے ہیں۔''

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اپنے ہیں، اسی لیے تو ایسا کر رہی ہوں۔ انہیں مصیبتوں سے بچانا چاہتی ہوں۔ وہ اور آنٹی ثمینہ میری ذات سے جتنا دور رہیں گے، اتنا ہی ان کے لیے اچھا ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

''لیکن آپی! اس طرح بھی تو انہیں تکلیف ہو رہی ہوگی۔''

''یہ تکلیف ان تکلیفوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو وہ ہماری خاطر جھیل رہے ہیں اور آئندہ جھیلیں گے۔''

اسی دوران میں باریال گھر میں داخل ہوا تو وہ دونوں خاموش ہوگئیں۔ اس روز شام کو جب عمر کا فون پھر آیا تو اس نے کال ریجیکٹ کردی اور پھر اس کے قریباً ایک گھنٹے بعد اس نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر عمر کو ایک میسج بھی کردیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''ویری سوری عمر! جس انداز سے آپ سوچ رہے ہیں، میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا..... یہ بہت بڑا جھوٹ لکھ کر وہ دیر تک غمزدہ اور گم صم بیٹھی رہی۔

وقت گزرتا رہتا ہے۔ آنے والے پلوں، دنوں اور برسوں میں ہمارے لیے کیا چھپا ہے، ہمیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وقت کے آنے والے ''دورانیے'' اپنے اندر ہمارے لیے کون سی خوشیاں اور دکھ چھپائے ہوئے ہیں، نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے حالات، ہمارے واقعات اور ہماری زندگی کی کہانیاں کیا رخ اختیار کریں گی..... ہاں، کہانیاں بدل جاتی ہیں، ان کا بہاؤ بدل جاتا ہے۔ ان کے انداز اور مناظر نئے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ عروبہ اور حریم کو بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ان کی ''دردکہانی'' ایکا ایکی کیا روپ اختیار کرنے والی ہے۔ یہ کہانی اس گھر اور اس گھر کے گردوپیش سے نکل کر ایک اور جگہ..... ایک اور سنسان مقام کا رخ کرنے والی تھی۔ کچھ واقعات انہیں ایک خاص سمت میں دھکیلنے والے تھے اور محصور کرنے والے تھے۔

اس دفعہ بھی تاریخ پر وکیل صفائی ''بیمار'' ہوگیا تھا اور عدالت نے پندرہ دن بعد کی ڈیٹ دی تھی۔ عدالت سے واپس آکر عروبہ گم صم سی صوفے پر نیم دراز تھی۔ دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ یہ جمعے کا روز تھا۔ عید الضحیٰ کی آمد آمد تھی۔ تہوار اپنے ساتھ خوشی کی ایک نادیدہ لہر لاتے ہیں اور یہ لہر کسی نہ کسی حد تک غم زدہ لوگوں اور رنجور ترین گھرانوں پر بھی اثر کرتی ہے۔ تمام تر پریشانیوں کے باوجود باریال اور ماہین کے لیے عروبہ نے نئے کپڑے سلوائے تھے اور انہوں نے تھوڑی سی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماہین کی آمد کی وجہ سے گھر کے اداس در و دیوار میں تھوڑی سی رونق بھی محسوس ہوتی تھی۔ زندگی ایسے ہی آلام کی تاریکیوں کے درمیان اپنے لیے نیم روشن راستے ڈھونڈا کرتی ہے۔

کچن میں حریم دوپہر کا کھانا تیار کرچکی تھی۔ اس نے آکر عروبہ سے پوچھا لیکن عروبہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''آپ لوگ کھالو۔ میرا دل چاہا تو بعد میں کھالوں گی۔ میں تھوڑی دیر سستالوں۔''

وہ صوفے پر سیدھی ہوکر لیٹی ہی تھی کہ باریال اور ماہین اندر آگئے۔ باریال نے عروبہ کی پائینتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لیے۔ وہ اچھے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ بولا۔ ''ماما! دیکھیں، ماہین بھی آئی ہوئی ہے۔ مجھے بھی پورا ڈیڑھ ہفتہ کالج سے چھٹی ہے۔ اگر آپ اس دفعہ بھی سیر کے لیے نہ لے کر گئیں تو..... تو میں نے مٹنڈ کرالینی ہے اور گلے میں منکوں کی مالا ڈال کر منگ بن جانا ہے۔''

''کہاں جانا چاہتے ہو؟'' عروبہ نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

''کہیں بھی..... لیکن لاہور میں نہیں..... لاہور سے باہر۔ ذرا لمبی ڈرائیو ہو۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو باریال۔'' عروبہ نے اسے ٹوکا۔ ''عید میں پانچ چھ دن رہ گئے ہیں۔ لاہور سے باہر جاؤ گے تو عید کیسے مناؤ گے؟''

''عید واپس آکر منالیں گے ماما۔ اس میں بھی بڑا مزہ ہوتا ہے۔ عید سے پہلے سیر اور سیر کے بعد عید۔ آپ کو یاد ہے نا ایک دفعہ اسی طرح چھوٹی عید سے پہلے ہم خالہ نادیہ

کے فارم ہاؤس پر گئے تھے۔ عید سے ایک دن پہلے واپس آگئے تھے اور چاند رات لاہور میں منائی تھی۔"

فارم ہاؤس کے ذکر پر ماہین بھی چونک گئی۔ "ہاں ماما! اس دفعہ کیوں نا فارم ہاؤس ہی چلے جائیں۔ لانگ ڈرائیو بھی ہوجائے گی اور ذرا چینج بھی مل جائے گا۔"

"زبردست بات کہی ہے ماہین نے۔" باریال فوراً بولا۔ "یہ آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا ہے۔ کیوں آپی! کیسا رہے گا یہ ٹور؟"

حریم بس ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر رہ گئی۔ اس کے اندر جیسے سیر و تفریح کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی لیکن پھر ایک دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے سوچا، اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ان کے گھر سے کتنی دور ہوگئی ہیں۔ جیسے مدت ہوگئی ہے مسکرائے ہوئے۔ اس نے دیکھا کہ باریال اور ماہین دونوں اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ جو صاف انکار کرنے جارہی تھی، اچانک بے ساختہ کہہ گئی۔ "بھئی! ماما سے پوچھ لو۔"

عروبہ کو توقع نہیں تھی کہ حریم اس طرح نیم رضامندی ظاہر کردے گی۔ وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حریم کی نیم رضامندی دیکھ کر باریال اور ماہین مزید پُرجوش ہوگئے۔ وہ زور دینے لگے کہ آج ہی تھوڑی سی تیاری کرلی جائے اور کل صبح وہ لوگ فارم ہاؤس کے لیے روانہ ہوجائیں۔

وہ جس فارم ہاؤس کی بات کررہے تھے، وہ کہیں آس پاس نہیں تھا۔ وہ ساہیوال سے پینتیس چالیس کلومیٹر آگے چیچہ وطنی کے علاقے میں تھا۔ چھانگا مانگا کی طرز کا خوبصورت ایریا تھا اور کئی دیکھنے کی جگہیں تھیں۔ خالو یاور حیات کی بڑی بہن نادیہ شجاع نے یہ فارم ہاؤس بنا رکھا تھا۔ وہ کافی عرصہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر رہی تھیں۔ وہ ساہیوال میں رہتی تھیں اور اکثر اپنے فارم ہاؤس پر آتی جاتی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کام کے سلسلے میں مسقط میں مقیم تھے۔

عروبہ نے شروع میں تو اس پروگرام سے اتفاق نہیں کیا پھر اس کے دل میں بھی وہی بات آئی جو حریم کے دل میں آئی تھی۔ اس گھر سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی بالکل روٹھ کر رہ گئی تھیں۔

ویسے بھی ان کے اردگرد ٹینشن کا ماحول ہی تھا۔ دروازے پر ہونے والی ہر دستک پر یہی لگتا تھا جیسے کوئی نئی مصیبت آئی ہے۔ ایسے میں اگر دو چار دن کے لیے وہ آؤٹنگ پر چلے جاتے تو شاید دل و دماغ پر "اسٹریس" کم ہوجاتا۔ جب حریم کے بعد ماما کو بھی نیم رضامند دیکھا تو باریال اور ماہین مزید پکے ہوگئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے خالہ نادیہ کو فون کرکے یہ تصدیق بھی کرلی کہ وہ آج کل فارم ہاؤس میں ہیں اور عید سے ایک دن پہلے ساہیوال واپس آئیں گی۔

ماہین بولی۔ "ماما! کیوں نا ہم آنٹی ثمینہ کی فیملی کو بھی چلنے کی دعوت دیں؟"

اس بات پر عروبہ اور حریم دونوں ہی سنجیدہ ہوگئیں۔

عروبہ بولی۔ "نہیں بھئی! اگر واقعی تم نے یہ پروگرام بنانا ہے تو پھر اس کو اپنی فیملی تک ہی رکھو۔"

"ان سے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟" باریال نے کہا۔ عمر کے بھائی علی کے ساتھ باریال کی گاڑھی چھنتی تھی۔

"نہیں باریال!" حریم نے فوراً مداخلت کی۔ "عمر..... بھائی..... آج کل اسپتال میں بہت مصروف ہیں..... آنٹی بھی بتا رہی تھیں کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

گفتگو کا رخ ایک بار پھر سفر کی پلاننگ اور وہاں قیام کے دورانیے کی طرف مڑ گیا۔ حریم چاہتی تھی کہ خالہ نادیہ کو زیادہ تکلیف نہ دی جائے اور پروگرام دو دن سے زیادہ کا نہ رکھا جائے۔

شام تک ان لوگوں نے پروگرام کی تفصیل طے کرلی۔

☆☆☆

ایک عرصے بعد یہ چھوٹی سی فیملی کہیں تفریح کے لیے نکلی تھی۔ اپنی مہران کار پر یہ لوگ علی الصباح لاہور سے نکل گئے اور ہنستے بولتے بارہ بجے دوپہر تک ساہیوال پہنچ گئے۔ ساہیوال سے چیچہ وطنی اور پھر شجاع فارم ہاؤس تک پہنچنے میں انہیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ خالہ نادیہ ان کی آمد پر خوش تھیں۔ ان کے دو روزہ قیام کے لیے ایک کمرا پہلے سے تیار تھا۔ شاندار لگژری باتھ روم، صاف ستھرے بیڈ اور روشن کھڑکیاں۔ عروبہ کچھ اداس ہوگئی۔ جب وہ پچھلی دفعہ یہاں آئی تھی تو امین بھی ان کے ساتھ تھے..... کئی چھوٹی چھوٹی باتیں اسے یاد آئیں اور اس کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی لیکن اپنی میزبان اور اپنے بچوں کی خوشی کے لیے اس نے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حریم بھی کچھ اداس دکھائی دی لیکن جلد ہی اس نے بھی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

خالہ نادیہ نے انہیں بتایا۔ "ہمارے پرائیویٹ "زو" میں ایک بڑے جنگلی بلے اور سفید مور کے ایک جوڑے کا اضافہ ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مصنوعی

آبشار بھی بنوایا ہے میں نے۔''

''اوروہ سوئمنگ پول؟'' باریال نے اشتیاق سے پوچھا۔

''وہ بھی ہے بیٹا جی، اس کے علاوہ حریم بیٹی کے لیے لال رنگ کے اسپیشل بیر بھی بیریوں سے اتروائے ہیں میں نے۔ مجھے پتا ہے یہ بڑے شوق سے کھاتی ہے۔''

خالہ نادیہ، حریم کی دلجوئی کی خاص طور پر کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ حریم کتنے بڑے المیے سے گزری ہے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ عروبہ اور حریم نے کس طرح اس ظلم کے خلاف آواز بلند کر رکھی ہے..... اور انصاف کے حصول کے لیے اپنی سی کوشش کر رہی ہیں۔

شجاع فارم میں ان کا یہ دو روزہ قیام بڑا خوشگوار رہا۔ انہوں نے دیسی کھانے کھائے اور گھومے پھرے بھی۔ عروبہ نے بھی پوری کوشش کی کہ بچے کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن اپنے تفکرات سے نکلیں۔ عید سر پر نہ ہوتی تو شاید وہ ایک روز مزید وہاں ٹھہر جاتے۔ بہرحال انہوں نے تیسرے روز بے حد شکریے کے ساتھ خالہ نادیہ سے رخصت چاہی اور صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ لاہور کے لیے واپس روانہ ہوگئے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ راستے میں ہڑپہ کے کھنڈرات بھی دیکھتے ہوئے جائیں گے۔

گاڑی عروبہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ حریم اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ فارم ہاؤس سے قریباً دس کلومیٹر آگے آچکے تھے۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ عروبہ سکون سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ اچانک اسے سامنے سے ایک تیز رفتار سلور گاڑی آتی دکھائی دی۔ دو تین لمحوں کے لیے عروبہ کی نگاہیں گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص پر پڑیں اور اسے یوں لگا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک ایک نہایت تیز برقی رو دوڑ گئی ہے۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع منظر تھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر عدیل عرف عادی کو بیٹھے دیکھا تھا..... اور اسے یوں لگا تھا کہ اس نے بھی عروبہ کو دیکھ لیا ہے۔

عروبہ کا پورا جسم لرز اٹھا۔ اگلے دو تین سیکنڈ میں اس کا یہ بدترین شبہ حقیقت میں بدل گیا کہ عادی نے بھی انہیں دیکھ لیا ہے۔ اس کا ثبوت عروبہ کو عقب نما آئینے میں نظر آیا۔ عادی والی گاڑی پچاس ساٹھ میٹر آگے جا کر رک گئی تھی..... اور غالباً رکنے سے پہلے ہی اس نے یوٹرن لینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ہاں گاڑی مڑ رہی تھی..... اس کا مطلب تھا کہ وہ ان کے پیچھے آرہی ہے۔

اس دوران میں پہلو میں بیٹھی حریم نے بھی اپنی ماما کو چونکتے اور پھر وحشت زدہ ہوتے محسوس کر لیا تھا۔

''کیا ہوا ماما؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''کک..... کچھ نہیں۔'' وہ ہکلائی۔ اس کی نظریں بدستور عقب نما آئینے پر تھیں۔

حریم نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ اسے بھی سلور رنگ کی جیپ کی جھلک نظر آئی لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکی اور ماں کا خوفزدہ چہرہ دیکھنے لگی۔

تب تک عروبہ نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

''کیا ہوا ماما؟'' اب حریم اور باریال نے ایک ساتھ پوچھا۔

عروبہ کا چہرہ بالکل زرد ہونے کے بعد اب سرخی مائل ہو رہا تھا۔ ''یہ..... بہت برا ہوا ہے..... وہ..... پیچھے آرہے ہیں۔'' عروبہ بڑبڑائی۔

''کون ماما؟'' حریم نے روہانسی ہو کر پوچھا اور دوبارہ مڑ کر عقب میں دیکھا۔

سلور گاڑی اب واضح نظر آرہی تھی۔ ایک دم اس کے دماغ میں بھی زبردست جھماکا سا ہوا۔ اسے پتا چل گیا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کس کی ہے۔ اسے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ عادی اور اس کے دوست تھے۔ وہ بڑی تیزی سے ان کے عقب میں آرہے تھے۔

اب باریال اور ماہین بھی چونک گئے تھے۔ ماہین نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے ماما؟ ہمارے پیچھے کون آرہا ہے؟''

''وہی..... ایڈووکیٹ ریاض کا بیٹا ہے۔'' عروبہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ اسے جیسے اپنی ہی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' ماہین روہانسی ہو کر بولی۔

باریال بولا۔ ''آ..... آپی..... مجھے موبائل دیں۔ میں ون فائیو پر کال کرتا ہوں۔''

حریم نے سوالیہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ عروبہ کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ اس کے ذہن میں بس یہی سوچ تھی کہ وہ اس سنسان جگہ سے نکل کر کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں، جہاں اور لوگ بھی موجود ہوں۔ پھر ہو سکتا ہے کہ عادی ان کا راستہ روکنے سے باز رہے۔

دوسری طرف شاید عادی بھی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ اگر اس نے انہیں تین چار کلومیٹر مزید آگے جانے دیا تو وہ نسبتاً بارونق علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ اس لیے اپنی گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔ گاڑی کسی عفریت کی طرح اچھلتی کودتی ان سے قریب تر پہنچ رہی تھی، جیسے ایک ہی لقمے میں

انہیں نگل جانا چاہتی ہو۔

عقبی نشست پر باریال نے حریم کے موبائل سے دن فائیو پر کال ملانے کی کوشش کی پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''کیا ہوا باریال؟'' حریم نے پوچھا۔

''شاید..... سگنل نہیں آرہے۔''

عروبہ کی نگاہیں سامنے شکستہ سڑک پر تھیں۔ ''او مائی گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

آگے ایک درخت گرا ہوا تھا۔ سائڈ پر تھوڑا سا راستہ تو نظر آرہا تھا تاہم وہاں سے گزرنے کے لیے انہیں گاڑی کی رفتار بہت آہستہ کرنا پڑتی اور ایک گڑھے سے بھی بچنا پڑتا۔ یقینی بات تھی کہ اسی دوران میں عادی ان کے سر پر پہنچ جاتا۔ عروبہ کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا اور اس نے گاڑی کو دفعتاً بائیں جانب ایک کچے راستے پر موڑ دیا۔ رفتار چونکہ اب بھی تیز تھی اس لیے کچے راستے پر آتے ہی مہران بری طرح اچھلنا شروع ہوگئی۔ ماہین گھٹی گھٹی آواز میں پکاری۔ ''ماما! وھیان سے۔''

عروبہ کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا..... اسے عادی اور اس کے ساتھیوں سے بچنا ہے۔ وہ کبھی کمزور دل نہیں رہی تھی، بلکہ اس کے نانا کہا کرتے تھے..... پریشانی اور خطرے میں میری عروبہ کا دماغ زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ انہیں ہمیشہ عروبہ پر فخر رہا تھا۔ اس کے نانا آرمی میں رہے تھے۔ انہوں نے عروبہ کو چھوٹی عمر میں ہی پیراکی سکھائی تھی۔ نشانہ بازی کی تربیت دی تھی اور جب وہ مری جاتے تھے تو نانا اور نواسی کا سب سے محبوب مشغلہ گھڑسواری ہوتا تھا۔ ہاں..... وہ ہمیشہ سے بے خوف رہی تھی لیکن اب بہت سا وقت گزر چکا تھا۔ نانا کو دنیا سے گئے تقریباً تیس سال بیت چکے تھے۔ اس سے کوئی پانچ سال بعد ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں عروبہ کو اپنے والد اور والدہ کی ابدی جدائی جھیلنا پڑی تھی۔ عروبہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ دادا نے چھوٹی عمر میں ہی اس کی شادی کردی۔ اپنے مہربان شوہر امین سرور کی رفاقت میں اس نے زندگی کے کئی یادگار بائیس برس گزارے..... اور اب وہ اپنے اس جیون ساتھی سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ شاید یہی اکیلا پن تھا جس کے سبب اپنے نانا کی شیر دل نواسی نے بھی بھی ڈرنا شروع کردیا تھا۔

آج اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ وہ ایک انجان راستے پر ایک نامعلوم منزل کی طرف گاڑی دوڑا رہی تھی اور اس کے تعاقب میں ایک شیطان زادہ پوری رفتار سے لپکتا آرہا تھا۔

''یا اللہ! میری مدد کر۔'' وہ دل ہی دل میں پکاری۔

تینوں بچے بار بار مڑ کر عقب میں دیکھ رہے تھے۔ کچے راستے کی دھول نے ان کے عقب میں گرد کا ایک بادل سا بنا دیا تھا۔ اس بادل کی دوسری جانب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، مگر یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ لوگ بھی تعاقب کر رہے ہیں۔

''ماما! ہم کہاں جارہے ہیں؟'' ماہین نے بدحواسی آواز میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ عروبہ جواب میں کچھ کہتی، انہیں ایک زوردار دھچکا محسوس ہوا۔ ان کی اچھلتی کودتی مہران ایک موڑ کاٹتے ہوئے اچانک خطرناک زاویے سے دائیں طرف جھک گئی تھی۔ عروبہ کے سوا وہ سب ہی چلا اٹھے۔ گاڑی کا دایاں اگلا پہیا ایک گڑھے میں چلا گیا تھا۔

گاڑی کو نکالنے کے لیے عروبہ نے دو تین بار ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ پہیا تیزی سے گھوما اور اس نے بہت سا کیچڑ اڑایا۔ عروبہ نے ہراساں نظروں سے عقب میں دیکھا۔ گرد کے دبیز بادل میں سے ابھی تک سلور جیپ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنی طرف والا دروازہ کھولا اور پکاری۔ ''حریم، باریال..... نکلو باہر۔''

تینوں بچوں نے ماں کی ہدایت پر سرعت سے عمل کیا۔ انہوں نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور جھاڑیوں میں گھس گئے۔ عروبہ نے ماہین کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور آگے تھی..... حریم اور باریال پیچھے آرہے تھے۔ ''ماما! ہم کہاں جائیں گے؟'' باریال نے ہانپتی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

''پتا نہیں..... یہاں سے تو نکلیں۔'' عروبہ نے کہا۔

کبھی بھاگتے اور کبھی تیز چلتے ہوئے وہ قریباً ایک تہائی کلومیٹر آگے آگئے۔ خاردار شاخیں ان کے جسموں کو چھیل رہی تھیں..... لیکن درد کا احساس نہیں تھا۔ وہ صرف دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ ایک بلندی پر تھے جب حریم نے مڑ کر دیکھا اور دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''ماما! وہ آرہے ہیں۔''

عروبہ نے بھی مڑ کر دیکھا۔ گرد کے بادل سے نمودار ہونے والی سلور جیپ ان کی مہران کے قریب رک گئی تھی۔ اس کے دروازے کھل رہے تھے۔ عادی اور اس کے دو تین ساتھی باہر نکل رہے تھے۔ عروبہ کو یوں لگا جیسے وہ ایک مچھلی ہے اور اپنے بچوں سمیت خطرناک شکاریوں کے جال میں

Digitized by Google

پھنسنے والی ہے۔ اس نے بائیں جانب دیکھا۔ ادھر جھاڑیاں زیادہ گھنی تھیں اور جھاڑیوں کی پرلی طرف اونچے سرکنڈے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ماہین کا بازو کھینچا اور پکاری ''اس طرف.....'' اس نے اب بھاگنا شروع کردیا تھا۔

تینوں بچے بھی بھاگنے لگے۔ شاخیں بری طرح ان کے چہروں اور جسم کے کھلے حصوں سے ٹکرا رہی تھیں، مگر وہ رفتار کم نہیں کرسکتے تھے۔ ہوا کے دوش پر، دور افتادہ آوازیں تیر کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ یقیناً پیچھے آرہے تھے۔ ابھی فاصلہ زیادہ تھا لیکن یہ تادیر ''زیادہ'' نہیں رہنا تھا۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گیلی زمین پر ماہین کا پاؤں بری طرح پھسلا اور وہ اوندھے منہ گری۔ عروبہ والا موبائل فون ماہین کے ہاتھ میں ہی تھا۔ گرتے ہوئے وہ اس کے ہاتھ سے نکلا اور ایک بارشی گڑھے میں جا گرا۔ رکنے یا موبائل کو تلاش کرنے کی مہلت کہاں تھی۔ ماہین کے اٹھتے ہی وہ پھر بھاگنے لگے اور دس پندرہ فٹ اونچے سرکنڈوں کے اندر گھس گئے۔

عروبہ محسوس کررہی تھی کہ وہ ایک نیم دائرے کی شکل میں بھاگ رہے ہیں۔ جونہی وہ سرکنڈوں کی دوسری جانب پہنچے، انہیں خودرو پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان یوپلر اور اشوکا کے درخت بھی دکھائی دیے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ مکمل غیر آباد نہیں ہے..... اور پھر عروبہ کا یہ اندازہ درست نکلا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک عمارت کے آثار نظر آئے جو درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

''کوئی ریسٹ ہاؤس لگتا ہے۔'' حریم نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ تیزی سے اس عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ محسوس کررہے تھے کہ ان کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ اس کا ثبوت ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی آوازیں تھیں۔ عادی اور اس کے دوست ان کے پیچھے آرہے تھے۔ درختوں میں گھری ہوئی یہ عمارت کافی کشادہ لگتی تھی۔ عمارت کے اردگرد باؤنڈری وال ایک وسیع وعریض آہنی جنگلے کی صورت میں تھی مگر اس جنگلے میں دروازہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

باریال نے ایک جانب انگلی اٹھائی اور ہانپتی کانپتی آواز میں بولا۔ ''ماما! وہ دیکھیں، وہاں سے جنگلا ٹوٹا ہوا ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ طویل جنگلے کے درمیان دو تین فٹ کا ایک خلا سا تھا جس میں سے وہ گزر سکتے تھے۔ جھاڑ جھنکاڑ میں سے یہ خلا بہ مشکل ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے اس خلا میں سے گزرے اور عمارت کے احاطے میں پہنچ گئے۔

آثار بتا رہے تھے کہ تعاقب کرنے والے اب سرکنڈوں میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کی آوازیں مدھم تھیں لیکن سنائی دے رہی تھیں..... بہرحال الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

عروبہ پکاری۔ ''کوئی ہے..... مدد کرو..... کوئی ہے؟''

کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ اس ریسٹ ہاؤس کا عقبی حصہ تھا مگر اسی لان کو تراشا گیا تھا مگر کچھ کا ٹھ کباڑ بھی نظر آرہا تھا۔ ایک طرف لوہے کے بڑے بڑے زنگ آلود پائپ اور دوسری طرف کچھ تعمیراتی سامان پڑا تھا۔ ایک کمرے کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ دکھائی دیا۔ عروبہ نے اس ادھ کھلے دروازے کو دیکھا اور بچوں سمیت تیزی سے اس میں داخل ہوگئی۔ چند قدم آگے تنگ سیڑھیاں تھیں جو کسی تہ خانے میں اتر رہی تھیں۔ ''کوئی ہے؟'' عروبہ ایک دفعہ پھر پکاری۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ چاروں اس چھوٹے سے تہ خانے میں اتر گئے۔ باریال نے ایک بٹن دبایا۔ دو کمروں پر مشتمل اس تہ خانے میں ہلکی سی روشنی ہوگئی..... فی الوقت ان کے لیے سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ خود کو تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے بچا سکیں۔

اندر داخل ہوتے ہی عروبہ نے تہ خانے کا دروازہ اندر سے بولٹ کردیا۔ ماہین کا حوصلہ جواب دے رہا تھا، وہ روتے ہوئے بولی۔ ''ماما! مجھے۔ ڈر لگ رہا ہے۔'' اس کی آواز تہ خانے میں گونجی۔

عروبہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی باریال سے کہا کہ وہ لائٹ آف کردے۔

باریال نے لائٹ آف کردی۔ عروبہ نے ماہین کو اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ حریم بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے ماں کا بازو زور سے تھاما ہوا تھا۔ ان چاروں کی ہانپتی ہوئی سانسیں ان کے اپنے ہی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ ایسے ڈرے سہمے پنچھیوں کی طرح دبکے بیٹھے تھے جن پر خونخوار عقاب حملہ آور ہوگیا ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد کچھ آوازیں ان کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ یہ ایک سے زائد آوازیں تھیں لیکن الفاظ مطلق سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ دروازے کھل رہے تھے اور بند

ہو رہے تھے اور پھر عروبہ کا دل جیسے سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ اسے سیڑھیوں کے بالائی دروازے کے قریب آہٹیں سنائی دیں۔ کوئی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ اس دفعہ الفاظ بھی سمجھ میں آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''اوئے کچن کی طرف دیکھ لیا ہے؟''

جواب میں جو کچھ کہا گیا، وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن یہ بات تو ان پر ثابت ہو رہی تھی کہ تعاقب کرنے والے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ماہین کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ پھر کھٹی کھٹی آواز میں رونے لگی۔

''چپ کر جاؤ ماہین۔'' عروبہ نے تیز سرگوشی کی۔

ماہین اپنی آواز روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ عروبہ نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے حریم نے اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا تھا۔ اب ان کو بس اپنی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں یا پھر سانسوں کی آواز تھی۔ آوازیں اور آہٹیں بتاتی تھیں کہ وہ لوگ آس پاس موجود ہیں۔

یہ سوال ان چاروں کے ذہنوں میں ابھر رہا تھا کہ کیا یہ عادی اور اس کے دوست ہی ہیں یا اس ریسٹ ہاؤس کے مکین بھی ان کے ساتھ شامل ہیں؟ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ آوازیں اور آہٹیں کبھی فاصلے پر چلی جاتی تھیں، کبھی قریب آجاتی تھیں۔ کھڑکیاں دروازے کھل رہے تھے، بند ہو رہے تھے۔ اسی طرح قریباً دس منٹ گزر گئے۔ یہ دس منٹ خوف اور دہشت میں لپٹے ہوئے دس برسوں کی طرح تھے۔ تب اچانک ایک بار پھر آہٹیں قریب آگئیں۔ اس مرتبہ بھاری قدموں کی تیز چاپ سیڑھیوں پر محسوس ہوئی۔ کوئی نیچے آرہا تھا۔ ''یا اللہ خیر!'' عروبہ دل ہی دل میں پکاری۔ اس نے ماہین کی سسکیاں ایک بار پھر اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لی تھیں۔ حریم کی گرفت ماں کے بازو پر اور سخت ہوگئی۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیاں اس کے گوشت میں دھنساتی چلی جا رہی تھی۔ باریال نیم تاریکی میں چاروں طرف نگاہ دوڑا رہا تھا، جیسے کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہو جس سے اپنا دفاع کیا جا سکے۔ مگر یہ ایک اضطراری عمل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بھاری قدموں کی چاپ آہنی دروازے کے بالکل پاس پہنچی اور پھر ایک بالکل غیر متوقع کام ہوا۔ آنے والے نے دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے دروازے کو باہر سے بولٹ کرنے کے بعد قفل لگا دیا اور جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر دم بخود بیٹھے رہے، پھر باریال نے ہی تیز سرگوشی کی صورت میں اس خاموشی کو توڑا۔ ''ماما! یہ کیا ہے؟ کیا وہ ہمیں..... بند کر گئے ہیں؟''

عروبہ کیا جواب دیتی، اس کی اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

اسی دوران میں ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں اب عمارت کے سامنے کی جانب سے آرہی تھیں۔ عروبہ اور حریم بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے تہ خانے کے دوسرے کمرے میں پہنچیں۔ باریال اور ماہین بھی ان کے پیچھے آئے۔ یہ مستطیل کمرا زیادہ کشادہ تھا۔ یہاں ایک چوڑا روشندان بھی نظر آرہا تھا۔ عمارت کے سامنے کی طرف سے آنے والی آوازیں اسی روشندان کے ذریعے ان تک پہنچ رہی تھیں۔ اب تقریباً چار بج چکے تھے۔ سورج کی کچھ ترچھی کرنیں روشندان کے راستے اندر پہنچ رہی تھیں۔

ایک آواز روشندان سے کچھ ہی فاصلے پر سے سنائی دی۔ ''احسن خاں! کہاں رہ گئے ہو؟ میری بس ہی نہ چھڑوا دینا۔'' یہ شخص مقامی لب و لہجے میں بولا تھا۔

کچھ فاصلے سے دوسرے شخص کی مدھم آواز ابھری۔ ''آیا جی آیا۔''

پہلے شخص نے کہا۔ ''ٹھیک ہے احسن! میں جا رہا ہوں۔ مین گیٹ کو دونوں تالے لگا دینا اور دو تین چکر ضرور لگانا یہاں کے..... مرغیوں کو دانہ وغیرہ ڈال دینا اور ذرا گھوم پھر کر دیکھ لینا۔ نئے گملوں میں پانی بھی دینا ہے۔''

''بے فکر رہو صرجی۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پہلا شخص روانہ ہو گیا۔ عروبہ اور حریم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو مدد کے لیے پکاریں یا نہیں۔ انہیں خوف تھا کہ عادی اور اس کے ساتھی آس پاس ہی موجود ہیں۔ موٹر سائیکل کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور یہی وقت تھا جب عروبہ کے دل نے گواہی دی کہ عادی اور اس کے ساتھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ یہاں سے جا چکے تھے..... یا پھر..... ایک اور بات ہو سکتی تھی..... یہ بھی ممکن تھا کہ وہ..... یہاں تک آئے ہی نہ ہوں۔ جو آوازیں اور آہٹیں انہیں سنائی دیتی رہی تھیں، وہ اسی ریسٹ ہاؤس کے مکینوں یا ملازموں کی ہو سکتی تھیں۔

اس بارے میں سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ عروبہ نے تیزی سے فیصلہ کیا، وہ روزن کے بالکل نیچے پہنچی

اور سینے کی پوری قوت سے چلائی..... ''کوئی ہے..... مدد کرو..... ہماری مدد کرو۔''

عروبہ کو دیکھ کر باریال اور حریم بھی بلند آواز میں پکارنے لگے۔ ''کوئی ہے؟ کوئی ہے؟''

کسی طرح کا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ احسن خاں نامی شخص جو غالباً یہاں کا چوکیدار تھا، اب کچھ فاصلے پر جاچکا تھا۔ کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں ہی ان تک پہنچ پا رہی تھیں پھر ایک اور کھٹارا سی موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی پُرشور آواز سنائی دی اور دور ہوتی چلی گئی۔

روشندان فرش سے کم و بیش نو فٹ اونچا تھا۔ وہ ان کی آوازوں کو زیادہ دور تک نہیں پہنچا رہا تھا۔ عروبہ پھر پکاری۔ ''احسن خاں..... احسن خاں! مدد کرو۔ ہم یہاں ہیں احسن خاں۔''

لیکن احسن خاں اب ریسٹ ہاؤس کا وسیع احاطہ طے کرکے جنگلے والی چار دیواری کے قریب پہنچ چکا تھا اور غالباً بڑے گیٹ کو مقفل کر رہا تھا۔ اس کی کھٹارا موٹر سائیکل کی مدھم سی آواز ہی ان تک پہنچ پا رہی تھی۔

آناً فاناً عروبہ کی سمجھ میں آگیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ پرسوں عید الاضحیٰ تھی۔ لہٰذا آج سے اس ریسٹ ہاؤس کے ملازم چھٹی پر جا رہے تھے۔ چونکہ عید بدھ کے روز تھی اس لیے یہ چھٹیاں ''لانگ عید ہالیڈیز'' بن گئی تھیں۔ عروبہ اور حریم نے پاگلوں کی طرح چلانا شروع کردیا۔ ''بچاؤ، بچاؤ..... ہم یہاں ہیں..... ہماری بات سنو۔''

باریال نے ایک طرف پڑا ہوا لکڑی کا ایک ڈنڈا اٹھایا اور تہ خانے کے آہنی دروازے پر زور زور سے مارنا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ آوازیں باہر تک پہنچ سکیں لیکن شاید اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کھٹارا موٹر سائیکل کی آواز معدوم ہوگئی۔ چوکیدار احسن خاں بھی یہاں سے نکل چکا تھا۔

عروبہ بے دم سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ بچے بھی گم صم تھے۔ باریال نے نیم تاریکی میں سوئچ بورڈ ڈھونڈا اور کمرے کی لائٹ آن کردی۔

یہ مستطیل کمرا دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید یہاں کے ملازمین اسے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف گیس سلینڈر اور چھوٹا سا چولہا پڑا تھا۔ پاس ہی اسٹیل کے کچھ برتن رکھے تھے۔ ایک طرف دیوار میں کچھ تحفیلفس بنی ہوئی تھیں جن میں نمک، مرچ اور چینی وغیرہ کے ڈبے تھے۔ پلاسٹک کے کچھ بڑے ڈبوں میں دالیں وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ لکڑی کے ایک، ڈیڑھ دو فٹ اونچے یوسیدہ تخت کے نیچے کرکٹ کا ایک بیٹ اور ٹیپ چڑھے ہوئے دو ٹینس بال دکھائی دیتے تھے۔ شاید ریسٹ ہاؤس کے ملازم فارغ وقت میں وسیع احاطے کو استعمال کرتے اور کرکٹ وغیرہ کھیلتے تھے۔

اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ ماہین نے عروبہ کا کندھا تھاما اور اس کے ساتھ لگ گئی۔ ''ماما! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ہم باہر کیسے نکلیں گے؟'' وہ کھانستے ہوئے بولی۔

ماہین کو بچپن سے ''استھما'' تھا۔ اس حوالے سے اس کا بڑا دھیان رکھا جاتا تھا۔ وہ ذرا کمزور دل بھی تھی۔ جلد ہی ..... ڈر جاتی تھی۔ اس کے برعکس حریم حوصلہ مند تھی اور مضبوط "Nerves" رکھتی تھی۔ امین سرور جب زندہ تھے تو کبھی کبھی ہلکے پھلکے انداز میں کہا کرتے تھے..... ''عروبہ! مجھے لگتا ہے کہ حریم تم پر اور ماہین مجھ پر گئی ہے۔''

عروبہ جواب میں کہتی۔ ''لیکن آپ ایسے کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تو نہیں ہیں۔''

جواب میں وہ کہتے۔ ''لیکن اب بیماری کے بعد تو ہوگیا ہوں نا..... اس کا مطلب ہے کہ میرے ''جینز'' میں کم ہمتی پہلے سے موجود تھی جو تمہاری اس چھوٹی نے بڑی شتابی سے ''پک'' کرلی ہے۔''

عروبہ کے ساتھ لگی ہوئی ماہین بری طرح کانپ رہی تھی۔ عروبہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ رکھو ماہی! سب ٹھیک ہوجائے گا..... دیکھو اللہ نے ہمیں اتنی بڑی مصیبت سے بچالیا ہے نا..... اب یہاں سے بھی نکال دے گا۔''

''تو پھر..... نکلیں نا ماما! ہم دیر کیوں کر رہے ہیں؟'' ماہین نے کھانستے ہوئے کہا۔

عروبہ کی جگہ حریم بولی۔ ''دیکھو ماہی! اب ہمارے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہی بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے پیچھے آنے والے ابھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں۔''

''میرے دماغ میں بھی یہی آرہا ہے۔'' عروبہ نے تائید کی۔

باریال پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''ماما! ایک اور بات بھی سوچنے والی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ..... عادی اور اس کے دوست اس عمارت کی طرف آئے ہی نہ ہوں؟''

''اور..... وہ جو آوازیں تھیں؟'' ماہین نے لرزاں

آواز میں کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اس ریسٹ ہاؤس کے ملازموں کی ہی تھیں۔'' باریال نے خیال ظاہر کیا۔

عروبہ کے اپنے ذہن میں بھی یہی بات آرہی تھی۔ تاہم اس موقع پر اس نے کسی طرح کا تبصرہ مناسب نہیں سمجھا۔ حریم کی طرح وہ بھی یہی چاہ رہی تھی کہ ابھی کچھ دیر اسی طرح انتظار کیا جائے پھر یہاں سے نکلنے کی تدبیر کی جائے۔ عروبہ کا اپنا موبائل فون تو بھاگتے ہوئے پانی میں گر گیا تھا لیکن حریم کا فون اس کے پاس تھا۔ اگر وہ اپنے طور پر یہاں سے نکلنے میں ناکام ہو جاتے تو یہ فون بہت مدد کر سکتا تھا۔

روزن میں سے سورج کی جو تر چھی کرنیں اندر آرہی تھیں، وہ اب اوجھل ہو گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ سورج مزید نیچے چلا گیا ہے۔ بدلتے موسم کی یہ مختصر شام بہت جلد تاریکی کا لبادہ اوڑھنے والی تھی۔

عمارت کے کسی حصے سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس خاموشی کو بس کسی وقت مرغیوں کی کٹ کٹ کی آواز توڑتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہی مرغیاں ہیں جن کا تذکرہ ابھی کچھ دیر پہلے احسن خاں اور ایک دوسرے شخص کی گفتگو میں ہوا تھا۔ مرغیوں کا یہ دڑبا تہ خانے کے روزن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

عروبہ اور تینوں بچوں کا خیال تھا کہ لائٹ جلد ہی آجائے گی مگر وہ ایک بار جانے کے بعد پھر نہیں آئی۔ اس دوران میں باریال نے کونے کھدروں میں جھانک کر ایک لالٹین ڈھونڈ لی۔ دیا سلائی بھی چولہے کے پاس سے مل گئی۔ نیم تاریک تہ خانے میں لالٹین کی روشنی ہوئی تو ماہین کے علاوہ باقیوں کی بے چینی بھی کچھ کم ہو گئی۔ دو تین گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات انہیں جاگتی آنکھوں کے خواب جیسے لگ رہے تھے۔ وہ دو خوشگوار دنوں کی تفریح کے بعد اچھے بھلے لاہور کے لیے روانہ ہوئے تھے لیکن پھر..... سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ عادی کی جیپ کا نظر آنا..... ان سے بچنے کی کوشش میں مہران کار کی تیز رفتاری اور پھر کار کا کچے میں اتر کر پھنس جانا۔ کار سے نکل کر ان کا اندھا دھند بھاگنا اور پھر پناہ کے لیے اس نامعلوم عمارت کے تہ خانے میں بند ہو جانا..... یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ انہیں زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

عروبہ کو اپنے جسم کے مختلف حصوں پر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جلن ان جھاڑیوں اور خاردار شاخوں کے سبب تھی جو بھاگتے وقت اس کے جسم سے ٹکراتی رہی تھیں۔ چونکہ وہ سب سے آگے تھی اس لیے خاردار شاخوں نے زیادہ متاثر اسی کو کیا تھا۔ حریم، باریال اور ماہین کے جسم کے کھلے حصوں پر بھی گہری خراشیں موجود تھیں۔

حریم نے کہا۔ ''ماما! میرا خیال ہے کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہمیں روشندان سے باہر دیکھنا چاہیے۔''

عروبہ نے کہا۔ ''لکڑی کا وہ تختہ گھسیٹ کر روشندان کے نیچے کر لو اور اس پر کرسی رکھ لو۔''

باریال اور حریم نے دو منٹ کے اندر تختہ کو مقررہ جگہ تک گھسیٹ لیا اور اس کے اوپر ایک کے بجائے دو کرسیاں ساتھ ساتھ رکھ دیں۔ اب وہ بہ آسانی نوفٹ اونچے روزن میں سے جھانک سکتے تھے۔ پہلے حریم اور باریال نے باہر جھانکا، پھر باریال نیچے اتر آیا اور عروبہ، حریم کے ساتھ کھڑی ہو کر روزن میں سے جھانکنے لگی۔ شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ یہ ریسٹ ہاؤس کے سامنے والا حصہ تھا۔ خوب صورتی سے تراشا ہوا ایک وسیع گراسی لان اور کیاریوں میں پھولدار پودے دکھائی دے رہے تھے۔ گراسی لان کے بیچوں بیچ سے کنکریٹ کا بنا ہوا ایک چودہ پندرہ فٹ چوڑا راستہ مین گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ غالباً یہ ''ڈرائیوے'' کا کام بھی دیتا تھا۔ روزن میں سے مین گیٹ کا صرف نصف حصہ دکھائی دیتا تھا۔ گیٹ کی دوسری جانب غالباً ایک پرائیویٹ سڑک تھی جو بالکل خالی تھی اور یہاں سے دونوں جانب دیکھنے پر کیکر اور نیم کے درختوں کے بلند درخت خاموش کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ [illegible] الوداعی کرنیں انہیں چھو رہی تھیں..... عروبہ نے روزن کے بالکل ایک کونے پر جا کر دیکھا، ایک دیوار کے ساتھ مرغیوں کے دڑبے کا مختصر سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔

سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر عروبہ نے روزن کی آہنی گرل سے منہ لگایا اور ایک بار پھر مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔ حریم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تین چار منٹ تک ان کی آوازیں تہ خانے میں اور تہ خانے سے باہر گونجتی رہیں لیکن کسی طرح کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

وہ تھک کر نیچے اتر آئیں۔ اس دوران میں باریال تہ خانے کے آہنی دروازے سے زور آزمائی کرتا رہا تھا۔ اس ناکام زور آزمائی میں ماہین نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب باریال مایوسی کے عالم میں شیشم کے لٹھ نما ڈنڈے سے دروازے پر ضربیں لگا رہا تھا۔ یقیناً یہ آواز دور تک سنی جا سکتی تھی مگر ثابت یہی ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی سننے والا موجود

ہی نہیں ہے۔

اگلے ایک گھنٹے میں عروبہ اور بچوں نے کئی جتن کر کے دیکھ لیے۔ انہوں نے دروازے پر کوشش کی۔ وہ روزن سے منہ لگا کر چلاتے رہے، انہوں نے روزن کا اوپر نیچے حرکت کرنے والا شیشہ توڑ دیا اور روزن کی گرل کو مختلف اشیا سے ضربیں لگائیں کہ شاید وہ اپنی جگہ چھوڑ دے۔ سب کچھ بے سود رہا۔ اب انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک تہوار کے موقع پر اس سنسان جنگل میں واقع اس عمارت میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔

ماہین نے پھر سسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی کمزور تھی۔ حریم نے چھوٹی بہن کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور پچکارنے لگی۔ عروبہ سر پکڑ کر ایک بوسیدہ سے ٹوسیٹر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سینے میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ نگاہوں میں عدیل عرف عادی کا منحوس چہرہ تھا۔ بدقماش باپ کے اس شیطان صفت بیٹے نے ان کی زندگی کو وبال بنا کے رکھ دیا تھا۔ اس نے کس کس موقعے پر اور کہاں کہاں انہیں زخم نہیں لگائے تھے.....

اس پریشان حال گھرانے کو اگر مدت بعد تھوڑی سی خوشی اس تفریحی ٹور کی شکل میں ملی تھی تو اس کا انجام بھی ایک جانکاہ صورتِ حال کی شکل میں ہوا تھا۔ اگر آج عروبہ اور اس کے بچے اس تاریک بیسمنٹ میں مقید ہوئے تھے تو اس کی وجہ بھی یہی منحوس چہرہ تھا۔ عروبہ کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے جھاڑیوں میں بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا تھا اور اسے عادی کی سلور جیپ نظر آئی تھی۔ لمبے بالوں والا بدمعاش صورت عادی اور اس کے ساتھی جیپ میں سے نکل کر ان کے پیچھے لپک رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر ان اونچے سرکنڈوں میں یا ارد گرد کے ویرانے میں وہ اور اس کی بچیاں ان شیطان صفت جانوروں کے قبضے میں آجاتیں تو ان کا کیا حال ہوتا۔ یہ سب کچھ سوچ کر اسے یہ موجودہ مصیبت کمتر محسوس ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے نانا کہا کرتے تھے، ہر مقام شکر کا مقام ہوتا ہے اور ہر مصیبت میں بھی شکر کا پہلو ہوتا ہے کیونکہ ہر مصیبت سے بڑی بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں جن سے اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا ہوتا ہے۔

لالٹین کی روشنی تہ خانے کے دونوں کمروں میں مدھم سی پراسرار روشنی پھیلا رہی تھی۔ عروبہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر گھوم پھر کر دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک بوسیدہ سا ڈبل بیڈ اور تھری سیٹر صوفہ تھا۔ یہاں ایک بغلی دروازہ ایک چھوٹے سے گندے باتھ روم میں کھلتا تھا۔ ایسے باتھ رومز میں عموماً ''سیپٹک ٹینک'' اور ڈرین کرنے کے لیے موٹر ہوتی ہے مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ شاید پانی کی نکاسی کے لیے کوئی متبادل انتظام کیا گیا تھا۔ نلکے میں پانی موجود تھا اور بالٹی لوٹا وغیرہ بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہاں بھی ایک روشندان تھا لیکن یہ بمشکل چھ انچ ضرب دس انچ کا رہا ہوگا۔ یہاں بھی متحرک شیشے کی دوسری جانب آہنی گرل تھی۔ باہر تاریکی کے سبب اب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عروبہ نے مڑ کر دیکھا، عقب میں حریم کھڑی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''ماما! مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ ماہین کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں خالہ نادیہ سے رابطہ کر کے انہیں بتا دینا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے..... ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی فارم ہاؤس میں ہی ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ سکتی ہیں۔''

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر کر و فون۔''

حریم نے موبائل آف کر رکھا تھا، وہ اسے آن کرنے میں مصروف ہوگئی۔ ''اسے آف کیوں کر رکھا ہے؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''ماما! چارجنگ بہت کم ہے۔ اگر لائٹ جلدی نہ آئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔''

فون آن ہوا تو حریم نے خالہ نادیہ کا نمبر پریس کر کے اسے عروبہ کی طرف بڑھا دیا۔ عروبہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے اسے مایوس کیا..... آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔

عروبہ نے دوسری بار بھی کوشش کی مگر جواب وہی ملا۔

اسی دوران میں عروبہ کی نگاہ موبائل فون کی اسکرین پر پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ موبائل کی اسکرین پر ایک طرف سرخ نشان تھا اور وہ فقط نو فیصد چارجنگ بتا رہا تھا۔ حریم ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اگر جلد ہی لائٹ نہ آجاتی تو یہ فون بھی بے کار ہو سکتا تھا۔ ویسے تو اس موبائل کا یہاں تک پہنچ جانا بھی غنیمت تھا۔ یہ گاڑی میں بھی رہ سکتا تھا۔ دراصل حریم کی اچھی عادتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے شولڈر بیگ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ جب وہ گاڑی سے نکل کر بھاگے تو اس وقت بھی شولڈر بیگ حریم کے کندھے پر تھا اور موبائل اور اس کا چارجر وغیرہ بیگ کے اندر تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں انہوں نے تین جگہ پر کال

Digitized by Google

ملانے کی کوشش کی۔ خالہ نادیہ کے نمبر پر تو ویسے ہی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ خالو یا دور حیات کا نمبر بند جا رہا تھا۔ عروبہ کے اندازے کے مطابق وہ ویسے بھی دبئی میں تھے۔ جو تیسرا نمبر انہوں نے ملایا، وہ عمیر کا تھا۔ وہاں بیل تو جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ حریم کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اسے یاد آیا کہ چند روز پہلے اس نے کس طرح عمر کی کالز نظر انداز کی تھیں اور پھر آخر میں کیا میسج کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عمیر بہت حساس طبع کا مالک ہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے بہت زیادہ تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آج وہ اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔

چارجنگ اب اور کم رہ گئی تھی۔ حریم نے کہا۔ ”ماما! ہمیں رک جانا چاہیے۔ لائٹ کا کوئی بھروسا نہیں۔ ہمیں تھوڑی بہت چارجنگ بچانا چاہیے۔“

”اوہ گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔“ عروبہ نے سر تھام کر کہا۔

حریم نے فون آف کر دیا۔ پریشانی کے باوجود عروبہ کو اپنے بچوں کی بھوک کی فکر بھی تھی۔ وہ جب فارم ہاؤس سے نکلے تو انہوں نے لیٹ ناشتا کیا تھا۔ اب اس ناشتے کو قریباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ لالٹین کو چولہے کے قریب لے گئی۔ اس نے دیوار گیر الماری کو ٹٹولا۔ اسے چنے کی دال کے علاوہ کچھ چاول بھی مل گئے۔ اولاد کو ”فیڈ“ کرنے کی تڑپ قدرت نے ماں کے خون میں نصب کر رکھی ہے۔ اس وقت یہی تڑپ ان سخت نامساعد حالات میں بھی عروبہ کو کچھ پکانے پر مجبور کر رہی تھی۔

اس نے نہ صرف حریم کے ساتھ مل کر دال چاول پکائے بلکہ زبردستی ماہین اور باریال کو چند لقمے کھانے پر بھی مجبور کیا۔ کھانے کے بعد ماہین کو ایک بار پھر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس کو سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ یہ اچھی نشانیاں نہیں تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دمے کے اٹیک میں بدل سکتی تھی۔ یہاں چولہے کے پاس والی الماری میں جو مسالے وغیرہ پڑے تھے، ان میں عروبہ نے ایک ڈبے کے اندر تھوڑی سی اجوائن بھی دیکھی تھی۔ آخری عمیر میں عروبہ کے نانا کو بھی کسی وقت دمے کی شکایت ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے لیے اجوائن کا دیسی ٹوٹکا استعمال کیا کرتے تھے اور اس سے انہیں بہت فائدہ ہوتا تھا۔ کئی دیگر اشیا کی طرح ماہین کی دوا وغیرہ بھی گاڑی کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ عروبہ نے اجوائن استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چولہا جلا کر تھوڑی سی اجوائن بھونی۔ اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر اس میں اجوائن ڈالی اور ایک چھوٹی سی پوٹلی بنالی۔

”ماہین بیٹا! اس کو اپنی ناک کے قریب رکھو۔ یہ تمہارے لیے ”ان ہیلر“ کا کام دے گی۔“

ماہین نے ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی سانس میں بہتری آ گئی۔ ذرا آرام ملا تو اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ عروبہ نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ ایک طرف بڑا سا جستی صندوق پڑا تھا، اس پر چند میلے کمبل اور ایک دو لحاف رکھے تھے۔ اب کسی طرح گزارا تو کرنا ہی تھا۔ عروبہ نے ایک نسبتاً بہتر کمبل ماہین کو اوڑھا دیا..... تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

اسی دوران میں باریال نے جستی صندوق کے عقب سے ایک کام کی چیز ڈھونڈ لی تھی۔ ”یہ دیکھیں ماما۔“ اس نے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ عروبہ نے کہا۔

”یہ لوہا کاٹنے والی آری ہے۔ اگر ہم اس کا بلیڈ اس کے فریم میں سے نکال لیں تو اس کے ساتھ روشندان کی گرل کاٹنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔“

”لیکن یہ کام اتنی جلدی ہونے والا تو نہیں۔“ حریم نے کہا۔

”آپی! جلدی ہونے والا نہیں تو بہت زیادہ دیر والا بھی نہیں۔“

باریال نے لالٹین اٹھا کر لکڑی کے تخت پر رکھی پھر کرسی پر چڑھ کر روزن کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے آڑا ترچھا طور پر لوہا کاٹنے والا بلیڈ روزن کی گرل پر چلایا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش کے بعد وہ گرل کی ایک پتری میں چھوٹا سا کٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ امید کی ایک موہوم سی کرن تھی۔

ماہین اپنی خراب طبیعت کے باعث سو چکی تھی۔ انہوں نے اس کی نیند خراب کرنا مناسب نہ سمجھا اور گرل کاٹنے کا کام کل تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی ذہنی اور جسمانی تھکن سے ان کا برا حال تھا۔ وہ ایک ہی کمرے میں جہاں جگہ ملی لیٹ گئے۔ کھلے ہوئے روزن سے مارچ کی خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ جھینگروں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ سڑک کی طرف آوارہ کتے بھی کسی وقت شور مچانے لگتے تھے۔ وہ خود کو ایک جنگل کے بیچوں بیچ محسوس کر رہے تھے۔ عروبہ جاگ رہی تھی اور باریال اور حریم بھی جاگ رہے تھے۔ ان تینوں کے ذہن شاید ایک ہی رخ پر ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ وہ یہاں سے کیسے نکل پائیں گے، ان کو ایک سہارا حریم والے

موبائل فون کا بھی تھا مگر اس کی چارجنگ ایک سوالیہ نشان تھی اور لائٹ ایک بار جانے کے بعد پھر نہیں آئی تھی..... انہوں نے اب فون کو صبح استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بے شک یہ اکلوتا فون ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ ماہین کو فون استعمال کرنے کی ابھی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ جبکہ آزادی سے گھومنے پھرنے کے لیے باریال اپنا فون جان بوجھ کر گھر چھوڑ آیا تھا۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ لیٹے ہوئے تھے۔ کمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لیے کبھی کوئی بات کر لیتے پھر کئی منٹ کے لیے سناٹا چھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ باریال اور حریم سو گئے اور وہ اپنے بچوں پر اپنے بازو پروں کی طرح پھیلائے دیر تک جاگتی رہی۔ رات آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی.....

اونچی نیچی جھاڑیوں میں ننگے پاؤں وہ بے طرح دوڑتی جارہی تھی۔ چاروں طرف ایک سیاہ جنگل تھا۔ اس کے عقب میں کچھ نامعلوم جانور تھے۔ ان کی پھنکاریں اور ہانپتی ہوئی آوازیں اس کے قریب تر پہنچ رہی تھیں۔ وہ ان کی زد سے بچنا چاہتی تھی، اندھا دھند بھاگتی چلی جارہی تھی۔

ایک جھٹکے سے عروبہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا کہ جانوروں کی خونخوار آوازیں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ یہ کون جانور تھے؟ کیوں اسے اپنے حصار میں لے کر مار ڈالنا چاہتے تھے؟ وہ اپنے حواس بحال کرنے لگی اور اپنی سماعت پر غور کرنے لگی..... اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ وہ اب خواب میں نہیں، پورے ہوش وحواس میں ہے۔ اس کے باوجود وہ کچھ فاصلے سے بلند ہونے والی مکروہ آوازیں سن رہی تھی۔

وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا وہ اپنے حواس میں ہو کر بھی حواس میں نہیں ہے؟ اس نے دھیان سے سنا۔ آواز آرہی تھی بلکہ یہ آوازیں تھیں..... اور یہ وہی آوازیں تھیں جو وہ ایک مدت سے سنتی آرہی تھی۔ یہ جانوروں کی آوازیں تھیں لیکن وہ انہیں پہچانتی نہیں تھی۔

اس نے لالٹین کی لو بلند کی۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس نے حریم کو جگا دیا۔ ''کیا ہوا ماما؟'' حریم نے ڈر کر پوچھا۔

''کک..... کچھ نہیں۔'' اس نے چھپانے کی کوشش کی۔

لیکن اب حریم بھی یہ آوازیں سن چکی تھی۔ یہ آوازیں کتوں کی نہیں تھیں، نہ ہی گیدڑوں کی تھیں..... یہ کچھ اور طرح کی آوازیں تھیں۔ اسی اثنا میں باریال بھی جاگ گیا۔ جلد ہی اسے بھی اپنی ماما اور آپی کی دہشت کی وجہ معلوم ہوگئی۔ آوازیں ہولناک تھیں اور روزن کے قریب سے آرہی تھیں۔ یہ رات کے قریباً چار بجے کا عمل تھا۔ باریال نے بے چینی سے کمرے کا ایک چکر لگایا اور پھر ماں اور بہن کے قریب آن بیٹھا۔

''یہ کیسی آوازیں ہیں باریال؟'' حریم نے پوچھا۔

باریال کے چہرے پر ہلدی سی بکھر گئی تھی اور اس کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ وہ شاید ماں اور بہن سے زیادہ جانتا ہے۔ جب حریم نے اپنا سوال دہرایا تو وہ مدھم لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں نے ایک فلم دیکھی تھی..... دی ٹریپ..... وہ بھیڑیوں کے بارے میں تھی۔ مم..... مجھے..... لگ رہا ہے کہ..... یہ ویسی ہی آوازیں ہیں.....''

باریال کی بات نے جیسے حریم کے کسی بدترین اندیشے کی تصدیق کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی دہشت کے سائے گہرے ہوگئے۔ وہ ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

''مجھے بھی لگتا ہے کہ اس طرح کی آوازیں wolves ہی نکالتے ہیں۔ شاید کسی فلم یا ڈاکیومینٹری میں، میں نے بھی یہ آوازیں سنی ہیں.....''

''تو..... اس کا مطلب ہے..... یہاں بھیڑیے ہیں۔'' عروبہ نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی لیکن اسے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ دہشت اور اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز۔

وہ سب اپنی اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھے رہے۔ کسی میں جیسے اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ بات آگے بڑھاتا، یا پھر روشندان کی طرف جاتا اور باہر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ آوازیں وقفے وقفے سے مسلسل آرہی تھیں۔ یہ کم از کم دو جانور تو ضرور تھے۔ پھر عروبہ نے دھیان سے سنا اور اسے مرغیوں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کی بے قرار ''قیں قیں'' بھی سنائی دی۔ اس نے اپنی ہمت مجتمع کی۔ لالٹین تھام کر اٹھی اور لکڑی کے اس تخت کے پاس پہنچ گئی جس پر دو کرسیاں رکھی تھیں۔

''ماما! دھیان سے.....'' حریم نے جیسے کراہ کر کہا۔

اپنے سرپٹ بھاگتے دل کو سنبھالتے ہوئے عروبہ احتیاط سے کرسی پر چڑھی۔ روزن سے آنے والی خنک ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ مرغیوں کی آوازیں اب بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔ دل کڑا کر کے عروبہ نے روزن کی گرل سے چہرہ لگا کر باہر جھانکا۔ باہر کسی گوشے میں ایک زرد بلب روشن تھا جس کی بہت مدھم سی روشنی ڈربے کے اس حصے کو نمایاں کر رہی تھی جو روزن میں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس بلب کا تعلق یقیناً کسی ''یو پی ایس'' سے رہا ہوگا۔ عروبہ نے وہاں دو جانوروں کے ہیولے دیکھے..... یہ

کتے تو ہرگز نہیں تھے۔ وہ گیدڑ بھی نہیں تھے کیونکہ ان کی آوازیں عروبہ بخوبی پہچانتی تھی۔ یہ وہی تھے..... یہ وہی تھے شاید۔ اس کا پورا جسم اندر تک لرز گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں جانور دڑبے کے پاس کی کچی زمین اپنے پنجوں سے کھودنے کی کوشش کررہے تھے۔ یقیناً ان کی وحشی بھوک نے انہیں پوری طرح اس دڑبے کی طرف متوجہ کررکھا تھا۔ اسی دوران میں عروبہ کو پتا چلا کہ کم از کم ایک جانور اور یہاں موجود ہے کیونکہ ایک آواز ریسٹ ہاؤس کے کسی اور حصے سے آئی تھی۔

عروبہ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور اسے یوں لگا کہ دونوں میں سے ایک جانور اپنا سر دڑبے کے نیچے کسی خلا میں گھسانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ مرغیوں کی ''آہ وبکا'' اور پھڑپھڑاہٹ اب عروج پر پہنچ گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب عروبہ نے اس تیسرے جانور کا ہیولا بھی دیکھ لیا جس کی آواز تھوڑی دیر پہلے فاصلے سے سنائی دی تھی۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں اور وہ بلا کی رفتار سے دڑبے کی طرف آرہا تھا..... اس سے آگے دیکھنے کی ہمت عروبہ کو نہیں ہوئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی نیچے اتری، حریم اور باریال کو کھینچ کر دوسرے کمرے میں لائی اور دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کردیا۔

حریم نے کہا۔ ''ماما..... وہ بھیڑیے ہی ہیں؟''

''یہی لگ رہا ہے۔'' عروبہ نے جواب دیا۔ دہشت کے سبب اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''وہ مرغیوں کو مار رہے ہیں؟'' باریال نے پوچھا۔

''ہاں۔'' عروبہ نے کہا اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لگالیا۔

درمیانی دروازہ بند ہونے کے باوجود مرغیوں کے چلانے اور پھڑپھڑانے کی دردناک آوازیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ بھوکے جانوروں نے دڑبا توڑ دیا ہے اور مرغیوں پر پل پڑے ہیں۔

''یااللہ..... یااللہ۔'' حریم نے کراہتے ہوئے کہا اور سر جھکا کر اپنی دونوں ہتھیلیوں سے دونوں کان ڈھانپ لیے۔

عروبہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ غنیمت تھا کہ ماہین ابھی تک سو رہی تھی ورنہ پتا نہیں کہ اس کا کیا حال ہوتا۔

بھیڑیوں کی غراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ مرغیوں کی چیخ وپکار دب کر رہ گئی تھی۔ قیامت کا سا سماں تھا۔

کچھ دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے قیامت گزر گئی ہے۔ اب اردگرد کوئی آواز نہیں تھی۔ بھوکے جانور پیٹ کی آگ ماند کرنے کے بعد شاید کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی وسیع عمارت کے اندر ہی کہیں یا احاطے میں موجود ہوں گے۔

وہ تینوں ڈرے سہمے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ عروبہ کے ہونٹ بے ساختہ بدبدانے والے انداز میں ہلتے جارہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

حریم نے کمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''ماما..... جنگلی کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں تو ہم خالہ نادیہ کے فارم ہاؤس پر بھی سنتے رہے ہیں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ یہاں یہ wolves بھی ہوتے ہیں۔''

عروبہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نادیہ نے تم لوگوں کو شاید اس لیے نہیں بتایا کہ تم خوفزدہ نہ ہوجاؤ..... لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں آگے جنگل کی گہرائی میں یہ جانور پایا جاتا ہے بلکہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

باریال اور حریم مسلسل سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ اسے بات مکمل کرنا پڑے گی۔ وہ بولی۔ ''بلکہ کہا جاتا ہے کہ پندرہ بیس سال پہلے تک یہ جانور چیچہ وطنی سے کچھ فاصلے پر ''رکھوں'' اور ''ذخیروں'' میں بھی دیکھے جاتے تھے اور اس سے پہلے ہڑپہ کے اردگرد بھی پائے جاتے تھے۔ اب یہ ان علاقوں میں تو نہیں ہیں مگر دور دراز جگہوں پر ہیں۔ پاس کے چولستانی علاقے میں بھی ان کو دیکھا جاتا ہے۔''

''لیکن ماما! یہاں سے تو سڑک گزرتی ہے۔ عام لوگوں کا اور سیاحوں کا آنا جانا ہے..... پھر بھی؟'' یہ سوال باریال نے کیا تھا۔ اچھی بھلی خنکی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینا آرہا تھا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے..... کہ یہ بھٹک کر اس طرف آنکلے ہوں۔'' عروبہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

باریال چپ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد پرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہیں سنا تھا کہ بعض اوقات جنگلی جانوروں کو جب شکار نہیں ملتا تو وہ بھوک سے بے تاب ہوکر آباد علاقے کی طرف آجاتے ہیں۔''

''کچھ ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔'' عروبہ نے کہا۔ ویسے اس کے ذہن میں اب بھی یہ شک تھا کہ پتا نہیں یہ بھیڑیے ہیں بھی یا نہیں۔ دوسری طرف باریال اور حریم اس بات پر متفق تھے کہ یہ بھیڑیے ہی ہیں۔ باریال کا خیال تھا کہ ان کو ''گرے وولف'' کہتے ہیں۔

''ماما! میں ایک بار پھر فون پر ٹرائی کروں؟'' حریم

نے کہا۔

''نہیں بیٹا، ابھی نہیں۔ دیکھو لائٹ ابھی تک نہیں آئی۔ پتا نہیں کہ آنی بھی ہے یا نہیں۔ جو تھوڑی بہت چارجنگ ہے، وہ ختم ہوگئی تو.....؟''

''ہاں..... ابھی تو ہر کوئی سو رہا ہوگا۔'' باریال نے تائید کی۔

آوازیں اب نہیں آرہی تھیں۔ نہ کہیں کوئی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ ہاں سڑک پار سے آوارہ کتوں کا شور کبھی کبھار ابھرتا تھا۔ چند بار کچھ دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیں۔ یہ گیدڑوں کی تھیں اور ان آوازوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔

☆☆☆

ایک رات..... ایک خوفناک رات گزر چکی تھی۔ باتھ روم کے چھوٹے سے روزن سے جھانکنے والا اجالا بتا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں سورج طلوع ہونے والا ہے۔ وہ تینوں مسلسل جاگتے رہے تھے۔ انہیں ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی عمارت کے کسی حصے سے پھر وہی ہولناک آوازیں آنا شروع ہوجائیں گی۔ نیم غنودگی کی کیفیت میں عروبہ کے پردۂ تصور پر پھر وہی خوفناک منظر نمودار ہوا۔ جنگل..... جانور..... گیراؤ..... جان بچانے کی تگ و دو..... لیکن اس مرتبہ اس منظر کی عدالت چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔

عروبہ نے گھٹنے اوپر اٹھائے اور دیوار سے ٹیک لگا کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بارہا دیکھے ہوئے ان مناظر میں اور آج رات پیش آنے والے واقعے میں کیا واقعی کوئی ناتا تھا؟ اس کے نانا کہا کرتے تھے کہ انسان کے تصورات میں اور اس کے سپنوں میں وہی کچھ آتا ہے..... جو حقیقت میں ہونا عین ممکن ہوتا ہے اور اکثر اوقات وہ سب کچھ اس کی زندگی میں گزر چکا ہوتا ہے یا گزرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی شکل تھوڑی بہت تبدیل ہوسکتی ہے لیکن اس کا لبِ لباب وہی ہوتا ہے.....

باریال کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''ماما! لگتا ہے کہ اب کم از کم یہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ کیوں نہ اب آرمی سے گرل پر کوشش کی جائے۔''

''کون سا خطرہ بھائی؟'' ماہین نے پوچھا۔

وہ جاگ چکی تھی..... اور انہوں نے اسے رات والے واقعے سے مکمل بے خبر رکھا تھا۔

''وہی خطرہ جس سے بھاگتے بھاگتے یہاں پہنچے ہیں۔'' حریم نے اس کے سوال کو دوسری طرف گھما دیا۔

وہ غیر مطمئن نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھنے لگی۔

باریال اب تلا ہوا تھا کہ بلیڈ کے ذریعے گرل کاٹنی شروع کی جائے۔ عروبہ نے کہا۔ ''باریال! جلد بازی نہ کرو۔ پہلے ہم فون پر تمہاری خالہ نادیہ کو ٹرائی کرتے ہیں۔''

حریم بھی ماں کی ہم خیال تھی۔ عروبہ نے بسم اللہ پڑھ کر فون آن کیا۔ اس کی چارجنگ اب مزید کم ہوچکی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عنقریب جواب دے جائے گا۔ عروبہ نے نادیہ کا نمبر پریس کیا۔ فوراً ہی مایوسی کا ایک تیز جھونکا آیا۔ جواب کل والا ہی تھا۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں، تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

عروبہ کو یاد آیا کہ ساہیوال میں جہاں نادیہ کی رہائش تھی، وہاں کسی ٹاور وغیرہ کا مسئلہ بھی تھا اور کبھی کبھی موبائل کے سگنل وہاں نہیں ملتے تھے۔ شاید اب بھی کوئی ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ بہرطور اس نے خالہ نادیہ کو ایک مختصر میسج بھیج دیا۔ ''خالہ! مجھے کال کریں یا میسج۔ ہم مصیبت میں ہیں۔''

انہوں نے دوسری ٹرائی عمر کے لیے کی۔ یہ ٹرائی خود حریم نے کی۔ عمر کو کال جانے لگی لیکن ریسیو نہیں ہوئی۔

چارجنگ مزید کم ہورہی تھی۔ حریم نے دل کڑا کے دوسرے مرتبہ عمر کا نمبر پریس کیا۔ اس مرتبہ بھی بس بیل ہی جاتی رہی۔ پانچویں چھٹی بیل جانے کے بعد حریم نے دکھ آمیز مایوسی کے ساتھ کال منقطع کردی اور اس کے ساتھ ہی فون بھی آف کردیا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہر صورت اس موبائل کی رہی سہی چارجنگ بچانی ہے۔

فون کے حوالے سے ان ناکام کوششوں کے بعد باریال کی ساری توجہ ایک بار پھر روزن کی گرل کی طرف چلی گئی۔ اس مرتبہ حریم بھی اس کی حامی تھی۔ تاہم باریال کے کرسی پر چڑھنے سے پہلے عروبہ خود چڑھی تاکہ ایک دفعہ احتیاطاً باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔ باہر ہلکے بادل تھے اور بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ خنکی میں اضافہ محسوس ہوتا تھا۔ روزن میں سے تین چار مخصوص مناظر ہی دکھائی دیتے تھے۔ ڈرائیوے اور سلاخ دار مین گیٹ کا تھوڑا سا حصہ۔ اس سے آگے ریسٹ ہاؤس کی پرائیویٹ سڑک کا سنسان ٹکڑا، سبزہ زار کی باڑ اور کچھ پھولدار پودے۔ مرغیوں کے دڑبے کا دائیں جانب والا حصہ بھی نظر آتا تھا۔

عروبہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ مرغیوں کے پر اور ان کی خون آلود انتڑیاں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان دو ڈھائی درجن دیسی مرغیوں میں

سے شاید کوئی ایک بھی زندہ نہ بچی ہو۔ وڈیا ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ وڈیرے کے پاس ایک جگہ بچی زمین میں ٹھیک ٹھاک گڑھا نظر آرہا تھا۔ یقیناً یہ گڑھا ان بھوکے خون آشام جانوروں نے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بنایا تھا۔

یہ نگاہوں کے لیے ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ بہرحال اب آس پاس کہیں بھی کسی خطرے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اسی اثنا میں باریال بھی ماں کے پہلو میں آن کھڑا ہوا تھا اور سکتہ زدہ نظروں سے باہر کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔ یہی وقت تھا..... ہاں یہی وقت تھا جب عروبہ کی نگاہ وڈیرے سے کچھ فاصلے پر موجود مستطیل کیاری کے اندر پھولدار پودوں پر پڑی۔ اس کے ذہن نے ایک عجیب طرح کا دھچکا محسوس کیا۔ شاید وہ پہلے دھیان سے نہیں دیکھ پائی تھی۔ اسے وہاں گلاب کے سفید پھول نظر آئے۔ ان سفید پھولوں کے پتے تھوڑے گہرے رنگ کے تھے۔

وہ سرتاپا لرز گئی۔ ایسا منظر تو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ بے شمار بار دیکھا تھا۔ خونی جانوروں کے گھیرے میں وہ قیامت خیز گھڑیاں..... وہ جان بچانے کی جدوجہد..... وہ اردگرد کا سنسان ماحول..... وہ سفید گلاب اور ان پر خون کے چھینٹے۔ اسے لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا یا وہ چکرا کر گر جائے گی۔ یہ سب ایک اتفاق تھا..... یا پھر اتفاق نہیں تھا۔ اس کے نانے دور کہیں کسی ہونی انہونی سے جڑے ہوئے تھے..... اس کے نانا یہ بھی تو کہا کرتے تھے کہ کبھی بھی انسان مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلکیاں بہت پہلے سے دیکھ لیتا ہے..... اور یہ انسانی ذہن کی ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فہم صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔

''ماما! آپ ذرا نیچے اتر جائیں۔ مجھے کوشش کرنے دیں۔'' باریال کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

وہ جیسے چونک کر اور لرز کر نیچے اتر آئی۔

☆☆☆

باریال قریباً ایک گھنٹے تک بڑی دل جمعی سے لگا رہا تھا اور اس نے گرل کی دو جانب سے چھ سلاخوں کو کاٹ ڈالا تھا۔ اب ایک جانب سے بس دو سلاخوں کو کاٹنا باقی تھا۔ چوتھی جانب کی دو سلاخوں کو کاٹنا ضروری نہیں تھا، کیونکہ پھر گرل کو موڑ کر باہر نکلنے کا راستہ بنایا جاسکتا تھا۔

یہ روزن قریباً ڈیڑھ فٹ ضرب تین فٹ کا تھا۔ اگر تخت کے اوپر رکھی ہوئی کرسی پر ایک جستی بالٹی اوندھی رکھ لی جاتی تو شاید وہ چاروں اسی روزن میں سے رینگ کر باہر نکل جاتے۔ باریال اب تھک چکا تھا اس لیے بقیہ دو سلاخیں کاٹنے کا ذمہ حریم نے لے لیا۔ باریال نے لوہا کاٹنے والے بلیڈ کے ایک سرے پر بڑی مہارت سے فوم کا ایک چھوٹا ٹکڑا اور کپڑے کی ایک پٹی لپیٹ دی تھی۔ یوں اس بلیڈ کا دستہ سا بن گیا تھا۔ کل والی خوفناک بھاگ دوڑ میں جہاں ان سب کو بہت سی گہری خراشیں آئی تھیں وہاں باریال کی ایک ہتھیلی بھی دو تین انچ تک کٹ گئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے قریباً ایک گھنٹے تک بے مثال قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی ہتھیلی خونم خون ہوگئی تھی مگر اس نے گرل کے چھ سریے کاٹ ڈالے تھے۔ اب باقی دو کے لیے حریم کوشش کررہی تھی۔

''حریم! میں مدد کروں۔'' نیچے کھڑی عروبہ نے کہا۔

''نہیں ماما! بس دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔'' وہ بلیڈ کو سریے پر رگڑتے ہوئے بولی۔

یہ کام کرتے ہوئے بھی پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار عمر کی طرف چلا جاتا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر جاتی تھی۔ وہ روٹھا ہوا تھا۔ بری طرح روٹھا ہوا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جن سے ناراض ہوکر اس نے اپنا رخ موڑ لیا ہے، وہ کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ دو چار دفعہ اور فون کرتی تو وہ اٹھا ہی لیتا، مگر مسئلہ چارجنگ کا تھا جو بہت تھوڑی رہ گئی تھی..... اور ''لائٹ'' کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

وہ دل ہی دل میں جیسے پکار اٹھی۔ ''عمر..... پلیز عمر..... آپ تو میری چھوٹی سی تکلیف برداشت نہیں کرتے تھے۔ پھر میں میرے بازو پر ذرا سی چوٹ آئی تھی اور آپ کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ دیکھیں، اب میں کتنی بڑی مصیبت میں ہوں، ہم سب کتنی بڑی مصیبت میں ہیں.....''

کچھ ہی دیر بعد دونوں سلاخیں یعنی سریے کٹ گئے۔ ان چاروں کے لیے یہ ایک طرح سے بڑی کامیابی تھی۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ عادی اور اس کے دوست اب بھی آس پاس موجود ہوں گے بلکہ اب تو ان چاروں کو ہی ایسا لگتا تھا کہ وہ خبیث ٹولا اس ریسٹ ہاؤس کی جانب آیا ہی نہیں..... ہاں، رات کو تباہی مچانے والے تین عدد خونی جانوروں کے حوالے سے ان کے ذہن میں ابھی تک اندیشے موجود تھے کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے آس پاس موجود نہ ہوں۔ تاہم ان واقعات کو بھی اب قریباً دس بارہ گھنٹے گزر چکے تھے اور اس نسبت سے کسی طرح کی کوئی پریشانی سامنے نہیں آئی تھی۔

سریے کٹ گئے تو نیچے سے باریال نے پوچھا۔

Digitized by Google

''آجاؤں آپی؟''

''ہاں آجاؤ۔'' حریم نے ذرا ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

باریال لکڑی کے تخت پر چڑھا اور دوسری کرسی پر کھڑا ہوگیا۔ ان دونوں نے مل کر زور لگایا اور گرل کو اس طرح ٹیڑھا کردیا کہ باہر نکلنے کا راستہ کھل گیا۔ باریال نے روزن میں سے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ بارش کی بوندیں اس کے سر اور چہرے پر پڑیں۔ اسے جزوی آزادی کا احساس ہوا۔

''ماما! باہر نکلوں؟'' اس نے کہا۔

''نہیں بیٹا! پہلے اچھی طرح تسلی کرلو۔'' عروبہ کے لہجے میں ایک ماں کی وہ ازلی جبلت جھلک دکھا رہی تھی جو اپنی اولاد کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ بھی مول نہیں لیتی۔

عروبہ نے حریم کو نیچے اتارا اور اس کی جگہ خود دوسری کرسی پر کھڑی ہوگئی۔ مرغیوں کی باقیات نے ایک بار پھر اس کی نگاہوں کو مجروح کیا۔ اس نے اسٹیل کا ایک گلاس زور سے باہر پھینکا۔ وہ باہر کے پختہ فرش پر لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے اسٹیل کا ایک اور گلاس باہر لڑھکایا۔ وہ لڑھکتا ہوا کیاری میں جا گرا۔

اچانک عروبہ اور باریال کو لگا کہ زمین و آسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے ہیں۔ انہوں نے رات والے خونی جانوروں کو دیکھا۔ وہ گارڈینیا کی ایک باڑ کے پیچھے سے نکلے تھے اور طوفانی رفتار سے روزن کی طرف آرہے تھے اور ان کی تعداد دو یا تین نہیں تھی۔ وہ کم از کم پانچ جانور تھے۔ روزن سے ان کا فاصلہ پچیس تیس میٹر کے قریب تھا..... اور ان کے جھپٹنے کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ پلک جھپکتے میں روزن تک پہنچ سکتے تھے۔ ان کی آوازیں لرزہ خیز تھیں۔ سکتے کے ایک یا دو سیکنڈ گزر گئے تو عروبہ چلائی اور اس نے جسم کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے گرل کو موڑنا چاہا۔ باریال نے بھی بیجانی انداز میں اس کا ساتھ دیا۔ ابھی گرل بمشکل برابر ہی ہوئی تھی کہ خونخوار جانوروں کی تھوتھنیاں اس سے ٹکرائیں۔

گرل کو جو شدید جھٹکا لگا، اس نے باریال والی کرسی الٹا دی اور وہ فرش پر گرا۔ عروبہ نے جیسے اپنے جسم کے ریشے ریشے سے اپنی طاقت کشید کی اور گرل کو باہر کی طرف دھکیلے رکھا۔

''ماما..... ماما!'' حریم وحشت میں پکاری۔ پھر وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ اس نے کرسی سیدھی کی اور ماں کے پہلو میں کھڑے ہوکر گرل کو تھامے رکھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

عروبہ چلائی۔ ''باریال..... ماہین..... کرسیوں کو پکڑ کر رکھو۔''

ان دونوں نے عمل کیا۔ کرسیوں کے لڑھکنے کا خطرہ کم ہوگیا تو عروبہ اور حریم نے زیادہ مضبوطی سے گرل کو سنبھال لیا۔ وہ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ کمرے میں کہرام مچا ہوا تھا اور کمرے (تہ خانے) سے باہر ایک ایسا بھیانک منظر تھا جس کو دیکھ کر بھی نگاہیں اس پر یقین نہیں کر پا رہی تھیں۔ روزن کے سامنے کم از کم تین بھیڑیے موجود تھے۔ ان کی حیوانی بوار اور ان کی بدبودار سانسیں عروبہ کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے نکیلے مہلک دانت حریم اور عروبہ سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ ان کی آنکھوں میں وہ قاتل چمک تھی جس کو دیکھ کر ہی بندہ آدھا مر جاتا ہے۔ یہ ماں بیٹی کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنے حواس نہیں کھوئے تھے اور اس گرل کو تھام رکھا تھا جو ان کی زندگی کی ضمانت تھی۔

''ہمت سے حریم!'' ان بدترین لمحوں میں عروبہ نے بیٹی کا حوصلہ بڑھایا۔

نیچے ماہین نے ایک کرسی کو تھام تو رکھا تھا مگر وہ مسلسل بلک بھی رہی تھی اور ''ماما..... ماما'' پکار رہی تھی۔

بھوک نے موذی جانوروں کو جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ ہٹ کر گرل سے ٹکرانے لگے۔ ان کی ''ہاؤلنگ'' سماعت شکن تھی۔

''ماما! یہ ٹوٹ جائے گی۔'' حریم نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''نہیں..... کچھ نہیں ہوگا۔'' عروبہ نے اسے حوصلہ دیا..... تاہم وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوگا۔ بس وہ دل ہی دل میں اس اوپر والے کو پکار رہی تھی جو ہر وقت، ہر ڈھنگ سے ہر چیز پر قادر ہوتا ہے۔ ''یا اللہ..... میرے بچوں کی حفاظت کرنا..... یا اللہ! مجھے تنہا نہ چھوڑنا.....'' اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مسلسل یہ آواز نکل رہی تھی۔

وہ قیامت کا دورانیہ تھا..... پتا نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزرا۔ شاید دو منٹ شاید تین چار منٹ..... یا شاید اس سے کچھ زیادہ..... اچانک عقب میں کیاری کے پاس موجود کسی بھیڑیے کی آواز نے اپنا آہنگ بدلا۔ اس آہنگ کے بدلتے ہی دوسرے بھیڑیوں کے تیور اور آہنگ بھی بدل گئے۔ ان کی توجہ روزن کی جانب سے ایک دم کم ہوگئی۔ یوں لگا کہ انہیں دائیں جانب کوئی اور ٹارگٹ نظر آیا ہے۔ شاید کوئی خرگوش، کوئی خارپشت یا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ وہ جس طرح اچانک آئے تھے، اسی طرح اچانک روزن کے سامنے سے ہٹے اور ٹولی کی صورت میں ایک طرف لپکتے

Digitized by Google

چلے گئے۔

☆☆☆

خوفناک واقعے کو کم وبیش آدھ گھنٹا گزر چکا تھا، اس کے باوجود ان چاروں کے جسم لرزتے چلے جارہے تھے۔ ماہین بالکل نیم جان تھی اور عروبہ جان گئی تھی کہ اس پردے کا ایک ہوچکا ہے۔ خونی جانوروں کے اوجھل ہونے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر انہوں نے جو پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ کئی ہوئی گرل کو اس کے ''دیوار والے'' آہنی فریم کے ساتھ تاروں کی مدد سے باندھ دیا۔ تانبے کے یہ موٹے تار جو ایک ''ٹیلی فون وائر'' کے تھے، باریال نے چھوٹے کمرے کی ایک الماری سے ڈھونڈے تھے۔ ان کو فریم کے ساتھ تین چار جگہ اچھی طرح لپیٹا گیا تھا اور پھر پلاس کے ذریعے کئی بل دے دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود یہ دل دہلا دینے والا شک ان کے ذہنوں میں موجود تھا کہ خبر نہیں، خونخوار جانوروں کی یورش کی صورت میں یہ گرل اپنی جگہ ٹکی رہ سکے گی یا نہیں۔

بھیڑیے یقیناً ریسٹ ہاؤس کی چاردیواری میں موجود تھے۔ کسی وقت عمارت کے کسی نہ کسی حصے سے ان کی ''ہاؤلنگ'' سنائی دے جاتی تھی۔ حریم کو یہ بھی شک تھا کہ دو تین جانور مسلسل روزن کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ وہ بھوک سے بے تاب تھے اور انہوں نے اپنے شکار کی بُو پالی تھی۔ لائٹ ابھی تک ندارد تھی۔ یہ چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔

حریم، ماہین کے سینے کا مساج کررہی تھی تاکہ اسے سانس لینے میں آسانی رہے۔ بہن کی حالت نے جیسے اسے بھی نیم جان کر ڈالا تھا۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''ماما! کیا ایک بار پھر فون پر کوشش کروں؟''

''کس کو کروگی؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''خالہ نادیہ کو..... یا پھر..... عمر کو۔''

''پہلے بھی تو ناکامی ہی ہوئی ہے۔ بار بار فون آن کرنے سے بھی تو چارجنگ ضائع ہوگی۔''

حریم نے ماہین کے زرد چہرے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ماما! اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہورہے ہیں۔ ہم زیادہ دیر یہاں رکے تو اس کی حالت بگڑ سکتی ہے۔''

باریال نے کہا۔ ''کیوں نا ''ون فائیو'' پر کوشش کرکے دیکھیں؟''

اس تجویز پر عروبہ نے بھی نیم رضامندی کا اظہار کیا۔ حریم نے لرزاں ہاتھوں سے فون آن کیا۔ فون اب صرف پانچ فیصد چارجنگ بتا رہا تھا۔ عروبہ منہ ہی منہ میں دعائیہ کلمات پڑھ رہی تھی۔ حریم نے ''ون فائیو'' ملایا۔ کسی پولیس اسٹیشن کے کسی کمرے میں بیل جانا شروع ہوئی اور جاتی رہی۔ کال ریسیو نہیں کی گئی..... امید کی ایک اور کرن ڈوب گئی۔

اب فون تو آن ہو ہی چکا تھا۔ حریم نے ایک بار پھر خالہ نادیہ کو ''پکارنے'' کا فیصلہ کیا۔ اس نے جونہی نمبر پریس کیا، وہی مایوس کن آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں..... تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

حریم کراہ کر رہ گئی..... اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ میسج کی انڈیکیشن پر پڑی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر مایوسی کی ایک اور لہر ہر احساس کو ڈھانپ گئی۔ یہ ''مختصر میسج'' اسی منحوس عادی کی طرف سے تھا جس کے طفیل وہ یہاں موجود تھے۔ اس کے بھیجے ہوئے مکروہ الفاظ اسکرین پر چمک رہے تھے۔ رومن انگلش میں لکھا تھا..... ''کہاں چھپ گئی ہو سویٹ ہارٹ۔ فون تک بند کررکھا ہے لیکن اس طرح چھپ نہیں سکتی ہو اور نہ میں چھپنے دوں گا۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو۔''

حریم نے فون ایک بار پھر آف کردیا۔ شاید عروبہ نے اسے چونکتے اور فون کی اسکرین کو گھورتے دیکھ لیا تھا۔ ''کیا بات ہے حریم؟'' عروبہ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں ماما۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی ماں کی طرح اپنی پریشانیاں اور دکھ اپنے تک محدود رکھنے والی۔

عروبہ نے ماہین کی حالت سنبھالنے کے لیے ایک بار پھر وہی دیسی ٹوٹکا استعمال کیا۔ ایک فرائی پین میں تھوڑی سی اجوائن بھونی۔ اسے کپڑے کی ایک پوٹلی میں رکھا اور یہ پوٹلی ماہین کی ناک کے قریب رکھ دی۔ اس کے بعد وہ ایک گوشے میں اپنی اوڑھنی بچھا کر نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اب پتا نہیں کہ یہ نماز کی برکت تھی یا اس دیسی نسخے کی افادیت..... یا پھر دونوں ہی باتیں تھیں کہ ماہین کی سانس پہلے سے بہتر ہوگئی۔

''میری بچی کچھ کھائے گی؟'' عروبہ نے دلار سے پوچھا۔

ماہین نے انکار میں سر ہلا دیا۔ درحقیقت پچھلے قریباً تیس گھنٹوں سے ان میں سے کسی نے چاولوں کے تین چار لقموں سے زیادہ نہیں لیے تھے لیکن پھر بھی بھوک کہیں نہیں تھی، ہاں ایک ناتوانی سی تھی جو ان سب کے رگ وپے میں اترتی جارہی تھی۔ حریم نے اب واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ بھیڑیے روزن کے اردگرد موجود ہیں اور موقعے کی تاک

Digitized by Google

میں ہیں..... اور یقیناً عروبہ بھی یہ جان چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ان کی آوازوں سے بچنے کے لیے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ ایک بار پھر مضبوطی سے بند کردیا تھا..... ''اب کیا ہوگا؟'' یہ وہ سوال تھا جو ان چاروں کے دماغوں میں کسی دہکتے ہوئے نیزے کی طرح اترا ہوا تھا۔

حریم نے صوفے پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگی۔ کل عید تھی۔ یہ اپنے پاپا جانی کے بغیر ان کی پہلی عید تھی۔ اسے یاد آیا، بچپن کی بڑی عید پر سب سے بڑا ''چارم'' یہ ہوتا تھا کہ قربانی کے جانوروں کو لے کر گھوما پھرا جائے۔ قربانی کے لیے خریدے گئے بکرے عموماً بڑے تایا کے گھر ہوتے تھے لیکن عید سے دو دن پہلے وہ ضد کرکے بکرے اپنے گھر لے آتے تھے۔ پاپا ان بکروں کو لان سے تھوڑی دور ایک مضبوط پائپ کے ساتھ باندھ دیتے تھے۔ وہ ان کو بڑے اشتیاق سے چارا کھلاتے، ان سے کھیلتے، کبھی باہر سیر کرانے کے لیے لے جاتے اور اس وقت تک..... یعنی چاند رات کی آمد تک وہ تھک کر چور ہوجاتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بکرے بہت شور مچاتے تھے۔ ایسے میں باریال یا ماہین ٹرانسسٹر ریڈیو آن کرکے ان کے پاس رکھ دیتے کیونکہ اب وہ اتنا تھک چکے ہوتے تھے کہ بکروں کو مزید کمپنی نہیں دے سکتے تھے۔ پاپا اور ماما ان کی اس ترکیب پر مسکرائے بغیر نہ رہتے لیکن آج جو چاند رات آرہی تھی، یہ گزری ہوئی ان سبھی راتوں سے بہت مختلف تھی۔ بیتے دنوں کی یادیں، آنکھوں میں نمی جگا رہی تھیں..... اور یہ نمی ایک انجانے خوف میں لپٹی ہوئی تھی۔ حریم کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک خواب ہوا کرتا تھا کہ ان کا چھوٹا سا کنبہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے سرشار تھا۔ کہاں گیا تھا وہ گھر، وہ آنگن، وہ چہکاریں، سب کچھ..... ہاں سب کچھ اس منحوس سہ پہر کو برباد ہوگیا تھا۔ وہ بدبودار جانور جس کا نام عادی تھا، اس پر ایک شکرے کی طرح جھپٹا تھا اور وہ چڑیا کی طرح اس کے پنجوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی تھی۔ اس کا مکروہ لمس، اس کی بدبودار سانسیں اور اس کی وحشی آنکھیں..... وہ کچھ بھی بھولی نہیں تھی..... اور شاید زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی تھی..... اور پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا..... زندگی کتنی تیزی سے تبدیل ہوئی تھی۔ جیسے پانی تیزی سے نشیب کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلے وہ پیارا گھر گیا..... پھر منگنی ٹوٹی، پھر پاپا گئے پھر تعلیم اور مستقبل کے سہانے سپنے گئے..... اور پھر تھانے کچہریوں کے چکر۔ ایک مسلسل کوشش اور ایک سعی لاحاصل..... مسدود راستے..... بند دروازے..... اور ہر دروازے کے سامنے کوئی طاقتور اپنا پھن پھیلائے کھڑا..... اور اب آخر میں یہ سنسان تہ خانے جہاں یہ سہانی ''چاند رات'' آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈوب کر اتر رہی تھی۔ ایک موذی جانور سے ڈر کر وہ کچھ اور موذی جانوروں کے نرغے میں آگئے تھے۔ پتا نہیں کہ یہاں سے ان کی جان کب چھوٹنے والی تھی۔ اس کا دھیان ایک بار پھر ماہین کی طرف چلا گیا۔ اس کا سر ماما کی گود میں تھا۔ اس کی سانسیں اب بھی بوجھل تھیں۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے ٹمپریچر بھی ہوچکا ہے۔ اگر اس کا بخار بڑھ جاتا تو اسے دوا دی جاسکتی تھی۔ حریم کے شولڈر بیگ میں پیناڈول کا ایک پتا بھی موجود تھا لیکن اصل مسئلہ تو ماہین کے خطرناک وہم کا تھا۔

اچانک ایک مدھم آواز حریم کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا حریم؟'' عروبہ نے چونک کر پوچھا۔

''ماما! یہ آواز.....'' حریم نے اپنی توجہ آواز پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

اب عروبہ نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر امید کی موہوم سی کرنیں نمودار ہوئیں۔ یہ ایک پک اپ ٹرک موٹر سائیکل کی آواز تھی اور شاید یہ وہی موٹر سائیکل تھی جس پر یہاں کا چوکیدار کل سہ پہر یہاں سے گیا تھا۔

حریم اور عروبہ لپک کر دوسرے کمرے میں آئیں۔ پہلے حریم تخت پر پاؤں رکھ کر کرسی پر چڑھی، پھر عروبہ بھی آگئی۔ دونوں نے روزن سے باہر جھانکا۔ شام ہوگئی تھی لیکن ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ حریم اور عروبہ نے دیکھا کہ ڈرائیوے سے آگے سلاخوں والے مین گیٹ پر حرکت نظر آرہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز بھی اسی طرف سے بلند ہورہی تھی۔ ''یہ وہی چوکیدار ہے حریم۔'' عروبہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

وہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اندازہ ہورہا تھا کہ اس نے مین گیٹ کھولا ہے اور موٹر سائیکل اندر لے آیا ہے پھر موٹر سائیکل کی آواز تھم گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ موٹر سائیکل وہیں درختوں کے نیچے کھڑی کرکے پیدل ان کی طرف آرہا تھا۔ یقیناً یہ وہی چوکیدار احسن خاں تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر ہے اور وہ مرغیوں کے دڑبے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی سفید شلوار قمیص اور زرد ٹوپی انہیں صاف نظر آرہی تھی۔

دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ احسن خاں نے اندر آکر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ ابھی وہ دڑبے سے کافی دور تھا۔ وہ

Digitized by Google

دونوں چلانے لگیں۔ حریم اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکاری۔ ''چوکیدار..... چوکیدار..... آگے نہ آؤ..... آگے جانور ہیں..... چوکیدار.....''

عروبہ بھی روزن کی گرل سے منہ لگا کر دہائی دینے لگی۔ وہ احسن خاں کو آگے آنے سے روکنا چاہتی تھیں..... لیکن وہ تو کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ جیسے بہرا ہو گیا ہو۔ یکا یک حریم کو پتا چلا کہ احسن خاں کیوں نہیں سن رہا۔ اس نے کانوں میں ایئر فون ٹھونس رکھے تھے۔ غالباً وہ کوئی میوزک سنتا ہوا بڑے خوشگوار موڈ میں چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ چاند رات اپنے اندر کتنا جان لیوا اسرار چھپائے ہوئے ہے۔

مرغیوں کے ڈربے سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر احسن خاں اچانک ٹھٹکا۔ اسے خون کے دھبے اور مرغیوں کے پر نظر آئے تھے، اس نے اپنا سر تیزی سے دائیں اور بائیں گھمایا۔ تب حریم نے دیکھا کہ وہ بدحواسی کے عالم میں ایئر فونز اپنے کانوں سے نکال رہا ہے۔

عروبہ ایک بار پھر چلائی۔ ''احسن خاں..... باہر نکل جاؤ..... بھاگ جاؤ احسن خاں۔''

احسن خاں نے پہلی مرتبہ چونک کر تہ خانے کے روزن کی طرف دیکھا..... لیکن..... تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ حریم اور عروبہ نے بھیڑیوں کی مخصوص آوازیں سنیں۔ گارڈینیا کی پانچ چھ فٹ اونچی باڑ کے پیچھے سے تین بھیڑیے نمودار ہوئے اور بلا کی رفتار سے احسن خاں پر جھپٹے۔ مرغیوں کی خوراک والا بڑا شاپر احسن خاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ پلٹ کر بھاگا..... ابھی آٹھ دس قدم دور ہی گیا تھا کہ بھیڑیے اس پر جا پڑے۔ حریم نے دیکھا احسن خاں کی زرد ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ وہ دردناک انداز میں چلایا اور مچھلی کی طرح تڑپا لیکن اب اٹھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ تب دو اور بھیڑیے برآمدے کی طرف سے نمودار ہوئے اور برق رفتاری سے اپنے شکار کی طرف بڑھے۔ حریم نے دیکھا، پہلے سے مصروفِ عمل بھیڑیوں میں سے ایک کے منہ میں گوشت کا ایک لوتھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ مزید یہ منظر نہ دیکھ سکی اور چلاتی ہوئی کرسی سے نیچے اتر آئی۔ پھر احسن خاں کی آخری دلخراش آوازوں کو اپنی سماعت سے دور رکھنے کے لیے اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ عروبہ بھاگتی ہوئی باریال اور ماہین کے پاس پہنچی اور انہیں اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا۔ ان دونوں کے رنگ ہلدی ہو رہے تھے۔ باریال نے بھی کرب کے عالم میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں..... عروبہ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے ماہین کے کان ڈھانپ دیے۔ لالٹین کی لو جیسے جان کنی کے عالم میں تھرتھرا رہی تھی۔

☆☆☆

اصل چاند رات تو عیدالفطر کی ہوتی ہے لیکن اب عیدالاضحیٰ کی بھی چاند رات منائی جاتی ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ بازاروں، مارکیٹوں اور شاپنگ سینٹروں میں شاپنگ عروج پر تھی۔ حالانکہ رات ہو چکی تھی، موبائی منڈیوں میں بھی رش تھا۔ عمر ایک شاپنگ سینٹر کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس کی امی اور چھوٹا بھائی اندر گئے ہوئے تھے۔ پچھلے سات آٹھ روز سے عمر بہت اداس تھا۔ وہ بہت سے بے حد حساس تھا۔ چھوٹی سی بات کو دل سے لگا لیتا تھا..... اور یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کی منزل اس کے قریب آ کر بہت دور چلی گئی ہے۔ یوں تو حریم کے رویے میں تبدیلی وہ کئی ہفتوں سے محسوس کر رہا تھا لیکن پچھلے جمعے کو تو حد ہی ہو گئی تھی۔ پہلے تو حریم اس کی کالز اٹینڈ نہیں کر رہی تھی، پھر اس نے ایک کال ریجیکٹ کی تھی..... اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کا وہ میسج موصول ہوا تھا جس نے اس کے سینے میں ایک گہرا، انمٹ چرکا لگا دیا تھا۔ ''دیری سوری، جس انداز سے آپ سوچ رہے ہیں، میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا.....''

کہنے کو تو یہ چند الفاظ تھے لیکن ان کے اذیت ناک اثرات بہت گہرائی تک رکھتے تھے..... دو دن تک گاہے بگاہے عمر کی آنکھوں میں نمی تیرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن وہ تنہائی میں بہت کھل کر رویا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر حالات کچھ روز جوں کے توں ہی رہے تو وہ بھی حریم کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔

اگلے روز اس کو ایک اور مایوس کن اطلاع ملی تھی۔ اسے امی کی ہی زبانی پتا چلا تھا کہ آنٹی عروبہ اور بچے لاہور سے باہر سیر کے لیے گئے ہیں اور شاید دو تین روز بعد آئیں گے۔ اس کے دل کو ایک اور گہری ٹھیس لگی تھی۔ آنٹی عروبہ اور حریم جو اس سے تقریباً ہر بات شیئر کرتی تھیں، اب آہستہ آہستہ بیگانی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے جانے کا علم ان کو تب ہوا تھا جب وہ لاہور سے روانہ ہو چکی تھیں۔

عمر کا خیال تھا کہ عید سے ایک دو روز پہلے وہ لوگ ضرور واپس آ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اپنے آنے کی اطلاع بھی دے دیں۔ لیکن ایسی کوئی اطلاع بھی انہوں نے

نہیں دی تھی۔ اس تہوار کی آمد عمر کے لیے دکھ درد اور جدائی کے کرب کے سوا اور کچھ نہیں لائی تھی۔ اس نے ایک عرصہ حریم سے خاموش محبت کی تھی..... وہ کسی کی منگیتر بن کر غیر ہوگئی تھی تو اس نے یہ سب کچھ بھی جھیل لیا تھا لیکن جب امیدیں بندھ کر ٹوٹتی ہیں، آسیں پوری ہوتے ہوتے رہ جاتی ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ منزلوں کے قریب منزلوں کی جدائی بہت کربناک ثابت ہوتی ہے۔ کل عشا کی نماز کے بعد وہ دیر تک جائے نماز پر ہی بیٹھا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو پھر وہ اپنی طرف سے امی جان کو گرین سگنل دے دے گا۔ اس کے گرین سگنل کا مطلب یہی ہوتا کہ وہ اس جگہ شادی کرنے پر رضامند ہے، جہاں وہ چاہتی ہیں۔ اس نے یہ سب سوچا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچا تھا کہ کیا وہ واقعی ایسا کر سکے گا؟

وہ غم کے اسی اتھاہ گھیرے میں تھا جب کل شام حالات نے اچانک ایک پلٹا کھایا تھا۔ اسے اپنے سیل فون پر حریم کے نمبر سے ایک کال موصول ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک گیا تھا..... بلکہ اس کے دل میں ایک اندیشہ سا جاگ گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اب وہ اور کیا کہنے والی ہے۔ شاید زیادہ واضح لفظوں میں اسے بتانے والی ہے کہ ان کے راستے ایک نہیں ہیں، وہ اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔

اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی پھر ایک اور کال آئی تھی۔ یہ کال حریم نے آج صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ کی تھی..... سگنل آتے رہے تھے، میوزک بجتا رہا تھا مگر عمر نے فون نہیں اٹھایا۔ ایک دو منٹ بعد پھر کال آئی تھی۔ عمر شدید تذبذب کے عالم میں فون کی طرف دیکھتا رہا تھا تاہم اس نے یہ کال بھی ریسیو نہیں کی تھی۔

بعد میں وہ اسی جگہ بیٹھا دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے حریم ساری رات کسی پریشانی کے عالم میں رہی ہے اور صبح سویرے اس نے اسے کال کی ہے..... کیا ابھی کچھ امید باقی تھی؟ کیا مایوسی اور دکھ کے گہرے اندھیرے میں چند ایک کرنیں موجود تھیں، ان لمحوں میں عمر کو یوں بھی لگا تھا جیسے اس نے مکمل ناامید اور مایوس ہونے میں شاید تھوڑی سی جلدی کی ہے۔ کیا حریم کا بجھا بجھا رویہ، اس کا گریز اور اس کا ایک صبح اس برسوں پرانے تعلق کو یکا یک ختم کرنے اور ختم سمجھنے کے لیے کافی تھا؟ جواب اثبات میں نہیں تھا لیکن عمر اپنے دل کا کیا کرتا۔ محبت کے حوالے سے اس نے بے حد..... بے حد حساس طبع پائی تھی۔ یہی طبع ہی تو تھی جس کے سبب وہ لڑکپن سے حریم کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت دور رہا تھا۔ اس سے اپنے دل کی بات نہ کہہ پایا اور کئی بار کوشش کے باوجود کوئی ایسا اشارہ بھی نہ دے سکا جس سے وہ اس کی بے پایاں تڑپ سے آگاہ ہو سکتی۔

آج صبح دوسری کال آنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ اگر اب پھر حریم کی کال آئی تو وہ ریسیو کر لے گا۔ کم از کم پتا تو چلے گا کہ وہ کہاں ہے..... اور کیا کہنا چاہتی ہے۔ اب بھی جب، امی اور علی شاپنگ سینٹر میں گئے ہوئے تھے، اس نے اپنا موبائل فون گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا..... اور گاہے بگاہے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ یہ رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف چاند رات کی گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی کے آڈیو سسٹم پر دھیمی آواز میں مہدی حسن کی گائی ہوئی غزل پلے ہو رہی تھی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

گاڑی کا دروازہ کھلا اور امی اور علی شاپنگ بیگز پکڑے اندر آ گئے۔

"جی امی چلیں؟" عمر نے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی تھک گئے ہو۔" ثمینہ نے کہا۔

گاڑی ٹرن لے کر کشادہ سڑک پر آ گئی۔ ثمینہ نے یکایک کہا۔ "عمر! تمہیں پتا ہی ہے، میرا موبائل ٹھیک نہیں۔ کیا تمہیں بھی حرو یا بابا ریال کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی؟"

"نہیں امی۔" عمر نے مختصر جواب دیا۔

"تو بھئی، تم نے فون کر کے پوچھ لینا تھا۔" ثمینہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"شاید..... وہ لوگ اب زیادہ ملنا جلنا چاہتے ہی نہیں۔"

"ہاں..... یہ تو مجھے بھی لگتا ہے لیکن پھر بھی کل عید ہے۔ تھوڑی بہت بات ہی ہو جاتی۔" پھر انہوں نے ایکدم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اور یہ دیکھو..... میں شہلا کے لیے یہ تھوڑی سی جیولری اور چوڑیاں لائی ہوں۔ راستے میں دو منٹ ان کی طرف رک کر یہ اس کو دے دیں گے۔ بڑی خوش ہو گی۔"

"لیکن امی....."

"اوہو۔ اگر تم نے نہیں جانا تو باہر گاڑی میں بیٹھنا۔ ہم دو منٹ میں واپس آ جائیں گے۔" ثمینہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ شہلا عمر کی وہی ماموں زاد تھی، جس کی طرف امی، عمر کے رشتے کی بات چلانا چاہ رہی تھیں۔

عمر نے دیکھا، ست رنگی چوڑیاں اور آرٹیفشل

جیولری کا ڈبا، امی کی گود میں رکھا تھا۔ بے ساختہ اس کے سینے سے آہ نکلی۔ ہرے نگینوں والا ایسا ہی ایک خوبصورت ہار وہ دو ہفتے پہلے حریم کے لیے فیصل آباد سے لے کر آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ عید کے موقع پر ہمت کر کے وہ یہ ہار اسے گفٹ کرے گا لیکن پرسوں یہ ہار اس نے سخت مایوسی کے عالم میں ایک نیلے شاپر میں لپیٹ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ زندگی کئی دفعہ کتنی بے رحم ہو جاتی ہے اور کس طرح ''زندہ لوگوں'' کو پٹخنیاں دیتی ہے۔

اس نے ایک بار پھر بے ساختہ ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا، وہ یکسر خاموش تھا۔

☆☆☆

اس سنسان ریسٹ ہاؤس میں وہ بڑی اذیت ناک رات تھی۔ اس رات کا زیادہ تر حصہ انہوں نے جاگ کر ہی گزارا تھا۔ سرِ شام چوکیدار احسن خاں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے ان کے دل و دماغ کو دہشت کے بے رحم شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ ذہنوں میں بار بار یہی سوال اٹھتا تھا کہ کیا بالآخر ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا؟ یہ کل پانچ بھیڑیے تھے۔ ان کو اچھی خاصی خوراک مل گئی تھی لیکن لگتا تھا کہ ان کی بھوک بے پایاں ہے۔ وہ مسلسل روزن کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ دو تین موقعے ایسے آئے تھے جب انہوں نے باقاعدہ روزن کی جالی پر منہ مارے تھے اور اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

زرد رو ماہین غنودگی کی حالت میں لیٹی تھی۔ اس کی سانسوں کا زیر و بم ٹھیک نہیں تھا۔ حریم نے ماں کے کان میں بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ''ماما! لگتا ہے کہ ماہی کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ اب تو شاید آپ کی اجوائن بھی اثر نہیں کر رہی۔''

''تو پھر کیا کریں بیٹا! یہاں سے نکل نہ سکے تو..... یہ..... بچ نہیں سکے گی۔'' عروبہ نے بمشکل اپنا فقرہ مکمل کیا۔

''ایسا نہ کہیں ماما! اللہ سے دعا کریں۔''

''وہ تو کر ہی رہے ہیں حریم۔ پر یہ دنیا اسباب کی دنیا بھی تو ہے۔ کوئی سبب پیدا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔''

یہ رات کے قریباً چار بجے کا عمل تھا۔ دور کہیں جنگل سے شب بیدار جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سنائی دینے والی یہ آوازیں ماحول کو اور بھی ڈراؤنا روپ دے رہی تھیں۔

حریم بولی۔ ''ماما! آج سردی بھی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے تو ماہی کی طبیعت نہیں بگڑ رہی؟''

باریال بولا۔ ''سلینڈر میں کافی گیس ہے۔ کیوں نہ ہم چولہا مستقل طور پر جلا دیں۔''

''نہیں باریال۔'' عروبہ نے کہا۔ ''گیس جمع ہو جائے گی اور یہ ماہی کے لیے اور بھی نقصان دہ ہے۔''

آخر ایک اور طویل رات اختتام پذیر ہوئی، باتھ روم اور بڑے کمرے کے روزنوں سے دن کا اجالا اس زمین دوز ''قید خانے'' میں جھانکنے لگا۔ حریم تخت پر چڑھ کر اور کرسی پر کھڑی ہو کر باہر جھانکنا چاہتی تھی مگر اب خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سب سے پہلے اسے جو چیز نظر آئے گی، وہ احسن خاں کے کپڑوں کی دھجیاں اور اس کی باقیات ہی ہوں گی اور یہ منظر دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا..... اور نہ ہی شاید اس کی ماما کے بس میں تھا۔

بڑے کمرے کے روزن کے اردگرد بھوکے جانوروں کی غیصلی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں، کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ وہ روزن کی گرل کو پنجوں سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے میں عروبہ، حریم اور باریال اندر سے لرز جاتے تھے۔ تانبے کے تاروں کے ساتھ مضبوطی سے بندھی ہوئی گرل ابھی تک تو ان کا ''دفاع'' کر رہی تھی لیکن وہ کب تک اپنی جگہ جمی رہے گی، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اور یہ عید کا روز تھا۔ خوشی اور شادمانی کا تہوار۔ انہیں اس تہ خانے میں بند ہوئے، اب 40 گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ان کے ہونٹ اور منہ ہی نہیں، ان کے معدے بھی جیسے اندر سے سوکھ رہے تھے۔ جو تھوڑے سے چاول تھے، وہ ختم ہو چکے تھے۔ اب یہاں ماش اور چنے کی دال کے دو تین پیکٹس کے سوا کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ ان والوں میں بھی نظر نہ آنے والی بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں موجود تھیں۔ باتھ روم کے نلکے میں جو پانی آتا تھا، وہ کسی ٹینکی کا تھا اور اس میں ہلکی سی بُو موجود تھی۔ پرسوں اور کل تو انہوں نے یہ پانی پینے سے اجتناب کیا تھا مگر اب لاچار ہو کر انہوں نے اسے ابالا تھا اور تھوڑا تھوڑا پی رہے تھے۔

حریم نے اپنی رسٹ واچ دیکھی، اب دس بج رہے تھے۔ دیکھا جاتا تو چوکیدار احسن والا حادثہ گزرے اب قریباً سولہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ باریال نے اپنی زخمی ہتھیلی پر پٹی باندھتے ہوئے کہا۔ ''ماما! کیا احسن خاں کا آگے پیچھے کوئی نہیں؟ آج عید کا روز ہے۔ وہ پوری رات گھر واپس نہیں

Digitized by Google

گیا۔ کیا کوئی اس کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں نہیں آئے گا؟''

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''امید تو تھی کہ کوئی رات کو یا پھر صبح سویرے آئے لیکن ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ..... وہ اکیلا رہتا ہو۔''

''یہی بات لگ رہی ہے ماما۔'' حریم نے افسردہ لہجے میں تائید کی پھر اسے اپنی گاڑی کا خیال آیا جو پرسوں بھاگتے وقت وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر چھوڑ آئے تھے۔ وہ بولی۔ ''ماما! ہماری گاڑی اسی ویران جگہ پر کھڑی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی پولیس والے یا فارسٹ گارڈ کی نظر میں آجائے اور وہ کھوج لگائے کہ گاڑی یہاں کیوں کھڑی ہے؟ پھر وہ اس ریسٹ ہاؤس کی طرف متوجہ ہوجائے۔''

''اور ایسا ابھی تک نہیں ہوا۔ گاڑی کی چابی بھی اگنیشن میں ہی تھی۔ کیا پتا کہ اب وہ وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔'' عروبہ نے کہا۔

حریم کو ہلکی سی متلی محسوس ہورہی تھی۔ شاید یہ گندا، باسی پانی پینے کی وجہ سے تھا۔ عروبہ اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی۔ اس لیے وہ اپنے دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ کر صوفے پر لیٹ گئی اور بوسیدہ کمبل اپنی کمر تک کھینچ لیا۔ ماہین کی بوجھل سے بوجھل ہوتی سانسیں حریم کے سینے میں آرے کی طرح چل رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ سب دھیرے دھیرے مزید اذیت ناک صورتِ حال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ موبائل کی چارجنگ اب بہت کم رہ گئی ہوگی..... آن ہونے کے بعد شاید اس میں اتنا ہی کرنٹ ہو کہ ایک یا دو منٹ کی کال ہوسکے۔ اچانک وہ سٹپٹا سی گئی۔ اب تک اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ وہ عمر کو بھی ایک میسج کردے۔ شاید اس کی وجہ وہ حد درجے کی پریشانی تھی جس نے ان چاروں کو بے طرح پریشان کر رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ موبائل فون آن کرنے سے بھی تو ''بیٹری ایگزاسٹ'' ہوتی تھی۔ بہرحال اس نے یہ رسک لیا اور موبائل آن کرکے فوراً ہی عمر کے لیے یہ میسج لکھ دیا۔ ''مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بہت بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔''

میسج سینڈ کرنے کے بعد وہ فون آن رکھنا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ چارجنگ تیزی سے کم ہورہی تھی۔ اس نے فون آف کردیا۔

فون آف کرتے ہوئے اس کی نگاہ عادی کے ایک اور میسج پر پڑی۔ یقیناً یہ بھی اس کا ایک اور غلیظ میسج رہا ہوگا۔ لگاوٹ کے الفاظ اور ان الفاظ کے نیچے دھمکی کی ہلکی سی لہر۔ عادی کے ایسے میسج اس کی روح کو چھید نے لگتے تھے۔ وہ اکثر انہیں کھولتی ہی نہیں تھی اور اب تو ویسے بھی موبائل کی چارجنگ زیرو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اب وہ موبائل کو کم از کم ایک گھنٹے بعد آن کرنا چاہتی تھی اور آن کرتے ہی عمر کو ٹرائی کرنا چاہتی تھی۔ مارچ کا یہ سنہری دھوپ والا دن جو عید کا دن بھی تھا، تیزی سے گزرتا چلا جارہا تھا۔ آج ان تینوں نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں اور آہٹیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ کسی وقت ان کے ذہنوں میں یہ خوش خیالی جنم لیتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھوک سے دیوانے یہ موذی جانور کسی اور طرف نکل گئے ہوں.....؟

ماما سے مشورہ کرکے قریباً ایک گھنٹے بعد حریم نے پھر دھڑکتے دل کے ساتھ فون آن کیا اور فوراً ہی عمر کا نمبر ملایا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر عمر نے میسج دیکھ لیا ہے تو وہ فوراً کال ریسیو کرے گا۔ ماہین تو نیم بے ہوش تھی مگر عروبہ اور باریال امید بھری نظروں سے حریم کا چہرہ تک رہے تھے۔ ان کی امید بعد میں ٹوٹی، حریم کی اس سے پہلے ٹوٹ گئی۔ غیر متوقع طور پر اس کے کان میں آواز پڑی، آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔

حریم نے ایک آہ کے ساتھ فون آف کردیا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے تھے۔

''فون بند ہے؟'' باریال نے مایوس لہجے میں پوچھا۔

حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا..... وہ دوبارہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی اور بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس نے بڑے درد سے سوچا..... یہ کیا ہورہا ہے ان کے ساتھ؟ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ عمر نے اس کا میسج پڑھا ہو اور فون بند کردیا ہو..... وہ ایسا تو نہیں تھا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ ایسی سیریس اطلاع کو مذاق سمجھا ہو۔

ماہین کی سانسوں کی آواز بتا رہی تھی کہ اس کی حالت خراب سے خراب ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف خونخوار جانوروں کا خوف اس بری طرح ان کے دل و دماغ میں جم گیا تھا کہ وہ باہر نکلنے کا سوچ کر ہی پوری جان سے لرز جاتے تھے۔ پتا نہیں کیوں عمر کا متین چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اپنی بے لوث محبت سے ان سب کے دلوں میں جگہ بنائی تھی لیکن ان کی زندگیوں کے اس سنگین ترین موڑ پر وہ نجانے کہاں

تھا؟ اس کے آس پاس موجود نہ ہونے میں حریم کا اپنا قصور زیادہ تھا۔ وہ سوچنے لگی، شاید اس نے غلط کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنی حساس طبع کا مالک ہے۔ کہنے کو ایک ڈاکٹر لیکن مزاج کے اعتبار سے ایک نہایت گداز دل شاعر جیسا۔ اس کے نازک آبگینوں جیسے اتمول احساسات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا کہ اس نے کم وبیش سات برس تک اس سے خاموش محبت کی اور انگنت مواقع مہیا ہونے کے باوجود کبھی اظہار نہ کیا۔ حالانکہ آصف کے ساتھ منگنی سے پہلے اس نے کبھی بھی اظہار کیا ہوتا تو حریم خود کو اس سے بیگانہ نہ رکھ پاتی۔

وہیں آنکھیں بند کرکے لیٹے لیٹے اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں عمر کو مخاطب کیا۔ ”مجھے معاف کردو عمر! میں نے خود کو اس لیے آپ سے دور کیا کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ اگر یہ غلطی بھی ہے تو اس کی اتنی بڑی سزا تو نہ دیں۔ آپ تو میری چھوٹی سی تکلیف پر بے قرار ہوجاتے تھے۔ دیکھیں میں کتنی بڑی مصیبت میں ہوں۔ چلیں ایک بار..... ایک آخری بار آجائیں۔ مجھے اور میری فیملی کو اس جان لیوا مصیبت سے چھٹکارا دلا دیں۔“

اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔ وہ سوچنے لگی، ایک بار عمر نے اسے موت کے منہ سے کھینچا تھا اور زندہ رہنے کا حوصلہ دیا تھا۔ اس وقت وہ بن بلائے آیا تھا اور آج تو وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر اسے بار بار بلا رہی تھی۔ آج وہ کیوں نہیں سن رہا تھا؟

اسی طرح لیٹے لیٹے اور سوچتے سوچتے اسے ایک نقاہت بھری اونگھ نے آلیا..... پھر وہ سو گئی۔ ایک شور نے اسے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ روزن کی طرف گئی۔ شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے مگر پھر بھی پتا چلتا تھا کہ آہنی گرل اپنی جگہ موجود ہے۔ تب اس نے ماما کی طرف دیکھا۔ دوزانو بیٹھ کر انہوں نے ماہین کا سر گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر جھک کر وہ اس کا ماتھا چوم رہی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ ”میری بچی..... ہائے میری بچی آنکھیں کھول..... میں تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اٹھ جا میری بچی۔“ انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔

باریال کا رنگ بھی ہلدی ہو رہا تھا۔ حریم تڑپ کر ماہین کے پاس پہنچ گئی..... اس کی آنکھیں بند تھیں اور ماتھا بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے پا رہی تھی۔ آکسیجن کی کمی نے اس کے ہونٹوں کو نیلگوں کردیا تھا۔ حریم نے ماہین کا سر ماں کی گود سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا، ماہین کے مرجھائے ہوئے سر در خساروں کو تھپتھپانے لگی۔

”باریال! میرے بیگ سے وینٹو مین نکالو۔“ حریم پکاری۔

باریال لپکا اور حریم کے شولڈر بیگ سے وینٹو مین کا مرہم لے آیا۔

عروبہ نے کربناک لہجے میں کہا۔ ”ان ٹوٹکوں سے کچھ نہیں ہوگا حریم..... یہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی..... میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“

حریم نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ عروبہ کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے اور وہ عجیب نظروں سے روزن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حریم کے دل نے گواہی دی کہ ماں اب مزید انتظار نہیں کرے گی۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہے گی، ہر صورت.....

☆☆☆

یہ عید کا تہوار تھا لیکن عمر کو بے حد پھیکا اور اداس لگ رہا تھا۔ چاند رات کا بیشتر حصہ بھی اس نے جاگ کر ہی گزارا تھا اور اس بات کا انتظار کرتا رہا تھا کہ شاید حریم کی کال آجائے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس مرتبہ وہ کال ضرور اٹینڈ کرلے گا۔ صبح عید کی نماز پر جانے سے پہلے اس نے اپنی انا کی دیوار میں ایک رخنہ پیدا کیا تھا اور دل کڑا کر کے حریم کے نمبر پر بیل کی تھی۔ نمبر پریس کرتے وقت اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا مگر پھر ایک دم سینے میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ حریم کا نمبر بند جا رہا تھا۔

انا کی دیوار میں ایک رخنہ تو پیدا ہوا ہی تھا۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنٹی عروبہ کے نمبر پر ٹرائی کیا..... لیکن یہاں سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ فون بند تھا۔ چھوٹے بھائی علی کے ساتھ نماز پڑھ کر وہ گھر واپس آگیا۔ قربانی کے لیے جو بکرا خریدا تھا، وہ چونکہ کل صبح ذبح کیا جانا تھا لہٰذا عمر کو اب کوئی کام نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک دو کزن اور کچھ دوست شام کے وقت سیر پانے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن عمر کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ایک گہرے رنج کی کیفیت میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس تہوار کی خوشی اور گہما گہمی اس کی اداسی اور دکھ میں مزید اضافہ کررہی ہے۔ کیا ایک دم ہی سب کچھ ختم کردیا تھا حریم نے اور آنٹی وغیرہ نے؟ اور تو اور..... باریال کی طرف سے بھی علی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو عمر؟“ امی کی آواز نے اسے ایک دم خیالوں سے چونکایا۔

وہ ذرا توقف کرکے بولا۔ ”امی! کہیں ان لوگوں کے

Digitized by Google

ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہوگیا ہو۔ میرا مطلب ہے..... وہی خبیث عادی۔ وہ ان کے آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس سے ڈر کر کہیں غائب ہو گئے ہوں؟''

''نہیں بھئی۔ علی کل گزر رہا تھا ان کے گھر کے پاس سے۔ اس نے رک کر ان کے پڑوسی میاں احمد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ وہ چند روز کے لیے لاہور سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ عید کے بعد ہی واپس آئیں۔ تم نے آنٹی کو فون کر کے دیکھا ہے؟''

''ہاں، بند جا رہا ہے ان کا فون بھی۔'' عمر نے افسردگی سے جواب دیا۔

تھوڑا بہت میٹھا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ایسی روکھی پھیکی عید اس کی زندگی میں شاید پہلی بار آئی تھی۔ ایک تو کام کا بے انتہا بوجھ تھا، دوسرا یہ دل کا بگڑا ہوا معاملہ جس نے عمر کی نس نس میں کرب بھر دیا تھا۔

''کیا جدائیاں ایسی ہی کٹھن ہوتی ہیں؟'' اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا اور ایک طویل سرد آہ بھر کر اپنے بیڈ پر سیدھا لیٹ گیا۔

اس کا فون مسلسل آن تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی نگاہ بے ساختہ فون کی اسکرین کی طرف اٹھ جاتی تھی..... رات کی تھکن اثر انداز ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے اونگھ آئی اور وہ سو گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد والدہ ثمینہ اس کے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے دیکھا عمر سو رہا ہے۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر جیسے کسی کا اندیشہ رقم تھا۔ وہ ایک ماں تھیں۔ اپنے بچے کی دلی کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں مگر وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ جو وہ چاہ رہا ہے، وہ کسی طور ممکن نہیں۔ حریم ان کو ہمیشہ بڑی پیاری لگی تھی۔ اس پر مصیبت کا جو پہاڑ ٹوٹا تھا اس کا بوجھ انہوں نے بھی اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی بہتری کے لیے دعا گو رہتی تھیں لیکن اسے ایک بہو کے طور پر قبول کرنا ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ ان کی نگاہوں میں گاہے بگاہے وہ ہولناک منظر بھی گھوم جاتا تھا جو کچھ عرصہ پہلے عروبہ کے گھر کی سیڑھیوں سے دیکھا تھا۔ لمبے بالوں والا پُرغضب عادی کسی خون آشام جانور کی طرح عمر پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور رقابت کے شعلے ناچ رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو ایسے حالات کے سپرد کیسے کر سکتی تھیں..... کبھی نہیں۔

انہوں نے بڑی محبت سے عمر کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے بالوں کو نرمی سے سہلایا۔ موبائل فون اب بھی عمر کے سینے پر اوندھا رکھا تھا۔ انہوں نے فون عمر کے سینے سے اٹھا لیا۔ کچھ دیر پہلے عمر نے حریم اور عروبہ کو جو دو کالز کی تھیں، وہ اسکرین پر ظاہر ہو رہی تھیں، یہ کال ریسیو نہیں ہو سکی تھیں۔

انہوں نے دل میں سوچا..... جو کچھ ہو رہا ہے شاید ٹھیک ہی ہے۔ انہوں نے فون آف کر کے الماری کے اوپر والے خانے میں رکھ دیا۔ گھڑی کی سوئیاں دوپہر 11 بج کر 45 منٹ کا وقت بتا رہی تھیں اور یہ تقریباً وہی وقت تھا جب حریم نے عمر کو ایک میسج کیا تھا۔ ثمینہ کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ ابھی دو چار منٹ میں حریم کی طرف سے عمر کو ایک ٹیکسٹ میسج آنے والا ہے جس کے بارے میں جاننا عمر کے لیے اور ان سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ موت کے گھیرے میں زندگی کا میسج ہے..... یہ مدد کی پکار ہے..... ثمینہ کو ہرگز معلوم نہیں تھا۔

وہ موبائل الماری میں رکھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ عمر سخت تناؤ میں تھا۔ وہ سکون کی نصف گولی کھا کر لیٹا تھا۔ ایک بار سویا تو دیر تک سوتا رہا۔ ثمینہ نے بھی اسے جگانا مناسب نہ سمجھا..... یہاں تک کہ شام کے سائے طویل ہو گئے۔ عید ڈے کے بعد عید نائٹ شروع ہو گئی۔

☆☆☆

ماہین کی حالت بہت خراب تھی اور اس کی حالت دیکھ کر عروبہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ عروبہ اس درمیانی عمر میں بھی چھریرے اور توانا جسم کی مالک تھی۔ اس نے عجلت میں اپنے بال جوڑے کی صورت میں لپیٹے پھر وہ لکڑی کے تخت پر چڑھی اور دیوانہ وار روزن کی طرف بڑھی.....

''ماما! آپ کیا کرنے لگی ہیں؟'' حریم نے پکار کر پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا حریم..... ورنہ یہ نہیں بچے گی۔'' عروبہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

باریال بھی لپک کر عروبہ کے پاس پہنچ گیا اور ساتھ والی کرسی پر کھڑا ہو کر روزن سے باہر جھانکنے لگا۔ اس نے گرل سے چہرہ لگا کر دائیں بائیں دور تک دیکھا، کہیں کسی حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ یہ ایک مثبت اشارہ تھا۔ درحقیقت آج صبح سے انہیں نہ تو بھیڑیوں کی آواز سنائی دی تھی اور نہ کوئی ایسی آہٹ، کانوں تک پہنچی تھی جو ان کی موجودگی کو ظاہر کرتی۔ عروبہ نے پھر ہیجانی انداز میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ ہمیں تھوڑا بہت رسک تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ماہی کو کھو دیں گے ہم۔''

عروبہ تیزی سے تانبے کے تاروں کے بل کھولنے لگی۔ باریال پہلے تو تذبذب میں رہا پھر وہ بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ حریم، ماہین کے گلے اور سینے پر وینٹوہین لگا چکی تھی، اب وہ

Digitized by Google

اسے تھپک لگانے والے انداز میں بہلا رہی تھی تاکہ اس کی سانس میں بہتری آسکے۔ ماہین تقریباً بے ہوش تھی۔

جونہی تار کے سارے بل کھل گئے، عروبہ اور باریال نے زور لگا کر روزن کی گرل کو اتنا موڑا کہ دس بارہ انچ کا خلا پیدا ہوسکے۔ باریال نے عروبہ کی ہدایت پر پہلے اسٹیل کا ایک گلاس اور پھر پلیٹ باہر پھینکی۔ پلیٹ کافی دور تک لڑھکتی اور شور مچاتی ہوئی گئی۔ جواب میں بالکل سناٹا رہا۔ سرِشام پیڑوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی چہکار کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

''کوئی ہے یہاں..... کوئی ہے؟'' عروبہ بلند آواز میں پکاری اور یہ فقرہ کئی بار دہرایا۔

اس بات کی امید تو نہ ہونے کے برابر تھی کہ کوئی یہاں ہوگا، وہ اس طرح پکار کر صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ بھیڑیے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں یا نہیں۔

ردِعمل نہیں تھا۔ کمرے کے فرش پر بیٹھی حریم کے سینے میں بھی امید کی کرنیں روشن ہونے لگیں۔ شاید ماما ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں، اس نازک جان کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اب رسک لیا جائے اور یہاں سے نکلا جائے لیکن حریم دیکھ رہی تھی کہ ماما کے لیے روزن میں سے باہر نکلنا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ بے ہوش ماہین کو اٹھا کر روزن تک پہنچاتے اور اسے وہاں سے نکالتے۔ پہلا اسٹیپ تو یہی ممکن تھا کہ وہ خود یا باریال اس روزن میں سے باہر نکلتے اور گھوم کر اور سیڑھیاں اتر کر اس تہ خانے کے بند دروازے تک پہنچتے جسے پرسوں باہر سے تالا لگایا گیا تھا۔ اس تالے کو توڑ کر دروازہ کھول لیا جاتا۔

حریم نے کہا۔ ''ماما! آپ نیچے ماہین کے پاس آجائیں۔ پہلے میں باہر نکلتی ہوں۔''

''نہیں..... میں تم لوگوں کو نہیں جانے دوں گی۔''

''آپ کیسی بات کرتی ہیں ماما۔'' باریال بگڑ کر بولا۔ ''ہمارے ہوتے آپ باہر کیوں جائیں گی؟''

ماں بچوں میں بحث ہوئی لیکن یہ بحث طول نہیں پکڑ سکی کیونکہ ماہین کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وقت ضائع کیا جاتا۔ باریال اس بات پر تلا ہوا تھا کہ وہ باہر جائے گا اور دوسری طرف سے سیڑھیاں اتر کر تہ خانے کا تالا باہر سے توڑے گا..... بہرطور حریم نے اسے اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ اکیلا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس کے ساتھ جائے گی۔ دونوں پہلے روزن کے آس پاس ہی رہیں گے اور کسی خطرے کو محسوس کرکے فوراً روزن سے واپس آجائیں گے۔

ایسے میں ماما کی ذمے داری صرف یہ ہوگی کہ وہ دونوں کرسیوں کو تھامے رکھیں تاکہ باریال اور وہ گرل کو فوراً دوبارہ اس کی جگہ جما سکیں۔

حریم دیکھ رہی تھی کہ ماما اب بھی پوری طرح رضامند نہیں ہیں۔ ماں کی وہی جبلت کہ بچے کو خطرے میں ڈالنے کے بجائے خود مرجانا بہتر سمجھتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ باریال اور حریم کے لیے روزن میں سے باہر نکلنا آسان ہوگا..... اور یہ کام جتنا جلد سے جلد ہوتا، اتنا ہی بہتر تھا۔ اپنے دفاع کے لیے باریال نے تہ خانے میں موجود کرکٹ کا وہ مضبوط بیٹ اٹھالیا تھا۔ اس کے علاوہ چپکے سے کچن والی چھری بھی ایک رومال میں لپیٹ کر اپنی ایک جراب میں اڑس لی تھی۔ حریم کے ہاتھ میں وہی ڈنڈا نما لاٹھ تھی جس سے وہ تہ خانے کے آہنی دروازے پر ضربیں لگاتے رہے تھے۔

عروبہ ان دونوں کو مسلسل ہدایات دے رہی تھی۔

تین چار منٹ روزن کے آس پاس ہی رہنا ہے..... اردگرد پتھر وغیرہ پھینک کر آواز پیدا کرنی ہے..... خطرے کی صورت میں فوراً واپس پلٹنا ہے اور اوندھے لیٹ کر خود کو روزن کے اندر گرا دینا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں کے ساتھ مسلسل دعائیں وغیرہ پڑھ رہی تھی اور گاہے بگاہے ماہین کے بے سدھ چہرے پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔

حریم کا دل جیسے اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ پہلے باریال کرسی پر چڑھا اور رینگ کر باہر نکل گیا۔ پھر تھوڑی سی کوشش سے حریم بھی باہر آگئی۔ اندھیرا اب گہرا ہوچکا تھا۔ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مشرق کی جانب سفیدے کے بلند درختوں کے عقب سے دسویں گیارھویں رات کا چاند جھلک دکھا رہا تھا۔ یہ شدید تناؤ کے لمحات تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے سرخ آنکھیں چمکیں گی اور خون آشام بھوکے جانور ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ حریم مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی..... وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی ذرا سی کمزوری بھی ظاہر ہوئی تو اس کا اثر باریال پر پڑے گا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک تاریک اور خاموش تھی۔

ہوا کے سرد جھونکے میں حریم نے ہلکی سی بو محسوس کی اور تب اس کی نظر اس منظر پر پڑ گئی جسے دیکھنے سے وہ ڈر رہی تھی۔ یہ چوکیدار احسن خاں کی کٹی پھٹی لاش تھی۔ لاش بھی کیا تھی بس اس کی باقیات تھیں۔ اس کا ڈھانچا دو حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا، بلب کی مدھم زرد روشنی میں اس کی

پسلیاں اور ایک نچا کھچا باز و صاف دکھائی دیا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی نگاہوں سے گزرا اور اس نے جھرجھری لے کر منہ پھیر لیا۔ باریال شاید اس سے پہلے ہی یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہراس اور متلی کی سی کیفیت تھی۔

وہ نیچے جھکا اور گھاس پر پڑا ہوا اسٹیل کا ایک گلاس اٹھا کر پورے زور سے ڈرائیوے کی جانب اچھالا۔ گلاس دور تک آواز پیدا کرتا چلا گیا، پھر خاموشی چھا گئی۔

باریال اور حریم کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے کچھ پتھر اردگرد پھینکے اور آوازیں بھی لگائیں۔ تب باریال ہمت کر کے بولا۔ ''آؤ آپی..... سیڑھیوں کی طرف جاتے ہیں۔''

''ہمیں وہاں سے گھوم کر ان کمروں کی پچھلی جانب جانا ہوگا۔'' حریم نے ایک کوریڈور کی طرف اشارہ کر کے لرزاں آواز میں کہا۔

اندر سے ان دونوں کو ماما کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''حریم! سنبھل کے..... بہت سنبھل کے۔''

حریم جانتی تھی کہ کوریڈور کی تاریکی میں گھسنا کس قدر خطرناک ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ماہین کا بجھتا ہوا چہرہ مسلسل اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

باریال اجازت طلب نظروں سے حریم کو دیکھ رہا تھا۔ ''چلو آؤ۔'' حریم نے کہا اور تاریک کوریڈور کی طرف قدم بڑھائے۔ شیشم کی لٹھ پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط ہوتی چلی جارہی تھی۔ برآمدے کی طرف جو ایک بلب ''یو پی ایس'' کی مدد سے روشن تھا، اس کی روشنی اب ماند پڑ چکی تھی۔

بہن بھائی کوریڈور کی گمبھیر تاریکی میں گھسے، یہ آدھے منٹ کا سفر انہیں آدھی صدی کے مانند لگا۔ وہ گھوم کر عمارت کے عقبی حصے میں آگئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دور دور تک کسی متنفس کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس عمارت کے اردگرد میلوں تک کوئی انسان موجود نہیں۔ عمارت کے اس پچھلے احاطے میں گھاس کی تراش خراش پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ تعمیراتی سامان نے کافی جگہ گھیر رکھی تھی۔ لکڑی کے تختے، بالے، بجری، ریت وغیرہ۔

''وہ دیکھو باریال۔'' حریم نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

ایک زنگ آلود ہاتھ گاڑی کے پاس چھوٹے دستے والی ایک کلہاڑی پڑی تھی۔

تہ خانے کا تالا توڑنے کے لیے انہیں جس ہتھیار کی ضرورت تھی، وہ اس زنگ آلود کلہاڑی کی صورت میں..... شاید..... انہیں میسر آگیا تھا۔

باریال نے جھپٹ کر کلہاڑی اٹھالی۔ جیسے ہی باریال نے کلہاڑی اٹھائی، حریم کو ایک طرح کے تحفظ کا احساس بھی ہوا۔ زندگی میں پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ خطرے میں ہتھیار کی کیا اہمیت ہوتی ہے، چاہے وہ ایک کلہاڑی ہی کیوں نہ ہو۔

مدھم چاندنی میں ریسٹ ہاؤس کی باؤنڈری کا ہیولا دکھائی دیتا تھا۔ یہ باؤنڈری بلند آہنی جنگلے کی صورت میں ہی تھی۔ اس جنگلے کی دوسری جانب جھاڑیوں، سرکنڈوں اور لمبی گھاس کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ وہی ویرانہ جس میں سے گزر کر وہ اس ''بندی خانے'' تک پہنچے تھے۔

''چلو آپی! کوشش کرتے ہیں۔'' باریال نے کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی تہ خانے کی تاریک سیڑھیاں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر لرزتے قدموں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ تہ خانے کے آہنی دروازے پر پہنچ گئے۔ وہی منحوس دروازہ جس کی دوسری جانب وہ تین دن سے مقید تھے اور جہاں اب ماہین زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ دروازے پر چٹخنا کا موٹا سا قفل تھا۔ جب باریال نے الٹی کلہاڑی سے اس تالے پر ضربیں لگانا شروع کیں تو حریم کا دل گواہی دینے لگا کہ مشکل وقت ختم ہونے والا ہے۔ یہ قفل زیادہ دیر باریال کی ضربوں کی مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ اپنے زخمی ہاتھ کے باوجود باریال اندھا دھند چوٹیں لگا رہا تھا۔ اندر سے کسی وقت ماما کی دبی دبی آواز سنائی دے جاتی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے اور پھر قفل ٹوٹ کر لٹک گیا۔

جونہی کلہاڑی کی ضربوں کی آواز تھمی، حریم نے ایک اور آواز سنی۔ گونجتی ہوئی طویل آواز..... یہ بھیڑیوں کی آواز تھی۔ حریم کو یوں لگا جیسے پاؤں سے سرتک اس کا پورا جسم سن ہوگیا ہے لیکن پھر اگلے ہی لمحے وہ دیوانہ وار سیڑھیوں پر چڑھی اور اس نے عقبی احاطے میں جھانکا۔ اس سے زیادہ خوفناک منظر اس کی نگاہوں کی قسمت میں اور کیا ہوسکتا تھا؟ چار دیواری کے جنگلے کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے میں سے بھیڑیے اندر داخل ہورہے تھے اور پوری رفتار سے حریم کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ تیس چالیس قدم سے زیادہ نہیں تھا..... وہ یہیں تھے..... وہ کہیں

نہیں گئے تھے..... بس اپنے لیے ایک اچھے موقعے کا انتظار کررہے تھے..... اور یہ موقع شاید انہیں مل گیا تھا۔

''باریال.....'' حریم چلائی اور جیسے سیڑھیوں پر اڑتی ہوئی نیچے دروازے تک پہنچی۔

باریال کو بھی پتا چل گیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ دونوں حتی الامکان تیزی سے دوبارہ تہ خانے میں داخل ہوئے لیکن تب تک بھیڑیوں کے اس جتھے میں سے سب سے اگلا جانور دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے باریال کی ٹانگ پر حملہ کیا..... اس حملے کے باوجود باریال اندر گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ حریم ایک لحظہ پہلے ہی اندر آچکی تھی۔

تہ خانے کا دروازہ اندر کی طرف بند ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ حریم دروازے کو کھینچ کر پوری طرح بند کرپاتی۔ بھیڑیا اپنا سر دروازے میں گھسا چکا تھا۔ پورے تہ خانے میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ حریم نے دیکھا، ماما نے بے ہوش ماہین کا سر اپنی گود سے نکال دیا تھا اور اس ڈنڈا نما لٹھ کی طرف لپک رہی تھیں جو ابھی ابھی حریم کے ہاتھ سے گری تھی۔ ''دروازے کو کھینچ کر رکھو۔'' وہ پکاریں۔

یہ ان تینوں کی خوش قسمتی ہی تھی کہ دروازہ باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف بند ہوتا تھا۔ اگر اسے دھکیل کر بند کیا جانا ہوتا تو وہ کسی طرح اپنا دفاع نہ کرپاتے اور وحشی جانور جو بھاری پتھروں کی طرح اس آہنی دروازے سے ٹکرائے تھے، اسے push کرتے ہوئے اندر داخل ہوجاتے۔ اب بھی ایک بھیڑیے کی گردن دروازے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے نکیلے دانت، اس کی باچھوں سے جھانکتا سفید جھاگ اس کی سرخ قاتل آنکھیں..... یہ سب کچھ حریم سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

عروبہ آگے آئی اور اس نے شیشم کی مضبوط لٹھ سے بھیڑیے کی تھوتھنی پر اندھا دھند ضربیں لگائیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے حریم کو محسوس ہوا کہ بھیڑیا پیچھے ہٹنا چاہ رہا ہے۔ اس نے دروازے پر اپنی گرفت ذرا سی ڈھیلی کی۔ جانور نے اپنا سر باہر کھینچا اور حریم نے دروازے کو کھینچ کر بند کردیا۔ باریال نے بھی اتنی ہی تیزی دکھائی اور اندر سے دروازے کو بولٹ کردیا۔ یہ موٹی گول سلاخ کا سلائڈنگ بولٹ تھا جس کو ارل بھی کہا جاتا ہے۔ کلہاڑی باہر ہی رہ گئی تھی۔

دروازے کے نچلے قریباً دو ڈھائی انچ کی درز تھی۔ بھیڑیے یہاں سے اپنی تھوتھنیاں اندر گھسا رہے تھے اور دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔ حریم، باریال اور عروبہ سکتے کے سے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شاید یہ بات غنیمت تھی کہ ماہین اپنے اردگرد سے بے خبر، بے سدھ پڑی تھی ورنہ موجودہ صورتِ حال، اس پر مہلک ترین اثرات ڈالتی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک یہ قیامت کا شور برپا رہا پھر آوازیں کچھ دھیمی پڑگئیں۔ اچانک حریم کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہ بھیڑیے گھوم کر سامنے کی طرف آسکتے ہیں اور روزن میں سے اندر کود سکتے ہیں۔

''ماما روشندان.....'' وہ پکاری۔

عین اس وقت شاید عروبہ نے بھی روزن کے بارے میں ہی سوچا تھا۔ وہ تینوں دوسرے کمرے کی طرف لپکے۔ باریال اور حریم تخت پر چڑھ کر کرسیوں پر پہنچ گئے۔ عروبہ نے آہنی گرل کو برابر کررکھا تھا لیکن تانبے کا تار ابھی نہیں لپیٹا تھا۔ حریم اور باریال نے حتی الامکان تیزی سے روزن کے فریم اور گرل کو تین چار جگہ تار کی بندشوں سے جکڑ دیا۔ بھیڑیوں کی پوری توجہ ابھی تہ خانے کے دروازے کی طرف ہی تھی۔ ان کی آوازوں کا اتار چڑھاؤ، ان کی بے پناہ بھوک اور غضب ناکی کو ظاہر کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے ایک یا دو جانوروں کے سوا باقی سیڑھیاں چڑھ کر باہر چلے گئے ہیں۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہے؟'' حریم نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور کربناک انداز میں پکار اٹھی۔

لالٹین کی روشنی میں عروبہ نے بھی فرش اور کرسیوں کی طرف دیکھا۔ وہاں خون ہی خون نظر آرہا تھا۔ یہ باریال کا خون تھا جو اس کی پنڈلی کے پچھلے حصے سے بہہ رہا تھا اور اس کے جوتوں کو بھگوتا ہوا سارے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔

باریال نے ابھی ابھی چند سیکنڈ پہلے اس زخم پر ایک پرانا کپڑا لپیٹا تھا۔ اب اس کپڑے پر بھی خون کے دھبے نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔

حریم تڑپ کر نیچے بیٹھ گئی اور باریال کا زخم دیکھنا چاہا۔

''کچھ نہیں ہوا آپی۔ میں ٹھیک ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''ٹھیک کیا ہو؟ سارا فرش تو خونم خون ہورہا ہے۔'' وہ کراہی اور زبردستی کپڑا باریال کی ٹانگ سے ہٹا دیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ چکرا کر بے ہوش ہوجائے گی۔ باریال کی پنڈلی کے پچھلے حصے سے پاؤ بھر گوشت غائب تھا۔ یہاں سے اس کی نیلی جینز کا ٹکڑا بھی اودھل تھا اور اس کی ٹانگ کی ہڈی تک دکھائی دے رہی تھی۔

اب عروبہ بھی یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ وہ جیسے بے دم سی

Digitized by Google

ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''ہائے میرے مالک..... ہائے میرے مالک۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

مگر جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی بری حالت، بچوں کی حالت کو بھی ابتر کر دے گی تو اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ آگے بڑھی، اس نے باریال کا خون آلود جوتا کھینچ کر اس کے پاؤں سے علیحدہ کیا۔ لالٹین آگے کی اور دل کڑا کر کے اس کے نہایت سنگین زخم کو دیکھنے لگی۔

''سب سے پہلے اس کا خون بند کرنا ہوگا..... کسی بھی چیز سے۔'' وہ بولی اور سوالیہ نظروں سے حریم کی طرف دیکھا۔

''یہاں کیا ہوگا؟'' حریم کھٹی کھٹی آواز میں بولی۔

عروبہ لپک کر اس الماری کی طرف گئی جہاں مسالا جات اور پکن سے متعلق دیگر اشیا پڑی تھیں۔ اسٹیل کے ایک بڑے ڈبے میں تھوڑا سا خشک آٹا بھی تھا۔ وہ آٹا لے کر واپس آئی۔ اس دوران میں حریم، باریال کو فرش پر ہی پہلو کے بل لٹا چکی تھی۔ عروبہ نے آٹے سے وہ کام لیا جو چولہے کی راکھ وغیرہ سے لیا جاتا ہے۔ اس نے باریال کے خونچکاں زخم پر خشک آٹے کا لیپ کر کے اور اوپر صاف کپڑے کی بہت سی دھجیاں وغیرہ رکھ کر مضبوطی سے اپنی اوڑھنی کی پٹی باندھ دی۔

باریال کا رنگ اخراجِ خون اور تکلیف کے سبب زرد ہو رہا تھا لیکن وہ خود کو حوصلہ مند دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بھیڑیے اب تہ خانے کے دروازے سے پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دور نہیں گئے۔ سیڑھیوں کے آس پاس ہی ہیں۔ عروبہ اور حریم نے باریال کو فرش کی چٹائی پر ہی لیٹا رہنے دیا اور اس کی زخمی ٹانگ اٹھا کر بیڈ کے اوپر رکھ دی تاکہ وہ قدرے اونچی رہے اور خون کا اخراج کم ہو جائے۔ باریال کی ہتھیلی جو پہلی ہی کافی زخمی تھی، اس کھینچا تانی میں مزید زخمی ہو گئی تھی۔ زخم کا منہ کھل گیا تھا اور اس پر بندھی ہوئی پٹی خون سے گیلی ہو گئی تھی۔ عروبہ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ یہاں بھی دوبارہ بینڈیج کی۔ ابھی وہ بینڈیج پوری طرح مکمل بھی نہ کر پائی تھی..... کہ حریم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ماما! ماہی کو دیکھیں۔''

ماہین کی حالت کچھ دیر سنبھلنے کے بعد پھر ابتر ہو رہی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ سانس کے ساتھ ایک نہایت تیز آواز بھی آنے لگی تھی۔

''ہائے میں مرگئی۔'' عروبہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ باریال کی بینڈیج ادھوری چھوڑ کر ماہین کی طرف لپکی۔ یوں لگتا تھا کہ ماہین کسی ناہموار راستے پر گاڑی میں سفر کر رہی ہے اور اس کے جسم کو مسلسل دھچکے لگ رہے ہیں۔ بہت ضبط کرنے کے باوجود حریم اپنی سسکیوں کو ڈوک نہیں پائی۔ اس کے سینے کے اندر سے جیسے ایک چلاتی ہوئی سی آواز ابھری..... حریم! تم سب موت کے گھیرے میں ہو..... یہاں سے بچنا تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا.....

بھیڑیے اب گھوم کر روزن کی طرف آگئے تھے، تاریکی میں ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہ عید کا روز تھا اور شام کے آٹھ بج چکے تھے۔

☆☆☆

عمر نے عید کا آدھے سے زیادہ دن سو کر ہی گزار دیا تھا۔ وہ اٹھا تو وال کلاک آٹھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ وہ جاگ کر بھی اسی طرح چت لیٹا رہا پھر اسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا۔ اس نے بیڈ پر اور تکیے کے نیچے دیکھا۔ تب اس نے وہیں لیٹے لیٹے ماں کو آواز دی۔ ''امی! میرا فون؟''

امی شاید کچن میں مصروف تھیں، انہوں نے وہیں سے آواز دی۔ ''الماری میں پڑا ہے، دائیں طرف۔''

وہ اٹھا اور موبائل لے کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ فون آف تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے آن کرے لیکن پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے پتا تھا کہ آج دو کزنز اور دو تین دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ یقیناً انہوں نے اسے کئی کالز کر ڈالی ہوں گی۔ اب بھی فون آن ہوتے ہی ان کا تقاضا یہی ہوگا کہ لبرٹی مارکیٹ پہنچو۔ لبرٹی مارکیٹ تو بہت دور تھی، عمر کا دل گھر کی دہلیز پار کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بہت اداس اور خراب موڈ میں تھا۔

تب اس کا دھیان ایک بار پھر حریم کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا پورا سراپا اپنی تمام جزئیات سمیت عمر کی آنکھوں کے اندر سما جاتا تھا۔ اس کے لمبے ریشمی بال، ستواں ناک، جھیل سی گہری اور شفاف آنکھیں، جن میں دیکھ کر نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے ہونٹ جن میں سے ایک نادیدہ کشش پھوٹتی تھی۔ اس کا جسم تو خوبصورت تھا ہی، دل اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ کہتے ہیں کہ آئیڈیل ملنا مشکل ہوتے ہیں لیکن عمر کو شاید ہو بہو اس کا آئیڈیل مل گیا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ اس کو حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے فون آن کر دیا۔ عید آئی تھی اور تقریباً گزر گئی لیکن عمر کے دل میں اب

Digitized by Google

بھی یاسید کی ایک کرن سی چمکتی تھی۔ شاید..... شاید وہ رابطہ کرے۔ فون آن ہوگیا۔ اسکرین روشن ہوئی اور پھر عمر کے رگ وپے میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اسکرین پر حریم کا ایک میسج موجود تھا۔ اس نے جلدی سے میسج کھولا۔ الفاظ چنگاریوں کی طرح اس کی آنکھوں میں رقصاں ہوئے۔

''مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔''

اس نے دوبار میسج پڑھا اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ یہ میسج آج ہی گیارہ بج کر دس منٹ پر بھیجا گیا تھا، یعنی اس کے سونے کے تھوڑی ہی دیر بعد۔ ''اوہ خدایا۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

یہ کوئی مذاق تو نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ حریم کا نمبر پریس کیا اور ایک بار پھر وہی مایوس کن آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

اس نے جھلا کر ایک بار پھر آنٹی عروبہ کے نمبر پر ٹرائی کی۔ وہاں سے بھی وہی جواب ملا، جو حریم کے نمبر سے مل رہا تھا۔ آج صبح عمر نے اپنے چھوٹے بھائی علی سے باریال کا نمبر بھی لیا تھا، اس نمبر پر بیل تو جاتی تھی مگر کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ علی نے بتایا تھا کہ باریال جب کہیں تفریح وغیرہ کے لیے جاتا ہے تو فون گھر پر ہی چھوڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تفریح میں سیل فون ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔

پریشانی کے عالم میں عمر نے باریال کو بھی ٹرائی کرلیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ وہ پھر بار بار حریم کا نمبر پریس کرنے لگا۔ سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن عدیل عرف عادی کی طرف بھی جارہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس معاملے میں وہی خبیث ملوث ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ مقامی پولیس کہتی تھی کہ وہ قبائلی علاقے میں روپوش ہے..... لیکن لاہور کا انارکلی بازار قبائلی علاقے میں تو نہیں تھا اور چھ سات روز پہلے اسے وہاں دیکھا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس نے لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ ثمینہ نے بیٹے کو تیار دیکھا تو بولی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ آج کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟''

''بس ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آجاتا ہوں۔''

''خیر خیریت والا کام ہی ہے نا؟'' ماں کی آنکھوں میں ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔ جب سے عادی کے ساتھ لڑائی والا واقعہ ہوا تھا، ذرا سی بات پر ثمینہ کا دل خشک پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔

ماں کو تسلی دے کر عمر نے اپنی کلٹس گاڑی نکالی اور طوفانی رفتار سے حریم کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ وہ پڑوسیوں سے جاننا چاہتا تھا کہ ان کے پاس آنٹی عروبہ اور ان کی فیملی کے بارے میں کوئی اطلاع ہے یا نہیں۔ ساتھ ساتھ وہ حریم، آنٹی عروبہ اور باریال کے فونز پر بھی ٹرائی کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر وہ لوگ واقعی کسی مصیبت میں ہیں تو پھر ان کے فون بند کیوں ہیں؟ خاص طور سے حریم کا فون اب بند کیوں ہے؟

آنٹی عروبہ کے گھر پہنچ کر وہ سب سے پہلے ان کی لینڈ لیڈی سے ملا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ان لوگوں کو شاید عید سے ایک روز پہلے آجانا تھا مگر ہوسکتا ہے کہ پروگرام لمبا ہوگیا ہو۔ عمر نے پوچھا۔ ''پچھلے ایک دو روز میں ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''

عمر رسیدہ لینڈ لیڈی بولیں۔ ''کل میں نے ہی دو تین دفعہ فون کیا تھا مگر ان کے نمبرز بند جارہے ہیں۔ لڑکے باریال کے فون پر بیل جاتی ہے لیکن آواز سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا موبائل گھر میں ہی چھوڑ گیا ہے۔''

عمر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ دیوار سے اندر جھانکا۔ پچھلے چار پانچ روز میں ہاکر نے جو اخبار پھینکے تھے، وہ اسی طرح صحن میں پڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں پڑوسی میاں احمد بھی وہاں آگئے۔ انہوں نے بھی تقریباً وہی کچھ بتایا جو لینڈ لیڈی بتا چکی تھیں۔ انہوں نے بھی آج اور کل حریم وغیرہ سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن حریم کے علاوہ عروبہ کا فون بھی بند جارہا تھا۔

عمر کی چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ کوئی سنگین قسم کی گڑبڑ ہوچکی ہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر حریم کے خالو یاور حیات صاحب کا نمبر پریس کیا۔ ان سے رابطہ ہوگیا۔ عمر نے کہا۔ ''انکل! میں عمر سرمدی بول رہا ہوں۔ آپ کو آنٹی جان اور حریم وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟''

''نہیں بھئی، میں تو دعا ہی میں تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اسلام آباد ائرپورٹ پر اترا ہوں۔ ابھی گھر بھی نہیں پہنچا ہوں۔ کیوں؟ خیریت ہی ہے نا؟''

''ہاں..... جی..... خیریت ہی ہے..... لیکن آنٹی اور باقی لوگ عید سے پہلے کے کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید سامیوال اور چیچہ وطنی کی طرف..... یا پھر اس سے کچھ آگے.....''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... وہ شجاع فارم گئے

ہوں گے۔ وہاں کئی دفعہ سگنل بھی نہیں ملتے ہیں۔ میں نے بھی ابھی فون کیا تھا حریم کو..... رابطہ نہیں ہوا ہے۔''

عمر فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ اس موقع پر یاور حیات صاحب کو حریم کے سنگین میسج کے بارے میں بتائے یا نہیں۔ ویسے بھی وہ اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہیں یہاں لاہور پہنچتے پہنچتے پانچ چھ گھنٹے تو لگ ہی جانے تھے۔ عمر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے موبائل نکال کر ایک بار پھر حریم کا میسج پڑھا۔ ''مجھے فوراً کال کریں۔ ہم شجاع فارم اور چیچہ وطنی کے راستے میں ایک ریسٹ ہاؤس میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔''

اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بدقماش عادی نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو؟ اس کے سینے میں انگارے سے سلگنے لگے۔ کیا اس معاملے میں اسے ابو کو مطلع کرنا چاہیے؟ لیکن ایک بات وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر ایک دفعہ امی ابو اور خاص طور سے امی کو پتا چل گیا تو وہ اسے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالنے دیں گی۔ عادی کا خوف بے طرح ان کے دل و دماغ پر سوار ہو چکا تھا۔ کریم پور کے قریب عمر کا ایک فارسٹ آفیسر دوست رہتا تھا۔ عمر کا دل چاہا کہ وہ اس سے رابطہ کرے اور اس سے پوچھے کہ چیچہ وطنی سے آگے یہ شجاع فارم کہاں اور کس راستے پر واقع ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر حریم وغیرہ کسی مصیبت میں ہیں تو انہیں فوری طور پر مدد کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

باریال کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سخت بینڈیج کے باوجود اس کی پٹی پھر خون سے بھیگ چکی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگتا تھا اور اس کے ہونٹ خشک ہو جاتے تھے۔ حریم اسے ٹینکی کا وہی گدلا سا پانی دینے پر مجبور تھی جسے اب ابالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ حریم کو خود بھی ہلکا سا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ ماہین کی حالت مزید بگڑی نہیں تھی اور نہ ہی سنبھلی تھی۔ وہ ہر لحظہ ایک آسان سانس کے لیے تڑپ رہی تھی۔ یہ رات کے قریباً دس بجے کا عمل تھا۔ چاند کی کچھ ٹھٹھری ہوئی کرنیں روزن کی گرل میں سے چھن کر اندر آرہی تھیں اور ماحول کو مزید پراسرار و گمبھیر بنا رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے حریم ہمت کر کے تخت اور پھر کرسی پر چڑھی تھی۔ اسے روزن سے کچھ ہی فاصلے پر پوپلر کے درخت کے پاس ایک بھیڑیا دکھائی دیا تھا۔ وہ منہ اوپر اٹھا کر ہاؤلنگ کر رہا تھا۔ وہی طویل آواز جو کانوں کے راستے جسم کے رگ و پے میں اترتی تھی اور ایک لرزہ پیدا کرتی تھی۔ اب بھی یہ بھوکے جانور کورس کی صورت میں ویسے ہی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حریم نے کہیں پڑھا تھا کہ چاندنی راتوں میں بھیڑیے چاند کی طرف دیکھتے ہیں اور پراسرار انداز میں ہاؤلنگ کرتے ہیں۔ پھر ایک مرتبہ پاپا سے جنگلی جانوروں کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ بھیڑیوں کی آوازوں اور چاند کی روشنی میں کوئی ایسا تعلق سائنسی طور پر ثابت نہیں ہے۔ اس وقت حریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ ایک چاندنی رات میں اپنے اہل خانہ سمیت خونخوار بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں ہوگی..... اور ان کی خوفناک ''ہاؤلنگ'' سن رہی ہوگی۔

ماہین چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی اور یہ اس امر کی علامت تھی کہ اس کے پھیپھڑے شاید پچاس فیصد سے زیادہ کام نہیں کر رہے۔ اسے فوری طور پر ''ان ہیلرز'' اور دیگر ادویات کی ضرورت تھی۔ اس کا سر ماما کی گود میں تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز حریم کے کانوں تک پہنچی..... ''میں..... کہاں ہوں ماما..... یہ..... لمبے لمبے پروں والے جنگلی بلے..... کہاں سے آئے ہیں..... یہ کیوں رو رہے ہیں..... ان کو چپ کراؤ ماما..... پلیز چپ کراؤ۔''

حریم نے دیکھا ماہین کے بے رنگ چہرے پر کرب کے آثار تھے..... وہ بڑبڑاتے ہوئے بری طرح ہانپ رہی تھی۔

پھر وہ ہچکیاں لینے لگی، جیسے رو رہی ہو۔ ماما نے بستر پر لیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے دونوں کان اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ دیے اور اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ حریم نے اپنی حوصلہ مند ماما کو ایسی بے بسی کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر اپنے نانا یعنی حریم کے پڑنانا کی بات کیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ انہوں نے اپنے نانا سے یہی سیکھا ہے کہ مایوسی گناہ ہے اور شدید مشکلات کے بعد آسانیوں اور راحتوں کو آنا ہی آنا ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ حوصلے سے ان کا انتظار کیا جائے۔

باریال نے کراہ کر اپنی شدید زخمی ٹانگ کو تھوڑی سی حرکت دی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''آپی! مجھے لگتا ہے کہ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ ایک بار پھر عمر بھائی کو ٹرائی کریں۔''

وہ بولی۔ ''اب فون آن کروں گی تو مشکل سے دو ڈھائی منٹ کی چار جنگ ہوگی۔ اگر اب بھی رابطہ نہ ہوا تو پھر؟''

''لیکن اب تو یہ رسک لینا پڑے گا۔ آپ ماہین کی حالت دیکھ ہی رہی ہیں۔''

حریم ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ پھر فون آن کیا۔ جونہی سم کے سگنل نمودار ہوئے، اس نے عمر کا نمبر پریس کیا..... دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر دوسری لائن پر مصروف ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

''اوہ گاڈ..... اوہ گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

فون کی اسکرین پر ''بیٹری کریٹی کلی لو'' کے الفاظ چمک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے فون آف کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' باریال نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ان کا فون آن تو ہے لیکن وہ کسی سے بات میں مصروف ہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو باریال، اب رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ کال کرتے ہیں۔''

حریم نے دیکھا، ماما ماہین کو اپنے ساتھ چمٹائے لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ سر پر دوپٹے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسی حالت میں نماز ادا کر رہی ہیں۔

وہ پانچ منٹ کا وقت پانچ گھنٹوں کی طرح گزارا۔ جتنی بھی دعائیں حریم کو یاد تھیں، وہ اس نے پڑھ ڈالیں۔ وہ جانتی تھی کہ گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ باہر کے لوگوں سے ان کے رابطے کا چانس کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

آخر اس نے پھر دل کو مضبوط کیا اور فون آن کیا۔ سگنل نمودار ہوتے ہی اس نے عمر کا نمبر پریس کیا۔ دو تین سیکنڈ بعد وہی دلدوز آواز آئی۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر دوسری لائن پر مصروف ہے تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔''

حریم کا دل چاہا، وہ اس سیل فون کو کھینچ کر دیوار پر دے مارے اور سب خطروں سے بے نیاز ہو کر باہر نکل جائے۔ اپنی مرتی ہوئی بہن کے لیے مدد ڈھونڈ لائے۔

باریال کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ کچھ پوچھ سکے۔ وہ دونوں جیسے پتھرائے ہوئے تھے۔ فون آن تھا۔ پچیس تیس نہایت قیمتی سیکنڈ ضائع کرنے کے بعد حریم نے ایک اور کوشش کی..... شاید..... یہ قبولیت کی گھڑیاں ہی نہیں تھیں۔ اس کوشش کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ عمر ابھی تک دوسری لائن پر مصروف تھا۔ حریم کے موبائل کی اسکرین اب کسی وقت بھی بجھ سکتی تھی۔ اس نے ایک آہ کھینچ کر فون آف کر دیا..... پتا نہیں کہ کہاں اتنی لمبی بات کر رہا تھا ڈاکٹر عمر؟ حریم نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ عمر اس وقت اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب عمر نے اپنے اس فارسٹ آفیسر دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر رکھا تھا اور اس سے شجاع فارم اور اردگرد کے علاقے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر رہا تھا۔

باریال بھی ایک دم خاموش سا ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر یکایک کوئی چیز بجھ گئی ہے۔ شاید یہ رہائی اور زندگی کی امید تھی۔ باریال کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلسل فاقے سے پیدا ہونے والی نقاہت ہی کچھ کم نہیں تھی، اوپر سے اس کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا۔ نقاہت کی کچھ ایسی ہی کیفیت شاید حریم کی ماما پر بھی طاری تھی۔ پچھلے تین چار گھنٹے سے حریم محسوس کر رہی تھی کہ وہ اشد ضرورت کے تحت ہی بات کرتی ہیں۔ بس پپڑی جمے ہونٹوں کے ساتھ کچھ پڑھتی رہتی ہیں یا دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔

یہ وہ لمحے تھے جب حریم نے پہلی بار اپنا حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ ابھی عید کا دن گزرا تھا اور یہ عید کی رات تھی۔ اگلے کم از کم دو روز تک تو کوئی امید نہیں تھی کہ اس ریسٹ ہاؤس کا کوئی ملازم چھٹیوں سے واپس آئے گا..... اور شاید بجلی واپس آنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ یہی لگتا تھا کہ اس تنہا عمارت تک بجلی کی اکلوتی لائن آتی ہے۔ باحیثیت لوگ عام طور سے پرائیویٹ طور پر ایسی لائن کا انتظام کر لیتے ہیں۔ حریم کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ باریال کے سر پر تھا اور وہ چٹائی پر بیٹھی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں..... کمرے میں سردی تھی مگر بخار کی حرارت کے سبب اسے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پچھلے پانچ منٹ سے دو بھوکے جانور مسلسل روزن کی گرل سے اپنی تھوتھنیاں ٹکرا رہے تھے۔ شاید باریال کے خون کی بو ان کے معدوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔ حریم کو لگ رہا تھا کہ روشندان کی گرل کی بندشوں میں اب وہ پہلے جیسی مضبوطی نہیں رہی۔ شاید ایک جگہ سے سریا بھی اکھڑ گیا تھا۔ جب جانور گرل سے ٹکراتے تھے تو ایک علیحدہ آواز پیدا ہوتی تھی اور یہ یقیناً اکھڑ جانے والے چوکور سریے کی ہی تھی۔ وقتاً فوقتاً ایک دو جانور گھوم کر اور سیڑھیاں اتر کر تہ خانے کے دروازے کی طرف بھی آجاتے تھے۔ ان کی آوازیں دل دہلاتی تھیں اور ان کی تھوتھنیوں کی جھلک دروازے کی پٹی

درز سے دکھائی دیتی تھی..... یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ حریم کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ حریم امین! اب شاید کوئی معجزہ ہی تمہیں اور تمہاری فیملی کو اس جان لیوا صورت حال سے نکال سکتا ہے۔ یہ مایوسی، لاچاری اور بے دلی کی انتہا تھی۔ اس کا نیم بیجز بھی غالباً بڑھ رہا تھا۔ وہ بار بار اسٹیل کے گلاس میں سے گدلے پانی کا "سپ" لیتی تھی اور اپنی خشک رگوں کو تر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بخار کی وجہ سے اس کے دماغ میں جیسے دھند سی بھرنے لگی۔ اس دھند میں سے وہی منحوس چہرہ ابھرا جس نے اسے اور اس کی فیملی کو اس حال تک پہنچایا تھا..... یہ عادی کا چہرہ تھا۔ وہ بڑی کمینگی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ حریم کو لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو رہا ہے۔ عجیب یاسیت کے عالم میں اس نے سوچا..... اگر وہ ایسے ہی مرگئی تو اس کی بربادی کا بدلہ کون لے گا؟ جو جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، اس کا ازالہ کون کرے گا..... کون انصاف دے گا اسے..... کیا وہ "بھیڑیے جیسا خونی جانور" ایسے ہی اپنے اندر کی بھوک سے دیوانہ ہو کر گلی کوچوں میں دندناتا رہے گا؟ زندگیاں اجاڑتا رہے گا؟

ایک دم ایک خیال کسی الہام کی طرح اس کے دھند آلود ذہن میں چمکا..... وہ اب بھی اس سے ملنا چاہ رہا تھا..... ابھی آٹھ دس گھنٹے پہلے بھی اس کا غلیظ، دھمکی آمیز پیغام موصول ہوا تھا..... "ایسے مت تڑپاؤ ورنہ تمہیں بھی تڑپنا پڑسکتا ہے..... میں پھر کہتا ہوں۔ ایک بار مل کر دیکھ لو..... تمہارے سارے خوف دور ہو جائیں گے۔"

'تو پھر کیوں نا..... میں اس سے مل کر دیکھ لوں..... اسے یہاں بلالوں۔' اس نے عجیب ہیجانی انداز میں سوچا۔ یہ خیال اتنا طاقتور اور برق رفتار تھا کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کچھ بخار کی شدت سے اور کچھ اس ہیجانی خیال کے سبب اس کا دل سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ اس نے گدلے پانی کا ایک اور گھونٹ بھرا اور اپنا سر گھٹنوں پر ٹیک کر کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ جانتی تھی، اب چار جنگ اتنی کم ہے کہ وہ بمشکل ایک کال ہی کرسکتی تھی۔ یہ کال کتنے سیکنڈ کی ہوگی؟ وہ اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی..... ہاں وہ ایک کال کرسکتی تھی..... کیا وہ پھر عمر کو ٹرائی کرے..... یا مزید سیکنڈ ضائع کیے بغیر عادی کو کال کردے.....؟ ان لمحوں میں اس نے خود کو جیسے ایک سنگین دوراہے پر پایا۔ اب تک اس نے عمر کو جتنی کالز بھی کی تھیں، وہ رائگاں گئی تھیں۔ کبھی فون اٹھایا نہیں گیا تھا..... کبھی بند ملا تھا..... اور آخری بار لائن مسلسل مصروف ملی تھی..... اور اب اس کے پاس شاید آخری چند سیکنڈز تھے۔ وہ کیا کرے..... وہ کیا کرے؟ اس نے شدید ترین تذبذب کے عالم میں سوچا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، لالٹین کی لو نگاہوں کے سامنے پھیلتی جارہی تھی۔

ایکا ایکی وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ "کہاں جارہی ہو؟" عروبہ نے سوئی سوئی سی نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"واش روم میں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور واش روم میں گھس گئی۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ پانی کا نل کھولا۔ پانی کی دھار آواز پیدا کرتی ہوئی پلاسٹک کی بالٹی میں گرنے لگی۔ وہ لمبوترے واش روم کے آخری گوشے میں چلی گئی۔ ایک عجیب سی کیفیت کے تحت اس نے فون آن کیا۔ چند سیکنڈ بعد اسکرین روشن ہوگئی۔ چار جنگ شو کرنے والی انڈیکیشن زیرو کے قریب تھی۔ اس نے عادی کا نمبر پریس کیا۔

تین چار سیکنڈ بعد کال ریسیو ہوگئی۔ وہ کسی ایسی جگہ تھا جہاں ہیجان خیز میوزک بلے ہو رہا تھا..... اور شاید وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کر رہا تھا۔ حریم کے پاس ضائع کرنے کو وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو..... میں حریم بول رہی ہوں۔"

"یقین نہیں آرہا سویٹ ہارٹ۔ کہیں کھلی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے..... اور خود کو بہت سنبھال کر بول رہا ہے۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں تمہارے میسج دیکھتی رہی ہوں..... آخر..... کیا چاہتے ہو تم؟"

"بس تم سے ملنا..... تم کو چھونا..... تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانا۔"

اس نے چند سیکنڈ توقف کیا..... اور بولی۔ "میری ایک شرط ہوگی۔"

"ایک شرط؟" وہ حیرت سے بولا۔ "ایک سو ایک شرطیں بتاؤ سویٹی..... لیکن جلدی بتاؤ۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"دہاڑی میں..... یہاں ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں..... اور تم کہاں ہو؟"

میوزک کا بے پناہ شور اب کم ہوگیا تھا، شاید وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ حریم اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "شرط یہ ہے کہ تم بالکل اکیلے آؤ گے۔

اگر ایسا نہ ہوا تو پھر..... یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔"

"اکیلا..... بالکل اکیلا جانِ من..... بالکل بے فکر رہو۔ لیکن آنا کب ہے اور کہاں آنا ہے؟" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

حریم نے اپنے لہجے کو پست کر کے ذرا رازدارانہ انداز دیا اور بولی۔ "اس وقت موقع ہے اگر..... آج..... ہی آسکو تو اچھا ہے۔ سب دوسرے پورشن میں سوئے ہوئے ہیں۔ تم ابھی نکل سکتے ہو۔"

"مجھے واقعی لگ رہا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں..... اگر....."

"پلیز..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" حریم نے اس کی بات کاٹی..... اور پھر اس نے بہ عجلت تمام اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق عادی کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کر دیا۔ اس نے تین چار فقروں میں شجاع فارم سے نکلنے والی سڑک کا ذکر کیا اور سرخ دیواروں والے اس ریسٹ ہاؤس کا ذکر کیا جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ آہنی سلاخوں والا سفید مین گیٹ اندر سے کھلا ہے..... لیکن اسی دوران میں فون کی چارجنگ ختم ہوگئی اور وہ خاموش ہوگیا لیکن وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس نے ایک بہت اونچا پہاڑ سر کیا ہے۔ اس نے وہاڑی کا نام سنا ہوا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے مردہ سیل فون اپنی جرسی کی جیب میں ڈالا، پانی سے ہاتھ دھوئے اور ہولے سے دروازے کی چٹخنی اتار کر باہر نکل آئی لیکن اسے بری طرح چونکنا پڑا۔ دروازے کے عین سامنے ماما کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

انہوں نے حریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کس کو فون کیا ہے؟"

اس نے ماما سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن آج بولا اور نفی میں سر ہلا کر پھر سے باریال کے پاس آن بیٹھی۔ اس نے دوبارہ ماما کی طرف نہیں دیکھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ماما وہیں کھڑی ہیں اور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ وہ کئی سیکنڈ تک ساکت و جامد وہیں کھڑی رہیں۔ شاید انتظار کرتی رہیں کہ حریم ان کی طرف دیکھے پھر ماہین بے ہوشی کے عالم میں بری طرح ایکائیاں لینے لگی۔ حریم نے دیکھا کہ ماما جلدی سے پھر اس کے پاس بیٹھ گئی ہیں اور اس کا سر اونچا کر کے اپنے زانو پر رکھ لیا ہے۔ ماہین نے بے ہوشی کے عالم میں ہی ایک قے کی اور اس کی بگڑتی ہوئی سانس تھوڑی سی بہتر ہوئی۔ تاہم یہ عارضی بہتری تھی۔ ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے حریم اچھی طرح جانتی تھی کہ ماہین اسٹھیما کی تیسری اسٹیج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے خطرے میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

حریم دیوار سے ٹیک لگا کر باریال کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ ساتھ ساتھ سوچتی رہی کہ ماما کو فون کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اسے ماما کی ہچکیاں سنائی دیں۔ وہ برف سے سفید چہرے والی ماہین کے پاس نیم دراز تھیں اور رو رہی تھیں۔ انہوں نے بے ہوش ماہین کا سر اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا اور اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں لیا ہوا تھا۔ وہ حریم کی طرف دیکھے بغیر آتشیں لہجے میں بولیں۔ "تم نے اچھا کیا حریم..... تم نے بہت اچھا کیا..... اللہ کرے وہ یہاں آئے..... اللہ کرے وہ یہاں آئے۔ میں اس حرامزادے کو..... اس ظالم کو یہاں دیکھوں۔ اس نے جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ کیا، اللہ کرے اس کے ساتھ ہو..... ہماری آنکھوں کے سامنے ہو....."

اور یہ وقت تھا جب حریم کو پتا چلا اس کی ماں سب جانتی ہے۔

☆☆☆

وہ اکیلا ہی آرہا تھا لیکن اپنا بھرا ہوا کولٹ پستول اور اس کے کچھ فالتو راؤنڈز اس نے ضرور گاڑی کی نشست کے نیچے ایک خلا میں رکھ لیے تھے۔ یہ چاندنی رات کافی سرد تھی مگر عادی نے اپنی طرف والی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا کھولا ہوا تھا۔ الکحل کی گرمی میں اسے یہ ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج اس لڑکی کی ہمت جواب دے گئی ہے، مسلسل تناؤ اور خوف نے آخر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔

وہ ملن لڑکیوں کی نفسیات کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کو کس طرح گھیرنا ہے اور کیسے تھکانا ہے۔ حریم کے سلسلے میں اس کا اہم ترین حربہ اس کی چھوٹی بہن ماہین تھی جس کو وہ چھوٹی چڑیا کا نام دیتا تھا۔ اس نے بارہا اشاروں کنایوں میں حریم کو یہ بتایا تھا کہ اگر وہ راہِ راست پر نہ آئی تو اس کی چھوٹی چڑیا کے پر جھڑ سکتے ہیں لیکن وہ صرف دھمکاتا ہی نہیں تھا، بڑی مہارت سے حریم کو تھوڑی بہت "نرمی" کی جھلک بھی دکھاتا تھا یعنی یہ دُہرا اٹیک تھا..... اور آج مارچ کی اس چاندنی شب میں بالآخر اس کی کوششیں بار آور ہوتی نظر آرہی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں

ڈاکٹر عمر کا چہرہ گھوما اور اسے اس ساری صورتِ حال نے کچھ زیادہ ہی لطف دیا۔

اس نے بوتل سے آخری گھونٹ لیا اور باقی مشروب ... بوتل سمیت باہر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ وہ اتنی ہی پینا چاہتا تھا کہ حریم کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کر سکے۔ حریم نے اپنی جو لوکیشن بتائی تھی، وہ بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

پچھلے سال اسی موسم میں وہ اپنے مقامی دوست شہباز چودھری کے ساتھ اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس سڑک پر اس نے جنگل میں گھرے ہوئے دو تین ریسٹ ہاؤس بھی دیکھے تھے۔ یہ یقیناً انہی ریسٹ ہاؤسز میں سے ایک تھا۔

اس کے اندر عجیب سی ترنگ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کسی قسم کے خطرے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا اور اپنی پذیرائی کے لیے بھی۔ وہ ڈرنے والا نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ اکثر اپنے ''مقاصد'' تک پہنچ جاتا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر آج کی رات سب اچھا رہا..... اور اسے اس مشکل لڑکی کی طرف سے پذیرائی ملی تو کیا ہوگا..... کیا وہ مکمل طور پر سرنڈر کرے گی اور اسے اپنی من مانی کرنے دے گی..... یا پھر آج تھوڑی بہت پیش قدمی کرنے دے گی اور باقی کے معاملات آئندہ پر چھوڑنے پڑیں گے..... اور یہ بھی ممکن تھا کہ آج کی ملاقات صرف بات چیت تک محدود رہتی..... یہ خوبصورت وقت صرف اس کا خوف دور کرنے میں گزر جاتا لیکن کیا وہ ایسا ہونے دے گا؟

اس نے بے قراری میں اسٹیئرنگ پر ایک مکا رسید کیا اور آڈیو پلیئر کی آواز کچھ بلند کر دی۔ ماضی کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے..... دسمبر کی وہ ہیجان خیز سہ پہر اس کے دماغ پر مسلط ہونے لگی..... حریم کا اس کی بانہوں میں جکڑا جانا..... اس کی شدید مزاحمت..... اس کا سر بیڈ کے کراؤن سے بری طرح ٹکرانا اور اس کا مضمحل ہو جانا..... پھر اس کا لمس..... اس کا ان چھوا پیکر..... سب کچھ ماضی کے دھندلکے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

آج وہ اپنے میزبان دوست شہباز اور دیگر دوستوں کو بتائے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی غلطی کرے جس سے اس کا شکار بدک جائے۔ وہ بعد میں دوستوں کو کوئی بہانہ تراش کر مطمئن کر سکتا تھا۔ وہ اب منڈی بورے والا سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ اس ذیلی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں طرف خاموش جنگل تھا جس پر چاندنی کسی نرم پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا دھیان حریم اور اس کی فیملی کی مہمان کار کی طرف چلا گیا۔ عید سے دو دن پہلے جب وہ لوگ اپنی گاڑی سرکنڈوں کے قریب چھوڑ کر بھاگے تھے..... تو پھر اگلے روز تک وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔ شہباز نے اپنا ایک گرگا اس گاڑی کے قریب متعین کر دیا تھا تاکہ وہ کسی بھی نئی صورتِ حال پر نظر رکھے۔ وہ گرگا رات بھر گاڑی سے کچھ فاصلے پر سرکنڈوں میں چھپا رہا تھا، لیکن اگلے روز اس نے غلطی کی اور دوپہر کے بعد کھانے پینے کا سامان لینے ایک قریبی قصبے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے چرس کے چند سوٹے لگا لیے اور رات دس بجے کے بعد واپس موقعے پر پہنچا، تب تک گاڑی وہاں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ گاڑی کے مالکان ہی گاڑی وہاں سے لے گئے ہیں۔

عادی کی سوچ کی رو کافی دور تک چلی گئی تھی۔ یکایک یہ رو واپس پلٹ آئی۔ اسے دور گھنے درختوں میں کچھ فاصلے پر ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی سلور جیپ کی رفتار دھیمی کر دی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں چار پانچ کلومیٹر کے ایریا میں دو تین ریسٹ ہاؤسز موجود ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

☆☆☆

''کیا وقت ہوا ہے حریم؟'' عروبہ نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''ماما! ساڑھے بارہ ہو گئے ہیں۔'' حریم نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''بار بار یل کا خون مسلسل رس رہا ہے۔ ساری چٹائی گیلی ہو گئی ہے۔ کیا پٹی کھول کر نئی پٹی کر لیں؟''

''اس سے فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔ بس اس کی ٹانگ ذرا اونچی رکھو۔''

''یہ کہتا ہے اس طرح درد ہوتا ہے۔'' حریم نے کہا۔

''یہ درد تو جھیلنا ہے بیٹا! اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ ایک دو ''پینا ڈول'' اور کھا لو۔''

بار یال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی۔ تہ خانے کے دونوں کمروں میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو بس وہ دلخراش آوازیں اور آہیں ہی توڑتی تھیں جو روزن کی طرف سے ابھرتی تھیں۔ شکار کی طرح شکاریوں کے پیٹ میں بھی بے پناہ بھوک نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ وہ خونی جانور بے قرار ہو کر اپنی تھوتھنیاں آہنی گرل سے ٹکراتے تھے..... اور اس سے جو آواز پیدا ہوتی تھی، وہ گواہی دیتی تھی کہ یہ کھڑکھڑاتی ہوئی گرل مسلسل شکستہ ہو رہی ہے اور کسی بھی وقت ''اذیت

ناک منوں'' کو اس تہ خانے میں راہ دے سکتی ہے۔

ماہین کا سر عروبہ کی گود میں تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں ماہین بے ہوشی کے عالم میں تین بار قے کر چکی تھی۔ اب اس کے معدے میں کچھ باقی ہی نہیں تھا۔ وہ صرف ابکائیاں لے کر رہ جاتی تھی..... جو تھوڑا بہت پانی نکلتا تھا، وہ عروبہ کی گود میں رکھے کپڑے میں جذب ہو جاتا تھا۔

شدید نقاہت کے سبب کسی وقت اپنی پلکیں اٹھائے رکھنا بھی عروبہ کو مشکل لگتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں..... ایک بار پھر وہی ہولناک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا جو اکثر و بیشتر اس کے پردۂ تصور کو لرزا دیتا تھا۔ خونخوار جانور، ہولناک آوازیں، گھیراؤ، نکیلے دانتوں کی کٹ کٹ..... لیکن اب یہ منظر عروبہ کو اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس تصوراتی منظر کو اب جیتی جاگتی شکل میں دیکھ چکی تھی۔ یہ سب کچھ وہی تو تھا جس کا تجربہ اس کے دل و دماغ نے سیکڑوں مرتبہ کیا تھا..... اور شاید اس کے نانا ٹھیک ہی کہتے تھے..... کبھی کبھی ہمارا ذہن مستقبل کو کھینچ کر ہمارے حال میں ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ہم وہ سب کچھ کسی نہ کسی شکل میں دیکھ لیتے ہیں جو مستقبل میں رونما ہونے والا ہوتا ہے..... ہاں، یہ سب کچھ وہی تھا جو وہ دیکھتی رہی تھی۔ یہی وہ آوازیں تھیں..... یہی وہ محاصرہ تھا..... یہی دانتوں کی کٹ کٹ تھی..... یہی وہ گلاب کے سفید پھول تھے..... لیکن..... ایک فرق تھا۔ ان سفید پھولوں پر ابھی خون کے چھینٹے نہیں تھے..... یہ کس کا خون ہوگا؟ کس کا خون ہوگا؟ کسی غیر کا..... کسی اپنے کا؟ اس کا دھیان اپنے مصیبت زدہ بچوں کی طرف گیا اور اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

یہی وقت تھا جب عروبہ کو اور حریم کو ایک ساتھ کسی گاڑی کے انجن کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے ہراساں نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا..... ''شاید..... وہ آگیا ہے۔'' عروبہ نے سرسراتی آواز میں کہا اور ماہین کا سر گود سے نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

حریم بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لالٹین کی لو اونچی کر کے لکڑی کے تخت کی طرف بڑھی اور پھر ایک کرسی کے اوپر چڑھ گئی۔ ایک بھیڑیا جو شاید نر تھا، روشندان سے کچھ فاصلے پر ایک مور پنکھ کے قریب خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے کان، بے ساختہ کھڑے ہو گئے تھے اور وہ دور آہنی گیٹ کی طرف..... دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب کچھ حرکت سی محسوس تو ہوتی تھی لیکن دکھائی کچھ نہیں دیتا تھا۔ حریم کا دل گواہی دینے لگا..... ہاں، یہ وہی شخص ہے جو بظاہر انسان ہونے کے باوجود یہاں موجود خونخوار جانوروں ہی کی طرح سفاک ہے..... جو ظلم بھی ڈھاتا ہے اور سینہ تان کر بھی چلتا ہے۔ جو طاقت کے نشے میں رہتا ہے اور خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہتا ہے، انصاف اور احتساب میرے جوتے کی نوک پر ہیں..... اگر کوئی میرا کچھ بگاڑنا چاہتا ہے تو اپنی ہی کوشش کر کے دیکھ لے۔

پھر چمکتی ہوئی چاندنی میں حریم کو ایک پنک شرٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، گیٹ سے اندر داخل ہو چکا تھا اور بڑی احتیاط سے برآمدوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد حریم کا پورا جسم سنسنا اٹھا۔ اس نے قد کاٹھ سے اور لمبے بالوں سے پہچان لیا کہ یہ وہی بدبخت ہے۔ شاید اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے حریم کو فون بھی کیا ہو، لیکن حریم کا فون تو بے جان ہو چکا تھا۔

وہ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بھیڑیے کہیں نہیں تھے۔ دو منٹ پہلے جو اکیلا بھیڑیا حریم کو مور پنکھ کے پودے کے پاس نظر آیا تھا، وہ بھی اب اوجھل تھا۔ ایک لحظے کے لیے حریم کے ذہن میں یہ روح فرسا خیال آیا کہ اگر بھیڑیے نمودار نہ ہوئے تو؟

یہ پہلا موقع تھا..... ہاں، یہ پہلا موقع تھا جب حریم چاہ رہی تھی کہ بھیڑیے یہاں موجود ہوں.....

اور پھر وہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ جس کا ہونا اشد ضروری تھا۔ خونی جانور ٹولی کی صورت میں ایک طرف سے نکلے اور برق رفتاری سے لمبے بالوں والے عادی پر جھپٹے۔ عادی کے چلانے کی آواز آئی..... وہ گر کر اٹھا اور برآمدوں کی طرف بھاگا۔ بلب کی کمزور روشنی میں وہ صاف دکھائی دیا۔ دو بھیڑیے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے تھے اور اس کی گردن پر حملہ آور تھے۔ ایک نے اس کی پنڈلی کو اپنے مہلک جبڑے میں جکڑ لیا تھا۔ ''بچاؤ..... بچاؤ۔'' عادی کی پاٹ دار آواز ایک دردناک پکار بن کر گونجی۔ یہ پکار حیرت آمیز دہشت میں تھرتھری ہوئی تھی۔

جب چوتھا جانور بھی اس پر حملہ آور ہوا، وہ اوندھے منہ چوکیدار احسن خان کے بدبودار ڈھانچے کے پاس گرا۔ ٹولی کا پانچواں بھیڑیا بھی برآمدے سے نکلا تھا اور برق رفتاری سے اپنے شکار کی طرف آرہا تھا۔

ان لمحوں میں حریم نے محسوس کیا کہ ماما بھی دوسری کرسی پر چڑھ کر اس کے پہلو میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اس نے مضبوطی سے ماما کا بازو تھام لیا۔ منظر لرزہ خیز تھا..... لیکن وہ دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ بھیڑیوں کے

نرغے میں چوڑا چکلا عادی مچھلی کی طرح تڑپا۔ اس نے اپنی گلابی شرٹ کے نیچے سے کچھ نکالا..... یہ ایک سیاہ پستول تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے بپھرے ہوئے جانوروں کی طرف سیدھا کرپاتا..... وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر مرغیوں والے دڑبے سے ٹکرایا اور فرش پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

پھر گلابی قمیص کی دھجیاں فضا میں بکھرنے لگیں۔ ہاں، حریم کی قمیص بھی تو گلابی ہی تھی۔ اس کی دھجیاں بھی تو اسی طرح بکھری تھیں۔ خونخواری اور سفاکی نے اس کا بس بھی تو نہیں چلنے دیا تھا۔ اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اور وہ مزاحمت کے لیے درکار توانائی کھو بیٹھی تھی۔

یہاں بھی تقریباً وہی کچھ ہو رہا تھا۔ اب کوئی نامی گرامی ایڈووکیٹ ریاض اپنے قانونی داؤ پیچ اور اپنے تعلقات کے ذریعے عادی کو بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ زندہ نوچا جا رہا تھا۔ عادی کی پکاریں دردناک تھیں..... اور ایک روز حریم کی مامانے بڑھ دکھ سے کہا تھا۔ ''حریم! دیر ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔ ریاض جاوا کے بیٹے نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور بھگتے گا اور ہماری نگاہوں کے سامنے بھگتے گا.....''

سب کچھ حریم اور عروبہ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ تب حریم نے ایک بھیڑیے کے منہ میں عادی کی پشت کے گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا دیکھا اور وہ مزید نہ دیکھ سکی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ماتھا روزن کے کنارے سے ٹیک دیا۔ لیکن عروبہ اب بھی دیکھ رہی تھی۔ تاہم اس کی نگاہ اب بھیڑیوں پر نہیں تھی اور نہ ہی ان کے شکار پر تھی۔ وہ سفید گلابیوں کی طرف دیکھ رہی تھی، ان پر خون کے چھینٹے اب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک اور رات..... ایک اور خونی رات گزر گئی۔ دن کا اجالا پھیل گیا۔ یہ عید کا دوسرا روز تھا..... اور موت کے گھیرے میں ان کا چوتھا روز۔ مابین تو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی لیکن ان تینوں کو لگ رہا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے یقینی موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نقاہت نے اب ان کے جسموں کے علاوہ ان کے ذہنوں میں بھی عجیب سی بے حسی بھر دی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ اچانک مابین کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے گی اور وہ اسے دیکھتے رہ جائیں گے۔

آج رات پھر ان جنونی بھیڑیوں نے انسانی گوشت کا ذائقہ چکھا تھا..... اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس گوشت نے ان کی بھوک کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا یا ہے۔ وہ بار بار تہ خانے کے زیریں دروازے کی طرف اور اوپر روزن کی طرف اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ ان کی مسلسل ضربوں نے روزن کی گرل کے آہنی ڈیزائن کو دو تین جگہوں سے شکستہ کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ گرل اب کسی بھی وقت اپنی جگہ چھوڑ جائے گی..... اجالا ہونے کے بعد اکتالیس سالہ عروبہ نے ہمت کی اور خود کو جیسے گھسیٹتی ہوئی اوپر روزن تک پہنچی۔ اس کی نگاہ کو احسن خاں اور عادی کی کچی کچی لاشوں کے منظر نے بری طرح مجروح کیا۔ بھوکے جانوروں نے عادی کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے بھی گوشت نوچ لیا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کے گچھے اور گلابی قمیص کے ٹکڑے ہوا سے اِدھر اُدھر حرکت کر رہے تھے۔ کچھ کوّے ان باقیات کے اردگرد پھڑپھڑا رہے تھے۔ منظر دردناک تھا لیکن اس کے اندر کہیں آسودگی کا احساس بھی تھا۔

عروبہ نے اس منظر سے توجہ ہٹا کر اپنی نگاہ سیاہ رنگ کے اس کولٹ پسٹل پر مرکوز کر دی جو کل رات عادی کے ہاتھ سے نکلا تھا اور فرش پر لڑھک گیا تھا۔ وہ پسٹل کو دھیان سے دیکھنے لگی۔ اسے اس کا سیفٹی کیچ نظر آ رہا تھا اور ٹریگر بھی۔ عروبہ کے نانا فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ ان کے پاس اپنا ایک پرائیویٹ لائسنسی پستول بھی تھا۔ وہ اپنے مزاج کے جداگانہ تھے۔ نانی احتجاج کرتی رہ جاتی تھیں مگر وہ عروبہ کو اپنی گود میں بٹھا کر اسے پستول کے اسرار و رموز سمجھایا کرتے تھے، اس وقت وہ لڑکپن کے دور میں تھی۔ وہ اسے بتاتے پستول یا ریوالور کو تھامنا کیسے ہے؟ اس سے نشانہ کیسے لینا ہے، اس کا جھٹکا کیسے برداشت کرنا ہے؟ کبھی کبھی وہ اسے رہائش گاہ کے وسیع باغیچے میں لے جاتے اور محفوظ طریقے سے اسے فائر کرنا سکھاتے..... یہ سب کچھ عروبہ کے حافظے میں محفوظ ہو چکا تھا اور پتا نہیں کیوں آج صبح سے اسے لگ رہا تھا کہ اپنے بچوں کی زندگی کے لیے اسے باہر نکلنا ہوگا..... اس پسٹل تک پہنچنا ہوگا۔ وہ سیاہ رنگ کے پسٹل کو بغور دیکھتی رہی۔ اس کی اسلحہ شناسی اسے بتا رہی تھی کہ پسٹل کے میگزین میں دس بارہ گولیاں تو ضرور ہوں گی۔ پسٹل ایک کیاری کے قریب پڑا تھا۔ کیاری کا برآمدے سے فاصلہ دس پندرہ قدم کے لگ بھگ تھا۔ وہ ہر چیز کو ''کیلکولیٹ'' کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے جسم میں شدید نقاہت کے باوجود ایک لہری چلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایک بااہمت فوجی کی نواسی تھی۔ وہ لڑے بغیر ہتھیار نہیں ڈال سکتی تھی۔ اسے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اپنے جاں بلب بچوں کے لیے ایک آخری کوشش کرنا تھی اور ہر صورت کرنا تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہیں ماما؟'' نیچے سے حریم کی نحیف آواز ابھری۔

''کچھ نہیں۔''

''وہ نظر آرہے ہیں؟'' حریم نے پوچھا۔ اشارہ بھیڑیوں کی طرف ہی تھا۔

''نہیں..... لگتا ہے باڑ کے پیچھے ہیں یا پھر پچھلے احاطے میں۔''

وہ کرسی سے نیچے اتر آئی۔ حریم کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک بخار میں پھنک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے پُرتشویش انداز میں اپنا چہرہ عروبہ کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی میں بولی۔ ''ماما! بار بار کا خون بند نہیں ہو رہا۔ شاید ٹانگ کی کوئی بڑی رگ بھی کٹ گئی ہے۔'' ساتھ ہی وہ سسک پڑی۔

عروبہ نے اسے کندھے سے لگایا اور تھپکی دے کر بولی۔ ''حوصلہ رکھو..... اور اللہ سے مدد مانگتی رہو۔''

وال کلاک کی سوئیاں اب صبح آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں..... اور یہی لمحے تھے جب عروبہ اور حریم نے ایک بار پھر سنسان سڑک پر گاڑی کی آواز سنی۔ باریال تو گہری غنودگی میں تھا، وہ دونوں تڑپ کر اوپر روزن کے پاس پہنچ گئیں۔ انہیں یوں لگا کہ ڈرائیووے سے آگے مین گیٹ کے پاس کوئی گرے کلر اسٹیشن ویگن کھڑی ہے..... پھر تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے دو افراد کو دیکھا جو ادھ کھلے گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر کسی کو پکار رہے تھے..... تب وہ اندر آگئے۔ دونوں نے پینٹ اور چرمی جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ یکا یک عروبہ کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ یقیناً حریم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہاں ڈرائیووے پر عمر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھی کو بھی تھوڑی سی دقت کے ساتھ انہوں نے پہچان لیا۔ وہ عمر کا قریبی دوست جرنلسٹ محسن تھا۔ ایک بندہ غالباً اور بھی تھا لیکن وہ ابھی تک گیٹ کی دوسری طرف گرے اسٹیشن ویگن کے اندر ہی تھا۔

عمر اور محسن ذرا جھکتے ہوئے آگے بڑھے، یہی وقت تھا جب عروبہ اور حریم نے اپنی بچی کھچی توانائی کو جمع کیا اور پورے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ''آگے نہ آؤ..... آگے بھیڑیے ہیں..... آگے نہ آؤ۔''

آواز مکمل طور پر عمر اور محسن تک نہیں پہنچی تاہم عروبہ نے عمر کو ذرا چوکنے ہوئے محسوس کیا۔ وہ دونوں پھر پوری طاقت سے پکارنے لگیں۔ ''باہر نکل جاؤ..... آگے نہ آنا..... آگے بھیڑیے ہیں۔''

حریم پکارنے کے ساتھ ساتھ اسٹیل کی ایک پلیٹ سے روزن کی گرل کو بھی پیٹ رہی تھی۔ آوازیں ان دونوں تک پہنچ چکی تھیں اور وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ شاید جاننا چاہ رہے تھے کہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں اور ان کا مکمل مفہوم کیا ہے۔

''آگے نہ آنا عمر۔'' عروبہ گرل سے منہ لگا کر پھر چلائی۔

اور تب اس نے دیکھا کہ عمر اور محسن ڈرے ڈرے انداز میں الٹے قدموں پیچھے ہٹے..... مگر جس تیزی سے انہیں ہٹنا چاہیے تھا، یہ وہ تیزی نہیں تھی۔ ابھی وہ چند قدم پیچھے ہی گئے تھے کہ قاتل بھیڑیے برآمدے کی طرف سے نمودار ہوئے اور ان دونوں کی طرف لپکے۔ بھیانک خطرے کو اپنے سامنے دیکھ کر عمر اور محسن پلٹے۔ چند قدم کے فاصلے پر لکڑی کا وہ سرخ کیبن تھا جو چوکیدار کی پوسٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ جان بچانے کے لیے ان دونوں کو اس کے سوا کچھ سجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کیبن میں گھس جائیں اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیں۔ بھوکے جانور عالم وحشت میں اس چوبی کیبن سے ٹکرائے۔ یہ کیبن ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ ان دونوں کا دفاع کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی خامی وہ تقریباً دو فٹ ضرب ڈھائی فٹ کا خلا تھا جس میں شیشہ فکس تھا..... تین چار سیکنڈ کے اندر یہ شیشہ چکنا چور ہو گیا اور دو تین بھیڑیے اندر گھس گئے۔ یہ قیامت خیز منظر تھا۔ پھر عروبہ اور حریم نے دیکھا، لکڑی کے کیبن کا دروازہ ٹوٹ کر کھلا اور عمر نکل کر بھاگا..... محسن یقیناً بھیڑیوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ بھیڑیے خونی عفریتوں کی طرح عمر پر جھپٹے۔

عروبہ عجیب ہیجانی انداز میں پکاری۔ ''آؤ حریم۔''

وہ دونوں نیچے اتریں اور دروازے کی طرف بڑھیں۔ تمام جانور گیٹ کی طرف تھے۔ یقینی بات تھی کہ اب اس دروازے کے پاس کوئی نہیں۔ عروبہ نے بپھرے ہوئے انداز میں دروازہ کھولا اور حریم کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں کرکٹ کا وہی مضبوط بیٹ تھا جو وہ اس سے پہلے بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کر چکے تھے۔ دروازے سے نکلتے ہی حریم نے وہ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اٹھالی۔ عروبہ نے دونوں بچوں کی حفاظت کے لیے آہنی دروازہ باہر سے بولٹ کر دیا..... ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر وہ دونوں سیڑھیوں کی طرف لپکیں اور باہر آگئیں۔ عروبہ آگے اور حریم ایک قدم پیچھے تھی۔ پھر انہوں نے وہ منظر دیکھا جو سینے کو شق کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جوان کی مدد کے لیے یہاں آیا تھا..... اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر انہیں ڈھونڈتا ہوا

یہاں پہنچا تھا..... موت کے گھیرے میں تھا۔ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ تین بھیڑیوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں۔ عمر کے ہاتھ میں شاید ٹوٹے ہوئے چوبی کیبن کی ایک مضبوط لکڑی تھی، وہ اس لکڑی کو چاروں طرف گھما رہا تھا اور قاتل جانوروں کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک بازو بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور چہرے پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کی یہ کوشش کسی طرح کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ان کے مہلک شکنجے میں جکڑا جانے والا تھا۔

عروبہ جیسے ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی، وہ چنگھاڑتی ہوئی اس بھیڑیے پر پل پڑی جو عمر کی چھاتی پر اپنے اگلے پنجے رکھ چکا تھا۔ حریم نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ بھیڑیا پلٹ کر حریم کی طرف آیا۔ وہ اندھا دھند کلہاڑی چلانے لگی۔ اس نے زنگ آلود کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور اسے بس گھماتی چلی جا رہی تھی۔ عمر گر گیا تھا، وہ اس کے سامنے جیسے ڈھال بن گئی تھی۔ یہ ایک گھمسان کا رن تھا۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر عروبہ کا بیٹ دو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار برآمدے کی طرف بھاگی۔ وہیں ایک کیاری کے پاس وہ کولٹ پسٹل پڑا تھا جو کل رات عدیل عرف عادی کے ہاتھوں سے چھوٹا تھا۔ دھوپ کی کرنیں سیدھی اس پسٹل پر پڑ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ پسٹل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

وہ جیسے پسٹل کے اوپر ہی جا گری اور تڑپ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے درخت سے ٹیک لگائی۔ پچیس تیس قدم کے فاصلے پر منظر تہلکہ خیز تھا۔ اکیلی حریم خوف سے چلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کلہاڑی بھی گھما رہی تھی۔ وہ تینوں بھیڑیوں کو زخمی عمر سے دور رکھنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی، بھیڑیے دو قدم پیچھے ہٹتے تھے اور پھر جبڑے پھاڑ کر تین قدم آگے آ جاتے تھے۔ عمر گر چکا تھا لیکن تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب عروبہ نے باقی دو بھیڑیوں کو دیکھا۔ وہ بدقسمت محسن کو خون میں نہلانے کے بعد لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے کیبن میں سے نکلے تھے اور اب تیزی سے عروبہ کی طرف لپکے تھے۔ حریم اور عمر سے برسرِ پیکار ایک بھیڑیے نے بھی ان کو جوائن کیا..... تین قاتل جانور اس کی طرف جھپٹے اور درمیانی فاصلہ تھا تقریباً پچیس میٹر..... عروبہ کو لگا جیسے اس کے نانا، ماضی کے دھندلکے سے نکل کر اس کے بالکل پاس آ گئے ہیں۔ اسے اپنی گود میں بٹھا لیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو کولٹ پسٹل کے دستے پر جما دیا ہے۔

ان کی سرگوشی عروبہ کو کانوں میں گونجتی محسوس ہوئی، سیفٹی کیچ ہٹاؤ..... بایاں ہاتھ بیرل کے قریب رکھو..... سر سیدھا کرو..... سامنے دیکھو..... صرف سامنے دیکھو.....

وہ سامنے دیکھنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ بھیڑیے پردۂ اسکرین پر اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سلوموشن میں اس کے قریب آ رہے ہیں..... اس کے نانا کی آواز کانوں میں گونجی..... کئی دفعہ دشمن کے مقابلے میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی..... سانس روک لو..... ہاتھ کانپنا نہیں چاہیے..... ٹریگر دباؤ..... ہاں، اب ٹریگر دباؤ۔

اس نے ٹریگر دبایا اور پھر دباتی چلی گئی۔ اس پر جیسے ایک جنون طاری تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور کولٹ پسٹل M1911 دھماکوں سے شعلے اگل رہا تھا..... ہاں، یہاں غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ دو جانوروں کو سر اور سینے میں گولیاں لگیں۔ وہ لڑھکنیاں کھا کر گرے۔ ان میں سے ایک عروبہ سے صرف دس بارہ فٹ کی دوری پر پھڑک رہا تھا۔ تیسرا جانور زخمی ہوا تھا..... اب وہ واپس پلٹا تھا۔ عروبہ اٹھ کر اس کے پیچھے گئی۔ اس نے ایک اور فائر کیا جو سیدھا اس کی گردن میں لگا۔ وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

باقی دو بھیڑیے حریم کا گھیراؤ چھوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ پھر یکا یک وہ چار دیواری کے جنگلے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے حصے کی طرف گئے تھے جہاں سے انہیں اندر آنے کی راہ ملی تھی۔ عروبہ جنونی کیفیت میں ان کے پیچھے بھی گئی۔ اس کی حالت زخمی شیرنی جیسی تھی۔ وہ ٹریگر دباتی چلی گئی لیکن اب صرف ایک فائر ہوا۔ اس کے بعد ٹرچ ٹرچ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ دس راؤنڈ والا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگنے والے دونوں جانور ''جنگلا چار دیواری'' کی دوسری جانب جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔

عروبہ پلٹ کر حریم اور عمر کی طرف آئی۔ عمر اب اٹھ گیا تھا۔ اس کے کندھے سے نیچے اس کا ایک بازو سخت زخمی تھا۔ وہاں سے سیاہ جیکٹ کا ایک بڑا ٹکڑا بھی غائب تھا۔ اس کے بعد دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی شدید زخمی تھیں۔ انگلیوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ بھیڑیے نے چبائی ہیں۔ اسے ایک جھٹکے میں شدید موچ بھی آئی تھی۔

''محسن..... محسن.....'' عمر کربناک انداز میں پکارا اور چوکیدار کے ٹوٹے ہوئے چوبی کیبن کی طرف بڑھا۔ کیبن میں چاروں طرف خون کے چھینٹے تھے۔ عروبہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ محسن کا پیٹ چاک ہے اور انتڑیاں جھلک دکھا

رہی ہیں..... لیکن اس کی سانس ابھی چل رہی تھی۔

عروبہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''عمر..... یہ بچ سکتا ہے۔ اسے اسپتال پہنچاؤ۔ جلدی کرو۔''

اسی اثنا میں گیٹ سے باہر کھڑی اسٹیشن وین میں سے بھی گول چہرے اور فربہ جسم والا ڈرائیور نکل آیا تھا۔ یہ تیس بتیس سالہ شخص وین میں سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا پھر بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں ان سب نے مل کر نہ صرف جاں بلب محسن کو اسٹیشن وین میں ڈال لیا بلکہ تہ خانے میں اتر کر باریال اور بے ہوش ماہین کو بھی نکال لائے۔ ماہین کو زخمی عمر نے اپنے کندھے پر اٹھایا تھا..... اسے اسٹیشن وین کی پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا۔ اس دوران میں عمر وہ ہولناک منظر دیکھ چکا تھا، جو عروبہ اور اس کے بچوں کو پچھلے کئی دن سے مسلسل ڈرا رہا تھا۔ یہ چوکیدار احسن خاں اور عدیل عرف عادی کی نچی کھچی لاشوں کا منظر تھا..... لاشیں جو کپڑے کی دھجیوں، مرغیوں کے بہت سے پروں اور پنجوں کے درمیان پڑی تھیں۔ ایک کیاری کے بارشی پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا قیمتی موبائل فون بھی پڑا تھا جو یقیناً عادی کا ہی تھا۔

عمر نے وحشت زدہ نظروں سے عروبہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ..... کیا ہے..... آنٹی؟..... یہ عادی.....؟''

''مر گیا..... اپنی موت آپ مر گیا.....'' عروبہ نے آتشیں لہجے میں کہا۔

تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ مڑے اور تیزی سے اسٹیشن وین کی طرف بڑھے۔ چند قدم آگے جا کر عروبہ رکی۔ اسے اس سارے منظر میں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک مُردہ بھیڑیا کیاری کے قریب پڑا تھا..... کیاری میں سفید گلاب تھے..... ہاں، سفید گلابوں پر اب خون کے چھینٹے موجود تھے.....

☆☆☆

ریسٹ ہاؤس کے ان خونی واقعات کو اب پندرہ روز گزر چکے تھے..... محسن کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا تاہم اسے پوری طرح تندرست ہونے میں ابھی کئی ماہ درکار تھے۔ باریال کی پنڈلی کا گہرا زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ماہین ابھی تک اسپتال میں تھی لیکن اس کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی۔ حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو رہے تھے۔ وہ مہربان کار پولیس نے دیرانے سے اپنی تحویل میں لی تھی جس میں سے عروبہ اپنے بچوں کے ساتھ نکل کر پناہ کی تلاش میں بھاگی تھی۔ وہ گاڑی اب واپس مل چکی تھی۔ عادی کی دردناک موت کا بھی خوب چرچا ہوا تھا۔ سب حقائق لوگوں کے سامنے آگئے تھے۔ عروبہ نے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا اور سچ کی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اس طاقت نے ہر ایک کو باور کرا دیا تھا کہ عادی اپنی شامتِ اعمال کے نتیجے میں اس ''گلزاری ولا'' نامی ریسٹ ہاؤس تک پہنچا اور وہاں بھیڑیوں کے غول نے اسے زندہ نوچ کھایا۔ عادی کے بااثر باپ ریاض کو اس واقعے کے بعد فالج کا اٹیک ہو چکا تھا اور وہ تصویرِ عبرت بن کر اسپتال میں پڑا تھا۔

عمر ڈیوٹی سے واپس آکر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بازو اور ہاتھ پر ابھی تک بینڈیج موجود تھی۔ ثمینہ صوفے پر نیم دراز تھی اور سیل فون کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہی تھی۔

''امی! کیا ہو رہا ہے؟'' عمر نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔

''وہی ویڈیو دیکھ رہی ہوں۔'' ثمینہ نے جواب دیا۔

عمر ٹائی ڈھیلی کر کے اور کرسی گھسیٹ کر ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سیل فون کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ یہ ویڈیو کلپ تین چار دن پہلے ہی عمر نے چھوٹے علی کے فون پر وٹس ایپ کیا تھا اور امی اب تک اسے آٹھ دس مرتبہ دیکھ چکی تھیں۔ ابو بھی اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہ تین چار منٹ کی تہلکہ خیز ویڈیو اس ڈرے سہمے وین ڈرائیور نے بنائی تھی جو ریسٹ ہاؤس کے خونی واقعے کے وقت وین میں موجود تھا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ بنائی گئی اس ویڈیو کا رزلٹ بہت اچھا تو نہیں تھا پھر بھی مناظر پوری طرح واضح ہوتے تھے۔ ویڈیو میں ڈرائیور کی اپنی خوفزدہ آوازیں بھی ریکارڈ ہوئی تھیں۔

اس ویڈیو میں جریم کسی چیل کی طرح عمر کی طرف جھپٹتی نظر آتی تھی، عمر جو خونی بھیڑیوں کے نرغے میں تھا۔ عروبہ بھی جریم کے ساتھ تھی پھر کچھ دیر بعد عروبہ کا کرکٹ بیٹ تو دو ٹکڑے ہو گیا تھا مگر جریم دیوانہ وار عمر اور بھیڑیوں کے درمیان موجود رہی تھی۔ وہ شلوار قمیص اور جرسی میں تھی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں، بال منتشر، چہرہ خاقہ زدہ..... اس کی بے مثال کوشش دیدنی تھی۔ وہ جان کی پروا نہیں کر رہی تھی..... شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے..... اسے کیسے استعمال کرنا ہے؟ بس وہ چلا رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے، اندھا دھند کلہاڑی کو حرکت دے رہی تھی۔

ویڈیو ختم ہوئی..... عمر نے امی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گداز اور آنکھوں میں نمی تھی۔ ماں بیٹا کتنی ہی دیر خاموش اور گم صم بیٹھے رہے۔ پھر ثمینہ نے گہری سانس لی

اور کھوئے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ ”کہتے ہیں جان اسی کی ہوتی ہے، جو جان بچاتا ہے۔“

عمر کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا۔ اس نے ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ماں کو کیسے بتاتا کہ اس کا دل اور دماغ برسوں سے اس کے تھے اور جس کے دل اور دماغ ہوتے ہیں، جان بھی تو اسی کی ہوتی ہے۔ وہ جو بھی تھی، جیسی بھی تھی، جب بھی تھی..... اس کے دل و دماغ کی مالک تھی اور آج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ لڑکپن کے دور میں آنے کے بعد کبھی اس کے حصار سے نکل ہی نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ عید اس خوشی کا نام ہے جو دل کے اندر سے پھوٹتی ہے اور جب دل خوشی سے محروم ہو تو وہ دن عید کا دن نہیں ہوتا..... اور جب دل میں خوشی موجزن ہو تو کوئی دن بھی عید کا دن ہو سکتا ہے۔ شاید وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ اپریل کی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ آنٹی عروبہ کی اجازت سے عمر، حریم کو سپر مارکیٹ لے کر آیا تھا۔ دونوں ایک آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ریسٹ ہاؤس والے واقعات کے حوالے سے حریم تقریباً سب کچھ ہی عمر کو بتا چکی تھی۔ اس نے عمر کو وہ بات بھی بتا دی تھی جو کسی اور کو نہیں بتائی تھی اور وہ یہ کہ اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر خود ہی عادی کو وہاں بلایا تھا..... وہ مرنے سے پہلے چاہتی تھی کہ عادی کو اس کی سزا تک پہنچانے کی ایک آخری کوشش کرے۔ یہ سب کچھ سن کر عمر سناٹے میں رہ گیا تھا۔ پھر عمر نے حریم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس بات کو ہمیشہ خود تک محدود رکھے گی۔ بہرحال، یہ تو تین چار دن پہلے کی بات تھی۔ اب اس سہانی سہ پہر میں وہ آئس کریم پارلر کے سامنے گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ حریم نے کن انکھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پچھلے کئی منٹ سے اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔ شاید وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ آخر بے حد حوصلہ کر کے وہ اتنا کہہ سکا۔ ”حریم! آپ کا بہت شکریہ، آپ نے..... میری جان بچائی۔“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گلابی چہرے کے ساتھ بولی۔ ”لیکن میں نے ابھی تک آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ ہمارے لیے ہی تو وہاں آئے تھے۔“

”اگر نہ آتا تو اس سے زیادہ شرمندگی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس میں شکریہ وصول کرنے کا کوئی جواز نہیں حریم۔“

”لیکن ایک اور بات پر بھی تو میں نے اب تک آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بول رہی تھی۔

”کون سی بات؟“

”آپ نے بھی تو ایک دن میری جان بچائی تھی..... پتا نہیں اس دن کیا ہوا تھا مجھے۔ گولیاں کھا کر اپرٹ پر گر گئی تھی۔ آپ نہ آتے تو شاید وہیں پڑے پڑے..... مر گئی ہوتی۔“

”مریں آپ کے دشمن۔“ عمر نے ناراضگی سے کہا۔

”اب ایسی باتیں منہ سے کیوں نکالتی ہیں۔“

حریم نے پھر کن انکھیوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ حریم کے الفاظ نے اسے تکلیف پہنچائی ہے۔

”سوری“ وہ بولی۔

عمر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہی وقت تھا جب نئے ماڈل کی ایک بڑی جیپ فراٹے سے ان کی گاڑی کے پاس سے گزری اور بہت سا کیچڑ قریبی لوگوں پر اچھال گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی امیر زادہ بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے بال پونی کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔

”خبیث..... بدمعاش..... لگتا ہے نشہ کیا ہوا ہے۔“ ایک جواں سال راہ گیر عورت نے اس پر لعنت ارسال کی..... اور پھر کپڑے اور بال پونچھتی ہوئی مارکیٹ کے اندر چلی گئی۔

عمر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لوگ طاقت اور اختیار کے نشے میں جرم کرتے ہیں..... اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انجام سے بچ جائیں گے..... کیونکہ ان کے پاس بچنے کے بے شمار وسائل ہیں لیکن وہ ایک ”لاٹھی“ کو بھول جاتے ہیں، جو خدا کی لاٹھی ہے۔ وہ ہر جگہ انہیں ڈھونڈ سکتی ہے..... اور وہ ڈھونڈ لیتی ہے۔“

دونوں خاموش ہو کر کسی سوچ میں کھو گئے۔ لاہور کی اس حسین سہ پہر پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

”اب واپس چلیں؟“ حریم نے پوچھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے خالی خالی لہجے میں کہا۔

”نہیں، جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

اس کے الفاظ میں ہلکی سی معنی خیزی بھی تھی۔ ان الفاظ میں وہ اقرار پوشیدہ تھا جس کا انتظار عمر کئی دنوں سے بڑی ہی بے تابی کے ساتھ کر رہا تھا..... بے شک کوئی دن بھی عید کا دن ہو سکتا ہے۔

”او کے.....“ اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے حریم کے گھر کی طرف موڑ دی۔